کلیاتِ سجاد ظہیر

روشنائی

مرتبین:

نجمہ ظہیر باقر، علی باقر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)
ایف۔سی۔33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

کلیاتِ سجاد ظہیر

BACKU
25
OCT

روشنائی

مرتبین:

نجمہ ظہیر باقر، علی باقر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)

ایف۔سی۔33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

Kulliyat-e-Sajjad Zaheer

Edited by: Prof. Ali Baquer, Prof. Najma Baquer

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت :
پہلا ایڈیشن :
قیمت :
سلسلہ مطبوعات :
کمپوزنگ : مسعود التمش

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ایف۔سی۔33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی۔110066

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خدا داد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ، فلسفہ، سیاسیات، اقتصادیات، سماجیات اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور

اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم وفنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی، بولی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

کلیات سجاد ظہیر کی اشاعت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اہل علم سے گزارش ہے کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

ڈائرکٹر

عرضِ حال

انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام کو پچاس سال پورے ہو رہے ہیں۔ اس موقعے پر سجاد ظہیر ورضیہ سجاد ظہیر میموریل کمیٹی، دہلی نے طے کیا ہے کہ ''روشنائی'' شائع کی جائے۔ ''روشنائی'' انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام وتشکیل کی واحد مستند تاریخ ہے جو سجاد ظہیر صاحب نے راولپنڈی سازش کیس میں ماخوذ ہونے پر پاکستان کی جیلوں میں لکھی تھی، ہمیں اُمید ہے کہ اُردو ادب اور اس کی تاریخ کے طلبا اس کتاب کی اشاعت کا خیر مقدم کریں گے۔

انجمن ترقی پسند مصنّفین کی تنظیم وتشکیل میں سجاد ظہیر اور ان کی رفیقۂ حیات رضیہ سجاد ظہیر نے اپنی زندگیوں کا بہترین حصہ صرف کیا۔ 1935 میں سجاد ظہیر نے اپنے چند ہم خیال دوستوں کے ساتھ لندن میں اس تحریک کی داغ بیل ڈالی تھی اور اپنی زندگی کے آخری دم تک وہ ان مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں رہے، جو ترقی پسند تحریک کی جان تھے۔ اس تحریک کے ذریعہ وہ ہندستان کے لاکھوں کروڑوں پسماندہ انسانوں میں ایسا شعور پیدا کرنا چاہتے تھے جو انھیں سماجی، معاشی، استحصال اور سیاسی غلامی سے نجات دلانے میں مددگار ثابت ہو، اور یہ اہم کام ہندستان کی مختلف زبانوں کے شاعروں، فنکاروں، اور دانشوروں کی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے بغیر ممکن نہ تھا۔ سجاد ظہیر کا یہ یقین تھا کہ ادب کا تعلق عوامی زندگی اور اس کے اُتار چڑھاؤ سے ہونا

چاہیے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اس طرح گزاری کہ لوگ ان کی صداقت، عوام دوستی، مستقل مزاجی اور ان کے اعتقاد اور خلوص کے قائل ہو گئے۔ اپنے عقائد کی پختگی، مزاج کی نرمی اور دریا دلی سے انھوں نے لکھنے پڑھنے اور سوچنے والوں کی کئی نسلوں کو اپنا ہمراز، ہمدم اور ہم قدم بنا لیا تھا۔ کبھی انعام یا عہدے کا لالچ ان کے قدموں کو نہ ڈگمگا سکا، کسی موقع پرستی کی وجہ سے انھوں نے نہ کبھی اپنے نظریے میں جھول آنے دیا اور نہ ہی کبھی فن کو رُسوا کیا۔ باوجود ہزار تنگی اور صعوبت اپنے ملک سے بے وفائی نہیں کی اور دُنیا کو یہ باور کرا دیا کہ ہر اچھا لکھنے والا عوام کا دوست اور رہنما بن سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا تعلق عوام اور ان کی زندگی سے ہو۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے ذریعہ ہندستانی عوام کو جہالت، توہمات، روایات، تعصّبات اور استحصال کے اندھیروں سے نکال کر علم و دانش کی روشن راہوں پر گامزن کرنے میں مدد کی۔

سجاد ظہیر و رضیہ سجاد ظہیر کے لیے اس سے بہتر کوئی خراج عقیدت نہیں ہوسکتا کہ ان کی تحریروں کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ کمیٹی نے ان دونوں کی تخلیقات کی اشاعت کا ایک جامع پروگرام ترتیب دیا ہے۔ اب تک رضیہ سجاد ظہیر کے افسانوں کے دو مجموعے ''زرد گلاب'' (1981)، اور ''اللہ دے بندہ لے'' (1984) شائع کیے جا چکے ہیں۔ اب ''روشنائی'' کی اشاعت اس سلسلہ کی تیسری کڑی ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ بہت جلد'' پگھلا نیلم''، ''لندن کی ایک رات'' اور'' دیوانہ مرگیا'' بھی شائع کی جائیں، لیکن کمیٹی کے مالی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لیے یہ کام سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد ظہیر کے ان انگنت چاہنے والوں کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے، جو دنیا میں چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔

''روشنائی'' کے اس نئے ایڈیشن کی کئی نمایاں خصوصیات ہیں۔ یہ کتاب چونکہ بنّے بھائی نے بہ حالت اسیری لکھی تھی، اس لیے انھوں نے ابواب کے صرف نمبر دیے تھے، ہم نے ہر باب کے موضوع کی مناسبت سے عنوان تجویز کر دیے ہیں۔ ایک اور اہم بات ہے کہ کتاب میں ذکر ہوئے تمام تخلیق کاروں اور تحریک سے وابستہ افراد، رسائل، اخبارات اور مقامات کا ایک جامع اشاریہ (Index) تیار کر دیا گیا ہے، جو شبیع احمد صاحب کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ تحریک سے وابستہ افراد کی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ ہمیں اعتراف ہے کہ چند بہت ضروری تصاویر شامل ہونے سے رہ گئی

ہیں۔لیکن اس کے لیے ہماری اس مجبوری کو دخل ہے کہ بصد کوشش ہم ان تصاویر کو حاصل نہ کر پائے۔ شامل کی گئی تصویروں کے حصول کے لیے ہم پروفیسر نجمہ ظہیر، جناب علی سردار جعفری صاحب، جناب راج نرائن راز صاحب، اور پرتیش نندی کے مشکور ہیں۔ کتاب کے شروع میں سجاد ظہیر صاحب کا ایک مختصر سوانحی خاکہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ جناب راج بہادر گوڑ صاحب نے کتاب کا ایک مختصر مگر جامع مقدمہ ''ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی'' کے نام سے لکھا ہے۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ ہم مکتبہ دانیال، کراچی کے مالک جناب ملک نورانی صاحب کے بھی ممنون ہیں کہ انھوں نے اس ایڈیشن کی اشاعت میں ہماری مدد کی۔ اشاریہ ترتیب دینے اور اشاعت سے متعلق صلاح مشورہ کے لیے ہم شبیع احمد صاحب کے مشکور ہیں۔ طباعت کے دشوار گزار مراحل میسرز 'سیما پبلی کیشنز' اور 'نیوڈیر آرٹ پرنٹرس، دہلی' کی بدولت آسانی سے طے ہو گئے، ہم ان کے بھی ممنون ہیں۔

○○

ـــ علی باقر

سکریٹری

سجاد ظہیر و رضیہ سجاد ظہیر میموریل کمیٹی

عرضِ حال ثانی

''روشنائی'' کا یہ نیا ایڈیشن حکومت ہند کے ادارے ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کی جانب سے شائع کیا جا رہا ہے۔کونسل سجاد ظہیر کی صد سالہ جشن پیدائش کے موقع پر ''کلیات سجاد ظہیر'' شائع کرنے کا اعلان کر چکی ہےاور''روشنائی''اس کی پہلی کڑی ہے۔اس اہم تاریخی ادبی دستاویز کے کئی ایڈیشن، کچھ قانونی اور کچھ غیر قانونی طور پر شائع ہو چکے ہیں۔ ''روشنائی'' کے ہندی اور انگریزی تراجم بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔

اس کتاب کا پچھلا ایڈیشن''سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد ظہیر میموریل کمیٹی'' کی جانب سے 'سیما پبلی کیشنز' نے 1985 میں شائع کیا تھا۔سجاد ظہیر نے 17 جنوری 1954 کو سینٹرل جیل، کچھ (پاکستان) میں اس کتاب کا ''حرف آخر'' لکھا تھا۔اس کے بعد وہ تقریباً بیس برس زندہ رہے،مگر انھوں نے اپنی تحریر میں ترمیم یا اضافہ کی ضرورت محسوس نہ کی۔ان کو اپنی اس تحریری کاوش کی تخلیق میں صرف کی ہوئی محنت پر پورا اعتماد تھا۔قارئین اور محققین کی سہولت کے پیش نظر پچھلے ایڈیشن میں کچھ''اضافے'' کیے گئے تھے،جن کی تفصیل راقم الحروف نے''عرضِ حال''میں لکھی تھی۔یہ اضافے کچھ اس طرح تھے......میرا تیار کیا ہوا سجاد ظہیر کا سوانحی خاکہ،ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا مقدمہ،ترقی پسند مصنّفین اور سجاد ظہیر کی چند تصاویر، شبیع احمد کا ترتیب دیا ہوا اِشاریہ (انڈیکس)۔ بنے بھائی نے ابواب کے عنوان نہیں دیے تھے۔پچھلے ایڈیشن میں ہر باب کا عنوان بھی تجویز کیا گیا تھا۔

ترقی پسندی تو ہمیشہ سے رہی ہے۔مگر ترقی پسند تحریک کا وجود اچانک ظہور میں نہیں آیا تھا

اور نہ ہی یہ بغیر مسلسل جدوجہد اور لگن کے پروان چڑھی۔ یہ سچ ہے کہ نومبر 1934 کی ایک تاریک اور ٹھٹھرتی ہوئی شام کو لندن کے ایک چائے خانے میں چند ہوش مند ہندستانی نوجوان اکٹھا ہوئے تھے اور انھوں نے ترقی پسند تحریک کے منشور کے اعلان پر اپنی رضامندی ظاہر کی تھی۔ اس منشور کا مسودہ تیار کرنے والے سجاد ظہیر تھے، اس تحریک کو انگریز حکمرانوں سے ٹکر لینے کا ایک سیاسی آلہ بنانے والے سجاد ظہیر تھے، اس گروپ میں سے سب سے پہلے ہندوستان لوٹنے والے سجاد ظہیر تھے، اس منشور کی حمایت میں اس وقت کے ہندوستان کے بڑے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو ساتھ لینے والے سجاد ظہیر تھے۔ اس گروپ کے سبھی ممبر کسی نہ کسی طرح اس نئی تحریک کو فروغ دینے کے لیے کوشاں تھے، مگر سب سے زیادہ فعال اور مستعد سجاد ظہیر تھے۔

سجاد ظہیر جب 1927 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ گئے تو انقلاب روس کو رونما ہوئے دس برس بیت چکے تھے۔ ان کی والدہ لیڈی وزیر حسن اپنے سکریٹری سے اخبار میں چھپی خبریں خاص طور پر سنتیں جو روس کے اس عظیم انقلاب سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس تحریک کا منشور تیار کرنے سے پہلے سجاد ظہیر آکسفورڈ اور لندن میں سات برس تاریخ، قانون اور صحافت کی باقاعدہ تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ کارل مارکس کی تحریروں اور خصوصاً کمیونسٹ مینی فیسٹو کو پڑھ کر ایک نئی دُنیا کے خواب دیکھنے کی جسارت ان میں بیدار ہو چکی تھی۔ یہ وہ دَور تھا جب انگلستان اور یورپ کے دانشور نئے سوشلسٹ سماج کی افادیت کے امکانات سے مبہوت تھے۔ سجاد ظہیر نے ان کی تحریروں کو پڑھا، تقریروں کو سنا، جلسوں میں شرکت کی، بحث و مباحث میں سرگرمی سے حصہ لیا اور اپنے لیے ایک راہ عمل کا تعین کیا جس پر وہ اگلے چالیس برس، باوجود مصیبتوں کے، ثابت قدمی سے چلتے رہے۔ ترقی پسند مصنّفین کی تحریک ان کے نزدیک برطانوی سامراجیت سے نجات پانے کا ایک وسیلہ تھی اور اپنے وطن کے کروڑوں افراد کا بہتر مستقبل حاصل کرنے کا ایک ذریعہ۔ اس لیے سجاد ظہیر اور اُن کے رفقا نے اس تحریک کو ہندستان کی جنگ آزادی، ہندستانی ادب اور یہاں کی مخلوط تہذیب کی اعلیٰ اقدار سے باندھے رکھا۔

سجاد ظہیر نے ''روشنائی'' لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ تاریخ نویسی بہترین ادب کا حصہ بن سکتی ہے۔ یہ کتاب ترقی پسند تحریک کی ابتدا اور ارتقا کا آنکھوں دیکھا حال ہونے کے ساتھ ساتھ اس لیے بھی مقبول ہے کہ سجاد ظہیر کی تحریر کا انداز ادبی ہے، دلکش ہے، عوام و خواص کو پسند ہے۔ اس نئے ایڈیشن کا اشاریہ (انڈیکس) جناب انیس امروہوی نے مرتب کیا ہے۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

ـــــ علی باقر

سوانحی خاکہ

سجّاد ظہیر

نام	:	سید سجاد ظہیر
ادبی نام	:	سجاد ظہیر (بنّے بھائی)
عرفیت	:	بنّے بھائی
والد کا نام	:	سر سید وزیر حسن (1874-1947)
والدہ کا نام	:	سکینۃ الفاطمہ
تاریخ ولادت	:	5 نومبر 1905
مقام پیدائش	:	منجھلے صاحب کا مکان، گولہ گنج لکھنؤ۔ (یو۔ پی)
بھائی بہنوں کے نام	:	سید علی ظہیر
		نور فاطمہ (مسز سید عبدالحسن، والد پروفیسر سید نورالحسن)
		سید حسن ظہیر
		سید حسین ظہیر
		نورزہرہ (مسز نظیر حسین)
		سید سجاد ظہیر
		سید باقر ظہیر
شادی	:	10 دسمبر 1938 کو خان بہادر سید رضا حسین کی بڑی صاحبزادی رضیہ دلشاد (رضیہ سجاد ظہیر، 15 فروری 1917 تا 18 دسمبر 1979) سے اجمیر میں ہوئی۔

اولاد : نجمہ ظہیر باقر
نسیم بھاٹیہ
نادرہ ظہیر ببّر
نور ظہیر گپتا

تعلیم : میٹرک۔ گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول، لکھنؤ
بی۔اے۔(لکھنؤ یونیورسٹی)
ایم۔اے۔(آکسفورڈ یونیورسٹی)
بارایٹ لا (لندن)
ڈپلومہ اِن جرنلزم (لندن یونیورسٹی)

سرگرمیاں

1919 : تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کیا۔

1927 : انڈین نیشنل کانگریس (لندن برانچ) میں شرکت کی اور انگریزوں کے خلاف ہندستانی طلبا کو جمع کیا اور مظاہرے کیے۔
ہندستانی طلبا کے رسالہ ''بھارت'' کے مدیر بنے۔ یہ رسالہ آکسفورڈ یونیورسٹی نے بند کروادیا۔

1929 : انگلستان میں ہندستانی کمیونسٹ طلبا کا پہلا گروپ قائم کیا۔

1935 : لندن میں ہندستانی ترقی پسند مصنّفین کی انجمن قائم کی اور اس کا پہلا مینی فیسٹو تیار کیا۔ بعد میں وہیں ہندستانی مارکسسٹ طلبا کا ایک گروپ بنایا اور برٹش کمیونسٹ پارٹی سے ربط پیدا کیا۔ نومبر 1935 میں ہندستان واپس آئے اور الہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے رکن بنے، اور الہ آباد شہر کی کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری ہوکر پنڈت جواہرلعل نہرو کے شانہ بہ شانہ کام کیا۔ بعد میں آل انڈیا کانگریس کے ممبر منتخب ہوئے اور کانگریس کے مختلف شعبوں، خاص طور پر فارن افیئرس اور مسلم ماس کنٹیکٹ سے وابستہ رہے۔ ساتھ

ہی کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور آل انڈیا کسان سبھا جیسی تنظیموں کی تشکیل کی اور کسانوں اور مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا۔ اسی دوران اُن کا تعلق اُتر پردیش کے انڈر گراؤنڈ کمیونسٹ لیڈروں، جیسے کامریڈ پی۔ سی۔ جوشی، اور آر۔ ڈی۔ بھاردواج وغیرہ سے بھی قائم ہو گیا تھا۔ آگے چل کر وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی اُتر پردیش شاخ کے سکریٹری مقرر ہوئے جو اُس وقت انڈر گراؤنڈ تھی۔ اسی زمانہ میں سجاد ظہیر ماہنامہ ''چنگاری'' کے بھی مدیر رہے۔

برطانیہ سے واپسی کے فوراً بعد ہی انھوں نے ترقی پسند مصنفوں کو یکجا کرنے کے لیے کام شروع کر دیا۔

1936 : ہندستان کی انجمن ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی، جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی۔ اس انجمن کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ برطانوی حکومت کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کرنے کے جرم میں تین بار جیل گئے۔ سینٹرل جیل لکھنؤ میں دو سال قید کاٹی۔ قید کے دوران مختلف ناموں سے اخباروں کے لیے لکھتے رہے۔

1942 : کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے پابندی ہٹالی گئی۔ سجاد ظہیر نے پارٹی کے لیے کھلے بندوں کام کرنا شروع کر دیا۔ پارٹی کے ''قومی جنگ'' اور ''نیا زمانہ'' نامی اخباروں کے مدیر اعلیٰ رہے۔

1943 : انجمن ترقی پسند مصنّفین کی مزید تنظیم کرتے رہے اور ملک کی سب زبانوں کے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، اور فنکاروں کو اس انجمن سے وابستہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان دنوں بیوی اور دو بیٹوں کے ساتھ والکیشور روڈ، بمبئی میں قیام تھا۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے فیصلہ کے مطابق وہ پاکستان چلے گئے اور وہاں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ پاکستان میں طلبا، مزدوروں اور ٹریڈ یونین کے ممبروں کی تنظیم کا کام سنبھالا۔ تقریباً تین سال انڈر گراؤنڈ رہے۔

1951 : حکومت پاکستان نے راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کیا۔ مقدمہ اور سزا کے دوران حیدر آباد سندھ، لاہور، مچھ اور کوئٹہ کی جیلوں میں انتہائی صعوبت کی حالت میں ساڑھے چار برس رہے۔ اسی دوران ''ذکرِ حافظ'' اور ''روشنائی'' لکھی گئیں۔

1955 : پاکستان جیل سے رہائی کے بعد ہندستان واپس لوٹے اور انجمن ترقی پسند مصنّفین کی دوبارہ تنظیم شروع کی اور جنرل سکریٹری کے فرائض انجام دیے۔

1958 : تاشقند میں منعقدہ پہلی ایفروایشین رائٹرس کانفرنس میں شرکت کی اور ہندستان کی ایفروایشین رائٹرس ایسوسی ایشن کے سکریٹری مقرر ہوئے۔

1959 : ترقی پسند ہفتہ وار ''عوامی دور'' کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ بعد میں اسی اخبار کا نام بدل کر ''حیات'' رکھا گیا۔

1962 : اسلحہ بندی اور امن کی عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے ماسکو گئے۔ ہندستان کی مختلف ریاستوں (خصوصاً بنگال، اُتر پردیش، آندھرا پردیش، راجستھان، پنجاب، اور مہاراشٹر) میں ایفروایشین رائٹرس ایسوسی ایشن کو مستحکم کرنے کا کام کیا۔ ہندستان سے باہر جرمنی، پولینڈ، روس، چیکوسلوواکیہ، ہنگری، بلغاریہ اور رومانیہ کے ادیبوں اور شاعروں میں اس تحریک کو پھیلایا۔

1971 : ویتنام کے ادیبوں کی دعوت پر ویتنام کا دَورہ کیا اور ویتنام، لاؤس اور کمبوڈیا میں امریکی جبروتشدّد کے خلاف کام کیا۔

1973 : 13 ستمبر کو الما آتا روس میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ تدفین جامعہ ملیہ اسلامیہ، اوکھلا، نئی دہلی کے قبرستان میں ہوئی۔

تخلیقات

1935 : انگارے (افسانوی مجموعہ)

بیمار (ڈرامہ)

لندن کی ایک رات (ناول)

1942 : نقوش زنداں (جیل سے اپنی بیوی کے نام لکھے گئے خطوط کا مجموعہ)

روشنائی (ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کی تاریخ)

ذِکرِ حافظ (حافظ کی شاعری پر تحقیقی مقالہ)

1964 : پگھلا نیلم (نثری نظموں کا مجموعہ)

ترجمے

اوتھیلو (شیکسپیئر)

گورا (رابندر ناتھ ٹیگور)

پیغمبر (خلیل جبران)

ان کے علاوہ ادبی، معاشرتی اور سیاسی موضوعات پر چالیس برس تک مضامین لکھتے رہے، جو ہندستان اور بیرونی ممالک کے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئے اور ریڈیو پر نشر کیے گئے۔

سفر

1927 اور 1973 کے درمیان ان ممالک کا بارہا سفر کیا......

برطانیہ، فرانس، بیلجیم، جرمنی، ڈنمارک، آسٹریلیا، اٹلی، سوئزرلینڈ، روس، پولینڈ، چیکوسلوواکیہ، رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری، مصر، الجزائر، لبنان، شام، عراق، افغانستان، کیوبا، ویتنام، سری لنکا اور پاکستان۔

○○○

روشنائی

ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی

''سجاد ظہیر ورضیہ سجاد ظہیر میمور یل کمیٹی (دہلی)'' کی مجلس عاملہ نے طے کیا ہے کہ سجاد ظہیر مرحوم کی کتاب ''روشنائی'' شائع کی جائے اوراس طرح نہ صرف بنّے بھائی کی یاد میں عقیدت کا اظہار ہو، بلکہ بنّے بھائی کی ایک ایسی ''خودنوشتہ سوانح حیات'' بھی جوترقی پسندادبی تحریک کی آپ بیتی بھی ہے جو اَب نایاب ہے، پھر سے اُردو والوں کو حاصل ہو جائے۔

بنّے بھائی نے یہ کتاب پاکستان کی جیلوں میں مکمل کی اور ''حرفِ آخر'' 17 جولائی 1954 کو بلوچستان کے سنٹرل جیل ''کچھ'' میں لکھا۔ ''روشنائی'' کا ہندستانی ایڈیشن 1959 میں ''آزاد کتاب گھر''، دہلی نے شائع کیا تھا۔ انجمن ترقی اُردو ہند کی عاملہ نے ڈاکٹر عبدالعلیم مرحوم سے خواہش کی تھی کہ وہ اس کے لیے ایک مبسوط مقدمہ لکھ دیں، اور ہر حیثیت سے وہی اس کے اہل بھی تھے۔ وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے روح رواں اوراس کے بانیوں میں رہے ہیں۔ وہ بنّے بھائی کے دست راست اور کچھ مدت کے لیے انجمن ترقی پسند مصنّفین کے معتمد عمومی بھی تھے اور ترقی پسند تنقید کے اماموں میں سے ایک تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کام شروع بھی نہیں کیا تھا کہ موت کے سرد ہاتھوں نے انھیں ہم سے چھین لیا اور اُردو والے نہ صرف ایک عظیم محسن کو کھو بیٹھے بلکہ ترقی پسند

ادبی تحریک کے چاہنے والے بھی اور اس کے منکر؛ بھی ایک جامع اور مبسوط مقدمہ سے محروم رہے، جو ہوتا تو ''روشنائی'' کا مقدمہ، مگر ہوتا بہت کچھ۔

میموریل کمیٹی کے معتمد، علی باقر نے یہ کام مجھے سونپا۔ میں نے جی چرایا۔ میں ایک زبردست احساس کمتری کا شکار تھا کہ یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے گا، ''روشنائی'' سے انصاف نہ ہو سکے گا۔ میں نے ٹالا بھی بہت لیکن آخر کتاب کو چھپ کر نکلنا ہی تھا۔ سوچا کچھ لکھ دوں۔ اس سے کچھ نہیں تو ''روشنائی'' سے میرے رشتے کی حقیقت ہی آشکارا ہو جائے گی۔

''روشنائی'' ناظرین کے ہاتھوں میں ہے اور جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ یہ ایک طرح کی ترقی پسند ادبی تحریک کی ''آپ بیتی'' ہے۔ اس میں تحریک کے آغاز سے 1947 تک (ملک کی آزادی اور تقسیم تک) کی کہانی خود 'میر کارواں' کی زبانی بیان ہوتی ہے۔ ''روشنائی'' میں نہ صرف سجاد ظہیر کا شگفتہ اور مسحور کن اسلوب آپ کو شروع سے آخر تک اپنی گرفت میں رکھے گا بلکہ اس تحریک نے جو اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں، جن مشکلات کا سامنا کیا ہے، اور جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، جن تنظیمی اور نظریاتی اُلجھنوں کا شکار رہی ہے، اور جس حسن وخوبی سے انھیں سلجھانے کی سعی کی ہے...... سبھی کچھ اس کتاب میں ملے گا۔ شاید ڈاکٹر قمر رئیس نے کسی جگہ ''روشنائی'' کو ترقی پسند ادب لکھنے والوں کے لیے ایک ''درسی کتاب'' کہا ہے اور اس کی اہمیت جتائی ہے۔ بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں دہے میں اُردو ادب جس کشمکش اور جس چیلنج سے دوچار رہا ہے، اس کے تصور ہی سے بدن میں پھریری اور ذہن میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔

بنّے بھائی نے ان 20 سے 25 برسوں کی، جو انتہائی تاریخ ساز رہے ہیں، ادبی تاریخ ان 500 صفحات میں اکٹھی کر دی ہے۔

ویسے عصری اُردو ادب کی داستان 1857 سے شروع ہوتی ہے اور یہی اُنیسویں صدی کا نصف آخر ہندستان کی اُردو دنیا کے نشاۃ الثانیہ کا دَور ہے۔ یہ برصغیر کی سبھی زبانوں میں نشاۃ الثانیہ کا زمانہ ہے۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو کنویں کے مینڈک کی طرح ٹھیٹ ہندستانی سمجھتے ہیں اور ہر بدیس سے آنے والی ہوا کو مسموم سمجھ کر ذہنوں کی کھڑکیاں بند کر لیتے ہیں، ان کے لیے لمحۂ فکر ہوگا کہ نشاۃ الثانیہ کی تحریک بھی انگلستان کی تبدیلیوں اور تحریکوں کی مرہون منت رہی ہے۔ یورپ میں یہ عقلیت پسندی کا دَور رہا ہے اور اس عقلیت پسندی نے، جو سرمایہ داری کے عروج کی نشاندہی

کرتی ہے، ہندستان کے متوسط طبقے کے انگریزی سے واقف پڑھے لکھے حلقوں کو متاثر کیا۔

نشاۃ الثانیہ کے علمبرداروں نے یہ نہیں کیا کہ اپنے قومی ورثے کو تیاگ دیا ہو، بلکہ انھوں نے دریا کے مشرقی اور مغربی دونوں ہی کناروں سے نہریں نکالیں اور گلشن تہذیب و ادب کی آبیاری کی۔ سر سید احمد خاں (1817 تا 1896)، محمد حسین آزاد (1833 تا 1910)، ڈپٹی نذیر احمد (1836 تا 1912)، خواجہ الطاف حسین حالی (1837 تا 1914)، مولانا شبلی (1857 تا 1914)، مرزا رسوا (1858 تا 1931) اور عبدالحلیم شرر (1860 تا 1926) کی ادبی، تخلیقی اور سماجی اصلاحی سرگرمیوں کا یہی درخشاں دور ہے۔ اس دور کے ادب کی خصوصیات ہی یہ ہیں کہ وہ سماجی برائیوں سے برسر پیکار رہے۔ اصلاح کا علمبردار رہے۔ اس کا انداز براہ راست ہے۔ اس میں خباثتوں پر طنز ہے اور مہملات کو ظرافت کا نشانہ بنایا ہے۔ اکبرالہ آبادی (1846 تا 1921) کا اسلوب سیدھا سادا اور انداز آسان ہے۔ یہی وہ دَور ہے جبکہ ناولیں لکھی گئیں اور نئے انداز کے صحافت کی نیو پڑی۔ مذہب کے نام سے جو مذہب دشمن لغویات سماجی زندگی میں راہ پا گئی تھیں، ان پر کس کر چوٹ کی گئی۔ قدامت پسند تلملا اٹھے، نشاۃ الثانیہ کے ان علمبرداروں کو قدامت کے طرف داروں سے سخت مقابلہ تھا اور صحت مند ادب اسی آویزش سے پیدا ہوا اور فروغ پاتا رہا۔

اس دور کی ادبی کشمکش ترقی پسند اور جارحانہ قدامت پسند قوتوں کے درمیان تصادم کا عکس پیش کرتی ہے اور نسیم مغرب کا ان کلیوں کو چٹکانے میں بہت بڑا رول ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے کہا ہے کہ...... ''سترھویں اور اٹھارھویں صدی کا ہندستان رو بہ زوال و انحطاط جاگیردارانہ نظام کے سہارے جی رہا تھا، جس کو دھکا دے کر آگے بڑھانے والی قوت محض کچھ روایتیں تھیں۔ اگر ان روایتوں کی طاقت گھٹتی جائے...... اگر ان کا تعلق اصلی مادی حالات سے ختم ہوتا جائے...... اگر نئے حالات کے مطابق ان میں اضافہ نہ ہو، تو محض روایتیں نہ تو ادب اور زندگی کی قدروں کو زندہ رکھ سکتی ہیں اور نہ انھیں آگے بڑھا سکتی ہیں۔ (ذوق ادب و شعور: 57)

شارب ردولوی اپنی کتاب ''جدید اُردو تنقید'' میں اس دور کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں...... ''اس زمانہ میں یک رنگی اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔ ایسے وقت میں عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ جدوجہد اور زندگی کے حقیقی مسائل سے فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے راستے

تلاش کرتے ہیں جو کہ آسان اور سہل الحصول ہوں۔ مثلاً معنی اور صورت اور مواد اور ہیئت کے مقابلے میں صورت اور ہیئت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ یہ روبہ انحطاط سماجی نظام کی علامت ہے۔ ایسے نظام میں جو ادب پیدا ہوتا ہے، اس میں آرائش، مبالغہ، بناوٹ اور تصنع پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ مادی زوال تنزل کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے فلسفے میں غرق ہوکر انسان دنیاوی جدوجہد سے علاحدہ ہوجاتا ہے۔ اسی میں اس کو سکون ملتا ہے۔ قنوطیت جو کہ تصوف کا ایک جزو ہے، انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں اور جدوجہد کی قوت کو ختم کر دیتی ہے۔ اس کے سامنے صرف پُرانی روایات ہی رہتی ہیں اور ان ہی روایات کی حفاظت میں تسکین و تشفی کا سامان نظر آتا ہے۔''
(جدید اُردو تنقید: 146)

اُردو کے نشاۃ الثانیہ کے رہنماؤں کو اس ''یک رنگی اور ٹھہراؤ'' اور اس اندھی روایت پرستی کے خلاف جہاد کرنا تھا اور جہاد ترقی پسندی کی صفت ہے۔ چنانچہ انگلستان کے نئے رجحان اور وہاں کا نیا ادب ان کو آسرا دیتا ہے۔ نذیر احمد دلی کالج سے وابستہ رہے، انگریزی سیکھی، انگریزی سے متاثر اساتذہ (ماسٹر رام چندر) سے تلمذ رہا۔ ان کی کئی ناولیں انگریزی ناولوں یا داستانوں سے ماخوذ ہیں۔ سرسید احمد خاں کے کارنامے ''تہذیب الاخلاق'' کے صفحوں پر ''انوارالاخلاق'' سے مناظرے، سائنٹفک سوسائٹی سے وابستگی، اور اینگلو محمڈن کالج کا قیام......ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ سرسید سائنٹفک تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے تا کہ وہ کارآمد شہری بن سکیں۔ جو سماجی کمزوریاں پیدا ہوگئی تھیں، انھیں دُور کرنا چاہتے تھے اور اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ہر اس رُکاوٹ کا دلیری سے مقابلہ کرتے تھے جو قدامت پسندوں اور روایات کے غلاموں کی طرف سے پیدا کی جاتی تھیں۔

ادبی محاذ پر بھی یہی اجتہاد اس دور کا خلاصہ رہا ہے۔

1911 کی جنگ طرابلس اور 1913 کی جنگ بلقان نے ہندستان کے مسلمانوں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اب سامراج دشمن میں صف بندی شروع ہوچکی تھی۔ دُنیا پہلی جنگ عظیم کی طرف تیزی سے جا رہی تھی۔ عالمی سامراجی دنیا کی ازسرِ نو تقسیم چاہتے تھے۔ حسرت موہانی اور شکیل نعمانی نے اس دور میں بالخصوص وہ ادب تخلیق کیا تھا جو زمانے کے ساتھ سامراج دشمن مزاج کے مطابق تھا اور جس نے مسلمانوں میں آزادی کے جذبے کو ابھارا۔

پھر پہلی بڑی جنگ ہوئی۔ ہندستان کی آزادی کی تحریک نے، جس کی نمائندگی انڈین نیشنل کانگریس کرتی تھی، انگریزوں کے کھوکھلے وعدوں پر بھروسہ کیا اور جنگ میں ساتھ دیا۔ اِدھر جنگ ختم ہوئی اور اُدھر دو بڑے واقعے رونما ہوئے۔ ایک 1917 کا عظیم انقلابِ روس تھا، جس نے زارشاہی کا تختہ اُلٹ دیا اور روس کی کایا پلٹ دی، اور دوسری طرف دُنیا بھر میں آزادی کی لہر اُبھر آئی۔ انگریزوں کی وعدہ خلافی کے خلاف ہندستان جسد واحد کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد، خلافت کی تحریک، گاندھی جی اور علی برادران کی سرکردگی میں ملک بھر میں ایک زبردست سامراج دُشمن تحریک چل پڑی تھی۔

ایسے میں اُردو ادب نے جو خدمت کی ہے وہ تاریخ کے زریں صفحات پر درج ہے۔ مولانا حسرت، محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، پنڈت برج نرائن چکبست، علامہ اقبال، جوش، کتنے ہی نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ اُردو کے ادیب صرف آزادی کے گیت نہیں گا رہے تھے۔ وہ آزادی کا جھنڈا لیے جد و جہد آزادی میں اگوائی کر رہے تھے۔

اب ہندستان کی آزادی کی تحریک پر نئے داخلی اور خاجی عوامل اثر انداز ہو رہے تھے۔ اندرون ملک سرمایہ داری کے فروغ نے مزدور طبقہ کو جنم دیا تھا جو آزادی کی جدو جہد میں ایک نئے اور طاقتور فوجی دستے کا اضافہ تھا۔ مزدوروں کی ہڑتالوں نے آزادی کی لڑائی کو ایک نئی جہت عطا کر دی تھی۔ اب آزادی کا مقصد ہندستانی سماج کی تنظیم جدید بھی تھا۔ پرانے جاگیرشاہی سامنتی نظام کو ٹھکانے لگانے کی ضرورت تھی اور سرمایہ داری کو اس سامنتی نظام کی جگہ لینے سے روکنا تھا۔ آزادی کی تحریک کے اندر ایک ''گرم دل'' پیدا ہو گیا تھا اور آتشیں نوجوان آتشی اسلحہ کے ذریعہ انگریزی سامراج کا قلع قمع کرنے کی راہ پر چل پڑے تھے، اور اُدھر ہمالیہ کے پرے انقلاب روس نے نہ صرف اس ملک کی کایا پلٹ دی بلکہ سرمایہ دار دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ اب سرمایہ داری بلا شرکت غیرے کرۂ عرض پر حکمراں نہیں تھی اور اب سامراج دشمن آزادی کی جدوجہد ایک نئے مخالف سرمایہ داری راستے اور ایک نئی سوشلسٹ منزل سے آشنا ہو چکی تھی۔

ایسے میں ادبی محاذ پر بھی گرمی پیدا ہونی لازمی تھی۔ حالی اور نذیر احمد نے اُردو ادب کے لیے جو قبا تیار کی تھی وہ اب تنگ ہو رہی تھی۔ تخلیقی ادب کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے۔ ہر دور میں نئی آن سے پھوٹتے ہیں اور نئی راہیں ڈھونڈ کر ان پر بہہ چلتے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کہا

ہے......’’میرے خیال میں ادب ایک سماجی عمل ہے اور چونکہ سماجی زندگی ہر لمحہ اور ہر آن تغیر و تبدل سے ہم آغوش و ہمکنار رہتی ہے، اس لیے ادب بھی تغیرات اور انقلابات کے سانچوں میں ڈھلتا رہتا ہے اور ہر دور کے ادب میں اس وقت کی سماجی زندگی ہی کے درمیان پلتا، بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے۔‘‘ (بحوالہ شارب ردولوی، جدید اُردو تنقید: 376)۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی (تنقیدی زاویے: 11) اور مجنوں گورکھپوری مزید وضاحت سے کہتے ہیں...... ہمارے خیالات زندگی کی صورت بدلنے میں مدد دیتے ہیں لیکن وہ خود پیداوار ہوتے ہیں زندگی کے ان تمام عناصر کی جن کو مجموعی طور پر زمانہ اور ماحول کہتے ہیں۔ مارکس اسی لیے وجود کو فکر پر مقدم سمجھتا ہے اور خیال و عمل (Theory & Practice) کی یک جہتی پر زور دیتا ہے۔ ہم زندگی کی اس متحرک قوت کو مانتے ہیں جس کو تاریخ کہتے ہیں اور جو ایک جدلیاتی قوّت ہے یعنی جو پُرانی صورت کی تردید اس لیے کرتی ہے کہ نئ صورت پیدا کرے، جو ہر پُرانی صورت سے بہتر ہو۔‘‘ (مجنوں گورکھپوری، ادب اور زندگی: 19، بحوالہ شارب ردولوی، جدید اُردو تنقید: 360)

مجنوں گورکھپوری ہی نے کہیں کہا ہے کہ موجود سے ناآسودگی اور ممکن الحصول کی خواہش کے درمیان آویزش ہی آرٹ کی خالق ہے، اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہی آویزش انسانی کارواں کے ارتقا کی جانب سفر کی متحرک ہے۔ ’’ممکن الحصول‘‘ کی خواہش نہ ہو تو زندگی اور زندگی کی ساری کشمکش بے مقصد ہو جائے...... اور جب آرزو کی آسودگی کی راہیں مسدود کر دی جاتی ہیں تو انقلاب رونما ہوتے ہیں...... بغاوتیں ہوتی ہیں۔

چنانچہ ادب میں سارے اجتہاد کا یہی راز اور یہی جواز ہے اور اس سے انکار تاریخ کی اس حرکی قوت سے انکار ہے جس نے سماج کے ارتقا میں محرک قوت کا کام کیا ہے اور آج بھی کر رہی ہے۔

دُنیا کی اور زبانوں کے عظیم ادب کی طرح اُردو ادب کے خمیر میں بھی یہی اجتہاد رہا ہے۔ تاریخ کے ہر موڑ پر، انقلاب کے ہر دوراہے پر، اُردو ادب نے سماجی قوتوں کا ساتھ دیا ہے۔ اسی کو ڈاکٹر اعجاز حسین نے ’’اُردو کا ترقی پسند خمیر‘‘ کہا ہے۔

لیکن یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ نیا ادب ہر دور میں پیدا ہوا ہے تاکہ سماجی کشمکش کی نئی راہیں ہموار کرے۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اپنے ماضی سے بالکل کٹا ہوا، اپنے

طور پر مجرد ادب ہے۔ ادبی محاذ پر تسلسل اور جدت کے درمیان، روایت اور بغاوت کے بیچ ہمیشہ آویزش رہی۔ روایت کے ناکافی ہونے پر ہی بغاوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ادب بھی جب عصری ضرورتوں کی تکمیل سے قاصر ہوتا ہے تو ایجاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ ایک مسلسل آویزش ہے اور ہر نیا ادب تسلسل اور جدت، روایت اور بغاوت، اور وراثت اور اختراع کے درمیان ایک بالاتر سطح پر امتزاج کا نتیجہ ہوتا ہے اور اسی بنا پر سردار جعفری نے کہا ہے......

''جدید ترقی پسند ادب میں قدیم ادب کا جادو ضرور سرایت کر چکا ہے لیکن اس کا اپنا جادو نیا ہے اور نیا ہونا چاہیے۔'' (سردار جعفری، ترقی پسند ادب: 140)

ماضی، مستقبل کے لیے ہماری جدوجہد میں انسپریشن فراہم کرسکتا ہے۔ لیکن وہ ہمارے ذہنوں اور ہماری فکری صلاحیتوں کو جکڑ کر مفلوج نہیں کرسکتا۔ یہیں سے احیا پسندی اور ترقی پسندی کے درمیان حدیں قائم ہوتی ہیں۔

اس طرح 1936 میں جب انجمن ترقی پسند مصنّفین قائم ہوئی اور ترقی پسند ادب کا دھارا پھوٹا، تو یہ نہ کوئی تعجب کی بات تھی، اور نہ کوئی آسمان سے نازل ہونے والی بلا یا نوازش ہی تھی، اور نہ کوئی ایسا پودا تھا جو بدیش سے لا کر سرزمین ہند پر لگا دیا گیا تھا۔ یہ اُنیسویں صدی کا نشاۃ الثانیہ کا ادب، پھر سامراج دشمن جدوجہد کے دوران بیسویں صدی کے اوائل میں پیدا ہونے والے اجتہادی ادب کی توسیع تھی۔ ہاں یہ توسیع نئے حالات میں ہو رہی تھی، اور اس کے نئے ابعاد (Dimensions) بھی تھے۔ یہ نئے حالات سامراجی دشمن تحریک آزادی کی اس نئی سمت اور نئی جہت سے پیدا ہو رہے تھے جو اُبھرتے ہوئے مزدور طبقے کی لڑائیوں اور سوشلسٹ خیالات کی دین تھی۔ اس ادبی تحریک کو نئے ابعاد اس نئی عالمی جدوجہد سے حاصل ہو رہے تھے جو عالمی سطح پر سرمایہ داری اور اس کے خبیث ترین مظہر، فاشزم کے خلاف لڑی جا رہی تھی۔ اب سرمایہ داری نظام اپنی پستی کی اس سطح پر پہنچ گیا تھا جہاں وہ تہذیب کا خالق نہیں، اس کا قاتل بن رہا تھا۔ کتابیں نذرِ آتش کی جا رہی تھیں۔ کلچر کا نام سنتے ہی ہٹلر کا ہاتھ ریوالور کی طرف بڑھتا تھا۔ اب تہذیب وتمدن کی حفاظت کے لیے، ادب کی مدافعت کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس خبیث نظام کی بیخ کنی کی جائے اور اس غرض سے ادیب اور علم برادران، تہذیب وتمدن، سبھی صف بستہ ہو جائیں۔ قلم اور تلوار کے درمیان پہلے بھی ایک قدر مشترک تھی۔ لیکن اب ان کے درمیان امتیازی حدیں ختم ہو

رہی تھیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کرسٹوفر کاڈویل نے قلم چھوڑا، تلوار سنبھالی اور جنرل فرانکو کی فاشسٹ فوجوں سے لڑنے کے لیے ہسپانیہ کی پہاڑیوں میں پہنچ گیا۔

یہیں سے ترقی پسند ادبی تحریک کی وہ داستان شروع ہوتی ہے جسے سجاد ظہیر نے ''روشنائی'' میں بیان کیا ہے۔

1935 میں لندن میں مقیم ہندستانی نوجوان لکھنے والوں کے ایک گروہ نے، جس میں سجاد ظہیر کے علاوہ ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر ملک راج آنند، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور دوسرے نوجوان تھے، انجمن ترقی پسند مصنّفین کے منشور کا ایک مسودہ تیار کیا اور اس کی نقلیں ہندستان میں کئی ابھرتے ہوئے لکھنے والوں کو بھیجیں۔ طویل اور تفصیلی بحث و تمحیص کے بعد اسی مسودہ کو قطعیت دے کر انجمن ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ میں ایک دستاویز کی حیثیت سے منظور کیا گیا۔ اب تک ترقی پسندی ایک رجحان اور ایک تحریک تھی۔ اب وہ ایک تنظیم بن گئی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تنظیم کی کیا ضرورت تھی؟ لکھنے والے لکھتے آئے ہیں۔ تنظیم کا سوال ادبی تاریخ میں کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔

لیکن تاریخ پر بھی یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ ادبی تنظیموں سے محروم رہی ہے۔ جب حالی اور ان کے رفقا کو ادب میں نئی تحریک جگانا مقصود تھا تو انھوں نے لاہور میں ایک ادبی تنظیم کی ضرورت محسوس کی۔ انجمن پنجاب (لاہور) کا اُردو ادبی مورچہ پر جو رول رہا ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ یہ بھی تو صحیح ہے کہ بغاوت انسان کی روایت رہی ہے اور بڑی بڑی بغاوتیں ہوئیں، جہاں ہم اس قسم کی تنظیم کے نشان نہیں پاتے، جس کے ہم آج عادی ہیں۔ ظلم جب سر سے اونچا اور نا قابل برداشت ہو جاتا ہے تو لوگ بغاوت کر بیٹھتے ہیں، اور پھر سماج نئی کروٹ لیتا ہے۔ لیکن بغاوت اور انقلاب میں فرق ہی یہ ہے کہ بغاوت کے سامنے مستقبل کا کوئی نقشہ نہیں ہوتا اور انقلاب کے آگے سماج کی تشکیل نو کا ایک پورا منصوبہ ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تنظیم کی ضرورت اور اس کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ خود سجاد ظہیر نے 1945 میں ترقی پسند مصنّفین کی حیدرآباد کانفرنس میں اپنے خطبے میں کہا ہے......

''بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ جب ہر دور میں ترقی پسند ادب کی تخلیق ہوتی ہے

اور جب حالی، شبلی اور اقبال بھی ترقی پسند ہیں تو پھر آخر ترقی پسند مصنّفین کی انجمن بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سوال ایسا ہے کہ جب دنیا میں ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک پھول کھلتے رہے ہیں تو باغ لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس انجمن کی ضرورت اس وجہ سے پیدا ہوئی جس وجہ سے دوسری انجمنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ افراد اجتماعی طور سے ادبی مسائل پر گفتگو اور بحث کریں، فرد اور جماعت کی ضروریات کو سمجھیں، سماجی کیفیت کا تجزیہ کریں اور اس طرح مشترکہ نصب العین قائم کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔'' (بہ حوالہ سردار جعفری، ترقی پسند ادب:181)

کچھ لوگ جن میں لکھنے والے بھی شامل ہیں، انجمن کو ادب کی تہذیب کا ذریعہ نہیں، اس کی تحدید کا کٹہرا خیال کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ ''ادیب کی آزادی'' کے نام پر انجمن اور اس کی ''پابندیوں'' سے بیزار معلوم ہوتے ہیں۔

لیکن آزادی کا کوئی انفرادی اور مجرد تصور نہیں۔ آج کے سماج میں فرد سماج سے الگ بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ آبادی سے دور جنگل میں چھوڑ دینے پر کوئی اپنے آپ کو آزاد اور محفوظ محسوس نہیں کرسکتا۔ آزادی اصل میں سماج کے اندر رہ کر سماجی تعاون کی اعلیٰ ترین سطح پر حاصل ہوسکتی ہے۔ کرسٹوفر کاڈویل کا کہنا ہے کہ آزادی کے حصول کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خود اپنے پر حکمراں ہو۔ لیکن آدمی سماج کا ایک حصہ ہے، اور سماج طبقات میں بٹا ہوا ہے جو پیداواری رشتوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ذرائع پیداوار سرمایہ داری کی ملکیت ہیں اور محنت کش طبقات ان آلوں اور مشینوں پر محنت کر کے دولت پیدا کرتے ہیں۔ محنت کی پیداوار سرمایہ دار کی ملکیت بن جاتی ہے اور ملکیت کے ان ہی رشتوں میں سماج منقسم ہے۔ ایسے میں فرد کی آزادی اسی وقت ممکن ہے جبکہ سماج پر اس طبقے کی حکمرانی نہ ہو جس میں وہ خود شامل نہیں۔ سرمایہ دار سماج میں سرمایہ دار خود تو آزاد ہے کیونکہ اس کا طبقہ پیداواری قوتوں اور ان کے آپسی رشتوں پر مقتدر ہے۔ اس کے برخلاف مزدور محکوم ہے کیونکہ وہ حکمراں طبقے کے زمرے سے خارج ہے۔ فرد آزادی کی اپنی جدوجہد میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ سماجی عوامل کو متحرک نہ کر سکے جو سماج میں اقتدار کی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ فرد کو آزادی سماجی تعاون سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، صرف

سماجی طاقتوں کو استعمال کر کے ہی حاصل کر سکتا ہے۔اس لیے ہر فرد اپنے آپ کو ان سماجی طاقتوں سے الگ کر کے یکا و تنہا ہو جائے تو آزادی نہیں قنوطیت اور ناکامی کی طرف جائے گا۔آج کے سماج میں سماج کو بدلے بنا فرد اپنے آپ کو نہیں بدل سکتا۔یہی تنظیم کا جواز ہے۔

ترقی پسندوں پر الزام لگایا گیا کہ وہ پروپیگنڈے کا بازاری ادب پیدا کر رہے ہیں۔ادب عالیہ سے ان کی تخلیقات کا کوئی تعلق نہیں۔اس کا سجاد ظہیر نے ''روشنائی'' کے صفحوں پر جواب بھی دیا ہے۔لیکن یہ الزام ہٹ دھرمی اور تعصب پر مبنی ہے۔یہ کوئی نہیں کہتا کہ ترقی پسندوں کی ہر تخلیق ادب کے جمالیاتی پیمانوں پر پوری اترتی ہے اور نہ ہی کوئی یہ کہتا ہے کہ جمالیات سے بے نیاز رہ کر بھی ادب،ادب رہ سکتا ہے۔پھر بھی اگر میر کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''بلندش بغایت بلند و پستش بغایت پست'' اور میر کی ''بلند'' تخلیقات کے بنا پر ان کے ادبی مقام کو جانچا جاتا ہے تو پھر یہی معیار پوری ترقی پسند ادبی تحریک کے ساتھ کیوں نہیں روا رکھا جاتا؟ ہر دور میں اچھا اور بُرا ادب رہا ہے بلکہ ہر ادیب کی تخلیقات میں کمزور اور اعلیٰ دونوں قسم کی تخلیقات ہوتی ہیں۔لیکن کسی ادیب کو یا کسی ادبی دور کو اس کے اچھے اور اعلیٰ ادب کی بنا پر جانچا جاتا ہے۔پھر یہی برتاؤ ترقی پسند ادب کے ساتھ بھی ہونا چاہیے۔

پروپیگنڈہ بھی زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے اور پروپیگنڈہ کا ادب بھی معیاری ادب ہو سکتا ہے۔بشرطیکہ وہ ادب کے سماجی مقصد کے ساتھ اس جمالیاتی پہلو سے بھی پورا پورا انصاف کرتا ہو۔چنانچہ یہی ''تبلیغ'' کا عنصر کرشن چندر کے افسانوں کی جان ہے۔ان کے شاہکار افسانے وہی ہیں جن میں انھوں نے سماجی بصیرت کے اپنے مقصد کو موزوں فنی ہیئت میں پیش کیا ہے۔اگر غور سے دیکھیے تو حالی سے اقبال اور نذیر احمد سے پریم چند تک نظم و نثر کی بے شمار تخلیقات میں پروپیگنڈہ نظر آئے گا۔پروپیگنڈہ...... جسے فنی ہیئت حاصل ہو گئی ہے۔

ترقی پسند ادبی تحریک کے سامنے بعض ایسے سوال بھی اُٹھائے گئے جیسے کہ کیا ادیب کے لیے لازمی ہے کہ وہ سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لے؟ قدیم اور کلاسکی ادب کی طرف ہمارا رویہ کیا ہو؟ ہماری زبان کیسی ہو؟ مذہب کی طرف ہمارا رویہ کیسا ہو؟ یا یہ سوال کہ رومان پسندی اور حقیقت پسندی کے حدود کیا ہیں؟......وغیرہ۔

سجاد ظہیر نے ''روشنائی'' میں ان سب سوالوں پر بحث کی ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک طرف انگریز، ہندستانی سماج میں ان قدامت پسند احیا پرست رجحانات کو ہوا دے رہے تھے جو آزادی اور ترقی کی سمت ہر پیش قدمی کو روکے ہوئے تھے۔ ان رجحانات کا مقابلہ کرنا ضروری تھا۔ تاریخ کو مسخ کرکے پیش کیا جا رہا تھا تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ کی تاریخی بنیادیں فراہم کی جائیں، زبان کا شاخسانہ کھڑا کرکے ہندی، اُردو تنازعہ پیدا کیا جا رہا تھا تاکہ شمالی ہندستان کے ان دو عظیم ادبی دھاروں کو ایک دوسرے سے دُور رکھا جائے۔

ترقی پسند ادبی تحریک کو ان سب مسائل سے نبٹنا تھا اور اس سے بڑھ کر حکومت وقت کے استبداد کا مقابلہ کرنا تھا۔ ''اسٹیٹس مین'' میں ''نامہ نگار'' کے نام سے ترقی پسند مصنّفین کے خلاف مضامین شائع ہوئے، جن کے متعلق بعد میں پتہ چلا (اور اس کا ذکر سجاد ظہیر نے ''روشنائی'' میں کیا بھی ہے) کہ یہ خفیہ پولیس کے ایک خاص محکمہ کی کارگزاری تھی۔ ترقی پسندوں کو بدیسی ایجنٹ، ہندستانی سماجی روایات کے منکر، اور معاشرے کے غدار کہا گیا۔ یہ بتانے کی کوشش کی گئی کہ عورتوں کی طرف ترقی پسندوں کا رویہ نراجی ہوتا ہے۔

ترقی پسندوں نے ان سب کا مقابلہ کیا۔ اخبارات و رسائل میں بحثیں ہوئیں اور ان بحثوں میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، اور سید احتشام حسین وغیرہ نے جو مضامین لکھے ہیں، وہ آج بھی ترقی پسند ادبی تحریک کی نظریاتی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

جاگیرداری سماج میں عورت محض ایک کھلونا تھی۔ سرمایہ داری نے اپنے عروج کے زمانے میں اسے آزاد تو کیا مگر ''وسعت زنجیر'' تک ہی۔ بورژوا جمالیات میں عورت کی طرف رویہ محض جنسیات کے تابع ہے۔ یہ تو ترقی پسند تحریک ہی ہے جس نے عورت کو انسان کے روپ میں دیکھا اور سماجی کشمکش میں عورت کو مرد کے دوش بدوش کھڑا کر دیا۔ سردار جعفری نے کہا ہے...... ''ترقی پسند شاعروں نے اُردو شاعری کو زیادہ فطری بنا دیا ہے اور اب ترقی پسند شاعری میں عورت، معشوقہ، بیوی، ماں، مجاہد، ہر روپ میں نظر آتی ہے۔'' (سردار جعفری، ترقی پسند ادب: 178)

البتہ حکومت کے جبر و استبدار کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض ایسے نیک لوگ جو سرکاری ملازمت کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے، تحریک سے عملی طور پر الگ ہو گئے، ان میں سے اکثر روحانی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔

رومانیت اور حقیقت نگاری، دو میلانات تو ادب میں پائے ہی جاتے ہیں۔ میکسم گورکی

کہتا ہے کہ......

''عوام کی زندگی اور ان کے حالات کی سچی اور ملمع کاری سے پاک تصویر کشی حقیقت نگاری ہے۔ جہاں تک رومانیت کا تعلق ہے، اس کی کئی تعریفیں کی گئی ہیں۔ لیکن کوئی تعریف اتنی صحیح اور جامع نہیں ہے جسے ادب کے تمام مورخین نے قبول کرلیا ہو۔ خود رومانیت کے مسلک میں بھی دو واضح اور الگ الگ رجحانات میں تمیز کرنا چاہیے۔ ایک مجہول قسم کی رومانیت ہے جو حقیقت پر رنگ چڑھا کر لوگوں کو اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر آمادہ کرتی ہے یا لوگوں کو حقیقت سے دُور لے جاتی ہے اور انھیں دُنیا کے بے معنی اور بے مصرف گورکھ دھندوں میں پھنسا کر سُلا دینا چاہتی ہے۔ جیسے فانی زندگی کا معمہ عشق اور موت اور اسی قسم کے دوسرے مسائل، جو فکر سے نہیں بلکہ صرف سائنس کی تحقیقات کی مدد سے حل کیے جاسکتے ہیں، دوسری فعال و متحرک قسم کی رومانیت ہے جو انسان کے زندہ رہنے کی خواہش کو تقویت پہنچاتی ہے اور اسے حقیقت اور اس کے مسائل کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرتی ہے۔'' (بحوالہ سردار جعفری، ترقی پسند ادب: (طبع ثانی)، 125-124)

اس دوسری قسم کی رومانیت سے ترقی پسندوں کو انکار نہیں۔ آرٹ اور ادب کا ایک مقصد انسان کو جمالیاتی حظ پہنچانا ہے، اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ہے۔ لیکن ''وہی حظ، وہی جمالیاتی تسکین اور وہی سیکھنا اور سمجھنا انسانوں کے لیے اچھا اور صحت مند ہے جو اُن میں پاکیزگی اور طہارت، زندگی کی اُمنگ اور حوصلہ، جہد حیات میں صلابت، دانشمندی اور نوع انسانی سے ہمدردی پیدا کرنے میں معین ہو اور اس طرح سے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی حیات، ان کا ظاہر و باطن دونوں کو زیادہ حسین، زیادہ لطیف، زیادہ بھرپور بنائے۔'' ......(''روشنائی'')

آگے چل کر سجاد ظہیر کہتے ہیں...... ''ہم کیف و بدمستی میں فرق کرتے ہیں۔ لذّت اندوزی اس حد تک ٹھیک ہے جب تک اس سے آسودگی اور سرور ہو، مگر جب وہ سمیت میں بدل کر ہمارے بدن کو چور کردے، ہمارے ذہن کو پراگندہ اور ہماری روح کو مردہ کردے تو پھر وہاں پر ہم حد کھینچ دیتے ہیں۔'' ......(''روشنائی'')

''حقیقت پسندی'' محض حقیقتِ موجود کے ادراک کا نام نہیں ہے بلکہ حقیقت پسندی کا

منصب ہی یہ ہے کہ سماجی کشمکش اور ممکن الحصول کی ابدی حقیقت کا شعور حاصل کرے۔ یزداں اور اہرمن کی آویزش ازل سے جاری ہے۔ اس آویزش میں زوال پذیر حقیقتوں کے خلاف اُبھرتی ہوئی حقیقتوں کو پرکھے اور انھیں آگے بڑھانے کے جہاد میں حصہ لے۔ ظاہر ہے ادب اس حقیقت پسندی سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ وہ زندگی سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اطہر پرویز نے لکھا ہے...... ''ادب میں حقیقت پسندی کسی چور دروازے سے نہیں بلکہ صدر دروازے سے داخل ہوئی۔ اس کا خاطر خواہ خیر مقدم ہوا۔'' (''اُردو کے تیرہ افسانے'': 14) ......اور زندگی ہی وہ ''صدر دروازہ'' ہے جس سے ''حقیقت پسندی'' نے ادب میں راہ کی۔

پریم چند نے کہا تھا کہ ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔ ''گودان'' اور ''کفن'' جیسی تخلیقات میں انھوں نے سماج کے سب سے زیادہ مظلوم، مجبور اور بے زبان انسانوں کو زبان دے کر آرٹ میں حسن کا ایک نیا تصور پیش کیا ہے۔ حقیقت کا ایک نیا روپ، ایک ایسے نئے زاویے سے دریافت کیا ہے جو اس سے قبل کے افسانوی ادب میں کہیں نظر نہیں آتا۔ ترقی پسند ادیبوں نے پریم چند کی اس روایت کو سینے سے لگا کر گاؤں اور شہر کے محنت کش انسانوں کی بظاہر ویران اور بے رومان زندگی کی عکاسی کر کے حسن اور حقیقت کے نئے معیار تلاش کیے ہیں۔ اس طرح اُردو میں ترقی پسند تحریک نے حقیقت نگاری کی نئی جہتیں روشن کیں اور ادب اور زندگی کے زیادہ پائے دار اور زیادہ معنی خیز رشتوں کو استحکام بخشا۔ پریم چند نے 1936 میں ترقی پسند ادیبوں کے پہلے اجتماع میں کہا تھا کہ...... ''ادب میں حسن اور قوت کے عناصر اسی وقت پیدا ہوں گے، جب ہماری نگاہِ حسن عالم گیر ہو جائے گی۔ جب ساری خلقت اس کے دائرے میں آجائے گی۔'' پریم چند نے ادیب کے منصب کا ذکر کرتے ہوئے ایک خطبے میں کہا کہ ادیب ''وطنیت اور سیاست کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتے ہوئے چلنے والی حقیقت ہے۔'' (1936 میں ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس کا خطبۂ صدارت، بحوالہ سردار جعفری، ترقی پسند ادب: 56)

ترقی پسند تحریک نے ادیب کو سماجی زندگی اور اس کے مسائل سے جوڑ کر اگر ایک طرف کچھ ذمہ داریاں سونپیں تو دوسری طرف اسے تہذیبی زندگی میں پیشوائی کا اعزاز بخشا۔ بھارت ساہتیہ پریشد کے ناگپور کے اجلاس میں جو اعلان نامہ منظور ہوا تھا اور جس پر پریم چند کے علاوہ ڈاکٹر عبد الحق، پنڈت جواہر لعل نہرو، اچاریہ نریندر دیو، اور اختر حسین رائے پوری کے بھی دستخط تھے، اس میں

بھی وضاحت سے کہا گیا تھا..... ''زندگی مکمل اکائی ہے، اسے ادب، فلسفہ، سیاست وغیرہ کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ یہی نہیں وہ کاروانِ حیات کا رہبر ہے۔ اسے محض زندگی کی ہم رکابی نہیں کرنا ہے بلکہ اس کی رہنمائی بھی کرنا ہے۔ انسانیت کے نام پر ہم پوچھتے ہیں...... کیا آج جب ترقی اور پستی کی طاقتوں میں فیصلہ کن جنگ شروع ہو چکی ہے، ادب اپنے کو غیر جانبدار رکھ سکتا ہے؟''

کچھ لوگوں نے ''ادیب کی آزادی'' کے نام پر اُسے ہر قسم کے ''نظریے'' سے بے نیاز کر دینا چاہا اور ترقی پسندوں پر الزام لگایا کہ وہ ایک نظریۂ حیات سے بندھے ہوئے ہیں۔ اسی لیے تخلیق کی آزادی سے محروم ہیں۔ اوّل تو یہ کہنا ہی نامناسب ہے کہ ایسے بھی لکھنے والے ہیں جو کسی نظریے کے تابع ہیں اور نہ محتاج۔ ہر ادیب کی اپنی ایک نظر ہوتی ہے جس سے وہ اپنے اطراف و اکناف کے حالات کو دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ پھر وہ اپنی تخلیق کے تانے بانے میں اپنے قاری کو ایک پیام دیتا ہے۔ اس پیام پر ادیب کی چھاپ اور زندگی کی طرف اس کے اپنے رویے کی مہر ہوتی ہے۔ کوئی ادیب ''نظریے'' سے بے نیاز نہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے کہا ہے...... ''جس طرح سائنسداں خارجی حقیقت کی دُنیا کا سیاح ہے، اسی طرح فنکار دل کی نئی سلطنتوں کو دریافت کرتا ہے۔ خارجی اور داخلی حقائق دونوں کے علم کے لیے ہمیں سائنس اور ادب کے سنجوگ کی ضرورت ہے۔ ادب میں نظریے کی تلاش اسی سنجوگ کا دوسرا نام ہے۔ (آل احمد سرور، ادب اور نظریہ: 282)

قصہ مختصر ان سب نظریاتی معرکوں، داخلی اُلجھنوں اور خارجی رُکاوٹوں کا مقابلہ کرتی ہوئی ترقی پسند ادبی تحریک آگے بڑھتی رہی۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اسے ''علی گڑھ تحریک کے بعد اُردو ادب کی سب سے بڑی تحریک'' کا نام دیا ہے۔ سجاد ظہیر نے اسی ترقی پسند ادبی تحریک کا سفرنامہ ''روشنائی'' میں پیش کیا ہے۔

اُردو کی ادبی تاریخ میں ترقی پسند تحریک کئی باتوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ ''آسان لکھو آسان لکھو'' سبھی کہتے ہیں لیکن آسان لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ اُردو کے نشاۃ الثانیہ کے رہنماؤں نے آسان طرزِ تحریر کی داغ بیل ڈالی اور ترقی پسند مصنّفین نے اسے آگے بڑھایا، اُردو زبان کو نئی ترکیبیں دیں، اُردو اور ہندی کو ایک دوسرے کے قریب تر کرنے کی کوشش

کی۔ مثال کے طور پر ’’ترقی پسندی‘‘، ’’عوام دشمنی‘‘، ’’امن دوستی‘‘ ایسی ہی ترکیبوں سے اُردو زبان پہلے آشنا نہ تھی۔ ہندی کے عام فہم الفاظ لے کر ترقی پسندوں نے کئی ترکیبیں باندھی ہیں۔

اُردو نظم کا رواج بھی نشاۃ الثانیہ کی دین ہے۔ لیکن اس میں بھی عصری مسائل کو پیش کر کے نظموں کے آہنگ میں بنیادی تبدیلی ترقی پسندوں نے پیدا کی۔ جوش اس نئی نظم کے امام ہیں۔

اُردو غزل پر مردنی چھائی تھی۔ نشاۃ الثانیہ کے دَور میں حالی نے اس پر فردِ جرم عائد کر دی تھی۔ پھر حسرت نے اس میں جان ڈالی۔ لیکن جہاں ترقی پسندوں پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے غزل کی کم مائیگی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور اسے مسترد کر دینے کی کوشش کی، وہیں یہ بات بھی اپنی جگہ تاریخی صداقت کی حیثیت رکھتی ہے کہ ترقی پسند شاعروں نے غزل کو نئے آہنگ سے آشنا کرایا اور اس میں نئی آوازیں پیدا کیں، غزل کے امکانات کو روشن کیا اور اسے عصری تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ بنایا۔ فراق، فیض، جذبی، مجروح اور دوسروں نے اس میدان میں جو کام کیا ہے وہ ترقی پسند تحریک کی بنائی ہوئی فضا ہی میں ممکن تھا۔

اردو افسانے پر تو ترقی پسندی کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ اس کو ترقی پسند ادبی تحریک سے الگ کر کے دیکھنا ہی مشکل ہے۔ ترقی پسند افسانے کا نقطۂ آغاز سجاد ظہیر کا مرتبہ مجموعہ ’’انگارے‘‘ ہے، جو 1932 کے آخر میں شائع ہوا تھا، اور جسے مارچ 1933 میں حکومت نے ضبط کر لیا۔ ’’انگارے‘‘ کے افسانے فنی نقطہ نگاہ سے خام اور کھردرے سہی، لیکن چند نوجوانوں کی بغاوت اور برہمی کے اس دیے سے کتنے ہی چراغ جل اُٹھے۔ رشید جہاں اور احمد علی کے بعد راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، سہیل عظیم آبادی اور دوسرے نوجوانوں نے اپنی منفرد صلاحیتوں سے اُردو افسانے کو نئی سمتیں دکھا دیں۔ انھوں نے قومی زندگی کے مسائل کی طرف، فکر و احساس کی تازگی کے ساتھ لوگوں کی توجہ مبذول کرائی۔ انھوں نے پریم چند کے آدرشواد اور نیاز فتح پوری کی تخیلی رومانیت سے نجات دلا کر افسانے کو عصری حقیقتوں سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ بخشا۔ آزادی، انصاف، اور کچلے ہوئے محنت کش عوام کی طرف داری میں اپنے مشترک رویے کے باوجود ہر ترقی پسند افسانہ نگار طرزِ فکر اور اسلوب کے اعتبار سے اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کہانی کہنے کا اپنا سلیقہ رکھتا ہے۔ زندگی کو اپنے مشاہدے اور

اپنے تجربے کے روشن آئینہ میں دیکھتا ہے۔ لیکن ہر ایک اس عقلی انسان دوستی اور عوام دوستی کا حامی اور ہمدرد ہے جس کی کرنیں اشتراکیت کے طلوع سے پھوٹی تھیں۔ اُردو افسانے میں ترقی پسند شعور و فکر کی یہ صحت مند روایت آج بھی زندہ نظر آتی ہے۔ بقول ڈاکٹر اطہر پرویز......

''پریم چند کے بعد ترقی پسند افسانہ نگاروں نے زندگی کے ہنگامی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ چاہے وہ بنگال کا قحط ہو، یا ہندو مسلم فساد ہو، یا کوئی بھی ہنگامی مسئلہ ہو۔ ان تمام افسانہ نگاروں نے اپنے سیاسی شعور کی بنا پر افسانے میں مقصدیت کو نمایاں کیا ہے۔ اُردو افسانوں پر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی چھاپ آج بھی گہری ہے اور اُردو کے نئے افسانہ نگار چاہے بالواسطہ ہی سہی، لیکن ان سے متاثر ضرور ہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنی نسل کو متاثر کیا ہی تھا۔ لیکن نئے لکھنے والوں کی نسل ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ (اُردو کے تیرہ افسانے: 14-13)

افسانے کی طرح اُردو تنقید میں بھی ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نئے امکانات پیدا ہوئے۔ ترقی پسند نقادوں نے حالی کے بعد پہلی بار شعر و ادب کے نظریاتی مسائل پر فلسفیانہ اور سائنٹفک نقطہ نگاہ سے غور و فکر کرنے کی طرح ڈالی۔ انھوں نے تاریخی اور سماجی حقائق کے پس منظر میں نثر اور شعری ادب کی اہمیت پر زور دیا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ترقی پسند تنقید نگاروں نے شعر و ادب کی جانچ پرکھ کے کچھ ایسے معروضی اصول وضع کرنے کی کوشش کی جن کے نتیجے میں ادب کے مطالعے کو بھی سائنس کے مطالعے کی قطعیت اور صحت کے قریب لایا جائے۔

پروفیسر احتشام حسین نے کہا ہے......

''سائنٹفک نقطۂ نظر وہ ہے جو ادب کو زندگی کے معاشی، معاشرتی اور طبقاتی روابط کے ساتھ متحرک اور تغیر پذیر دیکھتا ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر نقطۂ نظر ہے اور ادبی مطالعہ کے کسی اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔'' (احتشام حسین۔ تنقیدی نظریات: تنقید، نظریہ اور عمل: 145)

ڈاکٹر عبدالعلیم لکھتے ہیں......

''ادبی تنقید کا مقصد یہ ہے کہ ادب کو پڑھنے والوں کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔ جو ادیب سنجیدہ پڑھنے والوں کو اپنا مخاطب بنانا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے

کہ وہ انسانی زندگی کی کشمکش کی تصویر کھینچے اور جہاں تک ممکن ہو، پڑھنے والے کے تجربات اور مشاغل سے لگاؤ پیدا کرے تاکہ انسانی ماحول کا مکمل خاکہ سامنے آسکے۔'' (ڈاکٹر عبدالعلیم۔ادبی تنقید کا بنیادی اصول۔نیرنگ نظر: 96-95، بحوالہ شارب ردولوی، جدید اُردو تنقید: 369-368)

ترقی پسندوں کے بڑے بڑے نکتہ چیں بھی ترقی پسند ادبی تحریک کی اس دین سے انکار نہیں کریں گے۔

''روشنائی'' کے 500 صفحات میں سجاد ظہیر نے 1947 تک ترقی پسند ادبی تحریک کا جائزہ لیا ہے۔آزادی کے ساتھ ہی تقسیم ہند اور اس کے متعلق فسادات کے المیے نے ترقی پسند لکھنے والوں کے سامنے نئے مسائل کھڑے کر دیے۔انھوں نے آزادی کا جو تصور اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا یہ آزادی اس پر پوری طرح منطبق نہیں ہوتی تھی۔سماجی ڈھانچے میں جس تبدیلی کے خواب دیکھے تھے وہ ابھی دسترس سے باہر نظر آتی تھی۔یہ ''سحر'' تو تھی لیکن ''شب گزیدہ'' تھی۔فیض نے کہا...... ''وسعت زنجیر تک آزاد کیا''۔حیدر آباد سے شاہد صدیقی نے آواز دی۔فسادات نے جو المیہ پیش کیا، انسانی تاریخ میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔پنجاب...... جو پانچ دریاؤں کا مغرور علاقہ تھا، اب دو میں منقسم تھا اور خون کا ''چھٹا دریا'' ان دونوں پنجابوں کے بیچ میں حائل ہو گیا تھا۔ترقی پسند لکھنے والوں نے اس المیے پر خوب لکھا، اور انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ دیا۔صرف ترقی پسند ادیب ہی صحیح معنوں میں سیکولر تھے۔ہندو خون اور مسلمان خون نہیں، انسانی خون کی اصطلاحوں میں سوچتے تھے، اور انسانیت کو بیدار کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

ترقی پسند مصنّفین کی تحریک اور تنظیم کا ایک اور کارنامہ نہایت اہم ہے، اور سجاد ظہیر نے ''روشنائی'' کے صفحات پر اس کا اجمالی ذکر بھی کیا ہے۔وہ یہ کہ عوامی ادب یا لوک ساہتیہ سے ترقی پسند مصنّفین کے رشتے قائم کرنا۔ترقی پسند تحریک اور اس کے مقاصد نے جب دیہات کا رُخ کیا تو کسانوں کی لیکھک ٹولیاں پیدا ہو گئیں اور ان پُرانے لوک گیتوں کے بعد جنھیں دیویندر ستیارتھی نے ملک بھر میں گھوم گھوم کر جمع کیا ہے، ''اور گا تا جائے ہندستان'' میں ان کا ذکر بھی کیا ہے اور انھیں شائع بھی کیا ہے، ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نیا لوک ساہتیہ اور نئے لوک گیت تخلیق ہو رہے تھے۔

اسی طرح عوامی تھیئٹر کی تحریک کو جنم دے کر ترقی پسند لکھنے والوں کو عام لوگوں تک پہنچنے

کی نئی راہیں کھول دیں۔عوام اس تھیئٹر سے نہ صرف جمالیاتی انبساط حاصل کرتے اور اس طرح ان کی تفریح کا ذریعہ نکل آتا بلکہ وہ اسٹیج کی راہ ان ہی سماجی کشمکش کے لیے روشنی، طاقت اور نیا حوصلہ بھی پاتے۔

ترقی پسند ادبی تحریک و تنظیم فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ نئے لکھنے والوں کو جس قدر اس تحریک نے آگے بڑھایا اور لکھنے والوں کی ایک پوری پود کو کھڑا کر دیا ہے، ایسا ادبی تاریخ کے کسی دَور میں نہیں ہوا اور وہ بھی دو دہائیوں کے انتہائی مختصر عرصہ میں۔

لیکن 1947 کے بعد اس تحریک کو بہت سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے اور اس زمانے کا صحیح ،مستند محاسبہ ابھی تک شاید نہیں ہو سکا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنّفین نے اپنی آغوش میں ترقی پسند لکھنے والوں کے ایک وسیع حلقے کو اکٹھا کرلیا تھا۔ یوں کہیے انجمن اُردو کے ترقی پسند لکھنے والوں کا طیفی مناظر (Spectrum) پیش کرتی تھی۔ اگر ایک طرف منشی پریم چند جیسے آدرشوادی تھے تو دوسری انتہا پر سجاد ظہیر جیسے کمیونسٹ رہنما، اور طبقے کے ان دونوں انتہاؤں کے درمیان رنگارنگ کے غیر کانگریسی، غیر کمیونسٹ لکھنے والے تھے۔یہی انجمن ترقی پسند مصنّفین کی وسعت اور یہی اس کی طاقت تھی۔ جمہوری طریق کار، کھلی بحث اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا، پرکھنا اور مفاہمت اور مطابقت کی راہیں تلاش کرنا انجمن کا طریقۂ کار تھا۔

لیکن 1948 کے بعد ترقی پسند لکھنے والے کے طور پر اور کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ لکھنے والے خاص طور پر ایک ادعائیت کا شکار ہو گئے تھے۔لیکن اس ادعائیت کے بھی خارجی اور داخلی عوامل تھے۔ یہ وہ دور تھا جبکہ پورے جنوب مشرقی ایشیا میں آزادی کی ہتھیار بند جدوجہد جاری تھی۔سامراج سے گلوخلاصی کے ساتھ ہی سوشلزم کی سمت چل پڑنے کے راستے کی تلاش تھی اور اس تلاش میں چھوٹے سرمایہ داروں اور درمیانی طبقات کو شبہ کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ اندرون ملک دیسی رجواڑے سر اُٹھائے ہوئے تھے اور آزاد ہندستان غلام ہندستان کی ہی ایک توسیع نظر آتا تھا۔ ایسے میں نوجوانوں نے اسے ''آزادی'' تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا اور ''حقیقی آزادی'' کے حصول کے ذرائع تلاش کرنے لگے۔ان معروضی حالات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اس دور کے ادبی ہیجان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

پھر ترقی پسند مصنّفین کو سجاد ظہیر جیسے محبوب اور منجھے ہوئے رہنما سے محروم ہونا پڑا۔ وہ پاکستان چلے گئے اور وہاں انقلابی جمہوری تحریکوں کے سربراہ کی حیثیت سے ان مصروفیتوں میں پھنس کر رہ گئے جو ادبی کم اور سیاسی زیادہ تھیں۔

غرض اس دور میں یہ ہوا کہ انتہا پسندی کا ادب میں فروغ ہوا اور ادیبوں کا ایک بڑا حصہ پہلے تو خاموش ہو گیا پھر رفتہ رفتہ ترقی پسند تحریک سے الگ ہو گیا۔ طیف اب مجروح ہو چکا تھا۔ وسیع اتحاد ٹوٹ چکا تھا اور دانے بکھر گئے تھے۔ یہی نہیں، نئے ادبی رجحانات جڑ پکڑنے لگے۔ نئی اُلجھنیں تھیں مگر اس کو سلجھانے کی کوئی تدبیر نہیں تھی۔ غلطیوں اور لغزشوں کا محاسبہ کر کے ان کو دُور کرنے کی کوششیں کرنے کے بجائے انجمن ترقی پسند مصنّفین کی ضرورت ہی سے انکار کیا جانے لگا۔ انجمن اور ادعائیت کو ہم معنیٰ سمجھا جانے لگا۔ درخت پر ایک آکاش بیل چھا گئی تھی اور آکاش بیل کو چھانٹنے کے بجائے درخت ہی کو کاٹنے کی باتیں کی جانے لگیں۔

پھر بھی کرشن چندر نے انجمن کی باگ ڈور سنبھالی اور اس میں نئی روح پھونکنے اور تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کو پھر سے مالا میں پرونے کی فکر کرنے لگے۔ ایسے میں سجاد ظہیر پاکستان کی جیل سے رہا ہوئے اور ہندستان آ گئے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ پھر سے ان نظریاتی الجھنوں کو دور کرنے کی کوشش کی جن کا انجمن شکار تھی۔ معترض کو جواب دیے، دوستوں کے شکوک و شبہات دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر پھر بھی چونکہ 1947 سے 1952 تک کے ہیجانی دور کا صحیح محاسبہ نہیں کیا جا سکا اور اس کے صحیح فکری اور عملی نتائج اخذ نہیں کیے جا سکے، اس لیے اُلجھنیں قائم رہیں۔

ان الجھنوں میں اضافہ یوں بھی ہو رہا ہے کہ سرمایہ داری کے اس انحطاط کے دور میں جب کہ وہ موت کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے، اس نے ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں جن سے نئی نسل نئی اُلجھنوں کا شکار ہو گئی۔

اوّل تو درمیانی طبقہ کا المیہ ہی یہ ہے کہ وہ نہ تو سرمایہ دار طبقے کی طرح سماج پر قابض ہے اور نہ مزدور طبقہ کی طرح اس پر قبضہ و اقتدار حاصل کرنے کے خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔ اس لیے تذبذب اور تشکیک کی اس کیفیت میں منزل اس کی نظروں سے اوجھل ہوتے دیر نہیں لگتی۔ منزل دھندلی ہوئی اور اُمید و آرزو کی شکست و ریخت ہو گئی تو فرد قنوطیت اور بیزاری کا شکار ہو گا ہی۔ یہ ایک الجھن ہے۔ دوسری الجھن یہ ہے کہ سرمایہ داری سماج نزع کے عالم میں فرد کو بے سہارا کر دیتی

ہے۔ وہ سماج سے کٹا ہوا اور سماج سے دل برداشتہ، تنہائی اور اجنبیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یوں کہیے کہ سرمایہ داری کے ٹوٹے ہوئے آئینے میں وہ اپنی شکل دیکھتا ہے اور خود ہی اپنی مسخ شدہ ٹوٹی پھوٹی تصویر کو دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔ وہ غصہ میں آکر آئینہ کو اور بھی توڑ دیتا ہے۔ اس سے اس کی صورت اور بھی ٹیڑھی اور مکروہ ہو جاتی ہے۔ یہاں سے وہ بیزاری اور سماج سے دور بھاگنے کی منزل میں داخل ہو جاتا ہے۔

تیسری اُلجھن یہ ہے کہ سرمایہ داری سماج میں اسے روزگار کے انتخاب کی بات تو دُور رہی، روزگار ہی میسر نہیں اور روزگار حاصل ہے بھی تو اس سے تسکینِ محنت نہیں ہوتی۔ وہ اس کی مرضی کے مطابق نہیں۔ اس کی اپنی اُمنگوں سے ہم آہنگ نہیں۔ یہاں اس کی شخصیت کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ ''شق البشر'' کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی شخصیت کا ایک ٹکڑا وہ ہے جہاں وہ روٹی کے لیے محنت کرتا ہے۔ دوسرا ٹکڑا وہ جو روحانی اعتبار سے شکست خوردہ ہے جسے آسودگی میسر نہیں۔

ترقی پسند ادبی تحریک کو اِن تینوں اُلجھنوں کا سامنا کرنا ہے۔ پھر فرد کو اس مجہول انفرادیت سے آزاد کرنا ہے جو سماج سے کٹ جانے اور اجنبی بن جانے پر اس میں پیدا ہوگئی ہے اور جس کا وہ آج اسیر ہے۔ فرد اپنے آپ کو بدلنا چاہتا ہے تو اسے سماج کو بدلنا ہوگا۔ انسانیت اب ''تسخیر فطرت'' کے دَور میں ہے اور ادب کو بھی ''تسخیر فطرت'' کی طرف پیش قدمی کرنی ہوگی۔ ''روشنائی'' کا مطالعہ جہاں پڑھنے والوں کو ترقی پسند تحریک کی ابتدائی منزلوں سے آشنا کرتا ہے، وہیں نئے مسائل کو سلجھانے کے لیے تیار بھی کرتا ہے۔ عصری حالات میں تخلیقی ادب کو عوام کی اُمنگوں سے ہم آہنگ کرنے میں اور نئے ادیبوں کو آگے بڑھانے میں اور سب عوام دوست لکھنے والوں کو اکٹھا کرنے میں اسے اہم رول ادا کرنا ہے۔

''روشنائی'' اس مقدس کام میں مشعل راہ کا کام دے گی۔

○○○

— راج بہادر گوڑ

(حیدرآباد، آندھرپردیش)

اپریل 1985

حرفِ آغاز

اَب تو وہ یادیں دُھندلی ہوتی جارہی ہیں اور فی الحال یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کے شروع دَور کی دستاویزیں حاصل کرسکوں۔ تھوڑے دن پہلے تک کوئی خاص ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی تھی کہ اس تحریک کی تاریخ لکھی جائے۔ اس کی عمر تھوڑی تھی، اور وہ لوگ، جنھوں نے اس میں شروع سے یا قریب قریب شروع سے حصہ لیا تھا، تقریباً سب موجود تھے، اور انھیں تمام واقعات سے آگاہی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تحریک مسلسل طور سے زندہ ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے اس کا نمو، فروغ اور پھیلاؤ، اس کی تبدیلیاں اور نیرنگیاں دیکھ رہے ہیں اور ہم میں سے جو خوش بخت ہیں وہ دل ودماغ کی ان کاوشوں اور سینہ فگاریوں سے گل بدامن ہیں۔ بہرحال انقلابی تبدیلیاں پیدا کرنے میں حصہ لینا اس کی تاریخ نگاری سے زیادہ دلچسپ اور مفید ہے۔

لیکن اب ترقی پسند ادب کی تحریک کو ہمارے وطن میں منظّم طور سے جاری ہوئے پندرہ سال سے زیادہ ہوگئے ہیں۔ طرح طرح کی مخالفتوں، دشواریوں اور خود اپنی خامیوں اور کجرویوں کے باوجود یہ ادبی تحریک ہندستان، پاکستان کی سب سے عظیم ادبی تحریک بن گئی ہے۔ دونوں ملکوں میں شاید ہی کوئی بڑا شہر ایسا ہو جہاں علم وادب کا چرچا ہو اور ترقی پسند ادیبوں کا گروہ موجود نہ ہو۔ بعض علاقوں میں اور قصبوں اور دیہات میں بھی یہ تحریک موجود ہے۔ ہندستان پاکستان کی تمام

بڑی بڑی زبانوں میں اب ترقی پسند ادب کی کتابیں موجود ہیں۔ترقی پسند ادب کی ترجمانی کرنے والے رسالے برابر شائع ہوتے رہتے ہیں،اور اگر کبھی کبھی بعض لوگ اس تحریک میں شامل ہونے کے بعد اس سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں تو دوسری طرف نوجوان دانشوروں کے نئے نئے گروہ مسلسل اس سے وابستہ ہوتے جاتے ہیں۔ پندرہ سال کے عرصے میں ترقی پسندوں کی اس تحریک کو سرکاری سرپرستی کبھی بھی حاصل نہیں ہوئی۔انگریزی راج میں تو معتوب رہی ہی، آج بھی اہل اقتدار اسے خطرناک سمجھ کر اس کے درپئے آزار رہتے ہیں۔ سیاسی خفیہ پولیس اسے خشم گیں نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ وقتاً فوقتاً ترقی پسند رسالے ضبط ہوئے ہیں،اور ترقی پسند ادیب گرفتار اور قید۔ عام طور سے ترقی پسندوں سے دشمن کا سا سلوک ہوتا ہے۔

اس تحریک کے مخالف بھی اس کی مقبولیت سے انکار نہیں کر سکتے۔لیکن وہ اس مقبولیت کے عجیب وغریب اسباب بیان کرتے ہیں،اور اس کے متعلق طرح طرح کی غلط بیانیاں کرتے ہیں۔ مثلاً وہ اسے چند آدمیوں کی سازش یا چالاکی پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فی الحقیقت یہ تحریک کمیونسٹوں کی ایک گہری چال کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔اس قسم کا گمراہ کن پروپیگنڈہ مسلسل ہوتا رہا ہے۔اس وجہ سے بعض ایماندار آدمی بھی سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ کہیں واقعی ہم بے وقوف تو نہیں بنائے جا رہے ہیں۔ بہت سے نوجوان ترقی پسند ادیب، جنھیں تحریک کے ابتدائی دور سے متعلق پوری مستند واقفیت نہیں ہے، وہ ایسے لوگوں کے شبہات رفع کرنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ ہمارے نوجوان لکھنے والے خود اس تحریک کی ابتدا کے متعلق مفصل اور مستند معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تا کہ وہ اس کے ارتقا کے مختلف مدارج کا صحیح طور پر تجزیہ کر سکیں۔

یہ سطریں ترقی پسند ادب کی تحریک کے متذکرہ بالا گوشوں پر کسی قدر روشنی ڈالنے کے لیے لکھی جا رہی ہیں۔ان کو ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کی تاریخ تصور نہ کرنا چاہیے۔ مجھے اُمید ہے کہ جب ہماری ادبی تحریکوں کا مورخ اس کام کا بیڑا اُٹھائے گا تو یہ تحریر مفید ثابت ہوگی۔

○○○

ـــ سجاد ظہیر

تاریخ: 24 مارچ 1952

ترتیب

1۔ عرضِ حال ثانی ―――― علی باقر v
2۔ عرضِ حال ―――― علی باقر ix
3۔ سوانحی خاکہ: سجاد ظہیر ―――― علی باقر xi
4۔ روشنائی: ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی ―――― ڈاکٹر راج بہادر گوڑ xvii
5۔ حرفِ آغاز ―――― سجاد ظہیر xxxvii

روشنائی:

1۔ سمت کا تعین ―――― 1
2۔ تحریک کا آغاز ―――― 15
3۔ تحریک کا فکری و تہذیبی پس منظر ―――― 35
4۔ پہلی کل ہند کانفرنس 1936 ―――― 61
5۔ تحریک کے بنیادی مسائل ―――― 95
6۔ ترقی پسند تحریک کے مقاصد ―――― 125
7۔ تحریک کی عوام و خواص میں مقبولیت ―――― 143

8۔	تحریک کی کمزوریاں اور ولولے	165
9۔	دوسری کل ہند کانفرنس 1938	181
10۔	تحریک کے فنکار	199
11۔	تیسری کل ہند کانفرنس 1942	231
12۔	چوتھی کل ہند کانفرنس 1943	243
13۔	تحریک کی تیز رفتار ترقی	265
14۔	مناظرے اور مکالمے	291
15۔	حیدرآباد اور احمدآباد کی کانفرنسیں	311
16۔	تحریک اور اردو ہندی اور دوسری زبانیں	341
17۔	حرفِ آخر	363
18۔	اشاریہ (Index)	365

○○○

سمت کا تعین

ترقی پسند مصنّفین کا پہلا حلقہ 1935 میں چند ہندستانی طلبا نے لندن میں قائم کیا تھا۔ انجمن کے مینی فیسٹو (منشور) کا مسودہ وہیں تیار ہوا تھا۔ اس ایک صفحے کی دستاویز لکھنے اور اسے آخری شکل دینے میں ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر ملک راج آنند، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور سجاد ظہیر شریک تھے۔ ہم نے لندن ہی میں اس مسودے کو سائکلو اسٹائل کر کے ہندستان اپنے دوستوں کے نام بھیج دیا تھا تا کہ وہ اسے یہاں کے ادیبوں کو دکھائیں اور اس پر ان کی رائے لیں۔ اِن دوستوں میں اکثر وہ نوجوان تھے جو ہم سے پہلے ہندستان واپس آچکے تھے اور جنھیں ہم ادیب نہیں تو ترقی پسند کی حیثیت سے اپنا ہم خیال یا ہمدرد سمجھتے تھے۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر محمد اشرف تھے، جو اُن دنوں مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے لیکچرار تھے۔ امرتسر میں محمود الظفر تھے، جو وہاں ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے وائس پرنسپل تھے۔ وہاں پر اُن کے ساتھ ان کی دلنواز بیوی ڈاکٹر رشید جہاں تھیں، جن کے ادیب کی حیثیت سے پہلے ہی چند قدموں نے رجعت پرستی کی کابکوں میں کافی خلفشار مچا دیا تھا۔ کلکتہ میں ہیرن مکھرجی تھے، جنھوں نے آکسفورڈ سے واپس آکر بیرسٹری، پروفیسری اور ادبی وسماجی تنقید بیک وقت شرع کر دی تھیں۔ حیدرآباد (دکن) میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں تھے جنھیں دو سال پہلے پیرس میں ہم ایک روشن خیال محبّ وطن مورخ کی حیثیت سے

جانتے تھے۔انھوں نے بھگتی اور تصوف کی تحریکوں کے متعلق ایک وقیع مقالہ لکھ کر پیرس یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی تھی۔بمبئی میں ہتھی سنگھ تھے، جو آکسفورڈ میں ہمارے ہم جماعت تھے۔وہ آرٹ، ادب اور سیاست ہر چیز میں ایک فنی قسم کی تفریحی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ان کا لباس، ان کے سر کے لہراتے ہوئے پٹّے، ان کے کھانے پینے، چلنے اور بات کرنے کا انداز ہمیشہ اور ہر روز اچھوتا اور حیران کن ہوتا تھا۔آکسفورڈ کے انگریز طلبا ان کی صورت اور قطع دیکھ کر ہی دنگ رہ جاتے تھے۔اور لوگ بھی تھے جن کو ہم نے مینی فیسٹو بھیجا تھا۔لیکن اب ان کے نام یاد نہیں۔

لندن کے حلقے سے وطن واپس آنے والوں میں مَیں سب سے پہلا تھا۔ جہاز بہت سویرے ہی بمبئی کے قریب پہنچ گیا۔کیا دلکش منظر تھا وہ! پُرسکون سمندر ہلکے سبز رنگ کا تھا۔چاروں طرف سفید کہرے کا دھواں چھایا ہوا تھا۔کنارے پر مالابارہل اور مغربی گھاٹ کے پہاڑوں کے نیلگوں دھندلے خاکے نظر آرہے تھے۔اس رات مشکل سے نیند آئی تھی۔ بہت سے مسافر صبح ہی سے تیار ہوکر جہاز کے عرشے پر کنارے کے کٹہرے سے لگے کھڑے ٹکٹکی لگائے اپنے وطن کی سرزمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جہاز کبھی بالکل رُک جاتا اور کبھی بہت آہستہ آہستہ کنارے کی طرف رینگنے لگتا۔اتنے میں سورج کی پہلی کرنوں نے پہاڑوں کی نیلی چوٹیوں کو چپکے سے چھولیا۔ اب ہمیں اور بہت سے جہاز اور چھوٹی بڑی کشتیاں اوران کے مستول زیادہ صاف دکھائی دینے لگے۔روشنی کے ساتھ آفتاب کی تمازت بڑھنے لگی۔ساحل پر کئی منزلوں والی اونچی اونچی ماڈرن عمارتیں کابکوں کی طرح دکھائی دینے لگیں۔ یہاں تک کہ تاج محل ہوٹل کی بدشکل عمارت اور اس کے پاس ''گیٹ وے آف انڈیا'' کی محراب پہچانی جاسکتی تھی۔ برطانوی استعمار کے فنِ تعمیر کا وہ نمونہ ایک بے روح اجنبی بوجھ جو بمبئی کے حسین ساحل پر ایک بھاری سِل کی طرح رکھا ہوا ہے۔

جہاز ڈاک کے کنارے سے آکر لگ گیا۔چاروں طرف شور اور ہنگامہ تھا۔ڈاک کے چبوترے پر مسافروں کے دوست اور رشتے دار مرد اور عورتیں ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے اپنے عزیزوں کو پہچان کر دُور سے اُنھیں سلام کررہے تھے۔ڈاکر اور قلی اِدھر اُدھر دوڑ بھاگ رہے تھے، اوران سب کے درمیان سفید وردیاں پہنے اور سفید ہیٹ لگائے بمبئی پولیس اور کسٹم کے انگریز اور اینگلو انڈین افسر، نیلی وردی اور زرد پگڑی والی مرہٹہ پولیس کے سپاہیوں کے حلقے میں سیدھے اور ساکت کھڑے جہاز کی طرف خاموش اور بے حس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جب جہاز سے

لکڑی کی سیڑھی اُتار کر چبوترے تک لگادی گئی تو انھوں نے اس کے اِردگرد پوزیشن لے لی اوران میں چند سب سے پہلے اوپر چڑھ کر جہاز میں آ گئے۔

میں اپنا اسباب جمع کر کے تیسرے درجے سے جہاز کے فرسٹ کلاس کے ہال میں آ گیا، جہاں پولیس کا انگریز افسر تمام مسافروں کے پاسپورٹ دیکھتا اورانھیں جہاز سے نیچے اُترنے کی اجازت دے رہا تھا۔ اتنے میں میرے دوست ہتھی سنگھ آ گئے۔ ہم گلے ملے اور اِدھراُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ ذرا دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ کچھ لوگ ہمارے بہت قریب کھڑے گفتگو سننے کی کوشش کررہے ہیں۔ میں نے ان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اوران کی شکل سے پہچان گیا کہ یہ حضرات سی۔آئی۔ڈی۔کے ہیں۔ جب میرے پاسپورٹ دکھانے کی باری آئی تو وہ حضرات میرے پیچھے لگے لگے اس میز تک آئے جہاں پاسپورٹ افسر بیٹھا تھا۔ میرے پاسپورٹ کو کافی دیر تک بڑے غور سے دیکھنے کے بعداوراس کے اندراجات سے بہت سی باتیں نوٹ کر لینے کے بعد مجھے نیچے جانے کی اجازت تو مل گئی،لیکن سی۔آئی۔ڈی۔والے باڈی گارڈ کی طرح میرے ساتھ چپکے رہے۔

اس وقت صبح کے کوئی ساڑھے آٹھ یا نو بج رہے ہوں گے۔ میں سمجھتا تھا کہ گھنٹے آدھ گھنٹے میں کسٹم والوں کو اسباب دکھا کر فراغت ہو جائے گی اور پھر ہم اپنے دوست ہتھی سنگھ کے وارڈن روڈ کے پُر فضا فلیٹ میں جا کر آرام کریں گے۔بمبئ کی سیر بھی کریں گے، باتیں ہوں گی، منصوبے بنائیں گے، آگے سفر کی سوچیں گے۔لیکن ابھی اس میں کافی دیر تھی۔

کپڑوں وغیرہ کا تو میرے پاس ایک ہی سوٹ کیس تھا۔لیکن دو بڑے بڑے ٹرنک اور بھی تھے جن میں دو ڈھائی سو کتابیں، رسالے، کاپیاں، کاغذات وغیرہ بھرے تھے۔ اس ''خطرناک'' مال کی تلاشی کسٹم والوں کو لینی تھی۔ میں نے حسرت بھری نظروں سے دیکھا کہ جہاز کے تمام مسافرایک ایک کر کے کسٹم سے گزر گئے، یہاں تک کہ میں اکیلا رہ گیا۔ میری ایک ایک کتاب، ایک ایک کاغذ کو انگریز کسٹم اور پولیس کے افسروں نے باہر نکال کر ڈال دیا اوران کی جانچ شروع ہوئی۔ اس حرکت پر میرے کسی قدر استعجاب پر پولیس انسپکٹر نے شرمندہ ہوکر معذرت کی اور کہا کہ...... ''میں یہ سب کچھ اوپر کے احکام کے مطابق کررہا ہوں۔'' اس نے ازراہِ مہربانی میرے لیے ایک کرسی منگوادی اور کہا کہ آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔

یہ تکلیف دہ سلسلہ کوئی تین گھنٹے جاری رہا۔ ان دنوں ہندستان کی آزادی کے متعلق

یورپ میں چھپی ہوئی اکثر کتابوں، سوشلزم، کمیونزم، سوویت روس وغیرہ کے متعلق تمام لٹریچر پر سخت پابندی تھی اور اس قسم کی مطبوعات یہاں نہیں لائی جا سکتی تھیں۔ چونکہ مجھے علم تھا، چنانچہ اس طوفانی تلاشی سے پولیس والوں کو کافی مایوسی ہوئی اور شاید اپنا کھسیانا پن چھپانے کے لیے جب انھیں اور کچھ نہیں ملا تو برنارڈ شا کی ''ان ٹیلی جینٹ ویمنز گائڈ ٹو سوشلزم''، ریمزے میکڈانلڈ کی ''انڈیا''، فیبین سوسائٹی کے چند پمفلٹ اور ایک دو فرانسیسی کتابیں جن کے نام انھیں ''مشتبہ'' معلوم ہوئے، اپنے پاس رکھ کر مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

وطن کی سرزمین پر پاؤں رکھتے ہی اپنی آزادی اور ایک انسانی حق پر اس ناشائستہ اور جاہلانہ حملے نے بڑی صفائی سے یہاں کی سماجی اور سیاسی حقیقت کے ایک پہلو کو روشن کر دیا جس کا علم تو مجھے تھا لیکن ابھی تک اتنا واضح اور ذاتی تجربہ نہیں تھا۔ بین الاقوامی رجعت پرستی کے جال ملکوں ملکوں میں بچھے ہیں۔ میرے ہندستان آنے کی اطلاع میرے عزیزوں اور دوستوں سے پہلے ہی سامراج کے شکاری کتوں کو پہنچ گئی تھی، اور ان کی نظروں میں، میں اسی لیے نگرانی کا سزاوار تھا۔ چونکہ میں انگلستان اور فرانس میں ترقی پسند اور سامراج دشمن حلقوں میں وقتاً فوقتاً دیکھا جاتا تھا، چونکہ ہندستانی طلبا کے درمیان بیٹھ کر سامراج دشمنی کا کبھی کبھی اظہار کر دیتا تھا۔ ایسے خیالات اور جذبات کا رکھنا اور ان کا اظہار بھلا کیا اہمیت رکھتا ہے؟ بہت کم...... اصل چیز تو عمل ہے، تحریک ہے، لوگوں کو متحرک کرنا اور خود متحرک ہونا ہے۔ اس سے ہم ابھی کافی دُور تھے لیکن سامراجیوں اور ان کے اہل کاروں کے نزدیک خیال، تصور اور جذبہ بھی خطرے سے خالی نہیں۔ وہ اس حقیقت کو بھی سمجھتے ہیں کہ خیال اور جذبہ عمل کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے اور ان کا یہ گمان آخر ٹھیک ہی ہے۔

میں بمبئی میں ایک یا دو دن سے زیادہ ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اس دوران میں اگر ممکن ہوا تو گجراتی اور مرہٹی زبان کے ایک دو ادیبوں سے مل کر ان سے ترقی پسند ادب کی مجوزہ تحریک کے بارے میں تبادلۂ خیال کر لوں۔

ہتھی سنگھ خود گجراتی ہیں۔ ان سے میں نے کہا کہ تم اگر مجھے گجراتی ادیبوں سے ملا دو تو میں تمھارا شکر گزار رہوں گا۔ لیکن چونکہ وہ حضرت ''صاحب'' قسم کے آدمی ہیں، انھوں نے اوّل تو یہ کہا کہ گجراتی ادب ناقابل اعتنا ہے اور بہر حال انھیں اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ آخر میرے بہت اصرار پر انھوں نے طے کیا کہ مسٹر کنھیا لال منشی اور ان کی بیوی شریمتی لیلاوتی، ادیب اور

ناول نگار کی حیثیت سے گجراتی ادب میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اس لیے وہ مجھے ان سے ملادیں گے۔

خیر، ہم منشی صاحب اور ان کی بیوی سے ملے۔ منشی صاحب بڑے آدمی تھے اور میں ایک طالب علم۔ میں نے جب ترقی پسند مصنّفین کا مجوزہ مینی فیسٹو انھیں دیا تو اس پر اچٹتی سی نظر ڈال کر انھوں نے اسے الگ رکھا، اور جیسا کہ ہمارے لیڈروں کا عام دستور ہے، انھوں نے اپنی ادبی ولسانی اسکیموں پر مجھے لیکچر دینا شروع کیا۔ میرے لیے ضروری تھا کہ میں ان کی باتیں غور سے سنوں جو میری اپنی مسلمہ ادبی بے بضاعتی کے سبب یقیناً قابل توجہ تھیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ میں خود ایک ایسا ادارہ بنانے کی کوشش کر رہا ہوں جو ہندستان کی مختلف زبانوں کے ادب کو ایک جگہ جمع کر کے ایک واحد قومی زبان (ہندی) کے ذریعہ سارے ملک میں پھیلائے۔ انھوں نے مجھے متنبہ کیا کہ ہمارے ملک میں مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصب بہت ہے۔ چنانچہ لوگ، خاص طور پر اُردو والے، ہندی کی ترویج کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہر ایسے پلان کی مخالفت کرتے ہیں جس میں قومی اتحاد کی کوشش کی گئی ہو۔ انھوں نے کہا کہ چند دنوں کے بعد مجھے خود ہی اس کا علم ہو جائے گا۔ آخر میں انھوں نے مجھے صلاح دی کہ میں اُردو دانوں میں ہندی کے خلاف جو جذبہ ہے، اسے دُور کرنے کی کوشش کروں۔ منشی صاحب کے ان پند و نصائح سے بھلا مجھے کیا اختلاف ہوسکتا تھا؟ اُردو والوں میں ہندی کے خلاف تعصب نہ ہونا چاہیے۔ ہندستان کی مختلف زبانوں کے ادب کا ایک دوسرے میں ترجمہ کر کے قومی ثقافت میں یکجہتی کی کوشش کرنا چاہیے۔ لیکن میرے دل میں بار بار یہ سوال اٹھتا تھا کہ کیا بغیر ترقی پسند نظریہ کے یہ ممکن ہے؟ مختلف تہذیبوں میں اتفاق اسی صورت میں ممکن ہے جب ہر قوم اور تہذیبی گروہ کے اس حق کو تسلیم کیا جائے کہ وہ اپنی زبان اور ادب کو آزادی سے اور اپنے طریقے سے ترقی دے سکتا ہے۔ اس ہمہ گیر تہذیبی آزادی کی بنیاد رجعت پرست اور لوٹنے والے طبقوں کے اقتدار کے خاتمے اور عوام کی حاکمیت پر ہی رکھی جاسکتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سامراجی اور ان سے منسلک گروہ اپنے استحصال کو برقرار رکھنے کے لیے قوموں اور فرقوں کے مابین منافرت پھیلاتے ہیں۔ ان کا مقصد نفاق اور جھگڑا پیدا کر کے عوام کو منتشر اور کمزور کرنا ہے۔ لیکن محنت کش عوام کے مفادات دوسری قوم یا فرقہ کے محنت کشوں سے متضاد نہیں ہوتے۔ وہ قومی اور بین الاقوامی اشتراک عمل، امن

اور عام خوشحالی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

عوام کا اقتدار ہی قومی آزادی کے قیام اور استحکام اور قومی تہذیب کے فروغ کا ضامن ہو سکتا ہے، اور اس کی بنیاد پر بین الاقوامی تہذیبی اشتراک اور اتفاق کی عمارت بنائی جا سکتی ہے۔ کسی بھی زبان یا تہذیب کو دبا کر نہیں بلکہ ہر قوم یا تہذیبی اقلیتی گروہ کی زبان اور ثقافت کو پھلنے پھولنے کا پورا موقع دے کر۔

لیکن میں جب بھی گفتگو کو ترقی پسندی کی سطح پر لانے کی کوشش کرتا تو منشی صاحب بات کو بڑی خوش اسلوبی سے ٹال دیتے تھے۔ آخر میں جب ہم رُخصت ہوئے تو انھوں نے وعدہ کیا کہ میں آپ کے اعلان کو غور سے پڑھ کر اپنی رائے دوں گا، اور مجھ سے انھوں نے یہ وعدہ لیا کہ میں بھی ان کی ثقافتی اسکیموں پر ٹھنڈے دل سے اور اطمینان سے غور کر کے رائے قائم کروں گا۔

تھوڑی ہی مدت گزرنے کے بعد یہ ظاہر ہو گیا کہ کنھیا لال منشی کا اور ہمارا نقطۂ نظر بنیادی طور پر مختلف تھا۔ ہم اپنے وطن میں ایسی تہذیب اور ایسے ادب کے نمو اور فروغ کے خواہاں تھے جو ہمارے وسیع ملک میں رہنے والی مختلف اقوام اور تہذیبی گروہوں کے آزادی خواہ، روشن، سائنسی اور عقلی رجحانات کو نمایاں کرے، جو بیرونی اقتدار کے پیدا کیے ہوئے غلامانہ اور روح فرسا انتشار کی بیخ کنی کرے۔ ہم قدیم جاگیری دور کی توہم پرستی اور مذہبی منافرت کے زہریلے اثرات کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ یہ سامراجی اور جاگیرداری اقتدار کی نظریاتی بنیادیں ہیں۔ ہم اپنے ماضی کی عظیم تہذیب سے اس کی انسان دوستی، حق پرستی، صلح جوئی، اس کا حسن اور سوبھاؤ اخذ کر لینے کے حامی تھے۔ لیکن ہم ان کے جمود، فراریت، عقل دشمنی، اور افیون صفت جھوٹی ''رُوحانیت'' کو سختی سے مسترد کرتے تھے۔ کنھیا لال منشی سومناتھ کے کھنڈروں کو دوبارہ کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہماری نظریں موجودہ انسانی جدوجہد کی فیصلہ کن عظمت پر گڑی تھیں اور ہم مستقبل کی ان حسین تعمیروں کا خواب دیکھتے تھے جو ماضی کے تمام مقبروں اور معبدوں سے زیادہ شاندار ہوں گی۔ اس لیے کہ آزاد عوام کی آزاد محنت، ان کے روشن دماغ اور ان کی پاکیزہ روح ان کی تخلیق کریں گے۔

میرے والدین نے لکھنؤ چھوڑ کر الہ آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس لیے میں بمبئی سے سیدھا الہ آباد گیا اور ان کے ساتھ رہنے لگا۔

الہ آباد میں احمد علی تھے جو یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرار تھے۔ میں 1931 میں اپنی طالب علمی کے دوران چھ مہینے کے لیے انگلستان سے واپس آ کر لکھنؤ میں رہا تھا۔ تب ہماری ان کی ملاقات ہوئی تھی اور اسی زمانے میں ہم نے مل کر ''انگارے'' شائع کی تھی۔ دس مختصر افسانوں کے اس مجموعے میں احمد علی کی بھی دو کہانیاں تھیں۔ ''انگارے'' کی بیشتر کہانیوں میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ کم اور سماجی رجعت پرستی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان زیادہ تھا۔ بعض جگہوں پر جنسی معاملات کے ذکر میں لارنس اور جوائس کا اثر بھی نمایاں تھا۔ رجعت پرستوں نے ان کی انھیں خامیوں کو پکڑ کر ''انگارے'' اور اس کے مصنّفین کے خلاف بڑا سخت پروپیگنڈا کیا۔ حسب دستور مسجدوں میں رزولیوشن پاس ہوئے۔ مولوی عبدالماجد دریابادی خم ٹھونک کر ہمارے خلاف اُکھاڑے میں آ گئے۔ ہمیں قتل کرنے کی دھمکی دی گئی، اور بالآخر صوبہ متحدہ کی حکومت سے اس کتاب کو ضبط کروا دیا گیا۔

اس ہنگامہ خیزی سے شاید گھبرا کر احمد علی دو، ڈھائی برس سے نسبتاً گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن جب ہم تین سال بعد الہ آباد میں دوبارہ ملے تو انھوں نے ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کے بارے میں گرم جوشی کا اظہار کیا۔ چنانچہ ان کا گھر ہمارا دفتر بن گیا، جہاں بیٹھ کر احمد علی اور میں ترقی پسند مصنّفین کی مجوزہ تحریک کے متعلق منصوبے بنانے لگے، اور اس سلسلے میں خط و کتابت کرنے لگے۔

احمد علی نے مجھے اپنی یونیورسٹی کے دوسرے دوستوں سے بھی ملا دیا، ان میں رگھوپتی سہائے فراق اور ڈاکٹر اعجاز حسین بھی تھے۔ فراق صاحب یونیورسٹی میں انگریزی کے اور اعجاز صاحب اُردو کے لکچرار تھے۔ ہم بہت سے طلبا سے بھی ملے جن میں احتشام حسین اور وقار عظیم بھی تھے۔ یہ دونوں اس زمانے میں اُردو ایم۔اے کر رہے تھے۔ شاید اعجاز صاحب ان کے استاد نے میرا اُن سے تعارف کروایا تھا۔ اسی زمانہ میں میری ملاقات شیو دان سنگھ چوہان اور نریندر شرما سے بھی ہوئی۔ بعد میں ان سب نے ادیب کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

پنڈت امرناتھ جھا، وائس چانسلر، الہ آباد یونیورسٹی، اور ڈاکٹر تارا چند سے بھی میں ملا۔ انھوں نے بھی ترقی پسند ادب کی تحریک کے بارے میں ہمارے خیالات سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ شہر کے بعض اور دانشوروں سے بھی ہماری ملاقاتیں ہوئیں۔

اب ہم نے تین فوری مقاصد کو سامنے رکھ کر کام کرنا شروع کیا۔ پہلا......الہ آباد میں اُردو اور ہندی کے ادیبوں کو ملا کر ترقی پسند مصنّفین کا ایک حلقہ قائم کرنا۔

دوسرے، ترقی پسند مصنّفین کے اعلان نامہ کے مسودہ پر ادیبوں، شاعروں اور عام دانشوروں کے دستخط حاصل کر کے اسے شائع کرنا۔

تیسرے، ہندستان کے مختلف شہروں میں اپنے ہم خیال ادیبوں سے ربط قائم کر کے انھیں آمادہ کرنا کہ وہ بھی ایسا ہی کریں۔

خوش قسمتی سے چند ہی ہفتے بعد الہ آباد میں (غالباً 1935 کے آخری دنوں میں) اردو اور ہندی کے ادیبوں کا ایک اجتماع ہوا، جس نے ہماری بہت سی ابتدائی مشکلیں آسان کر دیں۔ اس زمانہ میں اُتر پردیش میں ہندستانی اکاڈمی قائم تھی۔ یہ ایک نیم سرکاری ادارہ تھا جسے **مانٹیگو چیمس فورڈ** اصلاحات کے ماتحت قائم ہونے والی **لیجسلیٹو** کونسل کے پہلے وزیروں نے قائم کیا تھا۔ ان وزیروں میں ایک صاحب اودھ کے ایک روشن خیال تعلقہ دار رائے راجیشر بلی تھے جو کلچر سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے پہلی بار لکھنؤ میں ہندستانی موسیقی کی ایک بڑی کانفرنس منعقد کروائی۔ ہندستانی مصوری کی نمائش کی اور میوزک کالج اور ہندستانی اکاڈمی قائم کی۔

ہندستانی اکاڈمی کے مقاصد بڑے نیک تھے۔ یعنی اردو اور ہندی کو ایک دوسرے سے قریب لانا، ان زبانوں میں دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے شائع کرنا، علمی اور ادبی ریسرچ کرنا، بلند پایہ ادب کی تصنیف اور اشاعت کی غرض سے اُردو اور ہندی ادیبوں کی مدد کرنا۔ ڈاکٹر تاراچند جو اُردو اور ہندی کے اتحاد اور ہندستانی کے بہت بڑے مبلغ اور طرف دار تھے، اس اکاڈمی کے سکریٹری تھے۔

لیکن تمام ان تعلیمی اور کلچرل اداروں کی طرح جن کا دُور سے بھی سامراجی حکومت کی مشینری سے تعلق تھا، کلچر کے غیر واضح بلکہ غلط نصب العین، قومی زندگی بے تعلقی، سرمایہ کی کمی، اکاڈمی کے اراکین میں سے بیشتر کی غیر علمی روش، تساہلی اور باہمی جھگڑوں کی وجہ سے ہندستانی اکاڈمی ایک مستقل جاں کنی کی حالت میں رہتی تھی۔

ڈاکٹر تارا چند نے ہندستانی اکاڈمی کی طرف سے اُردو اور ہندی کے ادیبوں کی یہ

کانفرنس، اس غرض سے منعقد کی تھی کہ اکاڈمی میں نئی جان ڈالی جائے۔ خیر اس میں جان تو کیا پڑتی، لیکن ادیبوں کا ایک جگہ پر جمع ہونا ایک اچھی بات تھی۔ بہر حال یہ کانفرنس ہمارے لیے ان سے ملنے اور تبادلۂ خیال کا بڑا اچھا موقع تھا۔

اس کانفرنس میں شرکت کے لیے منجملہ اور لوگوں کے منشی پریم چند، مولوی عبدالحق اور جوش ملیح آبادی بھی آیے تھے۔ میں ان میں سے کسی سے بھی اس سے پہلے نہیں ملا تھا۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی (دارالمصنّفین، اعظم گڑھ)، منشی دیا نرائن نگم (ایڈیٹر 'زمانہ'، کانپور)، ڈاکٹر محی الدین زور (پروفیسر اُردو، حیدرآباد، دکن)، بھی کانفرنس میں شریک تھے۔ رشید جہاں امرتسر سے آئی تھیں۔ ہم ان سے پہلے ہی سے ترقی پسند تحریک کے متعلق خط و کتابت کر چکے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ اس اجتماع کے موقع پر ادیبوں سے ہماری جو گفتگو اور بحثیں ہوں، ان میں وہ بھی شریک ہوں تا کہ پھر پنجاب جا کر وہاں کے ادیبوں سے ہمارا ربط قایم کرا سکیں۔

اب مجھے وہ تفصیلیں یاد نہیں کہ ہم یعنی رشید جہاں، احمد علی، فراق اور میں اس کانفرنس میں آنے والے ادیبوں میں سے کن کن سے ملے، کیسے ملے اور ان سے کیا باتیں ہوئیں۔ لیکن منشی پریم چند سے پہلی ملاقات میرے دل پر نقش ہے۔ کانفرنس کے دوران ایک دن گارڈن پارٹی ہوئی۔ الہ آباد یونیورسٹی کے وِزیانگرم ہال سے متصل جو خوبصورت لان ہے، وہاں کانفرنس کے اوقات میں تو کسی سے ملنے اور بات کرنے کا مشکل سے موقع ملتا تھا، اس لیے ہم نے سوچا کہ گارڈن پارٹی میں کوشش کر کے ہم ان لوگوں سے کم از کم متعارف ہو جائیں، جن سے ملنا ہمارے لیے ضروری تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کسی وجہ سے میں گارڈن پارٹی میں دیر سے پہنچا۔ میں نے پہلے ہی فراق کو ڈھونڈنا شروع کیا، تا کہ ان کے وسیلے سے پریم چند سے میرا تعارف ہو جائے۔

فراق صاحب حسب دستور ایک جگہ کنارے پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ کنارے پر وہ لوگ تھے جو کم اہم تصور کیے جاتے تھے اور معمولی سی لکڑی کی میزوں کے گرد، بید کی چھوٹی چھوٹی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ بیچ میں ایک طرف کو ہٹ کر صوفوں اور گدّے دار کرسیوں پر بیٹھنے والے ''اہم'' لوگ تھے۔ یعنی کمشنر، ڈپٹی کمشنر، وائس چانسلر، ہائی کورٹ کے جج، بڑے بڑے وکلا اور رؤسا اور چند جُغادری قسم کے پروفیسر، پنڈت اور مولانا...... تا کہ حاکموں اور بڑے آدمیوں کے درمیان کچھ ادبی اور علمی رنگ بھی رہے۔ باقی لوگ اِدھر اُدھر تھے۔ کل ملا کر وہاں کوئی دو،

ڈھائی سو آدمی موجود ہوں گے۔ پریم چند سے بڑا ادیب وہاں کون تھا، اس لیے ہم سمجھے کہ وہ بھی کہیں صوفے پر بیٹھے ہوں گے۔ فراق سے میں نے کہا کہ...... ''بھئی، ان سے مجھے ملواؤ؟ کہاں ہیں؟'' ہم اُٹھ کر انھیں ڈھونڈنے لگے۔ پریم چند کہیں نظر نہیں آئے۔

اتنے میں فراق نے کہا...... ''وہ ہیں......'' بالکل ایک کنارے پر تین چار آدمیوں کے حلقے میں، چھوٹے سے قد کے، دبلے پتلے، گورا زردی مائل رنگ، گال کی ہڈیاں اُبھری ہوئی، شیروانی، چوڑی دار پائجامہ اور سفید کھدر کی گاندھی ٹوپی پہنے، جو اُن کے سر پر چھوٹی لگتی تھی، اور جس کے نیچے سے ان کے سر کے بال کافی بڑے بڑے نکلے پڑ رہے تھے، چھوٹی گچھے دار مونچھیں جو اُن کے اوپر کے لب کو ڈھانپے ہوئے تھیں...... بالکل غیر اہم سے ایک صاحب کھڑے تھے۔ خیر ہم ان کے قریب پہنچے۔ فراق نے کہا...... ''بھئی، ان سے ملو۔ یہ سجاد ظہیر ہیں۔ تم سے ملنے کے بڑے خواہش مند ہیں۔'' فراق پریم چند سے اچھی طرح واقف تھے اور غالباً میرا ذکر اس سے پہلے ان سے کر چکے تھے۔ وہ دونوں کائستھ برادری کے تھے اور ضلع گورکھپور کے رہنے والے تھے۔ اس وقت پریم چند جی سے میری کیا باتیں ہوئیں، یہ مجھے بالکل یاد نہیں۔ البتہ میرے دل پر جو تاثر اس پہلی ملاقات میں ہوا تھا، وہ آج پندرہ سال گزر جانے کے بعد بھی تازہ ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ میں اپنے ادب کے ایک عظیم فنکار سے مل رہا ہوں، جو مجھے بھی ایک کیرکٹر کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ میں اپنی طرف سے ہر لمحہ ان کی عظمت اور بزرگی اور ان کے سامنے اپنی خوردی کو محسوس کر رہا تھا۔ لیکن ان کا انداز بڑا سادہ سا، بے تکلفی کا تھا، کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں...... ''بھئی سجاد ظہیر...... ہم تو کھلی کتاب ہیں۔ تمھیں اگر دلچسپی ہو تو پڑھ لو بلکہ جی چاہے تو ہمیں لے لو۔'' مجھے ایک دم یہ محسوس ہوا کہ جیسے ہم جس چیز کی تلاش میں تھے، وہ مل گئی ہے۔ ایسا رفیق اور ہمدرد جس کے دماغ اور روح کی لہکتی ہوئی مشعل چاروں طرف کے دھندلکے میں روشنی کے چمکتے ہوئے قمقمے لٹکا دے گی اور ہمارے راستے کو منور کر دے گی۔

اس کے ایک دو دن بعد ہم نے طے کیا کہ مولوی عبدالحق، منشی پریم چند اور جوش صاحب کو اکٹھا کر کے ان سے مشورہ کریں اور ہدایات حاصل کریں۔ اپنے ادبی وقار اور بزرگی کے لحاظ سے اُردو زبان میں اس وقت ان سے بڑھ کر اور کون ترقی پسند تھا؟

یہ ملاقات میرے گھر پر (بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میرے والد کے گھر پر جہاں

میں رہتا تھا) علی الصبح ہونا قرار پائی۔ صبح کا وقت شاید ہم نے اس لیے چنا تھا کہ دن کو کانفرنس کی مشغولیت تھی۔ شام کو جوش صاحب شغل کرتے ہیں، اور کام کرنا اصولاً غلط سمجھتے ہیں۔ مولوی صاحب صبح کو سیر کرنے ضرور نکلتے ہیں۔ رشید جہاں، علی گڑھ کی ہونے کی وجہ سے مولوی صاحب سے اچھی طرح واقف تھیں۔ انھوں نے ہی ان سے طے کیا کہ وہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (پروفیسر عربی، الہ آباد یونیورسٹی) کے گھر سے جہاں وہ ٹھہرے تھے، ہمارے گھر کی طرف سیر کرتے ہوئے آجائیں اور ناشتہ یہیں کریں۔ رشیدہ نے مولوی صاحب کو میرے گھر پر صبح کے ناشتے کے لیے مدعو تو کرلیا، لیکن اس کی اطلاع نہ مجھے کی اور نہ خود باورچی ہی سے کہا۔ جب مولوی صاحب آگئے تب انھیں یکبارگی اس کا خیال آیا اور گھبرائی ہوئی اِدھر اُدھر گھومنے لگیں۔ مولوی صاحب اپنے کھانے پینے اور دیگر کاموں میں بھی اصول اور اوقات کے بڑے پابند ہیں۔ اب وہ بھوکے بیٹھے ہیں اور اس کے منتظر ہیں کہ ان کے سامنے ناشتہ پیش کیا جائے، اور وہاں کہیں اس کا ذکر ہی نہیں! میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر وہ اتنے چپ کیوں ہیں اور ناراض کیوں لگ رہے ہیں۔ ترقی پسندی کوئی ایسی بُری چیز تو نہ تھی۔ آخر رشیدہ نے مجھ سے کہا کہ...... ''مولوی صاحب کے لیے ناشتے کا انتظام فوراً کرو۔ میں نے انھیں مدعو کیا تھا اور وہ یوں ہی بھوکے بیٹھے ہیں۔'' خیر اس وقت جلدی میں جو کچھ تھوڑا بہت ممکن ہوا، ہم نے مولوی صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ میں نے بہتر یہ سمجھا کہ مولوی صاحب سے سارا واقعہ بیان کردوں، اس لیے کہ دعوت میری نہ سہی میزبان میں ہی تھا۔ مولوی صاحب نے اصلی بات جب سنی تو ہنس پڑے۔ پھر ہم دونوں نے مل کر رشیدہ کو بُرا بھلا کہا۔ بہرحال مولوی صاحب ایک خوش جمال خاتون کا قصور معاف کرنے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ خاص طور پر اگر انھیں یہ بھی معلوم ہو کہ اسے اُردو کا شوق ہے۔

جوش صاحب بڑی آن بان سے آئے۔ ہاتھ میں چھڑی (جسے ڈنڈا کہنا شاید زیادہ مناسب ہوگا)، جامہ وار کی چست شیروانی، جس پر رنگین پھول تھے، ننگے سر، بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بارات میں جانے کے لیے تیار ہیں۔ ان کے تن و توش اور چوڑے چکلے سینے سے خوشحالی ٹپک رہی تھی۔ لیکن چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے کہہ رہے ہیں کہ...... ''ہمیں زندگی اور حسن سے بڑا پیار ہے۔ ہمیں زندگی سے پیار کرنے دو۔ اس کے گانے گانے دو۔ البتہ انسانیت اور شرافت کے نام پر ہم سے جو چاہے مانگ لو۔ ہم سب کچھ لٹا دیں گے۔''

پریم چند جی چپکے سے مسکراتے ہوئے آ گئے۔ ان کے ساتھ منشی دیا نرائن نگم بھی تھے۔ ہم نے کافی ڈر، انکسار اور جھجک کے ساتھ گفتگو شروع کر دی۔ کچھ چھوٹا منہ اور بڑی بات معلوم ہوتی تھی کہ ہم ان بزرگوں سے ترقی پسند ادب کی تحریک کے مجوزہ مقاصد اور تنظیم کی گفتگو کریں۔ ایسی صورت میں مینی فیسٹو کا مسودہ ہمارے بڑے کام آیا۔ ہم نے اس کی ایک ایک کاپی سب کو پڑھنے کے لیے دے دی۔ مولوی صاحب اپنی صاف گوئی کے لیے مشہور ہیں۔ انھوں نے اسے پڑھ کر فوراً کہا...... ''یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن آپ چاہتے کیا ہیں؟''

میں نے کہا...... ''ہم چاہتے ہیں کہ اگر آپ سب اس سے متفق ہیں تو اس پر دستخط کر دیں۔ ہم ہندستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں سے اس پر دستخط کرا کے شائع کر دیں گے۔''

مولوی صاحب نے فوراً قلم اُٹھا کر اپنے دستخط کر دیے۔ اس کے بعد اور صاحبوں نے بھی دستخط کر دیے۔ مولوی صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی نوجوان کسی بڑی اور اچھی ادبی اسکیم کو لے کر ان کے پاس جاتا ہے تو ہمیشہ اس سے کہتے ہیں کہ بڑا اچھا خیال ہے۔ اس پر ضرور عمل کرو۔ لیکن تجربے نے انھیں بتایا ہے کہ زیادہ تر ایسے لوگ ٹھوس کام سے گھبراتے ہیں۔ علم و ادب بڑے جان لیوا آقا ہیں۔ ان کی سچی خدمت کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ چنانچہ انھوں نے ہمیں یہ نصیحت کی کہ اعلان شائع کرنے، انجمن بنانے اور جلسے کرنے سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم اس ادب کی تخلیق کے لیے محنت کریں جو ہمارے نزدیک صحیح اور ضروری ہے۔

منشی پریم چند اور جوش صاحب نے ہمیں کوئی نصیحت نہیں کی۔ وہ خوش معلوم ہوتے تھے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ ان کی برسوں کی ادبی کاوش اب بارآور ہو رہی ہے۔ کم از کم چند نوجوان، زبان سے سہی لیکن واضح طور پر یہ کہنے کے لیے کھڑے تو ہو گئے تھے کہ ادب کا سب سے بڑا مقصد قوم میں انسانیت اور آزادی کا جذبہ اور اتحاد پیدا کرنا ہے، ظلم کی مخالفت کرنا ہے، محنت کش عوام کی طرفداری کرنا ہے، جمہوریت کے قیام کی کوشش کرنا ہے......اور جہالت، توہم پرستی اور بے عقلی کی بیخ کنی کرنا ہے۔ ان کے دل میں ضرور شک آیا ہوگا کہ ہم ان مقاصد کے لیے دل لگا کر کام کریں گے یا نہیں۔ اور ہماری کوششیں کامیاب ہوں گی یا نہیں۔ لیکن وہ ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہمیں آگے لے چلنے اور ہماری مدد کرنے کو پوری طرح تیار معلوم ہوتے تھے۔

منشی دیا نرائن نگم بالکل دوسرے قسم کے آدمی تھے۔ دراز قد، دبلے، سیاہ فام، سر پر فلٹ کی

نیچی سی گول ٹوپی اور سیاہ شیروانی پہنے ہوئے، سونے کی کمانی کی عینک لگائے اور پان کھائے، وہ ہمارے صوبہ یو۔ پی۔ کے ان باذوق کائستھوں میں سے تھے جو اُردو ادب اور شعروشاعری سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اُن کا رسالہ ''زمانہ'' (کانپور) اُن وقتوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے بڑا معیاری رسالہ تھا جو ہمیشہ وقت سے نکلتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ اچھے کاروباری بھی تھے۔ انگریزی سرکار سے ہمیشہ بنائے رکھتے تھے۔ سیاست میں وہ کانگریس کے مخالف اور لبرل جماعت کے طرف دار تھے۔ انھوں نے ہمارے مینی فیسٹو پر دستخط کر دیے۔ لیکن وہ تاڑ گئے کہ یہ معاملہ یہیں پر ختم ہونے والا نظر نہیں آتا اور ممکن ہے کہ اس تحریک سے وابستگی ان کی سرکار پرستی میں مخل ہو۔ منشی صاحب کم گوئی کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ اس روز زیادہ وقت انھوں نے ہی بآواز بلند باتیں کیں، اور لوگ ان کی باتوں اور لطیفوں پر ہنستے رہے۔ چلتے وقت ان سے رہا نہیں گیا۔ وہ ہمارے ڈرائنگ روم کے قالین کی تعریف کرتے ہوئے میری طرف آنکھ مار کر بولے کہ ''بھئی اگر ہمارے پاس بھی ایسے بڑھیا اور لاجواب قالین ہوتے تو ہم بھی مزدوروں اور کسانوں کے راگ الاپتے۔'' ان کے اس برجستہ فقرے پر سب ہنس پڑے اور میں کافی شرمندہ ہوا۔

اب ہمارے پاس ہندستان کے مختلف حصوں سے خطوط آنے لگے۔ حیدرآباد (دکن) سے سبطِ حسن نے مجھے لکھا کہ وہ وہاں پر مینی فیسٹو پر دستخط حاصل کرنے اور انجمن بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس وقت تک سبط حسن سے میں خود ملا نہیں تھا۔ وہ اس زمانے میں روزنامہ ''پیام'' (حیدرآباد، دکن) کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے جو قاضی عبدالغفار صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ سبطِ حسن علی گڑھ میں ڈاکٹر اشرف کے شاگرد رہ چکے تھے۔ شاید ان کو اشرف نے علی گڑھ سے ترقی پسند تحریک کے بارے میں لکھا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ سبطِ نے اپنے خط میں اس بات پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ میں نے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کو ترقی پسند تحریک کے بارے میں خط بھیجا تھا۔ انھوں نے لکھا کہ پیرس میں اپنے طالب علمی کے دَور میں ڈاکٹر صاحب موصوف شاید ترقی پسند رہے ہوں۔ لیکن حیدرآباد میں آنے کے بعد وہ آصف جاہی حکمرانوں کی ثناخوانیوں میں مشغول ہیں۔ البتہ قاضی عبدالغفار صاحب ترقی پسند تحریک میں دلچسپی لے رہے ہیں، اور ہر طرح سے اس کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔

بنگال میں ہیرن مکرجی نے کئی ممتاز ادیبوں کے دستخط حاصل کر لیے تھے اور کلکتہ میں

انجمن کی تشکیل کی کوشش کر رہے تھے۔

بمبئی سے بھی ہمارے پاس کچھ لوگوں کے خط آئے۔

لیکن ہم ابھی تک پنجاب کے ادیبوں میں سے کسی سے باقاعدہ ربط قائم نہیں کر سکے تھے۔ اس لیے رشید جہاں جب الہ آباد سے امرتسر واپس جانے لگیں تو انھوں نے یہ تجویز کی کہ میں بھی ان کے ساتھ پنجاب چلوں، تاکہ پھر ہم وہاں کے ادیبوں سے مل کر براہ راست گفتگو اور تبادلۂ خیال کر سکیں۔

چنانچہ جنوری 1936 میں، میں پنجاب کے لیے روانہ ہو گیا۔

○○

تحریک کا آغاز

اس سے پہلے میں پنجاب کبھی نہیں گیا تھا۔ سوا اس کے کہ لڑکپن میں ایک دفعہ اپنے خاندان کے ساتھ کشمیر جاتے ہوئے وہاں سے گزرا تھا اور اس کی کچھ عجیب وغریب یادیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اسٹیشنوں پر ہمارے یہاں کے مقابلے میں پھل اور کھانے کی چیزیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے ڈبل گلاسوں میں لسّی بافراط ملتی ہے۔ لاہور اسٹیشن کے ''مسلم'' رفرشمنٹ روم میں بریانی بڑی مزے دار ہوتی ہے۔ لوگ لمبے چوڑے ہوتے ہیں۔ باتیں اونچی آواز میں کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر کے سروں پر پگڑیاں اور چہروں پر داڑھیاں ہوتی ہیں۔ شلواریں، تہمدیں اور لمبی لمبی قمیصیں چاروں طرف نظر آتی ہیں۔ ہمارے یہاں کی طرح ننگے، ادھ ننگے اور بھوکے لوگ بالکل دکھائی نہیں دیتے۔ سبزہ ہمارے یہاں کے مقابلے میں کم ہوتا ہے اور جون کے مہینے میں گرمی کچھ ہمارے یہاں سے زیادہ۔ یعنی فی الجملہ پنجاب کے ساتھ خوشحالی، توانائی اور کسی قدر فطری سختی کا تصور ذہن میں وابستہ ہو گیا تھا۔

اس کے بعد انگلستان میں اپنے ساتھ کے بہت سے نوجوان پنجابیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جن میں سے کئی سے گہری دوستیاں بھی ہوئیں۔ میاں افتخار الدین، محمود علی قصوری (بیرسٹر، لاہور)، کرم سنگھ مان، بابا پیارے لال بیدی، پنجاب کے ان دانشور نوجوانوں کے بڑے اچھے نمائندے تھے جن کے دل میں وطن کی آزادی کی لگن تھی۔ ہم سب سیاسی مسئلوں میں ہم خیال نہیں

تھے۔لیکن آزادی کے سوال میں گہری دلچسپی رکھتے تھے اور آپس میں لامتناہی بحثیں کرتے۔طرح طرح کے منصوبے بناتے اور لڑتے جھگڑتے رہتے۔ بدقسمتی سے ان لوگوں میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جسے اُردو ادب یا ادب سے کوئی خاص دلچسپی رہی ہو۔انگلستان میں میرے قیام کے آخری دنوں میں ڈاکٹر ملک راج آننداور اقبال سنگھ سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ بھی خالصاً ادبی ہونے کے باوجود اُردو ادب سے تقریباً ناواقف تھے۔ یہ انگلستان میں مدتوں تک رہ کر اور وہاں شادیاں کر کے کسی قدر انگریز بن چکے تھے اور انگریزی ہی کے ادیب تھے۔تاہم ان کے ادبی ذوق سے میں متاثر ہوا تھا۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر البتہ ان سب سے مختلف تھے۔ان سے میں پہلی بار 1935 کے شروع میں کیمبرج میں ملا اور ان کے ساتھ ہی سومناتھ چٹرجی سے بھی ملاقات ہوئی۔کیمبرج میں مارکسی خیال کے ہندستانی طلبا کا ایک چھوٹا سا حلقہ تھا۔ چونکہ اس زمانے میں ہم اس طرح کے تمام ہندستانی طلبا ایک تنظیم بنانا چاہتے تھے۔اس لیے لندن کے طلبا نے مجھے کیمبرج کے ہم خیال طلبا کے حلقے سے ملنے کو بھیجا تھا۔

تاثیر سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور اس کا ہم دونوں کو افسوس ہوا کہ اس سے پہلے ہمیں ملنے کا موقع نہیں ملا تھا۔حالانکہ وہ شاید ایک سال سے انگلستان میں تھے۔تاثیر کی ذہانت اور بذلہ سنجی کا انسان پر فوراً اثر پڑتا تھا۔ اس کے بعد چھٹیاں ہوئیں اور تاثیر لندن آئے تو ہماری متعدد بار ملاقاتیں ہوئیں۔لندن میں ترقی پسند مصنّفین کی انجمن بنانے اور اس کے مینی فیسٹو کے تیار کرنے میں انھوں نے بھی حصہ لیا۔اس کے علاوہ مارکسی تعلیم کا ہمارا جو حلقہ تھا، جس میں ہم رالف فاکس (انگلستان کے نوجوان ترقی پسند ادیب، فلسفی اور شاعر جو بعد کو اسپین کی خانہ جنگی میں فاشسٹوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے)، ڈیوڈ گسٹ اور کارن فورتھ کو بلایا کرتے تھے۔اس میں تاثیر بھی آیا کرتے تھے۔ مجھے کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ مارکسزم سے تاثیر کی دلچسپی ذہنی اور تفریحی زیادہ ہے اور علمی کم ،کبھی کبھی بحث کے دوران میں وہ ایسی باتیں بھی کر دیتے تھے جس سے کسی قدر موقع پرستی کی بو آتی تھی۔اس وقت یہ باتیں مذاق میں ٹل جاتی تھیں۔ان کا کیرکٹر اس وقت بھی کچھ ایسا تھا کہ ان سے پُرخلوص اور گہری دوستی کرنی مشکل معلوم ہوتی تھی۔لیکن ان سے ملنے،ان سے گفتگو کرنے اور ان کی باتیں سننے سے کبھی جی نہیں تھکتا تھا۔

یہ تھا میرا پنجاب جانے سے پہلے اہل پنجاب کا ذاتی تجربہ۔لیکن ذہن اور دل پر اس کے علاوہ بھی بہت سے نقوش تھے۔ پنجاب نے ہمیں اقبال کی عظیم شاعری عطا کی تھی۔ اسی سرزمین سے سیراب ہو کر حالی اور محمد حسین آزاد نے جدید اُردو نظم و نثر کی بنیاد رکھی تھی۔ظفر علی خاں کی سیاسی نظموں، ان کے طنزیہ کلام اور ''زمیندار'' میں ان کی نگارشات نے ان اصنافِ ادب کو پروان چڑھایا تھا۔ شیخ عبدالقادر کے ''مخزن'' نے یہاں سے نکل کر اُردو ادبی رسالوں کے لیے اور اُردو تنقید کا ایک نیا اور اونچا معیار قائم کیا تھا۔سالک، مہر، اور چراغ حسن حسرت کے قلم اب بھی وہاں چل رہے تھے۔محمود شیرانی کا تبحر علمی اور اختر شیرانی کی نظمیں وہاں کی فضاؤں میں بسی ہوئی تھیں۔

اور پھر جلیان والا باغ کی مقدس یادگار کون ہندستانی بھول سکتا تھا...... یا بھگت سنگھ کی امر قربانی کو؟ یا وطن کی آزادی کے لیے تحریک خلافت کے مہاجرین، غدر پارٹی کی، اور ببرا کالیوں کی والہانہ جانبازیوں کو؟ یا فرقہ پرست سیاست کے خلاف جماعت احرار کی بے مثال ابتدائی مہم کو؟ پھر یہ وہی سرزمین تھی اور اسی راوی کے کنارے جب ہماری قوم کے لاکھوں افراد نے علی الاعلان انگریزی سامراج سے مکمل آزادی حاصل کرنے کی ایک ساتھ مل کر قسم کھائی تھی۔

میں الہ آباد سے سیدھا امرتسر آیا اور محمود الظفر کے گھر ٹھہرا۔محمود نے بھی ترقی پسند ادب کی تحریک میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔لیکن وہ بیچارے ایک خاص قسم کی مشکل میں گرفتار تھے۔ حالانکہ وہ یو۔ پی (ریاست رامپور) کے رہنے والے تھے، اور ان کی مادری زبان اُردو تھی، لیکن لڑکپن ہی سے ان کی تعلیم انگلستان میں ہوئی تھی۔ انگریزی پبلک اسکول اور بے لئیل کالج، آکسفورڈ سے پڑھ پڑھا کر جب وہ 1931 میں ہندستان واپس آئے تو مادری زبان تقریباً بھول چکے تھے۔ بولنا چالنا سیکھنے میں تو انھیں کچھ دیر نہیں لگی۔ البتہ چونکہ ان کی طبیعت حد درجہ آرٹسٹک اور ادبی قسم کی واقع ہوئی تھی، اور انگریزی شاعری کی لطافتوں اور باریکیوں میں جب وہ ڈوب جاتے تھے تو ان کا سراغ لگانا ہمارے لیے مشکل ہو جاتا تھا۔اس لیے جب ہم کبھی اُردو یا فارسی شعر پڑھتے یا اپنی زبان کے کسی دقیق ادبی مسئلہ پر گفتگو کرتے تو محمود کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی افسردگی چھا جاتی تھی۔محمود کو ہمیشہ اس کا بڑا قلق رہتا تھا کہ انھیں اپنی مادری زبان پر عبور حاصل نہیں۔ وہ انگریزی میں شعر اور کبھی کبھی افسانے اور ادبی مضامین لکھتے تھے۔مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہم لاکھ کوشش کریں، کسی اجنبی زبان میں کوئی بڑا تخلیقی کام نہیں کر سکتے۔

محمود میں محض ادبیت نہیں تھی، ان کی انگریزی تربیت اور فلسفے منطق اور معاشیات کی تعلیم نے ان میں باقاعدگی، نظم اور ان تھک کام کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی، اور غالباً پٹھان نسل کے ہونے کی وجہ سے ان کے مزاج میں ایک قسم کی صلابت تھی جو بعض اوقات جب انھیں غصہ آجاتا تھا تو ضد کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔

رشید جہاں اور محمود الظفر کا جوڑا اجتماعِ ضدین تھا۔ رشیدہ کو باضابطگی سے نفرت تھی۔ ان کے جاننے والے اور دوست ہمیشہ حیران رہتے تھے کہ آخر وہ اتنی اچھی ڈاکٹر کیسے تھیں......اور اپنے مریضوں میں اتنی مقبول کیوں تھیں؟ اپنی چیزیں اِدھر اُدھر چھوڑ کر بھول جانا، انھیں گم کر دینا ان کا روز کا معمول تھا۔ اس کے برخلاف محمود کبھی کچھ بھولتے ہی نہیں تھے۔ ان حضرت کو نہ صرف اپنی بلکہ اپنے دوستوں کی ذمہ داریاں اور کام کرنے کے منصوبے ازبر یاد رہتے تھے، اور وقت بے وقت انھیں ان کی یاد دلانا ان کا بڑا تکلیف دہ شیوہ تھا۔ ایسا کرتے وقت ان کے چہرے پر ہمیشہ ہلکی سی مسکراہٹ ہوتی۔ اس کی وجہ سے ہم جیسے دیسی کام چوروں، ٹال بازوں اور کاہلوں کو اور بھی زیادہ پشیمانی ہوتی۔ رشیدہ کی پھیلائی ہوئی گڑ بڑ اور انتشار کو محمود ہمیشہ ٹھیک کرتے رہتے۔ لیکن محبت کی سنہری زنجیر جس طرح سے ان دونوں کو ایک دوسرے سے باندھے ہوئے تھی، اس کی دلکشی اور لطافت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان دونوں نے اپنی زندگی کا مقصد جیسے اپنی ذات کو بھلا کر انسانیت کو بنا لیا تھا۔ جسے فارغ البالی یا خانگی اطمینان کہتے ہیں، وہ ان کی قسمت میں نہیں تھا۔ آئندہ جو زمانہ آنے والا تھا وہ محمود کے لیے قید و بند، محنت و مشقت اور قومی کاموں کے سلسلے میں فکر و تردد کا زمانہ تھا۔ رشیدہ کے لیے طویل تنہائیوں، مالی مشکلات اور جسمانی کلفت کا۔ مگر وہ امرتسر ہو یا دہرہ دون، یا لکھنؤ، جب بھی ان کے گھر جاؤ تو محسوس ہوتا تھا کہ خوشی وہاں تیر رہی ہے......ایسی خوشی جو دو دلوں کے میل اور دو دماغوں کی ہم آہنگی سے شفاف ٹھنڈے پانی کے چشمے کی طرح پھوٹ نکلتی ہے...... جو دوسری افسردہ یا غمگین روحوں کو بھی سیراب کر کے ان میں ترنم اور بالیدگی پیدا کر دیتی ہے۔

محمود امرتسر میں ڈیڑھ دو سال سے تھے۔ لیکن ان کی یا رشیدہ کی پنجاب کے ادیبوں سے اس وقت تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ پڑھانے میں بڑی محنت کرتے تھے اور اسی کام میں مشغول رہتے۔ رشیدہ ڈاکٹری کرتی تھیں یا کبھی کبھی افسانے لکھ لیتیں۔ ہم نے مشورہ کیا کہ لاہور

چلیں اور وہاں اپنے مشترک دوست میاں افتخار الدین اور دوسرے دوستوں سے مدد لے کر ادیبوں سے ملیں۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم لاہور جائیں، ہمیں غیر متوقع بلکہ غیبی مدد ملی۔ امرتسر میں میرے ایک دو دن کے قیام کے بعد ایک دن رشیدہ نے یکبارگی کہا...... ''محمود! وہ جو تمھارے کالج میں ایک نیا لڑکا آیا ہے نہ، انگلش ڈپارٹمنٹ میں......کیا نام ہے اس کا؟'' اور پھر میری طرف مڑ کر...... ''میرے خیال میں تم اس سے مل لو۔'' محمود بہت سنجیدگی سے انگریزی میں بولے...... ''تمھارا مطلب ہے ہمارے انگریزی کے نئے لکچرار فیض احمد......''

''اُنہہ ہوگا بھئی کوئی بھی نام...... مجھے یاد نہیں رہتا۔ وہ بولتا تو ہے نہیں۔ تمھارے کالج میں مجھے وہی ایک لڑکا سمجھدار معلوم ہوتا ہے۔ بنّے کو اس سے ملنا چاہیے۔''

محمود صاحب نے اس بات کو اپنے کالج اور کالج کے وائس پرنسپل ہونے کی حیثیت سے اپنے اوپر حملہ تصور کیا اور ذرا تیزی سے بولے۔

''تمھیں کیا معلوم میرے کالج میں کون سمجھدار ہے اور کون نہیں؟ تم کتنوں سے ملی ہو؟ اور جن سے تم ملی بھی ہو، ان کے نام تک تو تمھیں یاد نہیں۔''

اب کیا تھا۔ رشیدہ بالکل اپنے اصلی رنگ پر آ گئیں اور چمک کر بولیں...... ''سب اُلو بھرے ہیں تمھارے کالج میں۔ جنھیں الف کے نام ب تک نہیں آتا۔ پتہ نہیں کس دُنیا میں رہتے ہیں۔ میں اسٹاف کی بات کرتی ہوں لڑکوں کی نہیں...... نام جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ صورت سے ہی پتہ چل جاتا ہے۔ اس دن جب میں تمھارے کالج گئی تو وہ صاحب کون تھے؟ (ہاتھ سے اشارہ کر کے) اتنی بڑی داڑھی اور ایک لمبی پھندنے دار ٹوپی پہنے ہوئے؟ سارا وقت حضرت مجھے گھورتے رہے اور تمھارے کالج کے مالک صاحب وہ کون ہیں؟ شیخ...... پتہ نہیں کیا...... وہ جو قالین بیچتے ہیں......ان کا تو دماغ خراب ہے بالکل...... اتنا روپیہ لے کر کیا وہ قبر میں جائیں گے؟ اور اسٹاف کی تنخواہ بڑھانے کے نام سے ان کی جان نکلتی ہے......''

محمود بھی اس حملے سے گھبرا گئے اور آہستہ سے بولے...... ''میرا خیال تھا کہ ہم اسٹاف کی بات کر رہے ہیں اور تم مینجنگ کمیٹی کی بات کرنے لگیں......اور میں نے تم کو لاکھ بار بتایا ہوگا کہ شیخ صادق حسن ہمارے سکریٹری ہیں، کالج کے فاؤنڈر (مالک) نہیں اور وہ تو بیچارے کب کے مر چکے

ہیں۔ ان کے لڑکے خواجہ محمد صادق ہیں جو بڑے معقول آدمی ہیں...... اور وہ کچھ ایسے امیر بھی نہیں۔''

''مجھے کیا پتہ کون فاؤنڈر ہے اور کون سکریٹری۔ مجھے تو سب ایک سے لگتے ہیں۔ لال لال چقندر کی طرح کے کشمیری۔''

اب محمود کو ایک لاجواب موقع مل گیا اور پوری سنجیدگی سے انگریزی میں وہ کہہ گزرے...... ''میرا خیال تھا کہ تمھارے والد صاحب بھی کشمیری ہیں۔'' محمود کو شاید یہ غلط فہمی تھی کہ اس شدید حملے کے بعد دشمن کو بالکل خاموش ہونا پڑے گا۔ لیکن اُدھر سے فوراً جواب ملا۔ ''چھوڑو تم میرے والد کو...... تمھارے بھنگم، بے ڈول، چپٹی کھوپڑیوں والے رامپور کے روہیلوں سے تو بہت اچھے ہیں۔ تمھارے یہاں تو کسی کی کل ہی سیدھی نہیں ہے۔''

اس پر ہم سب کو بے ساختہ ہنسی آ گئی اور میں نے موقع غنیمت جان کر کہا...... ''اچھا بھئی اب یہ طے کرو کہ ان سمجھدار فیض احمد صاحب سے کب ملاقات ہوگی؟''

محمود نے جواب دیا...... ''میں نے تمھارے آنے سے پہلے ہی فیض احمد سے ترقی پسند مصنّفین کے بارے میں باتیں کر لی ہیں اور تمھارا ابھی ان سے ذکر کر دیا ہے۔'' پھر اپنی ڈائری دیکھ کر کہا۔ ''آج ساڑھے چار بجے چائے پر فیض آ رہے ہیں۔''

''دیکھا تم نے ان حضرت کی باتیں......'' رشیدہ نے مجھ سے فریاد کے لہجے میں کہا...... ''میں نے بھی تو آخر یہی کہا تھا کہ فیض کو تم سے ملانا چاہیے۔ یہ خواہ مخواہ مجھ سے گھنٹہ بھر سے اُلجھے ہوئے ہیں۔''

محمود مسکراتے رہے، کچھ نہیں بولے۔ ذرا دیر بعد انھوں نے اعلان کیا...... ''میں اب کالج کے لیے چلا۔ مہربانی کر کے چائے کے لیے سینڈوچ بنوا لینا۔'' پھر ڈائری دیکھ کر انھوں نے کہا...... ''اور کل چائے پی کر ہم موٹر سے لاہور کے لیے روانہ ہوں گے۔ میں نے افتخار کو اطلاع کر دی ہے۔ ہم ان کے یہاں ہی ٹھہریں گے۔ فیض اپنے گھر ٹھہریں گے۔''

''اور کچھ طے ہوا ہو تو وہ بھی ابھی بتا دو۔ ذرا ڈائری کا اگلا صفحہ تو دیکھو...... بریک فاسٹ اور لنچ کس کے یہاں کھانا پڑے گا؟'' رشیدہ نے پوچھ ہی لیا۔

''یو آر جسٹ امپوسیبل۔'' محمود نے کہا اور ہنستے ہوئے چلے گئے۔

بارے جب تیسرے پہر فیض احمد صاحب سے ملاقات ہوئی تو جس کا خطرہ تھا وہی ہوا۔ یعنی فیض نہیں بولے۔ کسی نئے آدمی سے گفتگو کرنے اور اسے جاری رکھنے کا مشکل فن مجھے بھی نہیں آتا۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ اس میدان میں مجھ سے بھی بڑے اناڑی پائے جاتے ہیں۔

فیض کی رازداری کا کمال یہ تھا کہ اس وقت تک محمود اور رشیدہ کو اس کا بالکل علم نہیں تھا کہ فیض شاعری بھی کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں تو بس وہ ادب، خاص طور پر انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ایک ذہین نوجوان تھے، جن میں کچھ کچھ ترقی پسند رجحانات پائے جاتے تھے۔ محمود نے مجھ سے ان کے ذوقِ سلیم کی تعریف کی تھی۔ جس کا پتہ انھیں اس طرح سے چلا تھا کہ وہ محمود کے یہاں سے اچھی اچھی کتابیں مانگ کر پڑھنے کے لیے لے جایا کرتے اور انھیں بڑے شوق سے پڑھتے۔ ہم نے شاید انگلستان کے نئے شاعر اسٹیفن اسپنڈر اور آڈن کا تذکرہ کیا جن کے شعر کے نئے مجموعے ان دنوں شائع ہوئے تھے اور جن کی شاعری میں انگریزی شاعری کے مروجہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے پھیلائے ہوئے تلخی اور نامرادی کے رجحانات سے الگ ہٹ کر انسانیت کے نئے اشتراکی مستقبل اور یورپی عوام کی فاشسٹ دشمن جدوجہد کی پُر امید جھلک تھی۔ مجھے اس پر کافی تعجب ہوا کہ فیض ان شاعروں کا کلام پڑھ چکے تھے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کے بارے میں ہم نے اس وقت تک جو کیا تھا سب بتایا، اور ان سے پوچھا کہ پنجاب میں اس کے کیا امکانات ہیں؟ فیض نے اپنے بشرے سے کسی خاص گرم جوشی یا انہماک کے جذبے کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ بس ایک پشیمان سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑی مشکل سے ہم سے اتنا ہی کہا...... ''لاہور چل کر دیکھتے ہیں۔ میرے خیال میں وہاں پر کچھ لوگ تو شاید ہم سے متفق ہوں گے۔'' معلوم ہوتا تھا کہ تہیہ کر کے آئے ہیں کہ سنیں گے، مسکرائیں گے، مگر بولیں گے نہیں۔ آخر کو رشیدہ چلاّ پڑیں...... ''یہ بھی خوب کہی۔ کچھ لوگ متفق ہوں گے۔ جناب ہمیں اس مینی فیسٹو پر بہت سے لوگوں کے دستخط لینے ہیں......اور پھر لاہور میں ترقی پسند مصنّفین کی انجمن بنانی ہے۔''

محمود اور میں، رشیدہ کی اس حرکت پر گھبرا گئے۔ ابھی ہماری فیض سے بے تکلفی نہیں تھی اور میری تو بالکل پہلی ملاقات تھی......اور رشیدہ تھیں کہ اس ہمارے شرمیلے مہمان کی نقلیں کرنے لگیں اور اس پر فقرے چست کر رہی تھیں۔ لیکن انھیں روکنے یا منع کرنے کی کسے ہمت تھی!

پھر بھی فیض ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ البتہ اب کی ذرا اور کھل کر مسکرائے اور بولے......

''لاہور چل کر کوشش کرتے ہیں......دیکھیں کیا ہوتا ہے۔''

ہم اپنے پروگرام کے مطابق دوسرے دن لاہور چل پڑے اور چراغ جلے وہاں پہنچ گئے۔فیض اپنے گھر چلے گئے اور ہم تینوں سیدھے کنال بینک پر میاں افتخارالدین کی کوٹھی پر گئے۔

وہاں پر میاں صاحب کے نوکروں نے ہمارا استقبال کیا اور بتایا کہ میاں صاحب اور بیگم صاحبہ کسی پارٹی پر گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ ابھی آتے ہیں۔

رشیدہ کو امیروں، بڑے آدمیوں، کام نہ کرنے والے غیر سنجیدہ خوش باشوں سے ایک عام نفرت تھی۔اپنی ڈاکٹری کے سلسلے میں ان کو اکثر ایسے لوگوں کے گھروں میں جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور انھیں اس طبقے کا کچا چٹھا ان کے زنانہ مکانوں کے ذریعہ سے معلوم تھا۔وہ ان امیروں کی کیفیت سے بھی واقف تھیں جنھوں نے اپنی مدقوق بیگموں کو گندے محل سراؤں میں مقفل کر کے باہر مردانے میں بھونڈے ڈرائنگ روم سجائے تھے۔وہ انگریزی دُکانوں کے سلے ہوئے گراں قیمت سوٹ پہنتے، سفید صاحبوں کی خوشامد کرتے......انھیں اور ان کی میموں، دیسی افسروں اور ان کی ریشم پوش عورتوں کو ڈنر اور پارٹیاں دیتے......اور خلوت میں جا کر دوسرے کاموں میں مشغول ہو جاتے، اور وہ ان نئے ''ترقی یافتہ'' امیروں کی حالت بھی جانتی تھیں جو ''ماڈرن'' بن چکے تھے اور جن کے یہاں پردے کا رواج اُٹھ چکا تھا۔ان کی بیویاں، بہنیں اور لڑکیاں انگریزی میں گٹ پٹ کرتیں۔بِرج اور رَمی کھیلتیں اور پکنک پر جاتیں۔انھوں نے اپنی زبان، قومی انفرادیت اور تہذیب کی دولت گنوا دی تھی۔ان کی ذہنی پراگندگی ان کے روحانی افلاس سے کم نہ تھی۔ان کی ساری زندگی ایک بے ہودہ ہیجان بن کر رہ گئی تھی۔لیکن اس کی بے مائیگی اور ابتذال کو مغربی ملمع کی چمک دمک سے چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔

افتخار کو گھر پر موجود نہ پا کر رشیدہ کے ماتھے پر فوراً شکن پڑ گئی اور محمود نے اپنے پتلے ہونٹ اور بھی بھینچ کر بند کر لیے۔کسی قدر رنج مجھے بھی ہوا۔ہم بڑے چاؤ سے افتخار کے یہاں گئے تھے اور میری تو انگلستان سے واپس آنے کے بعد اس سے یہ پہلی ملاقات ہوتی۔ہمیں ملے ہوئے تین سال کے قریب ہو گئے تھے، اور میں سات آٹھ سو میل کا سفر طے کر کے ان کے یہاں پہنچا تھا۔

ہم جاڑے میں شام کے وقت تیس چالیس میل موٹر پر چل کر آئے تھے۔اسی لیے کافی ٹھٹھرے ہوئے تھے۔اندر آتش دان میں بڑی اچھی آگ جل رہی تھی، چُپ چاپ اس کے گرد

جا کر بیٹھ گئے۔نوکر جلدی سے ہمارے لیے چائے بنا کر لائے۔آگ کی گرمی اور چائے نے ہمارے موڈ پر اچھا اثر ڈالا۔رشیدہ ایک نرم کشن میں منہ چھپا کر قالین پر ہی لیٹ گئیں۔محمود کا ہاتھ آہستہ سے اپنی جیب میں گیا اور انھوں نے وہاں سے پائپ نکال کر پینا شروع کر دیا۔لیکن وہ وقت ضائع کرنے کے قائل نہیں تھے۔ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنی نوٹ بک بھی برآمد کی اور میرے ساتھ دوسرے دن کا پروگرام طے کرنے لگے۔ان کی نوٹ بک میں بیس پچیس ناموں کی ایک فہرست تھی۔ لاہور کے ادیبوں، شاعروں، ادب میں دلچسپی لینے والوں، ادب کے مددگاروں، آرٹسٹوں، پروفیسرز کی فہرست۔انھوں نے کہا کہ تمھارے لیے ضروری ہے کہ تم ان سب سے فرداً فرداً ملو۔اس انکشاف پر مجھے کافی تعجب ہوا اور میں نے ان سے پوچھا کہ ''تم تو کہتے تھے کہ تم یہاں کے ادیبوں کو جانتے ہی نہیں۔پھر یہ اتنی بڑی فہرست کیسے بنالی؟''

انھوں نے جواب دیا...... ''تمھارے یہاں آنے سے پہلے میں اور فیض اس معاملے کے متعلق کئی بار باتیں کر چکے ہیں۔میں تو ان میں سے ایک دو ہی سے واقف ہوں۔لیکن فیض اکثر کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔یہ فہرست انھوں نے لکھوائی ہے۔ہمارا خیال ہے کہ جب ایک دو دن میں تم ان سب لوگوں سے مل کر باتیں کر لوگے تو پھر ہم اس کے فوراً بعد ان لوگوں کی میٹنگ کریں گے جو اس تحریک میں دلچسپی رکھتے ہیں۔''

مجھے محمود کی اس مستعدی سے بڑی خوشی ہوئی۔ میں ان کی اس خصلت سے پہلے سے ہی واقف تھا۔یورپ میں طالب علمی کے زمانہ میں ہم جب کبھی چھٹیوں میں ایک ساتھ سفر کو نکلتے تو محمود کی وجہ سے سفر کی تمام زحمتیں ختم ہو جاتی تھیں۔ٹکٹ خریدنا، سوٹ کیس اُٹھانا، ریل کے چھوٹنے اور پہنچنے کا وقت دریافت کرنا، کھانے پینے کا بندوبست کرنا، رہنے کے لیے ہوٹل کا انتخاب کرنا، سیر و تفریح کا پروگرام بنانا...... یہ سب وہ اپنے لیے ہی نہیں بلکہ میرے لیے بھی کر دیتے تھے۔ان کی موجودگی میں کچھ کام کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔اس لیے کہ وہ میرے مقابلہ میں یہ سب کام بہت خوبی کے ساتھ کیا کرتے تھے۔میری سُستی سے ناراض ہو کر وہ کبھی کبھی مجھے ڈانٹتے اور انھیں یہ شبہ بھی ہوتا تھا کہ میں جان کر کام چوری کر رہا ہوں۔لیکن بالآخر وہ مسکرا کر میری ذمہ داریاں بھی خود ہی پوری کر دیتے۔اسی لیے تو ہم دونوں اتنے اچھے دوست تھے۔

''یار......تم سے تو جو بات پوچھتے ہیں تم یہی کہتے ہو کہ فیض نے اور میں نے پہلے ہی طے

کرلیا ہے۔ میرے لیے تو تم نے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے اتنے دور آنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''بھئی اصل بات یہ ہے کہ فیض کے ساتھ پنجاب میں پروگریسو رائٹرس مووومنٹ آرگنائز کرنے کے بارے میں، میں نے کئی بار تفصیل سے باتیں کی تھیں اور ہم خود لاہور آنے کی سوچ رہے تھے۔ اتنی جلدی تمھارے یہاں آنے کی ہمیں اُمید بھی نہیں تھی۔ خیر، بہت اچھا ہوا کہ رشیدہ تمھیں اپنے ساتھ کھینچ لائیں۔ تم ہمیں اپنے یورپ کے تجربے اور وہاں کے تازہ ترین حالات بتا سکو گے، اور پھر تمھارے لیے یہاں ذاتی تجربہ اور واقفیت بھی ضروری ہے۔''

اگرچہ اس صاف گوئی سے میرے خود پسندی کے جذبہ کو ٹھیس لگی، لیکن آہستہ آہستہ یہ خوشگوار حقیقت بھی ظاہر ہونے لگی کہ ہمارے ملک کے ہر ایک حصے میں ترقی پسند ادب کی تحریک ایک ناگزیر تاریخی واقعہ کی طرح نمودار ہورہی تھی۔ ہماری تہذیب کا ماضی اور حال اس نئے ارتقا کا متقاضی تھا۔ ہم باہر سے کوئی اجنبی دانہ لاکر اپنے کھیتوں میں نہیں بو رہے تھے۔ نئے ادب کے بیج ہمارے ملک ہی کے روشن خیال اور محبِّ وطن دانشوروں کے دل و دماغ میں موجود تھے۔ خود ہمارے ملک کی سماجی آب و ہوا اَب ایسی ہوگئی تھی جس میں یہ نئی فصل اُگ سکتی تھی۔ ترقی پسند ادبی تحریک کا مقصد اس نئی فصل کی آبیاری کرنا، اس کی نگہداشت کرنا، اسے پروان چڑھانا تھا۔

اب اُس پُراسرار نوجوان کی شخصیت بھی، جس سے میں ایک دن پہلے پہلی بار ملا تھا اور جس نے ''ہوں ہاں'' کے علاوہ اور کچھ بولنے سے انکار کر دیا تھا، میرے ذہن میں زیادہ واضح ہونے لگی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ میاں افتخار الدین آ گئے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ ٹھیک ہوگا کہ وارد ہوئے۔ ان کی موٹر تو شاید چپکے سے آ گئی ہو، لیکن وہ خود بہت زوروں میں آئے۔ شاید باہر ہی ان کو مہمانوں کے آنے کی خبر ہوگئی تھی۔ اب کیا تھا، دروازے دھڑ ادھڑ کھلنے اور بند ہونے لگے۔ چاروں طرف سے نوکروں کے بوکھلاہٹ میں دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ گھر میں وہ جو ایک انگریزوں کے مکانوں کا سا سکوت تھا، ختم ہو گیا۔ چشم زدن میں ہمارے کمرے کا دروازہ بھی یکا یک چوپٹ کھلا اور ایک چیز تیر کی طرح اندر داخل ہو کر مجھ سے لپٹ گئی۔ بچھڑے دوست جب گلے مل چکے تو شکوے شکایتیں شروع ہوئیں۔ افتخار نے ہمارے پہنچنے کے وقت اپنے موجود نہ ہونے پر ایک لمبی معذرت شروع کی، اور کم از کم مجھے بالکل مطمئن کر دیا۔ میں دل ہی دل میں شرمندہ بھی ہوا کہ میں نے خواہ مخواہ اور بے جا

طور پر ایک مخلص اور شفیق دوست کی طرف سے اپنے دل میں رنجش پیدا کر لی تھی۔ ہم تینوں نے ہنسی مذاق اور باتیں شروع کر دیں۔ رشیدہ اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔ وہ خاموش تھیں۔ میں نے کسی قدر ڈرتے ہوئے ان کے چہرے پر نظر ڈالی تو محسوس کیا کہ ان کے ماتھے کی شکن ابھی اپنی جگہ پر موجود تھی۔ البتہ اب اس شکن کا رُخ صرف افتخار کی طرف نہیں تھا، اب وہ ہم تینوں پر وار کر رہی تھیں، اور جیسے ہم سے کہہ رہی تھیں کہ ''تم بڑے بے حیا ہو۔'' اتنے میں عصمت، بیگم افتخار، سروِخراماں کی طرح کمرے میں داخل ہوئیں۔ ہم سے رسمی صاحب سلامت کرنے کے بعد رشیدہ کے پاس بیٹھ گئیں۔ وہ بھی رشیدہ کی طرح علی گڑھ کی رہنے والی تھیں اور رشیدہ سے اچھی طرح واقف تھیں۔ ان میں آپس میں باتیں شروع ہو گئیں۔ بیگم افتخار کی خوش پوشا کی، نرم روی اور آہستہ کلامی نے کمرے میں ایک سہمی ہوئی سی مہذب فضا پیدا کر دی۔ تھوڑی دیر میں عصمت، رشیدہ کو ساتھ لے کر اندر چلی گئیں۔ ہم تینوں کی جان بچی اور ہم نے اطمینان کی سانس لی۔

لیکن افتخار اور محمود دونوں کی موجودگی میں کسی انسان کے لیے آرام سے دو گھڑی بیٹھ کر زندگی کے مزے لینا ناممکن ہے۔ کم از کم میں ایسا خوش قسمت نہیں۔ اب حالت یہ ہوئی کہ ایک طرف تو افتخار نے ہماری خاطر داری اور تواضع کے سلسلے میں سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیا۔ دوسری طرف محمود سارے وقت اس کوشش میں لگے ہیں کہ ہم جس کام کے لیے آئے تھے، ہر ایک بات سے پہلے اس کے متعلق افتخار کے ساتھ مل کر دوسرے دن کا پروگرام بنا لیں۔ افتخار ایک منٹ ہم سے بات کرتے ہیں تو دوسرے منٹ بھاگ کر اس کمرے کو جا کر دیکھ آتے ہیں جہاں انھوں نے ہمارے بستر لگانے کا حکم دیا تھا۔ ہم سے ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کے بارے میں سنتے سنتے یکبارگی نوکر کو چلاّ کر کہتے ہیں کہ ہمارے نہانے کے لیے گرم پانی تیار کیا جائے۔ بات بات میں انھوں نے ہم کو مطلع کر دیا کہ رات کو کھانے کے لیے ہم سب سر عبدالرشید (جو پاکستان فیڈرل کورٹ کے پہلے چیف جسٹس تھے) کے یہاں مدعو ہیں۔ جن کے یہاں ایک بڑا ڈنر ہے۔

ڈنر کی خبر گویا محمود کے لیے وہ آخری تنکا تھی جس نے اونٹ کی کمر توڑ دی۔ انھوں نے سختی سے کہا...... ''ہم سول لائن کی ڈنر پارٹیوں میں شریک ہونے کے لیے لاہور نہیں آئے ہیں۔ مجھے صرف دو دن کی چھٹی ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ تم ہمارے ساتھ دو گھنٹے اطمینان سے بیٹھ کر اس کام کے بارے میں باتیں کب کر سکتے ہو؟''

لیکن افتخار بھی ان لوگوں میں نہیں جن کو ان کے ارادوں سے آسانی کے ساتھ ٹالا جا سکے۔ وہ اپنی رائے سے اختلاف رکھنے والوں سے بے حد بحثیں کرتے ہیں۔ بظاہر اس کی بات قبول بھی کر لیتے ہیں لیکن آخر میں اسے اپنی رائے کا کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ لوگ عاجز آ کر یا تو ان کی بات مان لیتے ہیں یا کسی نہ کسی طرح ان سے پیچھا چھڑا کر بھاگ جاتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا......

''بھئی بات یہ ہے کہ تمھارا خط آنے سے پہلے ہی ہم اس ڈنر پر مدعو تھے۔ ہم نے وہ دعوت قبول کر لی تھی۔ جب تمھارا خط آیا تو میں نے میاں رشید کو ٹیلی فون کیا کہ ہمارے یہاں مہمان آ رہے ہیں۔ اس لیے عصمت اور میں آپ کی دعوت میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔ انھوں نے پوچھا کہ کون مہمان، میں نے تم لوگوں کے نام بتائے۔ اس پر انھوں نے بڑے اصرار سے کہا کہ تم ان تینوں کو بھی میری طرف سے مدعو کر دو۔ وہ تم سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ اب اگر تم کہتے ہو تو میں ان کو ٹیلی فون کر دیتا ہوں کہ ہم نہیں آ سکتے۔ لیکن آخری وقت پر پانچ آدمیوں کی غیر موجودگی سے ان کی ڈنر پارٹی خراب ہو جائے گی۔ بہر حال کھانا تو ہمیں کھانا ہی ہے۔ یہاں نہ کھایا وہاں کھایا۔ ہم وہاں سے جلدی واپس آ سکتے ہیں، اور میرا یہ بھی خیال تھا کہ بنّے لاہور پہلی بار آ رہے ہیں۔ ان کو یہاں پر ہر قسم کے لوگوں سے ملنا چاہیے۔ غالباً وہاں میاں بشیر احمد بھی ہوں گے، اور ممتاز (شاہنواز) بھی، ان سے تو تم کو ملنا ہی چاہیے۔ شاید اور بھی کچھ لوگوں سے ملاقات ہو جائے جو تمھارے کام کے ہوں۔''

محمود نے بے بس ہو کر میری طرف دیکھا۔ افتخار کی منطق کا آخر جواب ہی کیا تھا؟ اب یہ ذمہ داری انھوں نے ہم پر ڈال دی تھی کہ ایک شریف انسان کی دعوت میں جانے سے انکار کر کے اپنے کو بدتہذیب اور نامعقول ثابت کریں۔ ہم نے سوچا کہ میاں بشیر سے ہمیں یوں بھی ملنا تھا۔ سو اِسی وقت مل لیں گے۔ ہم ممتاز شاہنواز (یادش بخیر) سے بھی ملنے کے خواہش مند تھے۔ میں اپنی طالب علمی کے دنوں میں ان سے لندن اور آکسفورڈ میں ایک دو بار مل چکا تھا۔ وہ اب لاہور کے اُفق پر نمودار ہو رہی تھیں، اور چند اور لوگوں کے ساتھ مل کر انھوں نے لاہور میں ایک لٹریری لیگ بھی قائم کی تھی۔ یہ لٹریری لیگ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر تھا، لاہور کے ان انگریزی داں نوجوانوں نے بنائی تھی جنھیں ولایتی ادب سے دلچسپی تھی اور جو انگریزی میں

افسانے، نظمیں اور ادبی مضامین لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس ادارے میں جمالیاتی حظ پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔

جب ہم ایک رائے کے ہو گئے تو یہ سوال اُٹھا کہ رشیدہ سے ڈنر پر چلنے کے لیے کون کہے گا۔ ہم تینوں اس کام سے جھجکتے تھے۔ وہاں منطق سے کام چلنے والا نہیں تھا۔ بہر حال محمود اور میں نے یہ ذمہ داری میزبان پر چھوڑ دی اور انھوں نے ایک خوفناک دھماکے کا خطرہ محسوس کر کے اپنی بیوی عصمت پر......! خیر وہ مرحلہ بھی کسی نہ کسی طرح طے ہو گیا اور ہم سب خوشی خوشی ڈنر پر گئے۔

ہماری خوش قسمتی سے دعوت میں بیس پچیس آدمی تھے۔ بڑے مجمع میں انسان کو اپنی پسند کے لوگوں سے ملنے اور بات کرنے کی آسانی زیادہ ہوتی ہے۔ جسٹس رشید اور ان کی بیگم نے بڑی شفقت سے ہم سے مل کر ہمیں چھوڑ دیا کہ ہم جس سے چاہیں ملیں۔ چنانچہ ہم اپنی طرح کے دوسرے نوجوانوں کے ساتھ مل جل گئے۔ میں نے تھوڑی ہی دیر میں محسوس کر لیا کہ لاہور کی ''اونچی سوسائٹی'' ہمارے لکھنؤ یا الہ آباد کی اونچی انگریزی تعلیم یافتہ سوسائٹی سے بعض باتوں میں زیادہ اونچی ہے۔ وہاں کے لوگ زیادہ صحت مند ہی نہیں بلکہ ہمارے یہاں کے مقابلے میں زیادہ اچھے سوٹ پہنے ہوئے تھے، اور زیادہ شان سے انگریزی بولتے تھے۔ ہمارے یہاں اس زمانہ میں اس قسم کے ڈنر پر کافی لوگ شیروانی پہنتے تھے۔ لیکن یہاں سب سوٹ پوش تھے۔ عورتیں ہمارے یہاں کے مقابلے میں اگر زیادہ خوبصورت نہیں تو زیادہ گوری چٹّی، زیادہ قیمتی ساڑیوں میں ملبوس اور زیادہ اسمارٹ نظر آتی تھیں۔ لیکن جسم، لباس، دولت، اور اطوار کے ظاہری فرق کو چھوڑ کر اگر دیکھیں تو ذہنیتوں میں شاید ہی کوئی فرق ہو۔ وہ نوجوان جو آئی۔ سی۔ ایس یا اسی قسم کے اونچے افسر بن چکے تھے، ان کی ذہانت کے باوجود ان کا روحانی انجماد اور ان کی اخلاقی خود اطمینانی اگر اتنی دردناک نہ ہوتی تو مضحکہ خیز ہوتی۔ یہ نہیں تھا کہ قومی زندگی کے تیز اور تند دھارے ان سے آ کر ٹکراتے نہیں تھے۔ آخر وہ یہیں کے تھے اور اسی زمین نے انھیں جنم دیا تھا۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جب وہ اپنی چھوٹی چھوٹی انگریزی ساخت کی کشتیوں میں بیٹھ کر اس دھارے میں بہتے تھے تو وہ سمجھتے تھے کہ زندگی کا یہ دھارا اُن کی تفریح کے لیے بہہ رہا ہے اور وہ اس سے الگ کوئی چیز نہیں، اور نہ انھیں اپنے بھرے وطن میں اپنی تنہائی اور بیچارگی کا احساس

تھا۔ پھر وہ نوجوان بھی تھے جن کو ابھی یہ رنگین کشتیاں نہیں ملی تھیں۔ وہ حسرت بھری حاسدانہ نظروں سے کنارے پر کھڑے ہوکر ان ''خوش قسمتوں'' کی طرف دیکھتے اور خشکی پر کھڑے ہونے کے باوجود ان کی نقالی کرتے جو دریا میں بےفکری سے سیر کررہے تھے۔ اس سوسائٹی کے بزرگ خاص طور پر مائیں، دریا کی اس مخلوق کو اپنی بن بیاہی لڑکیوں کے واسطے پھنسانے کے لیے کنارے پر مستقل طور سے شست لگائے بیٹھی رہتیں۔ حالانکہ سب ان حرکتوں کو سمجھتے تھے لیکن شاید عام ضرورت کے احساس سے مجبور ہوکر، باہمی رضامندی سے اس ونایت اور بردہ فروشی کو ''روشن خیالی'' اور ''جدید تہذیب'' کا نام دے دیا گیا تھا۔

اس رات میاں بشیر احمد سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ میاں بشیر علم و ادب میں خاصہ شغف رکھتے ہیں۔ ان کے رسالے ''ہمایوں'' نے اُردو ادب میں ان کی باقاعدگی اور ادب نوازی کے سبب سے اپنے لیے ایک خاص مقام پیدا کرلیا تھا۔ میاں صاحب سے ملنے اور گفتگو کرنے سے (جس کی بعد میں بھی مجھے کئی بار سعادت نصیب ہوئی) یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے مزاج میں اعتدال اور توازن سکون کی حد تک پہنچا ہوا ہے، اور وہ ادب ہو یا سیاست یا سماجی مسائل......ان کو ہر ممکن طریقے اور زاویے سے، اتنی باریکی سے اور اتنی بار دیکھتے ہیں کہ اکثر وہ اپنے کو اور اپنے مخاطب کو مختلف النوع دلائل و براہین کے جال میں پھنسا کر ایسے مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں پر ہر قسم کی حرکت اور ترقی کی راہ جیسے کھو جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ اور فکر کی کثرت نے ان کے کردار میں تازگی اور تنوع نہیں بلکہ بےبسی اور انفعال کی کیفیت پیدا کردی ہے۔ شاید اپنے نفس کو اس منفعل حالت سے چھڑانے کے لیے ردعمل کے طور پر انھوں نے بعد کو گھبرا کر مسلم لیگ کی ہیجانی، جبلی اور عقل وفہم سے مبرا سیاست کا دامن پکڑ لیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ فرقہ پرست سیاست کی فضا میں ان کی ''خودی'' کو زیادہ دیر تک تسکین نہیں ملی اور بالآخر وہ پھر لارنس روڈ کی سرسبز شادابیوں اور اپنے بھرے کتب خانے کی الماریوں میں گم ہوگئے۔

اس کے بعد کے چند دن فیض احمد کی رہنمائی میں لاہور کے مختلف ادیبوں سے ان کے گھر جاکر ملنے میں گزرے۔ لیکن افسوس ہے کہ اب ان میں سے مجھے صرف دو سے ملنا صاف طور پر یاد ہے۔ ایک صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور دوسرے اختر شیرانی مرحوم۔

فیض شاید صوفی صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے۔ اس لیے وہ انھیں بہت اچھی طرح

جانتے تھے، اور غالباً رشیدہ اور محمود بھی فیض کے توسل سے ان سے پہلے سے واقف تھے۔ صوفی صاحب سے ملنے پر پہلی بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ ان کا تخلص بہت مناسب ہے۔ ان کے مزاج میں ایسی دلکش قسم کی نرمی ہے، اور ان کا لہجہ اور انداز کچھ ایسا متبسم ہے کہ ان سے ملنے کے ذرا ہی دیر بعد ان سے بے تکلف ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ وہ انسان کو ناقدانہ نقطۂ نظر سے دیکھ کر اسے پرکھنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ اس کے دل کی بات سننے کے لیے تیار بیٹھے ہیں، اور اس کی خوشی پر مسکرانے اور دکھ پر چپکے سے دو آنسو بہانے کے بعد کہنے والے ہیں کہ...... ''دوست! اب تم یہیں میرے ساتھ رہ جاؤ۔ میرے گھر میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں اور کھانا بھی جو کچھ روکھا سوکھا ہے، حاضر ہے۔ ساتھ رہیں گے تو غم غلط ہوگا، اور زندگی کا بوجھ شاید ہلکا ہو جائے۔''

مجھے یہ آج تک معلوم نہیں ہوا کہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ترقی پسند کتنے ہیں۔ انھیں سیاست سے دلچسپی نہیں کے برابر ہے۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ ان کے ادبی ذوق اور ان کے دردمند دل کے طفیل پنجاب میں ترقی پسند ادب کی تحریک کو اپنے بالکل ابتدائی مراحل میں اتنی زیادہ مدد ملی جتنی شاید کسی دوسرے ایک شخص سے نہیں ملی۔ شاید یہ ایک فطری بات تھی کہ جب رشید جہاں اور صوفی صاحب ملے، تو اس کے باوجود کہ دونوں کے مزاجوں میں بڑا فرق تھا، دونوں کو ایک دوسرے سے حقیقی اُنس ہو گیا۔ رشیدہ کے مزاج میں ایک قسم کی تندی تھی...... اور سچی بات چاہے کتنی کڑوی کیوں نہ ہو، اگر ان کی سمجھ میں آجاتی تھی تو وہ کسی کا لحاظ کیے بغیر کہہ گزرتی تھیں۔ اس کے برخلاف صوفی صاحب اس قدر زیادہ مہذب واقع ہوئے ہیں کہ اگر انھیں ذرا بھی گمان ہو کہ ان کی بات سے کسی کا دِل دُکھے گا، تو ضرورت پڑنے پر بھی بولنے سے گریز کر جائیں گے اور دل کی دل میں رکھیں گے۔ پھر بھی ان دونوں کی آپس میں خوب بنتی تھی۔

اختر شیرانی کے یہاں مجھے فیض لے گئے۔ ان کا مکان پُرانے لاہور کی ایک گلی میں تھا۔ ویسی ہی تنگ و تاریک گلی، جیسے پُرانی دہلی اور پُرانے لکھنؤ میں بھی بہت ہیں۔ ہم صبح کو کوئی آٹھ نو بجے کے قریب وہاں گئے تھے۔ اس لیے دھوپ اگر وہاں پہنچتی بھی تھی تو اس وقت تک نہیں پہنچی تھی۔ اختر صاحب کا کمرہ اوپر کوٹھے پر تھا۔ اندھیرے زینے پر ٹٹولتے ٹٹولتے ہم جب اوپر پہنچے تو اختر صاحب کے کمرے کو ہم نے کچھ زیادہ روشن نہیں پایا۔ بے ترتیبی سے چاروں طرف چیزیں

بکھری تھیں۔ کاغذوں، کتابوں، اور کرسیوں کے ہتھوں پر مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ میلے کپڑے اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ جوٹھی چائے کی پیالیاں اور صبح کے ناشتے کے برتن ابھی تک یوں ہی ایک طرف کو رکھے تھے اور اس پراگندگی اور کثافت کے درمیان ہمارا وہ محبوب رومانوی شاعر، سلمیٰ کا خالق، حسن کا پرستار، جس کے شعروں نے کتنے ہی نوجوان دلوں میں محبت کی ایک نئی چاشنی پیدا کی ہوگی، ایک پُرانی سی لکڑی کی کرسی پر تہمد باندھے سَر نِگوں بیٹھا تھا۔اس سارے ماحول سے اگر ایک طرف اختر کے مزاج کی آشفتگی ظاہر ہوتی تھی تو دوسری طرف معاشی تنگی بھی ٹپکی پڑتی تھی۔ اختر شیرانی کو ان حالات میں دیکھ کر میرے دل کو بڑا دُکھ ہوا۔ میں نے پریشان ہوکر فیض کی طرف دیکھا۔ان کے چہرے پر ہمدردی اور سکون کی ملی جلی کیفیت تھی اور زبان سے کچھ بولے بغیر جیسے انھوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ ''ایک اختر شیرانی ہی نہیں، ہمارے زیادہ تر ادیب، شاعر، اہل علم وفن انھیں روح فرسا حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔جبھی تو ہم اپنی اس تحریک کو شروع کر رہے ہیں۔''

فیض نے اختر شیرانی سے میرا تعارف کروایا اور ان سے ملنے کا مقصد بتایا۔ میں نے مختصراً ترقی پسند ادب کی مجوزہ تحریک کے بارے میں ان سے کچھ باتیں کیں۔ وہ چپ سنتے رہے۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں پوچھیں۔ ہمیں کسی قدر یہ محسوس ہوا کہ شاید ہم اس تحریک کے متعلق ان میں انہماک پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ وہ ہماری باتوں سے اتفاق تو ظاہر کرتے تھے لیکن جیسے وہ کسی اور فکر میں غرق ہوں۔ بہرحال انھوں نے ہمارے مینی فیسٹو کو غور سے پڑھا اور اس کے بعد ہماری درخواست پر فوراً ہی مسکرا کر دستخط بھی کر دیے۔

دو تین دن کی دوا دوش کے بعد جس میں اب میاں افتخار الدین بھی ہمارے ساتھ پورے جوش وخروش سے شریک ہوئے تھے، ہم نے ان پندرہ بیس آدمیوں کو، جنھیں ہم سمجھتے تھے کہ ترقی پسند مصنّفین کی تحریک میں دلچسپی لیں گے، ایک ساتھ مل کر گفتگو اور مشورے کے لیے مدعو کیا۔ یہ اجتماع افتخار کے ہی گھر پر ہوا۔ان کے مکان کے سامنے کے خوبصورت لان پر چار بجے کے قریب ایک ایک دو دو کر کے لوگ جمع ہونا شروع ہوئے۔ رشیدہ، محمود، افتخار، فیض، اور میں پہلے سے وہاں موجود تھے۔افتخار میزبان ہونے کے ناطے چائے وغیرہ کے انتظام کے لیے اپنے نوکروں کو اِدھر اُدھر بھگا رہے تھے۔ ہماری گھبراہٹ بھی کچھ کم نہیں تھی۔ جس کا اظہار اُس وقت

ہماری غیر معمولی خموشی سے ہو رہا تھا۔ فیض حسب دستور بظاہر اطمینان سے سگریٹ پی رہے تھے اوران کے اس اطمینان پر رشیدہ تو رشیدہ، مجھے بھی، جو اپنے کو کافی ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان تصور کرتا ہوں، کسی قدر غصہ سا آ رہا تھا۔ لیکن ہم سب نے اپنے جذبات کو اس وقت دبائے رکھا اور اگر باتیں کیں تو اِردگرد کے رنگ برنگے بڑے بڑے حسین گلِ داؤدی کے متعلق، جو جاڑوں کی معتدل دُھوپ اور گہرے سایوں میں بہار کے نقیب بنے ہمیں چاروں طرف سے گھیرے میں لیے تھے۔

اس دن ہم نے چائے جلدی جلدی پی۔ اب کل ملا کر وہاں پر کوئی پندرہ بیس آدمی جمع ہو گئے تھے۔ ان میں عبدالمجید سالک تھے اور چراغ حسرت، میاں بشیر احمد تھے، اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، فیروز دین منصور تھے اور رشید (جو پاکستان ریڈیو میں کام کرتے ہیں)۔ ان کے علاوہ چند اور نوجوان ادیب تھے جن کے نام اب مجھے یاد نہیں۔ چائے کے بعد یہ مجمع ایک حلقہ بنا کر کرسیوں پر بیٹھ گیا، اور شاید جلسے کی کارروائی شروع کرنے کی مشکل ذمہ داری مجھ غریب کے سر پڑی۔ میں نے لکنت آمیز لہجے میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق اس وقت تک جو کچھ ہوا تھا وہ بیان کیا۔ کچھ بین الاقوامی حالات، کچھ جدید یورپین ادب کے ترقی پسند رجحانات۔ لندن میں جب ہم تھے تو کیا سوچتے تھے۔ اس کے بعد پھر منشی پریم چند، جوش، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ کا اس تحریک سے موافقت کا اظہار، بنگال اور بمبئی میں ہماری کوششیں...... پھر میں نے مینی فیسٹو پڑھ کر سنایا (جسے اس مجمع میں شریک ہونے والے اکثر صاحبان پہلے ہی پڑھ چکے تھے)۔ اس کے فوراً بعد ہی اس مینی فیسٹو پر عام بحث شروع ہو گئی اور حاضرین نے مجھ سے بہت سے سوال کیے۔ اس مختصر سے پہلے اجتماع میں جو سوال اُٹھائے گئے تھے، بعد میں بالکل وہی سوال ترقی پسند تحریک میں بہت بڑی اہمیت اختیار کر گئے اور ان پر برسوں بحثیں ہوئیں اور آج بھی جاری ہیں۔

مثلاً ہمارے مینی فیسٹو میں یہ تھا کہ ترقی پسند ادیب کے لیے وطن کی آزادی کی حمایت کرنا ضروری ہے۔

سوال یہ تھا کہ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ادیب آزادی کی سیاسی تحریکوں میں حصہ لے؟ اور اگر وہ ایسا کرے تو پھر ایک سرکاری ملازم کے لیے اس تحریک میں حصہ لینا ناممکن ہو جائے گا۔ کیا

ایسا کر کے ہم اپنے دائرے کو محدود نہیں کر رہے ہیں اور حکومت سے خواہ مخواہ دشمنی نہیں مول لے رہے ہیں؟

ایک اور سوال تھا کہ قدیم کلاسیکی ادب کی طرف ہمارا کیا رویہ ہوگا؟ عاشقانہ یا غنائیہ شاعری کو ہم کس زُمرے میں رکھتے ہیں؟

رشید صاحب نے شاید یہ سوال اُٹھایا کہ غالب یا شیکسپیئر کیا ہیں؟ ترقی پسند انھیں کیا سمجھتے ہیں؟

میاں بشیر نے شاید پوچھا تھا کہ کیا ترقی پسند ادیب کے لیے کمیونسٹ یا سوشلسٹ ہونا ضروری ہے؟

کسی نے کہا کہ ہم کہتے ہیں کہ ہم جدید ادب میں عوام یا مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کرنے کو کہتے ہیں اور اس طرح ادب کے دامن کو وسیع کرنا چاہتے ہیں۔لیکن ہم جو زبان استعمال کرتے ہیں وہ عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔

مذہب کی طرف ہمارا کیا رویہ ہوگا؟ ہم نے اپنے مینی فیسٹو میں کہا ہے کہ ہم تو ہم پرستی کی مخالفت کریں گے اور عقلیت کی ترویج۔اس سے ہماری کیا مراد ہے؟

ان میں سے کئی سوالوں کا جواب قطعی طور پر دینا مشکل تھا۔میری جو کچھ سمجھ میں آیا میں نے کہا۔ باقی لوگوں نے بھی ان باتوں پر اظہار خیال کیا اور بہت سی باتیں صاف ہوئیں۔ ہمارا مقصد ہی یہ تھا کہ ہم وسیع لیکن واضح مقاصد کی بنیاد پر ملک کے تمام ادیبوں کو، جو اِن مقاصد سے متفق ہوں، ایک ایسی تنظیم میں جمع کریں جس میں پوری آزادی کے ساتھ یہ تمام سوال اُٹھائے جائیں۔ان پر بحث ہو اور اس کے جواب دیے جائیں۔اس وقت ہمارا پہلا فرض یہ تھا کہ ہم ان واضح مقاصد کو دریافت کر لیں جن کی بنیاد پر مختلف خیال وفکر کے ادیب ایک تنظیم میں متحد کیے جاسکتے تھے۔خوش قسمتی سے ہمارا اعلان نامہ بڑی حد تک ان مشترک مقاصد کا اظہار کرتا تھا، جن کی بنیاد پر اور بہت سی باتوں میں اختلاف رکھنے والے ادیب متحد ہو سکتے تھے۔ان باتوں پر بڑی دیر تک بحث رہی جس میں سب نے حصہ لیا۔

میرا خیال ہے کہ اس نقطۂ نظر سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔وہاں پر جتنے صاحبان موجود تھے، ان میں سے اکثر نے مینی فیسٹو سے اتفاق کا اظہار کیا اور اس پر دستخط بھی کیے۔

اب یہ تجویز پیش کی گئی کہ لاہور میں انجمن کی تشکیل کی جائے۔فیض نے تجویز کی کہ صوفی تبسم کواس وقت عارضی طور پر انجمن کا سکریٹری چُن لیا جائے۔ جب انجمن کے ممبر بن جائیں گے تو اس کے بعد باقاعدہ عہدہ داروں کا انتخاب ہوگا۔ یہ بات اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ صوفی صاحب نے پہلے انکار کیا لیکن بعد کو اصرار کرنے پر راضی ہو گئے۔اس چھوٹے سے جلسے کے ختم ہوتے ہوتے سورج ڈوب چکا تھا۔سردی یکبارگی بڑھ گئی۔لوگ جلدی جلدی رُخصت ہونے لگے۔

ہم خوش اور مطمئن تھے۔رشیدہ فیض کو چھیڑ رہی تھیں۔اب وہ حضرت بھی کسی قدر پگھلے اور بولنے چالنے پر رضامند سے معلوم ہورہے تھے۔لیکن ہم میں سے کسی کو بھی یہ وہم وگمان نہیں تھا کہ لاہور کی ادب پرورسرزمین پر یہ وہ پہلالغزیدہ قدم ہے، جو بعد میں اُردوادب کے کھلیان میں سنہرے خوشوں کا اتنا بڑاانبار لگادے گا۔چند سال کے اندر اندر یہیں سے کرشن چندر، فیض، بیدی، احمدندیم قاسمی، میرزاادیب، ظہیر کاشمیری، ساحر، فکر، عارف، رہبر، اشک، وغیرہ جیسے شاعروں اور ادیبوں نے ترقی پسند ادب کے علم کو اتنا اونچا کیا کہ اس کی درخشاں بلندیاں ہمارے وطن کے دوسرے حصے کے ادیبوں کے لیے قابل رشک بن گئیں۔

○○

تحریک کا فکری و تہذیبی پس منظر

ترقی پسند مصنّفین کی تنظیمی شکل وصورت اور کام کرنے کے طریقوں کے بارے میں ہمارے ذہنوں میں پہلے سے کوئی بنا بنایا خاکہ نہیں تھا۔ اس کے متعلق مختلف لوگ مختلف طریقوں سے سوچتے تھے۔

بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ جگہ جگہ پر انجمن کی شاخیں بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انجمن کا ایک کل ہند مرکز ہو، یا زیادہ سے زیادہ صوبائی مرکز ہوں، اور اَدیب اور مصنف اس کے براہ راست ممبر بنیں۔ ان لوگوں کے خیال میں انجمن کی طرف سے ہر جگہ پر جلسے کرنا یا کانفرنسیں منعقد کرنا غیر ضروری تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ کام سنجیدہ ادیبوں کے شایان شان نہیں۔ جلسوں اور کانفرنسوں میں انھیں سیاسی ہیجان اور پروپیگنڈہ بازی کی بو آتی تھی اور وہ انجمن کو اس سے بچانا چاہتے تھے۔ پیشہ ور ریا کار لیڈروں اور نعرہ باز سیاسی کارکنوں سے لوگ اس وقت بھی تنگ آ چکے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد (1919) سے لے کر اس وقت تک (1935) ہمارے ملک میں بڑی بڑی سیاسی آندھیاں آئی تھیں۔ نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریک، کانگریس کی دو سول نافرمانی کی تحریکیں، دہشت پسند نوجوانوں کی انقلابی تحریکیں، فرقہ پرست ہندوؤں اور مسلمانوں کی رجعتی زہرافشانیاں...... اور ان سب کا نتیجہ کیا نکلا تھا؟ عام لوگوں کی نظروں میں یہ سب ناکامیاں تھیں۔ اس لیے کہ انگریزی سامراج پہلے کی طرح پوری فرعونیت کے ساتھ ہمارے

سروں پر مسلط تھا۔ظلم، بھوک، اور جہالت کے سائے اب بھی ملک پر چھائے ہوئے تھے۔تقریر بازی کے لیےایک اور نیا پلیٹ فارم بنانا، کہیں ٹھوس کام سے بچنے کا ایک بہانا، اور ترقی پسند ادب کے نئے نام پر خودکوستی جذباتی تسکین دینے کا ایک اچھوتا طریقہ تو نہیں تھا؟ اگر ادیبوں کا خاص کام ادب کی تخلیق، پڑھنا اور لکھنا ہے تو پھر انھیں جلسوں اور کانفرنسوں پر اپنا وقت ضائع نہ کرنا چاہیے۔

شروع شروع میں منشی پریم چند کا یہی خیال تھا اور غالباً مولوی عبدالحق صاحب بھی یوں ہی سوچتے تھے۔لیکن حالات وواقعات نے ہمیں ان خیالات میں ترمیم کرنے پر مجبور کر دیا۔

1935-36 کے قریب کا زمانہ ہمارے ملک کے نوجوانوں، دانشوروں کے لیے بہت بڑی ذہنی چھان بین، کھوج، تبدیلیوں اور زندگی کی نئی راہیں دریافت کرنے کا زمانہ تھا۔

اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں ہمارے ملک میں دانشوروں میں دو قسم کے نظریے پھیلے ہوئے تھے۔ایک مذہبی اور تہذیبی احیائیت کے تصورات اور دوسرے مغربی، خاص طور پر انگریزی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے خیالات۔ مدارج اور لہجے کے فرق کے باوجود ہمارے ملک کے اکثر مصلحین اس خیال کی ترویج کرتے تھے کہ اگر ہم اپنے ماضی پر نظر ڈالیں تو اس میں ہمیں ایسی اقدار ملیں گی جنھیں صحیح طریقے سے سمجھ کر قبول کر کے اور ان کے مطابق عمل کر کے ہم اپنی موجودہ قومی، سماجی اور انفرادی گراوٹ کو ختم کر سکتے ہیں اور دنیا میں دوبارہ سر بلند ہو سکتے ہیں۔ان کے نزدیک ہمارے زوال اور مغربی سامراج کی کامیابی کا سبب یہ تھا کہ ہم نے، خاص طور پر ہمارے آخری دور کے حکمران بادشاہوں اور اُمرا نے، قدیم اقدار کو بالکل بھلا دیا تھا۔ وہ عیش پرستی، آرام طلبی، اور خود غرضی کا شکار ہو گئے تھے، اور یہ وبائیں عام ہو گئیں تھیں۔ خدا ترسی، سادگی، انصاف، سچائی، اخوت اور مساوات کی اقدار کو...... جو ہمارے بزرگوں کی عظمت کا بنیادی سبب تھیں، دوبارہ زندہ کرنے اور پھیلانے کا طریقہ کیا تھا؟ اس سوال کا جواب دو طریقوں سے دیا جاتا تھا...... اصلاح اور تعلیم۔یعنی اول تو ہم اپنے مذہبی عقائد اور سماجی رسوم میں ایسی اصلاح کریں جو مغرب کے جدید خیالات کی روشنی میں دقیانوسی اور بعید از عقل معلوم نہ ہوں۔ ہمارے مصلحین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ''اصل'' اور ''حقیقی'' مذہب وہ نہیں ہے، جو عام لوگوں میں رائج ہے بلکہ کچھ اور ہے۔ جاگیری عہد کی زیادہ پیچیدہ اور مادی اعتبار سے

زیادہ بھری زندگی کے مقابلے میں انھوں نے قبائلی یا ان چھوٹے چھوٹے شہروں کی زندگی کا نقشہ پیش کیا جن میں تجارت، گلہ بانی، دستکاری اور چھوٹی زمینداریوں کی مادی اعتبار سے قلانچ، لیکن زیادہ مساوی زندگی کا رواج تھا۔ مسلمانوں میں اسلامی تاریخ کے پہلے تیس چالیس سال کا زمانہ اور ہندوؤں میں آریہ قبائل کے ویدوں کا دَور عہدِ زریں کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔

اگر ایک طرف اپنے عقائد اور اپنے ماضی کی تاریخ کو اس نئے طریقے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جاتی تھی تو دوسری طرف اس بات پر بھی زور دیا جاتا تھا کہ ہم انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں جدید تعلیم حاصل کریں۔ مذہبی احیا پر زور دینے والے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ گزرتے تھے کہ مغربی قوموں کی ترقی کا سبب یہ ہے کہ ''ان میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو مسلمانوں میں ہونی چاہئیں۔ اسی لیے وہ سربلند ہیں اور مسلمانوں میں وہ خصلتیں آ گئی ہیں جو دراصل کافروں کی ہیں۔'' (جمال الدین افغانی)۔ سرسید احمد خاں نے اگرچہ یہ الفاظ استعمال نہیں کیے، لیکن ان کی ساری تحریک کا منشا بالکل یہی ہے۔ ہندستان کے ہر ایک حصے میں اُنیسویں صدی کا آخر اور بیسویں صدی کا شروع کم و بیش اسی نوع کی اصلاحی، احیائی اور تعلیمی تحریکوں کا زمانہ تھا۔

شمالی ہندستان میں ہندوؤں میں آریہ سماج اور برہمو سماج کی تحریکیں، مسلمانوں میں علی گڑھ کی تحریک، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن حمایت اسلام (پنجاب)، اور ان سے منسلک اُردو اور ہندی کی تحریکیں۔ (انجمن ترقی اُردو، ناگری پرچارنی سبھا) ان ہی رجحانات کی ترجمانی کرتی تھیں۔

جدید اُردو اور ہندی نثر اور نظم ان ہی اصلاحی، احیائی اور تعلیمی تحریکوں سے متاثر تھی اور ان ہی کی پیداوار تھی۔ حالی کا مسدس، سرسید احمد خاں اور ان کے ساتھیوں کے تہذیب الاخلاق کے مضامین، نذیر احمد کے اور رتن ناتھ سرشار کے ناول، آزاد کی ''نیچرل شاعری'' اُردو میں، اور میتھلی شرن گپت کی ''بھارت بھارتی'' اور ہریش چندر بھارتیندو کے ڈرامے اور مضامین ہندی میں ایک ہی قسم کی ذہنیت کا نتیجہ ہیں۔ ان میں اس بات کی تلقین کی جاتی ہے کہ قدیم اور گمشدہ عہد زریں کو کسی نہ کسی طرح دوبارہ زندہ کرنا ضروری ہے۔ لیکن جب عملی طور سے اس پُرانی دنیا کو موجودہ زمانے میں دوبارہ تعمیر کرنے کا سوال پیدا ہوتا تھا تو اس کے لیے جدید انگریزی وضع کے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم اور انگریز حکمرانوں کی ''خوبیوں'' کو حاصل کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے

مصلحین کو ان باتوں میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا تھا۔ اکبر الہ آبادی انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کی سطحیت، چھچھورے پن اور ان کے جدید خیالات کا مذاق اُڑاتے تھے۔ وہ اس بات کا رونا روتے تھے کہ نوجوان مذہبی عقائد اور رسوم کو چھوڑتے جاتے ہیں اور انگریزوں کی احمقانہ نقالی کرتے ہیں۔ وہ سرسید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کو نقصان دہ سمجھتے تھے۔ لیکن انھوں نے خود اپنے اکلوتے بیٹے عشرت حسین کو تعلیم کے لیے انگلستان بھیجنے سے درگزر نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ قصر دریا میں تختہ بند ہونے سے ''تر دامنی'' لازمی ہے۔

ہوتی ہے تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو
قومِ انگلش سے ملو، سیکھو وہی وضع و تراش

اس نظم کو اس شعر پر ختم کیا ہے......

درمیان قصر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکُن ہشیار باش

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک میں سماجی اصلاح (سوشل ریفارم) کے علاوہ سیاسی اصلاح کا مطالبہ بھی واضح طور سے درمیانی طبقے کے دماغوں میں پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ نیز بنگال اور مہاراشٹر میں ہندو نوجوانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ بیرونی حکمرانوں کے خلاف دہشت انگیزی کے حربے استعمال کرنے لگے تھے۔ لیکن اعتدال پسند اور انتہا پسند دونوں نظریوں میں ان ہی دو تخیّلوں کا میل تھا جو اس کے پہلے کی تحریکوں کی نمایاں خصوصیت تھی۔ یعنی ایک طرف احیا پرستی تو دوسری طرف مغربی جمہوری تخئیل۔ بنگال اور مہاراشٹر کے ہندو نوجوانوں کے ذہنی سرغنہ آر بندو گھوش اور بال گنگادھر تلک تھے جو ہندو مذہبی خیالات کی بنا پر لوگوں میں قومی آزادی کے جذبے کو بیدار کرتے تھے۔ اُدھر مسلمانوں میں شبلی، مولانا ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں وغیرہ اسلامی تخیلات کی بنا پر مسلمانوں کو محض تعلیمی اور سماجی اصلاح کی منزل سے آگے بڑھا کر وطنی آزادی کی سامراج دشمن جدوجہد کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن آزادی کے نصب العین کو متعین کرنے کا جب سوال آتا تھا تو اصلاح پسند اور انتہا پسند گروہوں کے ذہنوں میں برطانوی پارلیمنٹری طرزِ حکومت اور مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت کا خاکہ سامنے آجاتا تھا۔

یہ تہذیبی اور سیاسی نظریے دنیا، اور خاص طور پر ایشیا کے ملکوں میں مغربی سامراجی ملکوں کے سیاسی غلبے اور معاشی استحصال اور اس سے پیدا ہونے والے حالات کا نتیجہ تھے۔ ان نظریوں اور خیالات کی مختلف شکل وصورت کا تعین ہر ملک یا گروہ کی تاریخی روایات نے کیا۔ جب تک ہمارے یہاں جاگیری نظام، بادشاہتیں، نوابیاں بلا شرکتِ غیر قائم تھیں، اور مغربی تاجروں نے ہماری سیاست اور معیشت کو اندر سے کھوکھلا کرنا شروع نہیں کیا تھا، جب تک انگریزی سامراج کے غلبے سے ملک کی معیشت اور معاشرت میں بنیادی تبدیلیاں نہیں ہوئی تھیں، جب تک ملک میں نئے انگریزی تعلیم یافتہ گروہ، روشن خیال زمیندار، مغربی ملکوں کے ساتھ تجارت کرنے والے دیسی تاجر اور دیسی سرمایہ دار طبقوں کا وجود نہیں ہوا تھا اور نوابوں، راجاؤں وغیرہ کے جاگیری طبقے کو فرنگی سامراجیوں کے ہاتھوں شکست نہیں ہوئی تھی، اس وقت تک کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی اور کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ مطلق العنانی یا بادشاہت کوئی بُری چیز ہے یا اس کے علاوہ بھی کوئی سیاسی یا معاشی نظام ممکن ہے۔ ان مادی تبدیلیوں کے بعد ہی درمیانہ طبقہ کے دانشوروں کی خلافتِ راشدہ یا ویدوں کے عہد میں جمہوریت کا جوہر دکھائی دینے لگا تھا۔ یکا یک ان پر یہ انکشاف ہوا کہ مطلق العنانی بُری چیز ہے اور ہماری صدیوں سال کی بادشاہتوں کی تاریخ دین اور دھرم کے سچے راستے سے ایک افسوسناک کجروی کی داستان ہے۔

خیالات، نظریے اور عقیدے انسانوں کے دماغ میں نہ خودرو ہوتے ہیں اور نہ آسمانوں سے نازل ہوتے ہیں۔ مادی حالات زندگی یعنی وہ وسیلے اور طریقے، وہ آلات اور ذرائع پیداوار اور رسل و رسائل، جنھیں استعمال کر کے انسانوں کے گروہ اپنے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے وسائل حاصل کرتے ہیں، انسانی معاشرے کی شکل وصورت متعین کرتے ہیں۔ انسانی معاشرہ یا سماج کیا ہے؟ مختلف طبقے اور ان کے باہمی رشتے۔ لیکن یہ طبقے اور رشتے خود مادی حالات زندگی سے پیدا ہوتے اور مٹتے، بنتے، بگڑتے اور بدلتے رہتے ہیں۔ خیالات، نظریے، فلسفیانہ تصورات وعقائد، انسان کے ذہن میں اس کے مادی حالات زندگی اور اس کی بنیاد پر پیدا ہونے والے اجتماعی رشتوں اور مختلف قسم کے (سیاسی، مذہبی، تہذیبی وغیرہ) اجتماعی سماجی عمل اور ان سے پیدا ہونے والی زندگی کے عکس ہیں۔ ان خیالات اور نظریوں سے مدد لے کر انسان پھر اپنی معاشرت کو سمجھتے ہیں، اس کا علم حاصل کرتے ہیں، اسے استوار کرتے ہیں، اسے حسین یا قابل برداشت

بناتے ہیں، یا اس کا جواز پیش کرتے ہیں۔ جیسی کسی معاشرے یا سماج کی شکل ہوگی ویسے ہی اس کے خیالات، نظریے اور عقائد ہوں گے۔ جیسا رہن سہن ہوگا، ویسی ہی سوچ ہوگی۔ قدیم قبائلی گروہوں کے عقائد اور غلامی کے دور کے نظریے جاگیری دور کے نظریے، جدید سرمایہ دارانہ تصورات اور اشتراکی نظام کے تصورات، مختلف مادی حالاتِ زندگی، مختلف معاشروں کے تصورات ہونے کی وجہ سے مختلف ہیں۔ لیکن جب سماج میں تبدیلی آتی ہے یعنی نئے وسائل اور آلات پیداوار اور ذرائع رسل و رسائل کی دریافت اور استعمال کی وجہ سے پیداواری طریقے بدلتے ہیں تو پھر نئے آلات، ذرائع ورسائل کے ساتھ ساتھ نئے طبقے وجود میں آتے ہیں۔ نئے آلات و وسائلِ پیداوار اور انھیں استعمال کرنے والے انسانوں کا تخلیقی ہنر دونوں مل کر سماج کی پیداواری قوتیں ہوتے ہیں۔

ان نئی پیداواری قوتوں کی مطابقت سے سماجی رشتوں یا سماج کی شکل میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ لیکن پیداواری قوتوں کے مطابق سماجی رشتوں کے قائم ہونے کا عمل یعنی نئے معاشرے یا سماج کی تشکیل نہیں ہوتی۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ سماج میں نئے پیداواری ذرائع اور طریقے رائج ہو جانے کے بعد بھی پُرانے سماجی رشتے (جو پُرانے پیداواری طریقوں کے مطابق تھے) اور ان کے تصورات کافی دیر تک برقرار رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں سماج میں بحرانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ نئی پیداواری قوتیں متقاضی ہوتی ہیں کہ ان کی پوری ترقی اور نشونما کے لیے ایسے نئے سماجی رشتے قائم ہوں، جو اُن کے مطابق ہوں جن رشتوں کی مدد سے ان نئی قوتوں کو بڑھنے کا پورا موقع ملے۔ ایسی صورت میں پُرانے سماج کے رشتوں سے، جو دراصل اپنی طبیعی یا مفید زندگی کے دن پورے کر چکے ہیں، ان قوتوں کا تصادم ہوتا ہے، جن کو پُرانے سماج کے اندر ہی اندر نئے پیداواری ذرائع اور وسائل کے استعمال نے جنم دیا ہے۔ یہ تصادم صرف معاشی اور سیاسی میدان میں ہی نہیں ہوتا بلکہ خیالات، فلسفوں اور عقائد کی دنیا میں بھی ہوتا ہے۔

بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مختلف خیالات اور نظریے انسان کے شعور میں اسی اختلاف اور تصادم کا اظہار کرتے ہیں۔ پُرانے سماج کے تصورات اور عقائد ان طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو ان پُرانے سماجی رشتوں کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، جن کے قائم رہنے سے نئی مادی قوتوں کی ترقی رکتی ہے۔ اس لیے ایسے خیالات وہ ہیں جو سماج کی اس نئی تشکیل کا اظہار کرتے ہیں جن

کی نئی پیداواری قوتیں متقاضی ہیں یعنی جو معاشرتی تشکیل انسانوں کو زیادہ سے زیادہ ممکن ترقی کا موقع دے۔

تاریخی عمل کو اس طرح دیکھنے اور سمجھنے سے بعض نہایت اہم نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ انسانی معاشرہ کی شکل وصورت اور ہیئت میں تبدیلی کا بنیادی سبب آلات اور اوزارِ پیداوار (جن میں ذرائع رسل و رسائل و آمد و رفت بھی شامل ہیں) میں تبدیلی ہے اور انسانوں نے قدیم اشتراکی، غلامی، جاگیرداری، سرمایہ داری، اور جدید اشتراکی سماج، ان تبدیلیوں کی وجہ سے اور ان کے مطابق قائم کیا ہے، تو پھر یہ صاف ظاہر ہے کہ سماج میں تبدیلی کی اہم ترین قوت، وہ محنت کش انسان ہیں جن کے پیداواری تجربے اور ہنر اور نئے اور تبدیل شدہ آلات کو استعمال کرنے کی صلاحیت سے یہ تبدیلیاں عمل میں آئیں اور انسانوں کا بتدریج پستی سے بلندی کی طرف ارتقا ہوا۔ اس لیے تاریخی ارتقا فی الحقیقت، فوجی پیشواؤں، سرداروں، بادشاہوں، بڑے آدمیوں، مافوق الفطرت رہبروں کے کارناموں کی سرگزشت نہیں بلکہ محنت کش انسانوں کے اس اجتماعی عمل کی سرگزشت ہے جو وہ سماج کے لیے مادی اقدار پیدا کرنے کے سلسلہ میں کرتے ہیں۔ انسانوں کا یہی اجتماعی عمل، ہنر، فن اور تجربہ، انسانی دماغ اور ذہن میں سماج کی مادی زندگی اور اس سے پیدا ہونے والے سماجی رشتوں کے تجربوں اور عمل کا عکس اور نتیجہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مادی پیداواری عمل اور اس کا تجربہ انسان کے علم کی بنیاد ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ صرف پیداواری عمل کے ذریعے سے ہی انسانوں کو ہر قسم کا علم ہوتا ہے، ان کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پیداواری اجتماعی عمل کی بنیاد پر جو معاشرہ قائم ہوتا ہے اور اس طرح انسانوں کے جو مختلف طبقے وجود میں آتے ہیں اور ان میں جو باہمی رشتے اور تعلقات ہوتے ہیں (یعنی جو مختلف اقسام کے اجتماعی عمل اور تعلقات اس مادی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں) ان تمام سے اجتماعی طور پر پھر انسان کے شعور اور علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ اجتماعی اور سماجی عمل انسانوں کی سیاست، ان کی طبقاتی جدوجہد، ان کے فنون لطیفہ اور سائنس یعنی کلچر کے مختلف مظاہر کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس قسم کے سماجی عمل اور تعلقات کی بنیاد گو مادی ہے، لیکن خود مادی نہیں کہے جاسکتے۔ اس طرح انسانی علم اور شعور اس تمام مادی اور غیر مادی اجتماعی عمل اور تجربے سے پیدا ہوتا ہے۔ نئے خیالات اور تصورات کے وجود میں آنے کا سبب یہ ہے کہ

سماج کے مادی حالات اوران سے پیدا ہونے والے رشتوں، تقاضوں اورتصادموں یعنی ارتقا کے تقاضوں کوان کی ضرورت ہوتی ہے۔لیکن ان مادی خیالات سے پیدا ہونے کے بعد خیال، تصور، نظریہ، خود ایک بڑی قوت بن جاتا ہے۔ ترقی پسند نظریے انسانوں کے دماغوں میں جاگزیں ہوکرانھیں متحرک کرتے ہیں، منظّم کرتے ہیں، آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ نظریہ جوکہ ایک خاص زمانے اورجگہ میں انسانی سماج کے ممکن ارتقا کا قریب قریب پوری طرح اظہارکرے۔یعنی جس کی بنیاد زندگی کے نئے مادی حالات سے پیدا ہونے والے ارتقائی تقاضوں کے شعور پر ہو، زیادہ سے زیادہ ترقی پسندی یا انقلابی کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ انسان کے شعوراورعلم میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوا ہے۔فطرت یا سماج کا علم ابتدائی، نامکمل، یک طرفہ اور بہت سطحوں سے گزرکر زیادہ اونچی اور زیادہ مکمل سطح پر پہنچا ہے۔ معاملوں کومختلف سمت سے دیکھ کر زیادہ اچھی طرح سمجھنے کی صلاحیت ہم میں رفتہ رفتہ پیدا ہوئی ہے۔ جب پیداواری طریقے اور وسائل محدوداور چھوٹے پیمانے پر تھے، تب انسانوں کی سماجی زندگی اوران کا علم بھی محدود تھا۔ مزید برآں استحصال کرنے والے برسراقتدار طبقے اوران کے خوشہ چیں ہمیشہ اپنے طبقاتی مقاصد کی خاطر فطرت اور سماج دونوں کے علم کو (جس قدر کہ وہ حاصل ہوا تھا یا ہوسکتا تھا) توڑتے مروڑتے اورمسخ کرتے رہتے تھے۔طبقاتی سماج میں خیالات اورنظریوں کوان کی طبقاتی نوعیت سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہرشخص کی زندگی اس کے طبقاتی مقام سے متعین ہوتی ہےاوراس کے خیالات پرعام طور سے اپنے طبقے کی چھاپ ہوتی ہے۔

ہمیں اپنے ملک ہندستان میں بھی نئے خیالات، نئے تہذیبی اورادبی رجحانات کے مآخذ ان تاریخی تبدیلیوں میں ڈھونڈنے چاہئیں، جواُنیسویں صدی میں ہماری معاشرت میں ہوئے۔ انگریزوں کے معاشی اورسیاسی غلبے کی وجہ سے ہندستانی سماج کی اس معیشت کا تار و پود بکھر گیا جس پر ہماری تہذیب کی بنیاد تھی۔ جاگیرداری، خودکفیل دیہاتوں اور دستکاری کی صنعتوں کی ساکن معیشت کی جگہ نوآبادیاتی یا سامراجی محکومیت کی معیشت نے لے لی۔اس کے معنی یہ ہیں کہ اوّل تو ہمارا ملک برطانیہ کی جدید بڑی مشینوں کے بنے ہوئے صنعتی مال کی منڈی بن گیا۔ دوسرے، ہماری دستکاری کی صنعت انگریزی مشینی صنعت کے بنے ہوئے سستے مال کے مقابلے کی تاب نہ لاکر بالکل تباہ ہوگئی یا زوال پذیر ہوگئی۔ تیسرے، ہماری زرعی پیداوار کی قیمت گرگئی اور

ہم برطانیہ کے کارخانوں کے لیے سستے داموں اپنی خام پیداوار بیچنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ جدید عالمی سرمایہ داری کی منڈی بن جانے کی وجہ سے ہماری خام پیداوار (روئی، پٹسن، چائے، کھال وغیرہ) کے دام بھی عالمی سرمایہ داری منڈی میں مقرر ہونے لگے۔ چوتھے، ہمارے ملک کی مالیات (فائنانس، بینکی سرمایہ وغیرہ) پر برطانوی فائنانس (مالیاتی) سرمایہ پوری طرح سے حاوی ہو گیا۔ پانچویں، ہمارے ملک میں برطانوی سرمایہ داروں نے جدید مشینی صنعتوں کا آغاز کیا۔ لیکن یہ جدید صنعتیں اس طرح اور اس پیمانے پر قائم نہیں ہوئیں جیسا کہ آزاد سرمایہ دار ملکوں میں (مثلاً برطانیہ، فرانس، جرمنی یا امریکہ) میں ہوا بلکہ مخصوص محکومانہ (نوآبادیاتی) معیشت کے طریقے پر ہوئیں۔ مثلاً سب سے پہلے ہمارے ملک میں انگریزی سرمایہ دار کمپنیوں نے ریلیں بنائیں، جن سے بے حساب، غیر معمولی نفع اندوزی کے علاوہ بیرونی مال کو دُور دُور کی منڈیوں تک پہنچانا اور بیچنا، اور ہمارا کچا مال اُٹھانا اور ملک کو محکوم رکھنے کے لیے تیز فوجی نقل و حرکت مقصود تھا۔ اس طرح انگریزی سرمایہ داروں نے جوٹ پٹسن اور روئی کی ملیں قائم کیں، ان کا مقصد ہمارے مزدوروں کو کم از کم اجرت دے کر غیر معمولی نفع کمانا تھا جو خود ان کے ملک میں ممکن نہ تھا۔ بنیادی بڑی صنعتیں (مشین سازی، کیمیائی، لوہے، فولاد اور انجینئر نگ کی صنعتیں) قائم نہیں کی گئیں یا بہت کم اور زیادہ تر سامراج کی جنگی ضرورتوں کے ماتحت قائم کی گئیں۔ فی الجملہ صنعتی ترقی روکی گئی اور ملک کو صنعتی اعتبار سے برطانیہ کا دست نگر رکھا گیا۔

دستکاری کی صنعت کی تباہی (جس میں کپڑے کی صنعت سب سے بڑی تھی)، زراعت کی عام تباہی، جدید مشینی صنعت کی کمی اور اس کے علاوہ ملک کی عام مالی لوٹ کی وجہ سے (ٹیکسوں کی زیادتی، بیرونی سرمایہ دار کمپنیوں اور تجارتی اداروں کی غیر معمولی نفع اندوزی) سامراج کے بین الاقوامی فوجی اخراجات کے بار وغیرہ سے ہمارے ملک میں عام مفلوک الحالی اور مفلسی پھیلی۔ جس کا اثر دیہات کے کسانوں، دستکاروں، شہر کے محنت کشوں، درمیانہ اور نچلے درمیانہ طبقوں، پڑھے لکھے ملازم پیشہ لوگوں، چھوٹے اور درمیانہ زمینداروں، تاجروں، سب کے اوپر بُرا پڑا۔

صرف دو طبقے تھے جن کی حالت سامراجی عہد میں نسبتاً اچھی رہی۔ ایک تو وہ نواب، جاگیردار اور راجہ تھے جن کو یا تو انگریزوں نے خود دیہات کی آبادی پر مسلط کیا تھا، یا وہ شکست خوردہ مہاراجے، نواب اور ریاستی فرماں روا جن کے ہاتھ سے سیاسی اور انتظامی طاقت تو چھین لی گئی تھی،

لیکن جو انگریزی سرکار کے وفادار ہونے کی بنا پر سرکاری پشت پناہی کے لیے باقی رکھے گئے تھے اور جن کا کام اب محض دیہات کی محنت کش آبادی کو لوٹ کر مفت خوری کی زندگی بسر کرنا تھا۔

دوسرے نئے تاجروں کا وہ طبقہ تھا جو ایک طرح سے برطانوی سرمایہ داروں کے کمیشن ایجنٹ تھے۔ یعنی جو انگریز سرمایہ داری کی درآمد اور برآمد کی تجارت میں ان کے چھوٹے حصے دار تھے، جس کے وجود کا انحصار بیرونی سامراج کے استحصال پر تھا اور جو اس کے لیے آلہ کار بن کر خود بھی سرمایہ دار بن رہے تھے۔ اسی گروہ میں رفتہ رفتہ ہندستانی صنعتی سرمایہ داروں کا طبقہ بھی پیدا ہوا، جنھوں نے سوت اور جوٹ ملیں وغیرہ قائم کیں اور اس طرح ایک حد تک برطانوی سرمایہ داروں کے مدمقابل بننے لگے۔

ان طبقوں کے علاوہ ایک بالکل نیا طبقہ ہمارے ملک میں پیدا ہوا۔ یہ صنعتی مزدوروں کا طبقہ تھا جو کہ ان جدید مشینی صنعتوں میں کام کرتے تھے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ریلوے اور ان کی ورکشاپوں کے مزدور، سوت اور جوٹ ملوں کے مزدور، ان کے علاوہ لوہے، فولاد کے کارخانوں، کوئلے کی کانوں، چائے کے باغات، اور دوسرے مختلف کارخانوں کے مزدور۔ ریلوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے یہ محنت کش برباد شدہ، دستکاروں، دیہاتی مزدوروں، بے زمین کسانوں اور شہر کے ان غریب گروہوں سے تعلق رکھتے تھے جو سامراجی عہد میں بیکار اور پہلے سے بھی زیادہ مفلوک الحال ہو گئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے پاس اب اپنی محنت کی طاقت کے علاوہ اور کوئی دوسری مِلک نہیں تھی اور جسے سرمایہ داروں کے ہاتھ بیچ کر ہی وہ اور ان کے بال بچے زندہ رہ سکتے تھے۔ اسی طبقے کو جدید اصطلاح میں پرولتاری کہتے ہیں۔

اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں جب کہ ہمارے ملک کا معاشی نقشہ کچھ اسی طرح کا تھا، اگر ہم اپنے یہاں کے مختلف تہذیبی رجحانات پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ ایک طرف تو وہ نظریے تھے جنھیں انگریزی سامراج براہ راست یہاں پر پھیلا رہا تھا یا جن کی وہ سرپرستی کرتا تھا۔ دوسری طرف وہ نظریے تھے جو یا تو واضح طور پر سامراج دشمن تھے یا ایسے نظریے تھے جو سامراج کے واضح طور پر مخالف نہ ہونے کے باوجود اور سماجی نظام کی حدوں کے اندر رہتے ہوئے ہندستانی سماج کو اس کی پستی سے نکالنے کے دعوے دار تھے۔ ان کو ہم اصلاحی (ریفارمسٹ) نظریے کہہ سکتے ہیں۔

برطانوی سامراجی نظریوں کی خصوصیت کیا تھی؟ اوّل تو تمام ہندستانیوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیوست کرنا کہ انگریزی قوم ان سے ہر لحاظ سے بہتر ہے اور ہندستان پر اس کی حکومت جائز اور مناسب ہے، بلکہ خدا کی طرف سے نازل کی ہوئی ایک نعمت ہے۔ انگریزوں اور ان کی حکومت کا وفادار رہنا ہر ہندستانی کا سیاسی اور مذہبی فریضہ قرار دیا گیا۔ یہ نظریہ تمام سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں اور کالجوں، درسی کتابوں، نیم سرکاری اخباروں، عیسائی مشنریوں، زرخرید ملاؤں اور پنڈتوں، سرکاری عہدے داروں، راجاؤں، نوابوں، بڑے زمینداروں اور دیگر تمام ایسے لوگوں کے ذریعہ پھیلایا جاتا تھا جن کی روزی روٹی انگریزی سرمایہ داروں یا ان کے حکومتی اداروں سے وابستہ تھی۔ اپنے وطن کی عظیم تہذیب وتمدن کو گھٹیا خیال کرنا اور اس کی طرف بے توجہی برتنا، مغرب کی ہر ایک چیز کو اس سے بہتر سمجھنا اور انگریزی فیشن اور آداب کی احمقانہ نقالی کرنا اس نظریے سے پیدا ہونے والی ''تہذیب'' کا ایک لازمی جزو تھا۔ اس نظریے کی ترویج کا مقصد ظاہر ہے، ہم میں احساس پستی پیدا کر کے ہم کو ذہنی طور پر انگریزی استعمار کا آلہ کار اور مطیع بنانا، انگریز مورخین نے انیسویں یا بیسویں صدی میں ہمارے ملک کی جو تاریخیں لکھیں ان میں یہی نظریہ پیش کیا گیا تھا۔

انگریزوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ جس طرح انگریز سامراجیوں نے ہمارے ملک میں نوجوانوں، ریاستوں، جاگیرداروں کو ان کی سیاسی قوت سلب کر کے اپنے مقاصد کے لیے برقرار رکھا اور بڑے پیمانے پر ان جگہوں پر بھی زمینداریاں قائم کیں جہاں پہلے سے وہ موجود نہ تھیں۔ اسی طرح اور اس کے ساتھ ساتھ سامراجیوں نے تمام ان اداروں، روایات اور تصورات کو بھی اُبھارنے اور برقرار رکھنے کی کوشش کی اور ان کی سرپرستی کی، جن سے ملک کے مختلف مذہبی یا قومی گروہوں، ذاتوں اور فرقوں میں نااِتفاقی اور دوری بڑھتی تھی یا جن کی مدد سے توہم پرستی، تقدیر پرستی، یاس اور لاچاری کے جذبات ابھرتے تھے، جو عقل اور نئی روشنی کے خلاف تھے اور جو جاگیری دور کے زوال کی خصوصیت تھے۔ جس طرح سامراجی معاشی نظام کی ایک نمایاں خصوصیت جاگیرداری اور بڑی زمینداریاں برقرار رکھنا تھا، اسی طرح جاگیری عہد کے زوال پذیر تصورات کو بھی سہارا دینا اس کی خصوصیت تھی۔

انگریزی اقتدار سے قبل صدیوں سے ہمارا ملک فی الجملہ ایک خوشحال، ترقی یافتہ، زراعتی ملک تھا۔ اس میں راجاؤں اور فوجی اُمرا کی مطلق العنانی اور جاگیرداری درجہ بدرجہ قائم تھی۔ محنت

کش طبقے، کسان، مزدور اور دستکار تمام سیاسی طاقت سے محروم تھے اور حکمراں گروہ ان کا شدید استحصال کرتے تھے۔ ہندو سماج میں ذات پات کے نظام نے محنت کشوں کو سماجی اور مذہبی اعتبار سے مستقل طور سے ایک پست درجہ دے دیا تھا۔

اسی معاشی بنیاد پر جو مذہبی عقائد پیدا ہوئے تھے اور جو کہ اس مادی زندگی کا عکس تھے، ان کی خصوصیت یہ تھی کہ ایک بڑے خدا یا پرم آتما کے نیچے اور ماتحت بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا اور دیوتا تھے۔ بڑا خدا مطلق العنان تھا (شہنشاہ یا مہاراج ادھیراج کا عکس) اور اس کے نیچے دوسرے خدا تھے۔ ان اُمرا یا راجاؤں کا عکس جو مغلوب کیے جا چکے تھے اور شہنشاہ کے باج گذار تھے، یہ خدا جن میں فطرت کی تمام قوتیں اور مظاہرے مدغم تھے، انسانوں کی زندگی کے مالک تھے۔ ان کو خوش رکھنے کے معنی نجات یا ثواب اور ان کو ناراض کرنے کے معنی گناہ اور دائمی عذاب کے تھے۔ قسمت یا کرم کے چکر سے نکلنا معمولی آدمی کے لیے ناممکن تھا۔ معمولی آدمیوں کے لیے نجات صرف اپنی ذات اور اس کی خواہشات کو فنا کر کے ہی حاصل ہو سکتی تھی۔

افغان، مغل اور ترک مسلمانوں نے جب اس ملک پر حملے کر کے اسے مغلوب کیا تو یہاں کی معیشت میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اوپر کے استحصال کرنے والے باج خور طبقوں میں ایک اور نئے گروہ کا اضافہ ہو گیا۔ اسلام کا وحدانی اور انسانی مساوات کا نظریہ جو ایران اور وسطی ایشیا میں پہنچ کر اس وقت تک کافی بدل چکا تھا اور جس میں اگر ایک طرف بادشاہت اور امارت تو دوسری طرف تصوف نے جگہ لے لی تھی، ہندستان پہنچنے پر یہاں کے حالات سے متاثر ہوا اور اس میں اور ہندی عقائد میں بہت گہری مشابہت پیدا ہو گئی۔ پیروں اور مشائخ نے اللہ کے دربار میں وہی درجہ اختیار کر لیا جو سلطنت کے اُمرا کا سلطان کے دربار میں تھا۔ اللہ اور سلطان کی مطلق العنانی کو تسلیم کرنا سب کے لیے ضروری تھا۔ لیکن بادشاہ تک رسائی اگر وزیروں اور اُمرا کے توسل سے ہی ممکن تھی تو اللہ تک رسائی پیروں اور مشائخ کے توسل سے۔ معمولی انسانوں کا فرض بندگی اور اپنی جان و مال ان کے حضور میں پیش کر دینا تھا۔ ہندستان آنے والے مسلمانوں کے یہ عقائد ایک زراعتی اور کافی پیچیدہ معاشرت کا عکس تھے جس میں طبقہ واری تفریق زیادہ بڑھ چکی تھی۔ وہ اس قدیم عربی قبائلی تصور سے کافی مختلف تھے جس میں اللہ کی مطلق العنانی تو تھی لیکن اس تک پہنچنے کے

لیے جاگیری سماج کے اُمرا کی طرح درجہ بدرجہ قطب، ولی، اوتار، شیخ اور پیر کے وسیلے کی ضرورت نہ تھی اور جہاں اگر بندے کو اللہ کی عبدیت لازمی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کے مابین مساوات کا تصور بھی تھا۔ مسلمان حملہ آوروں اور حکمرانوں کو یہاں کے لوگوں کو اپنا ہم مذہب بنانے کا کوئی خاص جوش نہیں تھا۔ اگر کبھی انھوں نے ہندوؤں کے معبدوں کو منہدم بھی کیا تو اس کا مقصد مذہبی کم اور مالی یا سیاسی زیادہ تھا۔ البتہ ہندو محنت کشوں کے بعض طبقوں میں غالباً ان مقامات پر، جہاں حکمراں اونچی ذاتوں کا ظلم ان پر زیادہ تھا (مثلاً مشرقی بنگال)، بڑے پیمانے پر تبدیلیٔ مذہب ہوا۔ اسلام کا وحدت اور مساوات کا نظریہ جو کہ صوفی، مشائخ اور واعظین کے توسل سے ان تک پہنچا، ان کے لیے غالباً زیادہ مساوی اور منصفانہ زندگی کا پیامبر تھا اور مسلمان امیروں کی سیاسی حکمرانی غالباً ان کے لیے سماج میں کسی قدر بہتر حالت کی ترغیب کرتی تھی۔ لیکن ظاہر ہے اس تبدیلیٔ مذہب نے ان کے معاشی استحصال کو ختم نہیں کیا۔ اس لیے دوسرے غیر مسلم، مظلوم محنت کش عوام کی طرح تقدیر کے آگے سر جھکانا، اس زندگی کے مصائب کی کلفت کو کم کرنے کے لیے ایک اگلی خوش آئند زندگی کے خواب دیکھنا اور سماجی نظام کی اونچ نیچ کو الوہی درجہ دے کر اس کا مطیع رہنا ان کے عقائد میں داخل رہا۔ قسمت اور کرم ایک معنی میں استعمال ہونے لگے۔

یہ مذہبی عقائد اور توہمات ہمارے زراعتی مطلق العنان ایشیائی نظام معیشت کے لوازمات تھے۔ ان عقائد سے استحصال کرنے والے اُمرا کو یہ فائدہ پہنچا کہ ان کی سماجی پوزیشن کو مذہبی اور الوہی جواز حاصل ہو جاتا تھا۔ ان سے بغاوت کے معنی خدا سے، دین سے اور دھرم سے بغاوت کے تھے۔ ان عقائد کے ذریعہ اُمرا خود اپنے استحصال پر اخلاق کا پردہ ڈال کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتے تھے اور لوٹے جانے والے محنت کش طبقوں کے زخموں پر قسمت اور الوہی رحمت کا مرہم رکھ کر انھیں ذہنی اور روحانی طور پر اپنے مصائب کو ناگزیر سمجھ کر برداشت کر لینے کے قابل بنا دیتے تھے۔ (۱)

---

(۱)- اس موقع پر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس سماج میں طبقاتی نزاع ختم نہیں ہو گیا تھا۔ چنانچہ کسانوں اور دستکاروں کی بغاوتیں ایشیائی تاریخ کا ایک اہم جزو ہیں۔ لیکن حکمران طبقوں کی لکھی ہوئی تاریخوں میں ان کو یا تو اہمیت نہیں دی گئی ہے یا بہت برے الفاظ میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ مظلوموں کی ان تحریکوں سے مطابقت رکھنے والے باغیانہ مذہبی اور سماجی نظریے بھی تھے۔ ایران میں مزدک کی تحریک ان میں سب سے زیادہ مشہور ہے جسے وحشیانہ سفاکی کے ساتھ کچلنے پر نوشیرواں کو حکمراں طبقوں نے ''عدل'' کا لقب دیا۔ تصوف اور بھگتی کی تحریکوں کے بعض پہلوؤں میں بھی ہمیں یہ عوامی عناصر ملتے ہیں۔

برطانوی سماج نے جاگیری اور نیم جاگیری زمینی تعلقات کو ہمارے ملک میں اپنا ماتحت بنا کر اور اپنے مقاصد کے لیے برقرار رکھا۔ نیز انھوں نے اس نظام کے ثقافتی اور ذہنی آثار کو بھی زندہ رکھا جو لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے یہاں وہ عقائد و تصورات اور ادارے، جن کے ذریعہ سے عوام میں توہم پرستی، بت پرستی، تقدیر پرستی، پیر پرستی، قبر پرستی، ایک خاص قسم کی دقیانوسی مذہبی عصبیت، جو عقل اور سائنس کی قدم قدم پر مخالفت کے لیے کھڑی ہو جاتی تھی، ہمارے ملک میں برقرار رکھی گئی۔ انگریزی حاکم، نواب، راجا، بڑے اُمرا، زرخرید دانشور، مولوی، پنڈت وغیرہ اس تمام دقیانوسیت کے سرپرست تھے۔ ان فرسودہ تصورات اور اداروں کی مدد سے حکمران انگریز اور ان کے حمایتی اُمرا ہر قسم کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی آزادی، جمہوریت اور روشن خیالی کی مخالفت کرتے تھے، ملک کے مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو بڑھاتے اور پھیلاتے تھے، عوام کو متحد ہونے اور اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرنے سے روکتے تھے۔ انگریز حکمرانوں کو اس بات سے کوئی عار نہیں تھا۔ اگر ہندو توہم پرست گائے کو مقدس تصور کرتے اور گائے کو ذبح کرنے والے انسان کو واجب القتل سمجھتے۔ وہ اطمینان سے اس خیال کے سرپرست مہاراجاؤں، مہنتوں اور پنڈتوں کو اسے پھیلانے دیتے، اور اگر مسلمان اُمرا اور جاہل ملّا اور واعظ تمام غیر مسلم ہندستانیوں کو کافر اور اپنے سے پست درجے کا انسان سمجھ کر ان کے خلاف نفرت پھیلاتے تھے تو انھیں بھی اس کی آزادی تھی۔ ایک طرف تو اس قسم کے عقائد کی سرپرستی کی گئی اور انھیں پھیلایا گیا۔ دوسری طرف عوام کو تعلیم اور نئی روشنی سے تقریباً پوری طرح محروم رکھ کر انھیں اس دقیانوسی رجعت پرستی کا شکار بنایا گیا۔

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سماجی اور تہذیبی رجعت پرستی کے سوتے دراصل سامراجی محکومی کے معاشرتی نظام میں پیوست تھے۔ اپنے سیاسی غلبے اور معاشی لوٹ کو برقرار رکھنے کے لیے برطانوی سامراجیوں کو فوج، پولیس، نوکر شاہی، عدالتوں اور قید خانوں کی ضرورت تھی۔ سامراج کے لیے ضروری تھا کہ وہ نوابوں، رجواڑوں اور جاگیرداروں کو باقی رکھے۔ بالکل اسی طرح اس کے لیے ضروری تھا کہ ہماری قوم کو ذہنی اور روحانی طور پر مفلوج، غیر متحد اور غلام رکھنے کے لیے وہ سامراجی اور زوال پذیر جاگیری نظریوں اور عقائد کی سرپرستی اور ترویج کرے۔

ظاہر ہے کہ اُنیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے شروع میں صرف وہی طبقے اور گروہ ان نظریوں اور خیالات کی مخالفت کر سکتے تھے جن کو سامراجی نظام سے چوٹ لگتی تھی، جو اس میں بالکل مدغم نہیں ہو گئے تھے (رجواڑوں اور بڑے زمینداروں کی طرح)، اور جو ذہنی اور دماغی تربیت کے اعتبار سے اپنی روحانی بے اطمینانی یا مخالفت کا اظہار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اٹھارھویں صدی کے اخیر اور انیسویں صدی کے پہلے نصف میں (1857-58 تک) جب تک انگریزی غلبہ مکمل نہیں ہوا تھا، ہمارے ملک کے نوابوں اور راجاؤں کا ایک گروہ انگریزوں کے خلاف مسلسل جنگ کرتا رہا۔ اسی زمانے میں انگریزی نظام کے خلاف زبردست عوامی بغاوتیں بھی ہوئیں۔ جن میں ان کسانوں، دستکاروں اور دانشوروں اور فوجی سپاہیوں نے بھی حصہ لیا جن کو سامراجی لوٹ نے بالکل برباد کر دیا تھا۔ بنگال میں مولوی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک، بہار میں وہابی علما کی راہ نمائی میں فوجی بغاوت، سیاسی تحریک، پنڈاری تحریک وغیرہ ان کی مثالیں ہیں۔ لیکن انگریزی سامراج انھیں کچل دینے میں کامیاب ہوا۔ 1857 کی انقلابی تحریک ایک طرح سے ان تمام تحریکوں کے اتحاد کا مظاہرہ تھی۔ اس میں وہ اُمرا اور جاگیردار بھی شامل تھے جن کو انگریزوں نے بے دخل کیا تھا۔ اس میں فوجی سپاہیوں اور دانشوروں کا وہ گروہ بھی تھا جس کو پرانی نوابیوں اور ریاستوں کے نظام کے ٹوٹنے نے بالکل بیکار کر دیا تھا۔ اس میں وہ دستکار بھی شامل تھے جن کی صنعتیں برباد ہو گئی تھیں اور وہ کسان بھی تھے جن کی زمینیں چھینی گئی تھیں۔ مگر اس تحریک کی ناکامیابی نے ثابت کر دیا تھا کہ جاگیردار امرا کا طبقہ قومی انتشار کو دور کر کے بیرونی سامراج کے خلاف مضبوط قومی محاذ بنانے اور اس کی راہ نمائی کرنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کسان، دستکار، دانشور اور فوجی سپاہی نہ تو جاگیرداروں کو اپنا راہنما بنا کر کامیابی حاصل کر سکتے ہیں اور نہ خود ان میں نظریاتی اعتبار سے اپنی انتشار پسندی پر قابو پانے اور ساری قوم کو سامراج کے خلاف متحد کر کے لڑنے کی صلاحیت ہے۔

ان مسلسل ناکامیوں کے بعد سب سے پہلے جن لوگوں نے سامراجی اور جاگیری نظریوں اور عقائد کے خلاف تقریباً غیر شعوری، دبے لفظوں اور نامکمل طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، وہ دانشور تھے۔ ان کا تعلق ان نوکری پیشہ گروہوں سے تھا جو خود مختار ریاستوں اور

مغلیہ سلطنت کی شکست اور زوال کے بعد اب بیکار ہو گئے تھے اور جن کے کچھ افراد انگریزی نظام حکومت کے نیچے عہدوں پر فائز ہو گئے تھے۔ یہ لوگ طبقے کے اعتبار سے اکثر زمینداروں کے خاندانوں کے تھے یا پھر وہ نئے تجارتی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو نئے انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی پڑھ کر یورپ کے جمہوری خیالات اور ادب سے متاثر ہو رہے تھے، جن کو بڑی نوکریاں تو نہیں ملتی تھیں لیکن جو معمولی سرکاری عہدے دار ٹیچر، پروفیسر، وکیل، بیرسٹر وغیرہ بن رہے تھے۔ چنانچہ مذہبی اصلاح اور جدید تعلیم کی تحریک (مثلاً برہم سماج، آریہ سماج، سرسید کی تحریک وغیرہ)، جس کا ہم نے اس باب کے شروع میں ذکر کیا، انھیں گروہوں میں پیدا ہو رہی تھی۔ شعوری طور پر یہ لوگ انگریزی سرکار سے وفاداری کا پیہم دم بھرتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی کاوشیں ترقی پسندی کا پہلو لیے ہوئے تھیں۔ ان کی احیا پرستی اور مذہب کو نئے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش، دراصل جمہوری تصورات اور عقل پسندی کو فروغ دینے کے لیے تھی۔ اگر انگریز حکمراں اور ان کے مبلغ مسلسل اس کوشش میں تھے کہ ہم میں احساس پستی پیدا کریں، نسلی اور قومی اعتبار سے ہم کو سفید فام حکمرانوں سے کمتر اور گھٹیا ثابت کریں تو ہمارے اس دور کے احیا پرست اس کوشش میں تھے کہ ہماری تاریخ اور تہذیبی کارناموں کو ہمارے سامنے اس طریقے سے پیش کریں کہ اس سے ہمارا قومی وقار قائم رہے۔ اگر انگریز حکمراں براہ راست اور بالواسطہ ملک میں جہالت، دقیانوسیت اور قدامت پرستی پھیلانے میں مدد دیتے تھے تو ہمارے یہ اصلاح پسند راہنما انگریزی پڑھنے پر زور دے کر اور خود ہماری پرانی تاریخ سے مساوات اور عقل پسندی کی روایات کو اجاگر کر کے اس کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ اگر وہ انگریز حکمرانوں کی تقلید پر بھی زور دیتے تھے تو اس کا مقصد یہی تھا کہ ہم گزشتہ عہد کی مذموم توہم پرستیوں، تقدیر کا رونا رونے کی عادت، سستی اور انتشار پسندی کو ترک کر کے، جدید طریقے سے سوچنا اور کام کرنا سیکھیں اور جدید زمانے میں جدید انسان بنیں۔

تاہم ہمارے یہ اصلاح پسند، مذہبی احیا اور جدید انگریزی تعلیم کی تبلیغ کرنے والے ترقی پسند دانشور، اپنے طبقاتی حصار کو عبور کرنے سے قاصر تھے۔ مذہبی احیا کی تحریک تاریخی حقیقت کا سچا اور مکمل اظہار نہیں کرتی۔ احیا کے پرستار تاریخ کی حرکت اور ارتقا کے صحیح

اسباب بتانے سے قاصر ہیں۔ مثلاً اگر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ سچا اسلام وہی ہے جو عرب میں عہد نبوی اور اس کے بعد کے تیس سال تک رہا، تو پھر ہم جس چیز کو اسلامی کلچر کہہ کر فخر کرتے ہیں، وہ کن حالات کی پیداوار ہے؟ اگر قرون اولیٰ میں مدینے کی چھونپڑیاں اور مٹی کی مسجدیں ہی ہمارے لیے قابل فخر اور قابل تقلید ہیں تو پھر ہم الحمرا اور تاج محل اور موتی مسجد کو مسلمانوں کے زوال کی نشانیاں سمجھ کر ان سے نفرت کیوں نہیں کرتے؟ اگر ہم خلافت راشدہ کو اپنا نصب العین بنانا چاہتے ہیں تو پھر کیا موجودہ زمانے میں ہم غلامی کو جائز سمجھنے، چوروں کے ہاتھ کاٹنے، اور زانی اور زانیہ کو سنگسار کرنے کے قانون نافذ کرنے کے لیے تیار ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ ایسے تضادات ہیں جن سے احیا پرست مفر حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کی پوزیشن کی یہی کمزوری ہے جو ان میں سے بعض کی نیک نیتی کے باوجود ان کی تحریک کے سروں کو رجعت پرستی سے ملا دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی احیا کی تمام تحریکوں اور اصلاح شدہ نئے مذہبی فرقوں کے عقائد پر اس طبقے یا گروہ کی چھاپ ہوتی ہے جو اُن کے محرک اور مبلغ ہوتے ہیں، اور اگر مذہبی تقدس کے ان کہروں کے پیچھے دیکھا جائے جن سے کہ یہ تحریکیں ڈھکی ہوتی ہیں، تو ہمیں طبقہ واری مفاد کے نقوش صاف طور سے نظر آ جاتے ہیں۔ سید احمد خاں، نذیر احمد وغیرہ کی تہذیبی تحریک شمالی ہند کے مسلم زمینداروں، تاجروں، نوکری پیشہ دانشوروں کی اُس ذہنیت کا اظہار کرتی ہے جو انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں برطانوی سامراج کے مکمل غلبے کے بعد ان میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ جاگیردار طبقے کی شکست کا اعتراف اور اظہار کرتی ہے (انگریز حکمرانوں کا قرآن کی رو سے ''اُولی الامر'' ثابت کرنا اور ان کے خلاف جہاد کو ناجائز قرار دینا) اور اس کے ساتھ ساتھ انھیں اپنے اسلاف کے شاندار کارنامے کی یاد دلا کر اور جدید انگریزی تعلیم حاصل کر کے، توہم پرستی کی جگہ سائنس اور عقلیت کی تبلیغ کر کے، تقدیر کو کوسنے کے بجائے عمل، جہد اور اصلاح کا پیغام دے کر ان میں خود اعتمادی اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی تلقین کرتی ہے۔ یہ ترقی تو ضرور تھی لیکن ایک مخصوص طبقے اور گروہ کے لیے اور نئے سامراجی نوآبادیاتی نظام کے حلقے کے اندر رہ کر، اور اس کے وجود کو لازمی اور برحق تسلیم کر کے۔ اگر

تھوڑی دیر کے لیے ملک کے عام غیر مسلم باشندوں کی اکثریت کو چھوڑ بھی دیا جائے اور صرف مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو ہی لیا جائے ، جو دستکاروں اور کسانوں پر مشتمل تھی ، تب بھی اس تحریک کی عوام سے بے تعلقی ظاہر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے یہ مصلحین رسول اُمّی کے نام لیوا ہونے کے باوجود......جس نے کہا تھا......''**الھم احینی مسکیناً وا میتنی مسکیناً وا حشرنی فی زمرۃ المساکین** ؛ ☆ (اے خدا! تو مجھے مسکینی کی حالت میں رکھ، مسکینی کی حالت میں میری موت لا ، اور میرا حشر مسکینوں کے زمرے میں کر۔) اپنی قوم کی عظیم محنت کش اکثریت کے لیے ہمدردی اور بہشت کی بشارت کے علاوہ اور کوئی دوسری پیشکش نہیں رکھتے تھے۔

ہمارے یہاں احیائیت اور اصلاح کا دوسرا دور بیسویں صدی کے تقریباً ساتھ ساتھ شروع ہوا۔ شمالی ہند کے مسلمانوں کے راہنما ابوالکلام آزاد، شبلی، ظفر علی خاں وغیرہ تھے۔ ادبی اور نظریاتی اعتبار سے اس گروہ میں سب سے عظیم ہستی اقبال کی ہے۔ اُس زمانے میں ایشیائی اقوام میں سامراج دشمنی اور جمہوریت کی تحریکیں اُٹھیں۔ روسی سامراجیوں کی جاپان کے ہاتھوں شکست، پہلا انقلابِ روس (1905)، ایران میں سامراجیوں اور مطلق العنان بادشاہت کے خلاف آزادی اور مشروط (کانسٹی ٹیوشن) کی تحریک، مصر اور سوڈان میں انگریزوں کے خلاف بغاوتیں، ترکی کی سلطنت کے حصے بخرے کرنے کے لیے انگریز، فرانسیسی اور روسی سامراجیوں کی چھیڑی ہوئی جنگیں، ایشیائی عوام کے دلوں میں زبردست سامراج دشمن ہیجان پیدا کر رہی تھیں۔ ہندستان میں بھی قومی تحریک اعتدال پسندی کے دائرے سے نکل رہی تھی۔ سامراجیوں کے خلاف بم اور پستول استعمال ہونے لگے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور کے نئے مسلم راہنماؤں نے سید احمد خاں اور ان کے پیروؤں کے انگریزی سرکار سے وفاداری کے نظریہ پر حملہ کرنا شروع کیا اور مسلمانوں کے سامنے مذہبی احیا کے ساتھ ساتھ قومی آزادی، قومی اتحاد، اور

☆ ایک اور دوسری حدیث میں کہا ہے......''او تومنی اَحَیَّائی فیقول الملائکه من احبائك؟ فیقول اللّٰہ فقراء و المساکین۔ (روز قیامت خدا کہے گا مجھ سے میرے دوستوں کو قریب کرو۔ ملائکہ پوچھیں گے ''ترے دوست کون ہیں۔'' اللہ کہے گا ''فقرا اور مساکین۔'')

اس کے لیے جدوجہد کرنے کا تصور پیش کیا۔ (۱)

اس دور کی احیائیت میں سامراج دشمنی کی جانب آگے بڑھنے کی تلقین تو تھی لیکن اس کے تضاد اور ذہنی دشواریاں پہلے کے مقابلہ میں کچھ کم نہ تھیں۔ مثلاً اگر اسلامی احیا کا مقصد تمام دنیا کے مسلمانوں کو آزاد کر کے متحد کرنا تھا اور تاشقند سے لے کر مراکش تک ایک اسلامی خلافت قائم کرنا تھا (جیسا کہ جمال الدین افغانی، تحریک خلافت کے مبلغ اور اقبال کبھی کبھی کہتے تھے) تو ہندستان کے مسلمانوں کو، جو دنیا کی چالیس کروڑ مسلم آبادی کا سب سے بڑا واحد گروہ تھے، آزادی کی کون سی راہ اختیار کرنی چاہیے؟ ہندستان میں مسلمان ساری آبادی کا ایک چوتھائی حصہ تھے۔ اس لیے اس سارے ملک پر مسلم حکمرانی کے معنی ہندو اکثریت پر حکومت قائم کرنے کے ہوتے تھے۔ یعنی انگریز کی سلطنت ختم کرنے کے بعد ہندو اکثریت پر اقلیت کی حکومت قائم کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور وطن کی آزادی اور جمہوریت کے تصور کے متضاد تھا۔ وطن کی آزادی کی جدوجہد غیر مسلموں کے ساتھ مل کر انگریز سامراجیوں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی متقاضی تھی۔ بین الاقوامی اسلامی اتحاد (پان اسلامزم) کا تصور اگر اسے منطقی حد تک لے جایا جائے تو قومی اتحاد کے تصور سے ٹکراتا تھا۔

بالکل یہی حال ہندو احیائیت کا بھی تھا۔ آزادی کے معنی ملک کے تمام غیر ہندو ملکشوں کو اس دیش میں کالی دیوی، گئو ماتا اور ہنومان جی کی پرستش اور قدیم ویدک دھرم کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنا تھا۔ ذات پات کے نظام کو برقرار رکھنا تھا (جیسا کہ بنگال اور مہاراشٹر کے ہندو قوم پرست کہتے ہیں)، تو ظاہر ہے کہ اس بنیاد پر ہمارے وطن میں جہاں غیر ہندو کروڑوں

---

(۱)۔ اعتدال پسند انگریزوں کے وفادار گروہ کی نمائندگی اس وقت مسلم لیگ کرتی تھی۔ جس کی تشکیل سرسید احمد خاں کے جانشینوں محسن الملک و وقار الملک وغیرہ اور سر آغا خاں، نواب ڈھاکہ وغیرہ نے انگریزی حکمرانوں کے اشارے پر 1906 میں کی۔ مولانا آزاد کا الہلال (کلکتہ)، مولانا شبلی کا مسلم گزٹ، ظفر علی خاں کا زمیندار اور مولانا محمد علی کے کامریڈ سب مسلم لیگ کی انگریز پرستی کے مخالف تھے۔ اقبال نے جوابِ شکوہ میں لیگ پر حملہ کیا...... لیگ والوں نے تراشا ہے ترے نام کا بُت۔ مولانا شبلی نے بھی لیگ کی مذمت میں کئی نظمیں لکھیں۔ ایک نظم کا شعر ہے......

محسن قوم بھی ہے خادم حکام بھی ہے　　　مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو ہیں

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اقبال کے کلام کے موجودہ ایڈیشنوں میں سے متذکرہ بالا مصرعہ حذف کر دیا گیا ہے۔ لیکن پہلی اشاعتوں میں موجود ہے۔

کی تعداد میں اور کل آبادی کا کافی بڑا حصہ تھے، قومی اتحاد نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن ہندو محبان وطن کی ایک بہت بڑی تعداد احیائیت کو اس کی منطقی حد تک لے جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس وجہ سے ان کے ساتھ غیر ہندو مل کر مشترکہ آزادی حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھ سکتے تھے۔

ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ مذہبی عقائد میں اختلاف فی نفسہ نزاع کا باعث ہوتا ہے یا کہ جب تک مختلف گروہوں کے لوگ جدید علوم کی روشنی حاصل کر کے اپنے عقائد کو بدلتے یا ترک نہیں کرتے، اس وقت تک اتحاد اور ترقی ممکن نہیں ہے۔ مشترکہ زندگی اور مشترکہ سماجی مقاصد، بعض عقائد کے اختلاف کے باوجود لوگوں کو متحد کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مغل سلطنت کی بنیاد ترک، افغانی، ایرانی اور راجپوت امرا کے اتحاد پر تھی۔ تصوف کا وحدت الوجود اور ویدانت کا بھگتی کا عقیدہ اس اتحاد کو ایک حد تک استوار کرتا تھا۔ عوام الناس میں ان عقیدوں نے عام انسانی اخوت اور رواداری کی شکل اختیار کی، جس کے نتیجے کے طور پر ہند کی جدید زبانوں کا اور ہمارے از منہ وسطیٰ کے عظیم الشان ادب، موسیقی، مصوری، فن تعمیر وغیرہ کا ارتقا ہوا۔

ہمارا منشا یہ ہے کہ احیا پرستی اپنے موجودہ دور میں رجعت پرست طاقتوں اور طبقوں کو اس کا موقع دیتی ہے کہ وہ اس ملک میں بسنے والی اقوام اور فرقوں کے عوام کو آزادی، جمہوریت کے لیے متحد ہو کر جدوجہد کرنے اور نئے حالات کے مطابق نئی تہذیب وتمدن کی تعمیر کرنے سے روکیں۔ ایسا کرنے کے لیے احیا پرستوں کو خود ہماری تاریخ اور روایات کو مسخ کرنا پڑتا ہے۔ رجعت پرست خود جب اسلامی طرز معاشرت یا ہندو سبھتا کی تجدید کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کے یہ دعوے کھوکھلے ہوتے ہیں۔ وہ زبان سے اپنے قدیم مذاہب اور طرز معاشرت کا دم بھرتے ہیں اور عملی طور پر مغرب کی سب سے بڑی سرمایہ دار طاقت کی فرماں برداری اور اس کے جنگ پرست جارحانہ نظریوں کو بخوشی قبول کرتے ہیں۔ وہ قدیم اسلامی یا ہندو جمہوریت کے نام سے وحشیانہ جاگیری استحصال کو برقرار رکھتے ہیں۔ موجودہ دور میں احیا پرستی نظریاتی ریاکاری اور فریب، اور عملی طور پر اپنے وطن سے غداری اور استحصال کے ظالمانہ نظام کو برقرار رکھنے کا وسیلہ بن جاتی ہے۔

اس طرح ہمارے ملک میں ہندو اور مسلم احیا پرستی اپنے بعض ترقی پسند اور اصلاحی پہلوؤں کے باوجود، اپنے اندر خرابیاں رکھتی تھی جو بالآخر اسے فرقہ پرستی کی دلدل میں پھنسا دیتی تھیں، اور فرقہ پرستی ہی انگریز سامراجیوں اور ان کے حلیف ہندستانی رجواڑوں اور بڑے سرمایہ

داروں کا سب سے موثر اور خطرناک ہتھیار تھا، جس کے ذریعہ سے وہ قومی اتحاد کو روکتے تھے۔ لیکن جس اتحاد کے بغیر قومی آزادی ناممکن تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہمارے ملک میں زبردست سیاسی ہلچل ہوئی۔ جنگ کے زمانے میں انگریز سامراجیوں نے ہمارے ملک کا شدید استحصال کیا تھا۔ جنگ کے بعد اقتصادی حالات اور بھی خراب ہوئے۔ انگریز سامراجیوں نے لڑائی میں جو چوٹ کھائی تھی، اسے وہ ہندستان کی دولت کو لوٹ کر اچھا کرنا چاہتے تھے۔ زرعی اور خام پیداوار کے دام یک بارگی گھٹ گئے، جس سے خام مال اور زرعی پیداوار کرنے والوں کی مالی حالت یک بارگی خراب ہوگئی۔ اِدھر شہروں میں فیکٹریوں اور کارخانوں کے بند ہونے، فوجی دفتروں میں چھٹنی اور سپاہیوں کے ڈسچارج ہونے سے بے روزگاروں کی تعداد میں لاکھوں کا اضافہ ہوا۔ اکثر تاجروں اور صنعت کاروں کو بھی افراط زر (انفلیشن) کی وجہ سے بحرانی حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

دوسری طرف انقلابِ روس نے زارشاہی کا تختہ اُلٹ کر سارے ایشیا کی محکوم قوموں میں آزادی کی ایک نئی لہر دوڑادی تھی۔ وسطی ایشیا کی قوموں نے روسی سامراجیوں کا جوا اُتار کر پھینک دیا تھا۔ ایران اور ترکی روس کی انقلابی مزدور اور کسان حکومت کی مدد اور حمایت حاصل کر کے انگریز سامراجیوں کو اپنے اپنے ملکوں سے نکال رہے تھے۔ چین میں سامراجیوں کے اقتدار کے خلاف مسلح قومی جدوجہد جاری ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں ہمارے یہاں قومی آزادی کی جو تحریک جاری ہوئی، اس کی راہ نمائی ان ہی اونچے طبقے اور گروہوں نے کی جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ نان کو آپریشن (ترک موالات) اور خلافت کی تحریکیں نظریاتی اعتبار سے ہندو اور مسلم احیا پرستی کا سنگم تھیں، اور مہاتما گاندھی اور علی برادران کا اتحاد قومی اتحاد کی نشانی بن گیا ہے۔ لیکن جیسا بعد کے واقعات نے ثابت کیا یہ اتحاد دیرپا نہیں تھا۔ ہندو، مسلم اور سکھ عوام سارے ملک میں متحد ہوکر انگریز حکمرانوں کے خلاف غصے اور نفرت کا اظہار کررہے تھے۔ ان کا خون ایک ساتھ مل کر جلیاں والا باغ میں ہی نہیں، بلکہ بنگال، یو۔پی، مالابار، بمبئ وغیرہ میں ہماری زمین کو لالہ گوں کررہا تھا۔ مالابار میں موپلا کسانوں نے انگریز حکمرانوں، ساہوکاروں اور زمینداروں کے خلاف مسلح بغاوت شروع کردی تھی۔ یو۔پی میں کسان بڑے زمینداروں اور تعلقہ داروں کو دیہات سے بھگا کر زمین پر قبضہ کررہے تھے۔ پولس کے تھانوں پر حملے ہونے لگے تھے۔ بمبئ میں مزدور

دوسرے طبقوں کے ساتھ مل کر سیاسی ہڑتالیں کر رہے تھے۔

تاہم صرف انگریز سامراجی ہی نہیں، کانگریس اور خلافت کمیٹی کے اکثر داہنے بازو کے لیڈر اس عوامی اتحاد اور عوامی جدوجہد کو، جو انقلاب کا رخ اختیار کر رہی تھی، خشمگیں اور خوف کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ وہ قوم کو آزادی یا سوراج کے لیے لڑنے کو کہتے تھے، لیکن سوراج کے معنی بتانے سے انکار کرتے تھے۔ عوامی جدوجہد کی آگ جیسے جیسے بھڑکتی تھی، بورژوا لیڈروں کا انقلابی جوش ویسے ویسے ٹھنڈا ہوتا تھا۔ محنت کش عوام اور نچلے درمیانے طبقے کے لوگ سامراجی نظام پر براہ راست حملہ کر کے اسے ختم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ لیڈر جو درمیانہ طبقوں سے تعلق رکھتے تھے اور جن کے پیچھے ہندستانی زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد تھے، عوام کے جوش وخروش کو احتجاج، جلسے اور جلوس، انگریزی مال کے بائیکاٹ وغیرہ کے اصلاحی راستوں پر لگا کر سامراج پر صرف اتنا دباؤ ڈالنا چاہتے تھے، جس سے وہ مجبور ہو کر ان کے ساتھ سمجھوتہ کرے۔ ان کو معاشی اور سیاسی رعایتیں دے۔ وہ انقلاب اور آزادی کا نام لیتے تھے تاکہ عوام ان کی راہ نمائی کو آئیں۔ لیکن چونکہ عوامی انقلاب کے معنی جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے خاتمے کے تھے، چونکہ اس کے معنی سامراج کے معاشی نظام کے بالکل خاتمے کے تھے، اس لیے وہ ہر ایسا قدم اٹھانے سے گھبراتے تھے، جو جاگیری اور بیرونی سامراجی سرمایہ داری کا مکمل طور سے خاتمہ کر دے۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ہمارے درمیانہ طبقے اور سرمایہ دار اور زمیندار ایک طرف جاگیرداری اور دوسری طرف بیرونی سرمایہ داری، دونوں سے بندھے ہوئے تھے۔ الغرض تہذیب اور سیاست دونوں میدانوں میں اصلاحی تحریکیں 1930 کے قریب ایسے مقام پر پہنچ گئی تھیں جہاں سے ان کی کمی اور ناکامی واضح ہونے لگی تھی۔ قومی آزادی کا نصب العین حاصل نہیں ہوا تھا۔ احیائیت اور اصلاح پسندی، کھلی رجعت پسندی میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ مخلص اصلاح پسند دانشور، وہ سچے لوگ جو دراصل مذہبی یا اخلاقی احیا یا تعلیمی اور سوشل اصلاح کے ذریعے قوم کو اوپر اُٹھانا چاہتے تھے، بیشتر بددل اور مایوس ہو گئے تھے، اور میدان اُن لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا جو اب فرقہ پرستی کو ہوا دے کر، مذہب کے نام پر عوام میں پھوٹ ڈال کر، سامراج کی پشت پناہی کرتے تھے۔ زبان اور کلچر کی ترقی کے مقدس نام پر، اُردو اور ہندی کا نام لے کر امیر جاہلوں اور ان کے زرخرید دانشوروں کا گروہ تعصب اور علم دشمنی پھیلاتا تھا۔ سیاست کے میدان میں فرقہ پرست ہندو اور مسلمان

جماعتیں سامنے آنے لگی تھیں۔

یہ تصویر کا ایک رُخ تھا۔قومی حیات کے دوسرے سرے پر ایک دوسرا طبقہ اور ایک دوسرا نظریہ بھی ابھر رہا تھا۔ یہ طبقہ شہر کے صنعتی مزدوروں کا طبقہ تھا اور یہ نظریہ سوشلزم یا مارکسزم کا نظریہ تھا۔ بمبئی، کلکتہ، احمد آباد، کانپور کے جوٹ اور سوتی ملوں کے مزدور، ریلوے ورکشاپوں کے مزدور، کوئلے کی کانوں اور لوہے اور فولاد کے کارخانوں کے مزدور متحد ہو کر اپنی یونین بنا رہے تھے۔ ہڑتالیں کر کے اپنے حقوق کے لیے اجتماعی جدوجہد کر رہے تھے، اور ان کی تاریک بستیوں میں جگہ جگہ پر نچلے درمیانے طبقے کے نوجوان دانشور، مزدوروں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کو قدرِ زائد، طبقاتی کشمکش، تاریخی مادیت، پرولتاری تنظیم، جدوجہد اور انقلاب کے مسائل سمجھانے لگے تھے۔ مزدوروں میں طبقاتی شعور بیدار ہونے لگا تھا۔ انھیں یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ دنیا کے چھٹے حصے میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کا خاتمہ ہو گیا ہے اور وہاں پر مزدوروں اور کسانوں کی حکمرانی ہے۔ ہندستانی مزدوروں کی اپنی مستقل اور آزاد سیاست کا اظہار ہونے لگا تھا۔ ان کی اپنی طبقاتی پارٹی، کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی حالات میں بننے لگی تھی۔

1930 کے بعد کے چند سال میں سوشلزم کا نظریہ درمیانہ طبقے کے دانشوروں میں عام طور سے پھیل گیا تھا۔ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگریس میں بائیں بازو کی سیاست واضح طور سے نمایاں ہونے لگی تھی۔ نہرو نے اپنی سوانح حیات اور اپنے مضامین میں سوشلزم کی کھلے لفظوں میں تائید کرنی شروع کی۔ کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی بھی قائم ہوئی۔ نوجوان بھارت سبھا، یوتھ لیگوں نے بھی سوشلزم کو اپنایا۔ طلبا کی جو تنظیم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے نام سے بنی، زیادہ تر بائیں بازو کے اثر میں تھی۔ اسی زمانے میں کسانوں کی بھی علاحدہ تنظیم کسان کمیٹیوں اور کسان سبھاؤں میں شروع ہوئی۔ یہ بھی سوشلسٹ اور کمیونسٹ کارکنوں نے قائم کی تھی۔

سوشلزم کے نظریہ کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس نے بنیادی، سیاسی، تہذیبی اور سماجی تبدیلیوں کا محرک اور معمار محنت کش عوام کو قرار دیا۔ اس نظریہ کی مدد سے یہ حقیقت سمجھ میں آنے لگی کہ سماجی اور سیاسی نظام اور اس پر قائم ہونے والی کلچر، خیالات اور عقائد کی عمارت انسانوں کے ان آلات اور ہنر پر قائم ہوتی ہے جنھیں بروئے کار لا کر وہ اپنی زندگی کو برقرار اور جاری

رکھتے ہیں اور مادی اقدار پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے سماج میں بنیادی تبدیلی لانے کے لیے اس کی اقتصادی بنیادوں کو بدلنا ضروری ہے۔ صرف وہی طبقے اور گروہ اس بنیادی تبدیلی کے پیدا کرنے میں حصہ لے سکتے ہیں جن کے مفاد اس تبدیلی سے وابستہ ہیں۔ اصلاح پسندی کا راستہ، احیائیت کا راستہ غلط ہے۔ اس لیے کہ وہ پرانے نظام کو بنیادی طور سے نہیں بدلتا۔ اصلاح صرف اس حالت میں پسندیدہ ہے اگر وہ ہمیں بنیادی انقلاب کی جانب بڑھنے میں مدد دے۔ گزشتہ تاریخ اور اسلاف کے کارناموں اور اپنے تہذیبی ورثے سے ہمیں ضرور سبق لینا چاہیے، اور ان کا پہلا سبق یہ ہے کہ قدیم اور گزرے ہوئے معاشی، سیاسی، اور تہذیبی دور کو زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ، علم، فن، ہنر، آرٹ، ادب اور اخلاق کے وہ خزانے جو گزشتہ دوروں میں ہمارے اسلاف نے اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی کاوش سے جمع کیے ہیں، اور ہمارا موجودہ تمدن جن کا نتیجہ ہے، وہ ہمارا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اس سرمایہ کی حفاظت اور اس کا دانشمندانہ استعمال ترقی پسندی کا لازمی عنصر ہے۔ تہذیب کی یہ اقدار ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو سمجھنے اور اسے خوشگوار اور بہتر بنانے میں مدد دیتی ہیں۔ ان کے ہی وسیلے سے ہم اپنی موجودہ حیات اور عہد حاضر کے تقاضوں کو پورا کر کے نئی تہذیب کی تخلیق کر سکتے ہیں۔

یہ تھے وہ خیالات جو بیشتر نوجوان ترقی پسندوں کے ذہنوں میں ادب کی اس تحریک کے ابتدائی دور میں گردش کر رہے تھے۔ اس لیے جب ہم نے ترقی پسند ادبی تحریک کی تنظیم کی جانب قدم اُٹھایا تو چند باتیں خصوصیت کے ساتھ ہمارے سامنے تھیں۔ پہلے تو یہ کہ ترقی پسند ادبی تحریک کا رخ ملک کے عوام کی جانب، مزدوروں، کسانوں اور درمیانہ طبقے کی جانب ہونا چاہیے۔ ان کو لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور، حس و حرکت، جوش عمل اور اتحاد پیدا کرنا اور تمام ان آثار اور رجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود، رجعت، پست ہمتی پیدا کرتے ہیں، ہمارا اوّلین فرض ٹھہرا۔ اسی سے پھر دوسری بات نکلتی تھی، اور وہ یہ تھی کہ یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن تھا جب ہم شعوری طور پر اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد اور وطن کے عوام کی اپنی حالت سدھارنے کی تحریکوں میں حصہ لیں۔ صرف دُور کے تماشائی نہ ہوں، بلکہ حتی المقدور اپنی صلاحیتوں کے مطابق آزادی کی فوج کے سپاہی بنیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ادیب لازمی طور پر سیاسی کارکن بھی بنیں۔ لیکن اس کے یہ معنی ضرور ہیں کہ وہ سیاست سے کنارہ کش بھی

نہیں ہو سکتے۔ ترقی پسند ادیب کے دل میں نوع انسان سے انس اور گہری ہمدردی ضروری ہے۔ بغیر انسان دوستی، آزادی خواہی، اور جمہوریت پسندی کے ترقی پسند ادیب ہونا ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے ہم علانیہ اور دانستہ طور پر ترقی پسند ادبی تحریک کا رشتہ ملک کی آزادی اور جمہوریت کی تحریکوں کے ساتھ جوڑنا چاہتے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ ترقی پسند دانشور مزدوروں اور کسانوں، غریب اور مظلوم عوام سے ملیں۔ ان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا حصہ بنیں۔ ان کے جلسوں اور جلوسوں میں جائیں اور انھیں اپنے جلسوں اور کانفرنسوں میں بلائیں۔ اسی لیے ہم اپنی تنظیم میں اس پر زور دینا چاہتے تھے کہ دانشوروں کے لیے ادبی تخلیق کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی سے زیادہ سے زیادہ قرب ضروری ہے۔ بلکہ نیا ادب بغیر اس کے پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے ہم چاہتے تھے کہ ہماری انجمن کی شاخیں گوشہ نشین علما کی ٹولیاں نہ ہوں بلکہ ان میں حرکت بھی ہو۔ ادیبوں کے جلسوں میں دوسرے لوگ بھی آئیں۔ ادیبوں کی نگارشات پر کھلی بحثیں بھی ہوں۔ ادیب اور شاعر عام لوگوں سے ملتے جلتے رہیں، ان میں پیوست رہیں، ان سے سیکھیں اور انھیں سکھائیں۔ ہماری انجمن ادیبوں کی انجمن ہوتے ہوئے اور ادبی تخلیق پر زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول کرتے ہوئے بھی انجمن ترقی اُردو یا ہندی سیاہتیہ سمیلن نہ بن جائے بلکہ ایک ایسا متحرک اور جاندار ادبی ادارہ ہو جس کا علوم سے براہ راست اور مستقل تعلق رہے۔

ہم نے انجمن کو اسی طرح منظّم کرنے کی کوشش کی۔

○○

پہلی کل ہند کانفرنس ۔ 1936

انجمن کے منشور کے مسودے کی اشاعت اور دو ڈھائی مہینے تک ہندستان کے مختلف شہروں میں انجمن کی سرگرمیوں سے دانشوروں کے ایک بڑے حلقے میں ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستگی اور دلچسپی بڑھنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف شاخوں اور ان افراد نے جو ترقی پسند ادب کی تحریک کے حامی تھے، متفقہ طور پر یہ مطالبہ کیا کہ ہمیں اپنی ایک کل ہند کانفرنس کرنی چاہیے، تا کہ تحریک میں حصہ لینے والے ایک دوسرے سے مل سکیں، ملک کی مختلف زبانوں کی ادبی صورت حال کا جائزہ لیا جاسکے اور مرکزی انجمن کی باقاعدہ تنظیم ہو سکے۔

اس کام میں پہلا قدم الہ آباد کی انجمن نے اٹھایا۔ ہم عارضی طور پر تحریک کے مرکز کی حیثیت سے کام کرنے لگے تھے اور اب ہمارے سامنے سب سے بڑا کام ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کل ہند کانفرنس کرنا تھا۔

کانفرنس کرنا بہت بڑا فن ہے۔ اس کے لیے بڑی مہارت کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک میں چونکہ کانفرنسیں بہت ہوتی ہیں، اسی لیے ملک کے ہر ایک حصے میں ایسے افراد پیدا ہو گئے ہیں جن کو پیشہ ور کانفرنس باز کہا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ چند دنوں میں جنگل میں منگل کر دیتے ہیں۔ انھیں شہر کے تمام ان ٹھیکیداروں کے نام معلوم ہوتے ہیں جن کے یہاں شامیانے، خیمے، کرسیاں، میزیں، دریاں اور صوفے کرایہ پر ملتے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ روشنی کے لیے بجلی سستی

پڑتی ہے یا گیس کے ہنڈے۔ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ کس دکاندار کا لاوَڈ اسپیکر ہمیشہ تقریر کے درمیان ٹوٹ جاتا ہے اور کس کا آخری وقت تک بھیانک آوازیں نکال سکتا ہے۔ پھر انھیں اس کا بھی پتہ ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والے ڈیلی گیٹوں اور مہمانوں کو شہر کے کن کن لوگوں کے سر منڈھا جا سکتا ہے۔ کون ایسا سخی ہے جو ان کو کھانا کھلانے سے بھی انکار نہیں کرے گا، اور کون ایسا ہے جو ناک بھوں چڑھا کر سہی، لیکن ایک دو بستر ڈالنے کی جگہ دے دے گا۔

انھیں شہر کے ہر ایک گوشے، دیوار کے ہر اس ٹکڑے اور بجلی کے ہر اس کھمبے کا پتہ ہوتا ہے جس پر پوسٹر چسپاں کرنا ضروری ہے۔ وہ ان اوقات سے بھی واقف ہوتے ہیں جب پبلک زیادہ سے زیادہ تعداد میں سڑکوں پر، ہوٹلوں میں اور چائے خانوں میں تفریح کے لیے جمع ہوتی ہے اور جس کو تانگے پر لاوَڈ سپیکر سے اعلان کرکے اور اشتہار بانٹ کر ہونے والے تماشے میں دلچسپی لینے کے لیے ورغلایا جا سکتا ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ لوگ کانفرنس کے اخراجات کے لیے چندہ جمع کرنے، قرض لینے، اُدھار پر چیزیں حاصل کرنے، کرایے پر زیادہ سے زیادہ سامان لے کر بعد کو بل بالکل نہ ادا کرنے یا کم سے کم ادا کرنے کے فنونِ لطیفہ کے ماہر ہوتے ہیں۔ ایسے ماہرین میں بھی اچھوں اور بُروں کی تمیز کی جا سکتی ہے۔ وہ جن کا تعلق ملک کی بڑی بڑی قومی جماعتوں یا سرکاری اداروں سے ہوتا ہے، اور وہ جن کا تعلق ان غریب جماعتوں سے ہے، جن کی جھولی ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ وہ جن کی کانفرنسوں اور جلسوں کے لیے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور امیروں پر مشتمل استقبالیہ کمیٹیاں بنتی ہیں، اور وہ جن کی استقبالیہ کمیٹیاں اگر بنتی بھی ہیں تو اس کے ممبروں کی رکنیت کی فیس دو روپے ہونے کے باوجود بہتوں کو اس کی ادائیگی سے معافی دینا ہوتی ہے۔ پہلے گروہ کی کانفرنسوں کے بعد عام طور سے چندہ کا حساب کا جھگڑا پڑتا ہے اور یہ بات سنی جاتی ہے کہ رسپشن کمیٹی کے فلاں فلاں لوگوں کے یہاں خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا۔ دوسرے گروہ والے کانفرنس کے بعد عام طور سے قرض خواہوں سے منہ چھپائے پھرتے ہیں اور اس دن کا انتظار کرتے ہیں جب بالآخر انھیں دیوالیہ سمجھ کر ٹھیکیدار، پریس والے اور دُکاندار ان کا پیچھا چھوڑ دیں گے۔

الہ آباد کی انجمن کے ہم چند کارکن (فراق، احمد علی، شیو دان سنگھ چوہان وغیرہ) کامیاب کانفرنس کرنے کے ان داوَ پیچ سے تقریباً بالکل نابلد تھے۔ انجمن کے پندرہ بیس ممبر ہر ہفتہ یا

دوسرے ہفتہ کوئی افسانہ، نظم یا مضمون سننے کے لیے جلسے میں جمع تو ہو جاتے تھے، لیکن ان میں زیادہ تر ایسے تھے جن کو تحریک کے متعلق ابھی تک انہماک نہیں پیدا ہوا تھا۔ بعض ایسے تھے جن کی خاموشی ایک مستقل جملۂ استفہامیہ بن کر ہمیں پریشان کرتی تھی۔ وہ انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے نہیں بلکہ اس کے بارے میں، اور خاص طور پر ان میں شامل ہونے والی دو چار خواتین کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ چند ایسے تھے جو ایک دو بار شریک ہو کر پھر نہیں آئے۔ انھوں نے باقاعدگی سے اپنی استطاعت اور سمجھ کے مطابق شہر میں سرگوشیاں کرنی شروع کر دیں کہ یہ تحریک فضول اور مہمل ہے، اور بہت سی دوسری تحریکوں کی طرح دو چار دن میں ختم ہو جائے گی۔ بعض لال بجھکڑوں نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ یہ لوگوں کو کمیونسٹ جال میں پھنسانے کی ایک چال ہے۔

ان مشکلوں کے باوجود ہم نے الہ آباد کی انجمن کے سامنے تمام معاملات کو پیش کر دیا۔ یہ طے ہو گیا کہ کل ہند کانفرنس ہونا چاہیے۔ اپریل میں لکھنؤ میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا، جس کی صدارت کے لیے جواہر لعل نہرو چنے گئے تھے۔ سب کی رائے ہوئی کہ اسی زمانے میں لکھنؤ میں ہماری بھی کانفرنس منعقد کی جائے۔ کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے یا محض تماشائی کی حیثیت سے ملک کے ہر حصے سے لوگ جمع ہونے والے تھے۔ ہم نے خیال کیا کہ ہماری کانفرنس میں جو ادیب آئیں گے، اُن کے لیے کانگریس کا اجلاس ایک مزید کشش کا باعث ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ بائیں بازو کی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے، کمیونسٹ اور سوشلسٹ اور دوسرے ترقی پسند نظریوں کے لوگ وہاں اس موقع پر ہوں گے۔ ان کی موجودگی اور حمایت سے بھی ہمیں فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اس وقت تک کانگریس اور بائیں بازو کی ترقی پسند جماعتوں اور افراد میں وہ تفاوت نہیں تھا جو دوسری جنگ عظیم کے بعد پیدا ہوا۔ سب کی نظریں نہرو کی طرف تھیں کہ وہ کانگریس کو اصلاح پسندوں کے غلبے سے نکال کر جمہوری عوامی سیاست کے راستے پر چلانے میں ترقی پسند اور انقلابی قوتوں کی مدد کریں گے اور کانگریس کی تنظیم کو محور بنا کر اس کے اردگرد بیرونی سامراج کے خلاف متحدہ قومی محاذ بنائیں گے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک حالانکہ سیاسی نہ تھی، پھر بھی ہماری نظر میں وہ سامراج دشمن عوامی مورچہ کا ایک حصہ تھی۔

عام رائے یہ ہوئی کہ منشی پریم چند سے صدارت کی درخواست کی جائے۔ ہماری اس رائے

سے بنگال، بمبئی، احمد آباد، لاہور اور دوسری جگہوں کے سب ہی لوگ متفق ہو گئے۔ منشی پریم چند بنارس میں رہتے تھے اور میں انجمن کی تنظیم اور دوسرے مسائل کے بارے میں ان سے برابر خط و کتابت کرتا رہتا تھا۔ ترقی پسند ادب کی تحریک سے ان کی بھی دلچسپی روز بروز بڑھ رہی تھی۔ لیکن ان کی اور بھی بہت سی مصروفیات تھیں۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ ہندی یا اُردو کی کوئی بھی ادبی کانفرنس یا جلسہ یا اجتماع ملک کے کسی حصے میں ہو، منشی پریم چند کو اس کا صدر بنانے کے لیے سب لوگ دوڑتے تھے۔ منشی پریم چند چونکہ نیک، منکسر المزاج اور حلیم الطبع انسان تھے، اس لیے ان کے بارے میں بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں رہتے تھے کہ ان کی شہرت اور ادبی وقار کی آڑ لے کر اپنے ٹیڑھے میڑھے مقاصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ منشی جی کی وسیع المشربی اور انسانوں کی نیک نیتی پر ان کا بھروسہ انھیں مختلف قسم اور رائے کے لوگوں سے ملنے جلنے اور ان کی تحریکوں اور منصوبوں میں حصہ لینے پر آمادہ رکھتا تھا۔ لیکن غیر معمولی ذہانت اور آزاد پسندی اور انسان دوستی کی طرف ان کا جھکاؤ اور سچائی کی کھوج ہمیشہ انھیں کھوٹے اور کھرے کی پرکھ میں سہارا دیتے تھے۔

اسی وجہ سے ان کے تخلیق کیے ہوئے ادب میں بھی ہمیں سچائی تک پہنچنے، انسان کے باہمی رشتوں اور سماجی تبدیلیوں اور محرکات کے اندرونی عوامل کا مشاہدہ کرنے کی ایک مستقل کاوش پائی جاتی ہے۔ جب وہ اصلاح پسند گاندھیائی فلسفہ کو قبول بھی کرتے ہیں تو اس نظریے کو خواہ مخواہ سچا ثابت کرنے کے لیے وہ سماجی حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کرتے، اور جب بالآخر سماجی حقیقت کا مشاہدہ انھیں ایک حد تک اصلاح پسندی کی خامیاں سمجھنے میں مدد دیتا ہے تو وہ ایسے نتائج کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے ہچکچاتے بھی نہیں، جس سے ان کے پہلے تصورات کی نفی ہوتی ہے، لیکن حقیقت بینی جن کی متقاضی ہے، ترقی پسند تحریک سے پریم چند کی وابستگی ان کی زندگی کے تجربے اور مشاہدے اور ان کے ادبی ارتقا کا ایک لازمی اور فطری نتیجہ تھی۔ افسوس کہ ان کی بے وقت موت کے سبب سے اس ارتقا کی تکمیل نہ ہو سکی۔

جب میں نے منشی جی کو مجوزہ کانفرنس کی صدارت کے لیے لکھا تو پہلے انھوں نے معذوری ظاہر کی۔ انھوں نے لکھا کہ اس وقت ان کے پاس لاہور کے ہندی سمیلن اور حیدرآباد دکن کی ہندی پرچار سبھا کی صدارت کے دعوت نامے آئے ہیں۔ مزید برآں مسٹر کنھیّا لال منشی کی تحریک پر واردھا میں گاندھی جی ایک کل ہند ادبی اجتماع (بھارتیہ ساہتیہ پریشد) اپریل میں ہی کرنا چاہتے ہیں۔ اس

میں بھی انھیں شریک ہونا ہے۔ حسن اتفاق سے منشی پریم چند کے وہ خطوط، جو انھوں نے مجھے اس سلسلے میں لکھے تھے، میرے پاس محفوظ رہ گئے، اور وہ ''نیا ادب'' (فروری۔ مارچ 1940) میں شائع کیے گئے تھے۔ 15 مارچ کے خط میں انھوں نے مجھے لکھا......

''صدارت کی بات...... میں اس کا اہل نہیں۔ عجز سے نہیں کہتا۔ میں اپنے میں کمزوری پاتا ہوں۔ مسٹر کنھیا لال منشی مجھ سے بہت بہتر ہوں گے، یا ڈاکٹر ذاکر حسین۔ پنڈت نہرو تو بہت مصروف ہوں گے۔ ورنہ وہ نہایت موزوں ہوتے۔ اس موقع پر سبھی سیاسیات کے نشے میں ہوں گے اور ادبیات سے شاید ہی کسی کو دلچسپی ہو۔ لیکن ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔ اگر مسٹر جواہر لعل نہرو نے دلچسپی کا اظہار کیا تو جلسہ کامیاب ہوگا۔''

میرے پاس اس وقت بھی صدارت کے دو پیغام ہیں۔ ایک لاہور کے ہندی سمیلن کا، دوسرا حیدرآباد دکن کی ہندی پرچار سبھا کا۔ میں انکار کر رہا ہوں، لیکن وہ لوگ اصرار کر رہے ہیں۔ کہاں کہاں پریسائیڈ کروں گا۔ ہماری انجمن میں کوئی باہر کا آدمی صدر ہو تو زیادہ موزوں ہے۔ مجبوری درجہ میں تو ہوں ہی۔ کچھ رو گا لوں گا......اور کیا لکھوں۔ تم ذرا پنڈت امرناتھ جھا کو تو آزماؤ۔ انھیں اُردو ادب سے دلچسپی ہے اور شاید وہ صدارت منظور کرلیں۔'' (15 مارچ 1936)

لیکن ایک دو اور خطوں کے بعد بالآخر منشی پریم چند نے ہماری درخواست منظور کر لی اور مجھے لکھا......

''اگر ہمارے لیے کوئی لائق صدر نہیں مل رہا ہے تو مجھی کو رکھ لیجیے۔ مشکل یہی ہے کہ مجھے پوری تقریر لکھنی پڑے گی۔ میری تقریر میں آپ کن مسائل پر بحث کرنا چاہتے ہیں، اس کا کچھ اشارہ کیجیے۔ میں تو ڈرتا ہوں میری تقریر ضرورت سے زیادہ دل شکن نہ ہو۔ آج ہی لکھ دوں تا کہ واردھا جانے سے قبل اسے تیار کرلوں۔''

(19 مارچ 1936)

اب یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ پریم چند نے ہماری کانفرنس کی صدارت کے لیے کنھیا لال منشی کو اپنے سے بہتر سمجھا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس شروع زمانہ میں ہمارے اور

ان کے خیالات میں کئی باتوں میں فرق تھا۔لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ کنھیالال منشی 1936 میں ایک قوم پرست اور گجراتی زبان کے اہم ناول نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے تھے۔جب دو سال بعد صوبہ بمبئی میں وہ کانگریس کے وزیر داخلہ بنے اور انھوں نے عوام کی شہری آزادیاں سلب کرنا شروع کیں اور سرمایہ داروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ہڑتالی مزدوروں پر گولی چلوائی، تب ہی لوگوں کو ان کی قوم پرستی اور بھارتی کلچر سے دلچسپی کی اصلی حقیقت معلوم ہوئی۔رفتہ رفتہ منشی صاحب نے کانگریس سے بھی علاحدگی اختیار کر لی اور مالدار فرقہ پرستوں سے اعلانیہ مل گئے۔بعد میں انھیں دوبارہ کانگریس میں شامل کر لیا گیا۔بہر حال اس وقت بھی ترقی پسند انجمن کے بیشتر اراکین کنھیالال منشی سے اپنی کانفرنس کی صدارت کے لیے درخواست کرنے کو تیار نہ تھے۔رہ گئے پنڈت جواہر لعل نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین تو ملک کے معزز اور ترقی پسند قومی اور تعلیمی راہ نما ہونے کی حیثیت سے ہم اپنی تحریک کے واسطے ان کی ہمدردی کے خواہش مند ضرور تھے جو ہمیں حاصل ہو گئی تھی۔لیکن ہماری نظر میں ادیبوں کی کانفرنس میں ادیب ہی کی صدارت سب سے اچھی تھی۔

صدارت کا معاملہ طے ہوا تو ہم دوسرے کاموں میں لگے۔سوال یہ تھا کہ کانفرنس میں ہوگا کیا؟ خطبے، تقریریں، ریزولیشن یا اور کچھ بھی؟ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ ناکافی سا ہے۔ادبی کانفرنس میں ادبی مسائل پر ہی تبادلۂ خیال اور بحثیں ہونا چاہئیں۔پھر ہمارے وسیع اور عریض دیش میں چودہ پندرہ بڑی بڑی زبانیں ہیں۔ہر ایک کو لاکھوں کروڑوں آدمی بولتے ہیں اور ان میں گراں قدر ادب موجود ہے۔کل ہند کانفرنس میں ان تمام یا ان میں سے زیادہ سے زیادہ زبانوں کے جدید ادب اور ادبی مسائل پر مقالے تیار ہونے چاہئیں۔ہمارے ملک میں عام طور سے پڑھے لکھے لوگ صرف اپنی زبان کے ادب سے واقف ہوتے ہیں، یا اگر انگریزی داں ہیں تو کسی قدر انگریزی ادب سے، اُردو داں کو گجراتی ادب کا پتہ نہیں، گجراتی والے تیلگو ادب سے ناواقف ہیں۔تامل والے بنگالی ادب سے نابلد ہیں، اور بنگالی والے اپنی زبان کے علاوہ ہندستان کی تمام زبانوں کے ادب سے۔ بہت سے اُردو اور ہندی والوں میں تو یہ باہمی ناواقفیت، فرقہ وارانہ تعصب کے سبب سے مغائرت اور منافرت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔حالانکہ یہ دونوں ایک ہی خطے کی زبان کے دو ادبی مظہر ہیں اور ان کی بولیاں ایک ہی ہیں۔اگر ہماری کانفرنس کے ذریعے سے ملک کی مختلف زبانوں کے ادیبوں کو ایک دوسرے کے ادب سے تھوڑی بہت بھی واقفیت اور دلچسپی

ہو جائے، اگر ہم یہی جان لیں کہ اس ملک کی بڑی بڑی زبانوں میں اس وقت کون سے ادبی مسائل درپیش ہیں، اور ادبی دھاروں کا رُخ کیا ہے، تو یہ ایک بڑے اچھے کام کی ابتدا ہوگی، اور اس سے ہماری تحریک کو مجموعی طور سے فائدہ پہنچے گا۔

دوسرا کام انجمن کے دستور کا خاکہ تیار کرنا تھا، تاکہ کل ہند مرکزی تنظیم قائم ہو سکے، اور علاقائی اور مقامی انجمنوں کے باہمی تعلقات اور انجمن کی ممبری کی شرائط کا تعین کیا جا سکے۔ اس طرح انجمن کے مرکزی، علاقائی اور مقامی ادارے باقاعدگی سے جمہوری اصولوں پر قائم ہو سکتے تھے۔

تیسرا مسئلہ ہماری انجمن کا دوسرے بیرونی ادبی اداروں سے تعلق یا الحاق کا تھا۔

پھر ہمارے سامنے دو اور سوال تھے جو سیاسی تھے۔ پہلے تو یہ کہ ہمارے ملک میں بیرونی سامراج نے تحریر، تقریر، اور خیال کی آزادی کے جمہوری حق پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ شہری آزادیوں پر ان بندشوں اور گرفت کا محبّ وطن ادیبوں پر براہ راست اثر پڑتا تھا۔ ترقی پسند اخبار، رسالے اور کتابیں ہمیشہ سرکاری عتاب کی زد میں آتے رہتے تھے، اور جو سہولتیں ادیبوں کو ایک آزاد ملک میں ملنی چاہئیں، وہ ہمارے یہاں مفقود تھیں۔ ان کی مدد یا ان کا دل بڑھانا تو درکنار، ادیبوں کا اتحاد اس سلسلے میں ان کی تقویت کا باعث بن سکتا تھا اور ان کے جمہوری حقوق کا تحفظ کر سکتا تھا۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ اس زمانے میں بین الاقوامی فضا بڑی تیزی سے مکدّر ہو رہی تھی۔ جرمن اور اطالوی فاشزم دنیا کو دوسری جنگ عظیم کی طرف کھینچے لیے جا رہی تھی۔ اطالوی فاشزم نے پرامن ابی سینیا (حبش) پر حملہ کر دیا تھا۔

مجلس اقوام (لیگ آف نیشن) اطالیہ کو اس جارحانہ اقدام سے روکنے میں بالکل قاصر رہی تھی۔ ادھر جاپانی سامراج نے چین پر حملہ کر کے اس کے شمالی علاقوں کو ہڑپ لیا تھا اور چین میں جنگ جاری تھی۔ قوموں کی آزادی کا اس بے دردی سے سلب کیا جانا، جمہوریت کا خون، بین الاقوامی جنگ جس کا مقصد یہ ہو کہ ساری انسانیت کو خاک و خون میں لتھیڑ کر چند سامراجی طاقتیں دنیا کو آپس میں نئے سرے سے بانٹ لیں، تمدن اور تہذیب کے لیے مہیب خطرے ہیں اور کوئی سمجھ دار ادیب جسے اپنے فن اور نوع انسان سے لگاؤ ہے، ان سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ ہمارے

نزدیک یہ ضروری تھا کہ وطن کے تمام ادیب اور آرٹسٹ، نظریاتی اور سیاسی اختلاف کے بلا لحاظ قومی آزادی، جمہوریت، سامراج دشمنی اور بین الاقوامی امن کے طرفداروں کی صف میں کھڑے ہوں اور اپنی فنی قوت، ذہنی اور روحانی تاثر کی صلاحیت کو انسانی معاشرے کی ان بنیادوں کو محفوظ اور مضبوط کرنے کے لیے استعمال کریں جن پر تہذیب اور کلچر کا وہ گھرانہ قائم ہے جس کا ہر ایک ادیب اور فنکار خانہ زاد ہے۔

کانفرنس کا دفتری کام ہم الہ آباد سے کرتے رہے۔ مختلف جگہوں سے ہمارے پاس جو خطوط اور جواب آئے، ان سے ہم کو اس کا تو یقین ہو گیا کہ کانفرنس میں شرکت کے لیے ملک کے تقریباً تمام بڑے بڑے ادبی علاقوں کے ادیب آئیں گے اور کانفرنس اگر ''شاندار'' نہیں تو کم از کم مفید ضرور ہوگی، اور اگر ہمارے ملک کی مختلف زبانوں کے ادب پر تفصیلی رپورٹیں اور بحثیں نہ بھی ہوئیں تو کم از کم ان مختلف زبانوں کے جدید ادب پر کسی قدر روشنی تو ضرور ہی پڑے گی، اور ترقی پسند ادیبوں کے لیے عام راہ تو ضرور متعین ہوگی، اور اگر کوئی بڑی اور مضبوط ادبی تنظیم نہیں تو ایک ایسا ڈھانچہ تو ضروری بن جائے گا، جس کے ارد گرد آئندہ نئی ادبی عمارت کھڑی کی جا سکے گی۔

جب کانفرنس کے شروع ہونے کو آٹھ دس دن رہ گئے تو مرکزی دفتر ...... یعنی میں ...... تین چار فائلوں سمیت الہ آباد سے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ اس وقت تک لکھنؤ میں ترقی پسند مصنّفین کی کوئی مقامی شاخ نہیں تھی اور مقامی لوگوں میں سوا ہمارے ذاتی دوستوں یا رشتہ داروں، یا دو تین یونیورسٹی کے طلبا کے کوئی ہمارا مددگار تک نہیں تھا۔ کیفیت یہ تھی کہ ہمارے پاس کانفرنس کے اخراجات کے لیے شاید سوسوا سو روپے سے زیادہ نہ تھے اور نہ کوئی والنٹیئر تھے، نہ چپراسی، نہ کلرک۔ ابھی تک ہمیں جلسہ کرنے کے لیے کوئی ہال بھی نہیں ملا تھا۔

میں جب لکھنؤ پہنچا تو اس کے ایک دو دن کے اندر امرتسر سے ڈاکٹر رشید جہاں اور محمود الظفر بھی آ گئے۔ ہم سب کا قیام لکھنؤ میں وزیر منزل میں تھا۔ میرے والد کا یہ مکان ان دنوں سجا سجایا لیکن بیشتر خالی پڑا رہتا تھا۔ وہ خود الہ آباد میں رہنے لگے تھے۔ اس کافی بڑے مکان کے ایک حصے میں میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید حسین ظہیر رہتے تھے۔ لیکن دو تہائی حصہ خالی پڑا تھا۔ ڈاکٹر ظہیر کی خاصیت یہ ہے کہ ہر اس کارِ خیر یا تحریک میں، جسے وہ اچھی یا مفید سمجھتے ہیں، بے دھڑک فیاضی اور انہماک کے ساتھ مدد کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ پیشہ ور سائنسداں

ہیں اوران کی زندگی اوراوقات کا بیشتر حصہ کیمیائی تفتیش وتحقیق میں صرف ہوتا ہے۔ میں تو خیر ان کا چھوٹا بھائی تھا، لیکن میرے سارے دوست اور ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس کے کارکن رفتہ رفتہ وزیر منزل میں آکر ٹکتے گئے اور سب ان کے مہمان ہو گئے۔ ڈاکٹر ظہیر اور ان کی بیگم کو ان پر اعتراض نہیں تھا کہ ہم (آخر میں کل ملا کر وزیر منزل میں دس بارہ آدمی ٹھہرے ہوئے تھے اور ان کے علاوہ کھانے اور چائے کے وقت دو چار صاحب اور بھی آجاتے تھے) مان نہ مان ان کے مہمان ہو گئے ہیں اور انھیں زیر بار کر رہے ہیں۔ وہ مجھے اور میرے مہمانوں کو اس بات پر ڈانٹتے رہتے تھے کہ ہم کھانا وقت سے نہیں کھاتے۔ پہلے سے یہ نہیں بتاتے کہ ایک وقت میں کتنے آدمی کھانا کھائیں گے۔ کبھی کھانا بچ جاتا ہے اور ضائع ہو جاتا ہے، اور کبھی کم پڑ جاتا ہے۔

محمود الظفر کے آجانے سے لامحالہ ہمارے کام میں باضابطگی پیدا ہوگئی اور حالانکہ میں انجمن کا عارضی جنرل سکریٹری تھا، لیکن وہ فطری طور سے اس کے جنرل منیجر بن گئے۔ انھوں نے کانفرنس کے کاغذات، خطوط اور دستاویزات کی علاحدہ علاحدہ فائلیں بنائیں۔ کام کو مرتب کر کے ان کا پروگرام بنایا، روز کا روز سب کو کام تقسیم کرنے لگے اور شام کے وقت سارے کاموں کا فرداً فرداً جائزہ لینے لگے۔ حسب دستور اپنے ذمہ سب سے زیادہ کام لیا اور اسے بروقت اور بخوبی انجام دیا۔

لکھنؤ میں تین چار ہال ہیں جہاں عام طور سے کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں، سب سے اچھی قیصر باغ کی بارہ دری ہے۔ لیکن شاہان اودھ کے جانشینوں کی حیثیت سے اس پر اودھ کے تعلق داروں کی انجمن کا قبضہ ہے۔ ہم نے اپنے بعض نوجوان زمیندار دوستوں کے توسل سے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن تعلق دار انجمن کے کرتا دھرتا سخت ٹوڈی اور رجعت پسند لوگ تھے۔ انھوں نے شاید پولیس سے دریافت کیا ہو اور انھیں یہ اطلاع دی گئی ہو کہ ترقی پسند ''خطرناک شے'' ہے۔ اس لیے ہمیں وہاں سے ٹکا سا جواب مل گیا۔

پھر گنگا پرشاد ورما ہال کو حاصل کرنے کی کوشش ہوئی۔ وہاں ان دنوں میں شاید چھتری سبھا یا گئو رکشا قسم کی کوئی کانفرنس ہونے والی تھی۔ بالآخر ہم نے رفاہِ عام ہال حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کی۔ یہ خوبصورت عمارت لکھنؤ کے ایک نیم پاگل نواب نے قوم کو دے دی تھی، تاکہ اس میں پبلک جلسے اور کانفرنسیں ہوا کریں۔ لیکن وہ ترقی پسند نواب صاحب برسوں پہلے فوت ہو چکے تھے۔ اب وہاں شہر کے چند وکلا اور بیرسٹروں نے ایک کلب بنا لیا تھا اور اس کا ہال

بلیئرڈ اور برج کھیلنے اور وہسکی اور بیئر پینے کے لیے وقف ہو چکا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب رفاہِ عام میں بڑے بڑے تاریخی جلسے اور کانفرنسیں ہوتی تھیں۔ یہیں پر پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں ہوم رول لیگ کا وہ جلسہ ہونا قرار پایا تھا، جو مسز اینی بیسنٹ کی گرفتاری پر احتجاج کرنے کے لیے شہر کے قوم پرستوں نے مدعو کیا تھا۔ لیکن انگریز سرکار نے اُسے غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ یہ لکھنؤ میں اپنی قسم کا پہلا واقعہ تھا۔ مسلح پولیس سے رفاہِ عام بھر گئی تھی اور سارے شہر میں زبردست سنسنی پھیل گئی تھی(۱)۔ 1920 میں یہیں پر خلافت کانفرنس ہوئی جس میں علی برادران اور ملک کے تمام بڑے لیڈروں نے شرکت کی۔ اس موقع پر مولانا محمد علی نے مسلسل چھ گھنٹے تقریر کی تھی اور رفاہِ عام کے احاطے میں انگریزی کپڑوں کے بڑے بڑے انبار جلائے گئے تھے۔ اس کے بعد یہیں پر نان کو آپریشن کی تحریک کے سلسلے میں کانگریسیوں اور خلافتیوں نے لبرل پارٹی کی کانفرنس میں ہنگامہ کر کے ہال پر قبضہ کر لیا تھا اور ان کے ہی پلیٹ فارم سے لبرلوں کے خلاف ریزولیوشن پاس کروائے تھے۔ ہماری خوش قسمتی سے وکیلوں کے طبقے میں چند ترقی پسند بھی تھے۔ پنڈت آنند نرائن ملا، حالانکہ ترقی پسند ادبی نظریوں سے کسی قدر اختلاف رکھتے تھے، لیکن وہ ایک اچھے شاعر، محبّ وطن اور ادب نواز انسان تھے۔ ان کی اور بعض اور لوگوں کی کوششوں سے رفاہِ عام ہال ہمیں مفت مل گیا اور ہماری سب سے بڑی پریشانی دور ہو گئی۔

ہمیں اس کی بھی فکر ہوئی کہ اگر لکھنؤ میں باقاعدہ استقبالیہ کمیٹی بنائی نہیں جا سکتی تو کم از کم استقبالیہ کمیٹی کے نام پر سو پچاس ٹکٹ بیچ کر کچھ چندہ ہی فراہم ہو جائے، اور اگر پوری کمیٹی نہیں تو کم از کم استقبالیہ کمیٹی کا ایک صدر ہی بنا لیا جائے۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا اور اس عہدے کے لیے سب سے زیادہ موزوں چودھری محمد علی صاحب ردولوی کو سمجھا۔ یوں تو چودھری صاحب تعلق دار ہیں اور اودھ کے رؤسا میں سے ہیں، اور وہ ہم سے ایک نسل پہلے کے فرد ہیں، لیکن ان کی ذات میں کچھ عجیب خصلتیں جمع ہو گئی ہیں جن کی وجہ سے ان کی شخصیت سرزمین اودھ کی دلچسپ ترین شخصیتوں میں سے ایک ہے۔ ان کے اخلاق و آداب اودھ کے قدیم رئیسوں کی طرح ہیں۔

---

(۱)۔ اسی موقع پر چکبست نے اپنی مشہور نظم ہوم رول لکھی تھی اور مسز اینی بیسنٹ کی گرفتاری پر ان کو خطاب کر کے کہا تھا......

ماں کے دامن سے ہے بڑھ کر ہمیں تیرا دامن　　　تیرے بالوں کی سفیدی ہے کہ ہے صبح وطن

لیکن ان کی صورت، داڑھی مونچھ صاف، گوراچٹا رنگ، جدید انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سی ہے۔ وہ اُردو لکھتے ہیں تو اس میں وہ لوچ اور لطافت، طنز اور تفنّن ہوتا ہے جس سے پُرانے لکھنؤ کی مہک آتی ہے۔ لیکن باتیں کرنے پر آ جاتے ہیں تو نیٹشے اور مارکس، ٹیگور اور اقبال ایک طرف، تو جنسیات اور نفسیات کے ماہرین فرائڈ اور ہیولاک دوسری طرف ان کی زد میں ہوتے ہیں۔ بزرگوں اور بڑوں کے درمیان ہوتے ہیں تو ان سے آخرت، جائداد اور ان کی اولاد کا تذکرہ کریں گے، اور نوجوانوں میں ہوں گے تو جنسیات کے مسائل پر ایسی محققانہ باتیں کریں گے کہ بڑے بڑے رنگین مزاجوں کی آنکھیں کھل جائیں۔ اگر کسی محفل میں خوبصورت عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کا مجمع ہو تو وہ ان کے جھنڈ میں یوں پہنچ جاتے ہیں جیسے لوہا مقناطیس سے کھنچتا ہے اور پل بھر میں اپنی اجنبیت کو کھو کر ان سے ایسی رازدارانہ باتیں کرنے لگتے ہیں جو صرف راجہ اندر اپنی پریوں سے کرتے ہوں گے۔ وہ اُردو ادب کی بہترین روایات سے واقف اور ایک لطیف طرزِ تحریر کے مالک تھے اور جدید ادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ جب ہم نے ان سے اپنی استقبالیہ کمیٹی کی صدارت کے لیے کہا تو انھیں بڑا تعجب ہوا کہ یہ درخواست ان سے کی گئی۔ رسماً نہیں بلکہ بڑے خلوص کے ساتھ انھوں نے اس سے اپنی معذوری کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ وہ کبھی کسی تحریک میں شامل نہیں ہوئے ہیں اور ہر قسم کے سیاسی جھگڑوں اور ہنگاموں سے دُور بھاگتے ہیں۔ لیکن ہمارے، خاص طور پر رشید جہاں کے اصرار پر وہ نہیں بھی نہ کر سکے اور آخر میں راضی ہو گئے۔ اس کے بعد سب سے پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ بہت معذرت کے ساتھ چپکے سے سو روپے ہمیں عطیہ بھی دے دیا۔ یہ ہمارے لیے نعمت غیر مترقبہ تھی۔ چودھری صاحب کو اس کی شرمندگی تھی کہ یہ رقم بہت کم تھی، لیکن انھیں معلوم نہیں تھا کہ ہمیں کانفرنس کے لیے کسی ایک شخص سے دس روپے سے زیادہ چندہ نہیں ملا تھا اور ہم کل جملہ سوڈیڑھ سو روپے لے کر کل ہند کانفرنس کرنے چلے تھے۔

ہم نے کانفرنس کے ہال کے لیے کوئی دو تین سو کرسیاں کرائے پر لے تو لیں، لیکن اب یہ فکر لاحق ہوئی کہ ہال بھرے گا بھی یا نہیں۔ ملک کے مختلف حصوں سے جن ڈیلی گیٹوں کے آنے کی ہمیں اطلاع ملی تھی، ان کی تعداد مشکل سے تیس چالیس رہی ہوگی۔ دو بنگال سے، تین پنجاب سے، ایک مدراس سے، دو گجرات سے، چھ مہاراشٹرا سے اور شاید بیس پچیس صوبہ متحدہ کے مختلف

حصوں سے۔ لکھنؤ میں اس وقت تک ہماری تحریک بالکل جاری ہی نہیں ہوئی تھی۔ الہ آباد میں تو فراق، اعجاز حسین، احمد علی وغیرہ یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے، اور ان کے زیر اثر طلبا کی خاصی تعداد ہمارے جلسوں میں آجاتی تھی۔ یہاں یونیورسٹی میں بھی ہمارا کوئی نہ تھا۔ اس وقت تک ڈاکٹر علیم، ڈاکٹر رام بلاس شرما، احتشام حسین اور آل احمد سرور لکھنؤ یونیورسٹی میں مقرر نہیں ہوئے تھے۔ ہماری بے سروسامانی اور کمزوری کا اس سے بڑا اظہار کیا ہوتا کہ لکھنؤ جیسے ادبی شہر میں ہماری کانفرنس میں دلچسپی لینے والے گنتی کے ہوں۔ ہمیں اس کا احساس تھا کہ اگر ایسا ہوا تھا تو یہ اہل لکھنؤ کی بدذوقی یا رجعت پسندی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس سبب سے تھا کہ انھیں ہماری تحریک یا کانفرنس کے بارے میں مطلع نہیں کیا گیا ہے اور ان میں کانفرنس کے لیے دلچسپی نہیں پیدا کی گئی ہے۔ چند دنوں میں چند آدمی اس کمی کو کس طرح پوری کر سکتے تھے؟ پھر بھی ہم نے ہار نہیں مانی۔

یونیورسٹی میں چند طلبا کے ذریعہ ہم نے اشتہار تقسیم کروائے، اور جب کانفرنس کے دو دن پہلے بڑے پوسٹر چھپ کر آگئے تو محمود الظفر اپنے ساتھ دو اور ساتھیوں کو لے کر شہر کے خاص خاص حصوں، نکّڑوں اور چوراہوں پر رات بھر انھیں چسپاں کرتے پھرے۔ رشیدہ لکھنؤ میں چند سال پہلے ڈاکٹری کی پریکٹس کر چکی تھیں، اور یہاں پر بہتوں سے واقف تھیں۔ انھوں نے گھوم گھوم کر کانفرنس کی رسپشن کمیٹی کے تین تین روپے والے ٹکٹ بیچنے شروع کیے۔ اگر یہ لوگ ادب سے دلچسپی لینے والے نہیں بھی تھے تو تین روپے کی حد تک تو انھیں ادب نوازوں کی صف میں داخل کر ہی لیا گیا۔ اس کے علاوہ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے ہزاروں آدمی لکھنؤ آنے لگے تھے۔ ان میں سوشلسٹ لیڈر اور کمیونسٹ کارکن بھی تھے، جن میں اکثر اگر ادیب نہ تھے تو ترقی پسند ادبی تحریک کے ہمدرد تھے۔ آچاریہ نریندر دیو سنسکرت، پالی اور ہندی کے عالم تھے اور اُردو کے بہترین مقررین میں سے شمار کیے جاتے تھے۔ جے پرکاش نارائن کی سوشلسٹ سیاسی زندگی کا دلکش آغاز تھا۔ کملا دیوی چٹوپادھیا ایک سرخ شعلے کی طرح فروزاں تھیں۔ میاں افتخار الدین بڑے شد ومد کے ساتھ کانگریس کے بائیں بازو کی سیاست سے منسلک ہو گئے تھے۔ ان سب نے ہماری کانفرنس میں شرکت کا وعدہ کیا۔ سروجنی نائیڈو نئے شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی اور دل جوئی اور مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتی تھیں۔ وہ بھی لکھنؤ میں تھیں اور انھوں نے بھی

کانفرنس میں شرکت کا وعدہ کیا تھا۔

جوں جوں کانفرنس کا دن قریب آتا، ہماری گھبراہٹ بڑھتی جاتی۔ روپے کی کمی کی وجہ سے ہم اپنے ڈیلی گیٹوں کو ٹھہرانے اور ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چند کو ہم نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے یہاں ٹھہرانے کا بندوبست کیا تھا۔ بہت سے کانگریس کے کیمپ میں جا کر ٹک گئے تھے، جہاں ایک جھونپڑی چند روپے میں کرائے پر مل جاتی تھی اور کھانا بہت سستا تھا۔ بعض یونیورسٹی کے ہوسٹل کے خالی کمروں میں ٹھہرے۔ یہ انتظام ہمارے لیے بڑی زحمت کا باعث تھا۔ اس لیے کہ کانفرنس ہال اور میرے گھر سے، جہاں کانفرنس کا عارضی دفتر تھا، یہ سب جگہیں کئی کئی میل کے فاصلے پر تھیں۔ لیکن مجبوری تھی، ہم نے اپنے مہمانوں کو اپنی حالت بتا دی تھی اور ان سے پہلے کہہ دیا تھا کہ لکھنؤ میں ان کے ٹھہرنے کا خاطر خواہ انتظام کرنے سے ہم قاصر ہیں۔

باہر سے آنے والے لوگوں کا ریلوے اسٹیشن پر استقبال بھی ہم نہ کر سکتے تھے۔ تین چار آدمی آخر کیا کیا کرتے؟ تاہم اپنے صدر منشی پریم چند کو اسٹیشن پر لینے جانے کا ہم نے تہیہ کیا۔ محمود کسی اور کام میں لگے ہوئے تھے۔ اس لیے رشیدہ اور میں نے طے کیا کہ ہم دونوں اسٹیشن جائیں گے۔ کہیں سے تھوڑی دیر کے لیے ہم نے ایک موٹر بھی حاصل کر لی تھی۔ صبح کا وقت تھا، گاڑی نو بجے کے قریب آنے والی تھی۔ ہم نے سوچا کہ ساڑھے آٹھ بجے گھر سے روانہ ہوں گے۔ ہم آٹھ بجے کے قریب بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ گھر میں ایک تانگے کے داخل ہونے کی آواز آئی اور ساتھ ہی نوکر نے آ کر مجھے اطلاع دی کہ کوئی صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں باہر نکلا تو کیا دیکھا کہ پریم چند جی اور ان کے ساتھ ایک اور صاحب ہمارے مکان کے برآمدے میں کھڑے ہوئے ہیں۔ مجھ پر حیرت اور شرمندگی سے تھوڑی دیر کے لیے سکتہ چھا گیا۔ لیکن قبل اس کے، کہ میں کچھ کہوں، پریم چند جی نے ہنستے ہوئے کہا...... ''بھئی تمھارا گھر بڑی مشکل سے ملا ہے۔ بڑی دیر سے اِدھر اُدھر چکر لگا رہے ہیں۔'' اتنے میں رشیدہ بھی باہر نکل آئیں اور ہم دونوں اپنی صفائی اور معذرت پیش کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ ہمیں ٹرین کے وقت کی غلط اطلاع تھی۔ اس کے آنے کا وقت ایک گھنٹے پہلے کا تھا۔ پہلی اپریل سے وقت بدل گیا تھا۔ لیکن اب اُلٹے پریم چند جی نے معذرت شروع کر دی...... ''ہاں، مجھے چاہیے تھا کہ چلنے سے پہلے تار دے دیتا۔ لیکن میں نے سوچا

کہ کیا ضرورت ہے۔ اگر اسٹیشن پر کوئی نہ بھی ملا تو تانگہ کر کے سیدھا تمھارے یہاں چلا آؤں گا۔‘‘

میں دل میں سوچ رہا تھا کہ عام طور سے کانفرنسوں کے صدر کا شاندار استقبال کیا جاتا ہے۔ انھیں پلیٹ فارم پر ہار پہنائے جاتے ہیں، ان کے جلوس نکلتے ہیں۔ ان کی جےَ جےَ کار ہوتی ہے......اور ہمارا صدر ہے کہ خود اپنی جیب سے ریل کا ٹکٹ خرید کر چپکے سے آ گیا۔ اسٹیشن پر استقبال تو کیا، راہ بتانے کے لیے بھی کوئی اسے نہیں ملا۔ ایک معمولی سے تانگے پر بیٹھ کر وہ خود ہی بے تکلفی سے کانفرنس کے منتظمین کے گھر پر چلا آیا۔ ان کی کوتاہی کا شکوہ شکایت تو درکنار، اس کے ماتھے پر بل بھی نہیں پڑا، اور ان سے یوں گھل مل گیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ رسمی باتوں پر وقت ضائع کرنا اس کے نزدیک بالکل غیر ضروری ہے۔ یقینی ہماری تحریک ایک نئی قسم کی تحریک تھی اور اس کا صدر نئے قسم کا صدر تھا۔ اس کی شان، اس کی انکساری اور سادگی سے ظاہر ہوتی تھی۔

منشی جی ہمارے یہاں ہی ٹھہرے۔ ان کے ساتھ جو صاحب تھے ان سے ہم پہلے سے ناواقف تھے۔ یہ ہندی کے مشہور افسانہ اور ناول نگار، دہلی کے بابو جینندر کمار تھے۔ منشی پریم چند نے ہمارا ان سے تعارف کرایا۔ وہ بھی ہمارے مہمان ہوئے۔ ہمیں اس کی خوشی ہوئی کہ منشی جی ہندی کے ایک ادیب کو، جو اُن کے دوست تھے، اپنے ساتھ لائے۔ اُس وقت تک ہندی کے بڑے ادیبوں میں سے (منشی پریم چند کے علاوہ) ہماری تحریک میں کوئی شامل نہیں ہوا تھا۔ بابو میتھلی شرن گپت، پنڈت بنارسی داس چترویدی، سمترا نند پنت، سبھدرا کماری چوہان، پنڈت بال کرشن شرما، نوین وغیرہ نے ہماری تحریک سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی کانفرنس میں شرکت کے لیے نہیں آ رہا تھا۔ ہندی کے ادیبوں میں گروہ بندی بھی بڑی سخت تھی۔ بعض ان میں سے شاید ایسے بھی تھے جو اُردو کے ادیبوں کے ساتھ مل کر کچھ کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ میں نے پریم چند جی سے ان کے رجحانات کا ذکر بھی کیا تھا۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ ہندی کے بہت سے ادیب شاید احساس کمتری (Inferiority Complex) میں مبتلا ہیں۔ بہر حال ہمیں اپنی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ ان تمام باتوں کے مدنظر بابو جینندر کمار کا کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لانا ہمارے لیے دُگنی خوشی کا باعث تھا۔

اس کے بعد جینندر کمار صاحب سے ملنے کا مجھے کئی بار اتفاق ہوا اور ان سے بڑی بڑی

بحثیں اور گفتگوئیں ہوئیں۔ یقینی ان کی ہستی اپنی مثال آپ ہے۔ بحث کو اُلجھانے، آسمان کا سرا زمین سے ملانے، بیک وقت ترقی اور رجعت، مادیت اور الوہیت کی طرف داری کرنے میں ان کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ ان کا اعتقاد بھگوت گیتا پر بھی ہے اور آسولڈ اشپنگلر کے فلسفہ انحطاط اور موت پر بھی، جمہوریت پر بھی اور فاشزم پر بھی۔ ان سے گھنٹوں بات کرنے پر بھی پتہ نہیں چلتا کہ موصوف کس چیز کے قائل ہیں اور کہنا کیا چاہتے ہیں۔ وہ ترقی پسندوں کی کانفرنسوں اور جلسوں میں باقاعدگی سے شریک بھی ہوتے ہیں۔ لیکن بہت سی باتوں میں ان کے مخالف بھی ہیں۔ بڑے مرنجاں مرنج آدمی ہیں۔ دورانِ گفتگو میں اگر کوئی عاجز آ کر ان سے لڑنے پر آمادہ ہو جائے تو مسکرا کر ٹال دیتے ہیں۔

کانفرنس شروع ہونے کے دن ہم نے اپنی فائلیں، کاغذات اور ٹائپ رائٹر سنبھالا اور صبح سے ہی رفاہِ عام کو چلے گئے۔ اب ہال کے بغل میں ایک چھوٹے سے دفتر میں کانفرنس کا دفتر قائم کیا گیا، اور محمود الظفر اس کے انچارج ہوئے۔ انھیں ٹائپ کرنا بھی آتا تھا۔ اس لیے رزولیوشن اور ہر ایک سیشن کا پروگرام وغیرہ ٹائپ کرنے کا کام بھی ان ہی کے ذمے پڑا۔ رشید جہاں اور ہاجرہ بیگم کے سپرد ہال کے دروازہ پر بیٹھنا، ٹکٹ فروخت کرنا اور لوگوں کو ان کی نشستوں تک پہنچانا تھا، اور عام دیکھ بھال کا کام بھی تھا۔ ان دونوں نے اپنی مدد کے لیے معلوم نہیں کیسے اور کہاں سے تین چار خوش خصال اور سبک گام خواتین کو اکٹھا کر لیا تھا۔ ان کے علاوہ ہال میں سجاوٹ مطلق نہیں تھی۔ ہال کے باہر اور اندر کے دروازوں پر سرخ تُول کی چوڑی چوڑی پٹیوں پر اُردو، ہندی اور انگریزی میں ''کل ہند ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس'' لکھ کر لٹکا دیا گیا تھا اور بس......! ڈائس بھی بے حد معمولی تھا۔ یہ کوئی ایک فٹ اونچے، چھ گز لمبے اور چار گز چوڑے کھرّے تختوں کا تھا، جس پر ایک معمولی لکڑی کی میز تھی۔ ڈائس پر چار کرسیاں تھیں جو ہتھے دار تھیں مگر ان کی وارنش اُڑ چکی تھی۔ ہال میں باقی جو کرسیاں تھیں، بغیر ہتھے کے تھیں۔ فرش پر دری وغیرہ کچھ نہیں تھی، ڈائس پر بھی دری نہیں تھی۔ اچھے فرنیچر اور سجاوٹ کا سامان حاصل کرنے کے لیے زیادہ روپے کی ضرورت تھی جو ہمارے پاس نہیں تھے۔ اس وقت تک ہم کو جو روپیہ ملا تھا، وہ زیادہ تر پریس کی نذر ہو گیا تھا۔ جو کرسیاں وغیرہ ہم نے کانفرنس کے لیے کرایہ پر لی تھیں، وہ اُدھار تھیں اور ہم یہ توقع کرتے تھے کہ

ایک ایک روپیہ کے وزیٹروں کے دوسو ٹکٹ بیچ کر ہم ان کا کرایہ چکا دیں گے۔

کھلی کانفرنس صرف دو دن کے لیے ہونا قرار پائی تھی۔ دس بجے صبح سے ساڑھے بارہ بجے تک اور پھر دو پہر کو تین بجے سے ساڑھے پانچ بجے تک۔ درمیان کے وقفوں میں دوبارہ ڈیلی گیٹوں کی میٹنگ کر کے آئینی اور تنظیمی امور طے کرنے کا پروگرام تھا۔

نو، ساڑھے نو بجے کے قریب ایک ایک کر کے لوگ آنا شروع ہوئے۔ سب سے پہلے آنے والوں میں ہمارے صدر منشی پریم چند تھے، جو بے تکلفی کے ساتھ ہمارے پاس آ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ ان کے چہرے سے آج جیسے خوشی اور اطمینان کے آثار نمایاں تھے، جس سے ہم سب کی بہت ڈھارس بندھی تھی۔ صدر استقبالیہ کمیٹی چودھری محمد علی صاحب آئے تو تھوڑی ہی دیر میں ان کی گفتگو اور منتظم خواتین کے قہقہے بلند ہونے لگے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم (ان دنوں علی گڑھ یونیورسٹی میں عربی لیکچرار تھے) اپنے ساتھ سنجیدگی لے آئے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم حالانکہ ہمارے ہم عمر تھے اور برلن یونیورسٹی کے پی۔ ایچ۔ ڈی، لیکن ان کی باقاعدہ کتری ہوئی تکونی داڑھی، کھدر کی مکلّف ٹوپی اور شیروانی، گول چہرہ اور گورا رنگ، تول تول کر قدم رکھنا اور احتیاط سے بات کرنا ان میں ایک مولویانہ اور محتسبانہ انداز پیدا کر دیتا ہے۔

وہ غازی پور (مشرقی یو۔ پی) کے قاضیوں کے خاندان کے فرد ہیں، اور ان کی ذات میں شرعی تعلیم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جرمن تربیت کا میل ہوا ہے۔ ان کے منطقی ذہن میں سیاسی اور ادبی ترقی پسندی نے اس طرح جگہ بنائی ہے کہ جیسے عربی مصادر کی گردانوں نے، اور ترقی پسندی کی صراط مستقیم سے لغزش یا انحراف کو وہ اس طرح پکڑتے ہیں جیسے پُرانے طرز کے مولوی گردان رٹاتے وقت اعراب کی غلطیوں کو، ان کی وسیع المشربی میں ایک دلکش سخت گیری ہے، اور ان کی آزاد خیالی اور جدید سائنسی فکر قومی روایات کے مضبوط اور چمکدار چوکھٹے سے گھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

رفتہ رفتہ ہال بھرنے لگا۔ مدراس، بنگال، گجرات، مہاراشٹر، پنجاب، سندھ، بہار اور یو۔ پی کے ڈیلی گیٹوں سے آگے کی دو صفیں بھر گئیں۔ ان کے برابر پندرہ بیس رسپشن کمیٹی والے لوگ رہے ہوں گے، اور ہال کے دو تہائی حصے میں ایک روپیہ ٹکٹ والے وزیٹر رہے ہوں گے۔ طالب

علم، دفتروں میں کام کرنے والے دبلے پتلے، کسی قدر جھینپے اور شرمائے ہوئے ادب کے شوقین، مدرس، ٹیچر، نوجوان وکیل، کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹی کے چند ادب سے شوق رکھنے والے کارکن، ٹریڈ یونینوں کے کارکن، چند کسانوں میں کام کرنے والے کارکن جو ہندستان کے مختلف حصوں سے اس وقت لکھنؤ میں جمع ہوئے تھے، اور جنھیں نئے ترقی پسند قومی اور سماجی آزادی کے ادب سے دلچسپی تھی...... یہ تھے ہمارے ملک کے نئے قومی اور معاشرتی احساس اور شعور رکھنے والے دانشوروں کے نمائندے۔ ہال میں گہما گہمی اور شور وغل نہیں تھا۔ لوگوں کے بولنے کی آوازیں دھیمی تھیں، اور سکون کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ اس مجمع میں جوش بالکل معلوم نہیں ہوتا تھا۔

کوئی ساڑھے دس بجے کے قریب جب ہال تقریباً دو تہائی بھر گیا تو ہم نے کانفرنس کی کارروائی شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ اتنے میں باہر ایک تانگہ آ کر رُکا۔ اس میں سے ایک چھوٹے قد کے بزرگ اُچھل کر اُترے۔ ہم نے دیکھا تو یہ مولانا حسرت موہانی تھے۔ منشی پریم چند، ڈاکٹر عبدالعلیم اور میں، جو پاس ہی کھڑے تھے اور مولانا کو پہلے سے جانتے تھے، ان کے استقبال کے لیے بڑھے۔ ہمیں بڑی خوشی تھی کہ مولانا نے صرف ایک دعوت نامہ پا کر ہماری کانفرنس میں شرکت کے لیے کانپور سے لکھنؤ آنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ انھوں نے اپنے آنے کے بارے میں ہم کو پہلے سے اطلاع نہیں کی تھی۔ اس لیے ہمیں ان کے آنے کی کوئی خاص توقع بھی نہیں تھی۔ عام دستور تو یہ ہے کہ شاعروں کو جب مدعو کیا جاتا ہے تو پہلے وہ اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہیں۔ پھر لوگ ان سے جا کر ملتے ہیں اور شرکت کے لیے اصرار کرتے ہیں۔ سیکنڈ کلاس کا آنے جانے کا کرایہ اور اس کے علاوہ زادِ سفر دیا جاتا ہے، اسٹیشن پر استقبال کیا جاتا ہے، ضیافتیں اور مہمانداریاں ہوتی ہیں اور پھر جائے قیام سے موٹر پر بیٹھا کر شاعر کو محفل میں لایا جاتا ہے۔ یہ دستور ایسا بُرا بھی نہیں، کیونکہ ان موقعوں کے علاوہ شاعر اور ادیب کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا اور عام طور سے اس کی اور اس کے بال بچوں کی زندگی تنگدستی اور فاقہ کشی کی ہوتی ہے، اور اگر ایسا ہے تو عام لوگوں کا کیا قصور؟ خود عام لوگوں کی زندگی بھی تو ایسے ہی بسر ہوتی ہے۔

لیکن ہمارے ملک میں اگر کوئی ایسی ہستی تھی، جسے ہر قسم کے تکلف، بناوٹ، مصنوعی اور رسمی آداب سے شدید نفرت تھی، اور جو اس بات کی پروا کیے بغیر کہ لوگ اس کی بات کا بُرا مانیں گے

یا ناراض ہو جائیں گے، سچی بات کہنے اور اس کے مطابق عمل کرنے سے کبھی نہیں جھجکتی تھی، وہ حسرت موہانی کی ہستی تھی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ جو بات کہتے تھے وہ ہمیشہ ٹھیک ہی ہوتی تھی۔ لیکن جب سیاست یا ثقافتی اور معاشرتی امور میں وہ کوئی پوزیشن اختیار کرتے تھے تو اس کی سختی اور سچائی پر انھیں پورا اعتماد ہوتا تھا اور پھر دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے، اس کی وجہ سے ان پر مصائب اور آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں، وہ اپنی جگہ پر اٹل رہتے تھے۔

مولانا کا قد چھوٹا تھا اور وہ جی بھر کے بدصورت تھے۔ جسم گدبدا تھا جس پر وہ ایک کافی لمبی میلی سی ملی جلی گہرے سلیٹی رنگ کی کھدر کی شیروانی پہنتے تھے۔ ان کی تصویریں سب نے دیکھی ہیں اور ان کی صورت سے سب آشنا ہیں۔ چیچک رو، ڈھلتا ہوا رنگ اور سارا چہرہ ایک بڑی گھنی گول سی داڑھی سے ڈھکا ہوا تھا جو شاید چھ انچ سے بھی کچھ لمبی ہی تھی، اور جس کے بال کھچڑی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس داڑھی کو نہ وہ کبھی کترتے تھے اور نہ اس میں کنگھی کرتے تھے، اس لیے کہ وہ چاروں طرف اُڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سر پر وہ ہمیشہ بڑے شوخ سرخ رنگ کی چھوٹی سی فلیٹ کی ترکی ٹوپی پہنتے تھے جس میں پھندنا نہیں ہوتا تھا۔ آنکھوں پر عینک لگاتے تھے جس کا فریم لوہے کا تھا اور جس کے شیشے پرانی وضع کے چھوٹے چھوٹے اور بیضاوی تھے۔ لیکن ان کے پیچھے سے بھی ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی چمک اور پُھرتیلا پن جھلکتا رہتا تھا۔ ان کے انداز گفتگو میں شوخی اور لطافت تھی۔ وہ تیزی سے مسکرا کر بات کرتے تھے۔ اس عمر اور بزرگی کے باوجود ان کے جسم میں ایک چلبلاہٹ اور پھرتی سی تھی۔ ان کی آواز پتلی تھی اور جب وہ جوش میں آکر بڑے انہماک سے بولتے تھے، جیسا کہ اکثر ہوتا تھا، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی بچے کی ٹوٹی ہوئی سیٹی ہو، جسے زور دے کر پھونکا جا رہا ہے لیکن جو پھر بھی مشکل ہی سے بجتی ہے۔

ہم نے مولانا کو سیدھے لے جا کر ڈائس پر بٹھا دیا۔ درمیان میں منشی پریم چند تھے۔ ان کے داہنی طرف مولانا بیٹھے تھے اور ان کے برابر میں چودھری محمد علی۔ میں منشی جی کی بائیں طرف نیچے تخت پر کنارے کی طرف بیٹھا تھا، تا کہ پروگرام اور کاغذات وغیرہ انھیں وقتاً فوقتاً دے سکوں۔

چودھری صاحب کے استقبالیہ خطبہ سے کانفرنس کا آغاز ہوا۔ انھوں نے یہ خطبہ لکھ لیا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ اب ہمارے پاس نہیں ہے۔ نہیں تو اس سے معلوم ہوتا کہ کس طرح ہماری (خاص

طور سے لکھنؤ کی) قدیم تہذیب اور ادب کے ایک رسیا نے جدید ترقی پسند ادب کی تحریک کا خیر مقدم کیا تھا۔ چودھری صاحب کے خطبے کے بعد منشی پریم چند متفقہ طور سے کانفرنس کے صدر چنے گئے اور انھوں نے اپنا صدارتی خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ یہ سلیس اُردو میں لکھا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس مجمع میں غیر ہندستانی بولنے والے علاقوں کے جتنے بھی ڈیلی گیٹ اور وزیٹر تھے (جن کی تعداد آدھی سے کچھ ہی کم تھی)، ان کی سمجھ میں وہ بالکل نہیں آرہا تھا۔ وہ لوگ تو خاموش تھے ہی، لیکن ہم اُردو ہندی والے بھی جو اس خطبہ کو خاموشی سے سن رہے تھے، بالکل خاموش تھے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک طرح کی محویت سی مجمع پر طاری ہوگئی ہے۔ کسی جلسے میں زبانی تقریر کے بجائے اگر کوئی چیز لکھ کر پڑھی جائے تو تھوڑی ہی دیر میں جی اُکتانے لگتا ہے۔ لیکن اس خطبہ میں ہماری زبان اور ہمارے ملک میں پہلی مرتبہ ایک بڑے ادیب نے ہمیں ترقی پسند ادبی تحریک کی نوعیت اور مقاصد سے آگاہ کیا تھا۔ اس خطبے میں ہماری زبان کے افسانہ نگار اور ناول نگار نے ہمیں سیدھے سادے اور پُر اثر الفاظ میں بتایا کہ اچھے ادب کی بنیاد، سچائی، حسن، آزادی اور انسان دوستی پر ہی قائم ہوسکتی ہے۔

> ”جس ادب سے ہمارا ذوقِ صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت اور حرارت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے، وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔“

انھوں نے ادیبوں کو یاد دلایا کہ ان کی عدالت سوسائٹی ہے اور اس عدالت کے سامنے ان کی جواب دہی ہوگی، اور عوام کی اس عدالت میں ان کا استغاثہ اسی صورت میں کامیاب ہوگا اگر وہ انسانیت، شرافت، انصاف اور حق کی بے لاگ تلقین کریں گے۔ پریم چند نے کہا کہ ایک آرٹسٹ میں ”صحیح ذوقِ حسن اور محبت کی گرمی“ ہونا ضروری ہے، اور وہ فطرت اور انسانی سماج میں توازن اور ہم آہنگی کی جستجو کرتا ہے۔

> ”ادب آرٹسٹ کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے اور ہم آہنگی جس کی تخلیق کرتی ہے، تخریب نہیں۔ وہ ہم میں وفا اور خلوص اور ہمدردی اور انصاف اور

مساوات کے جذبات کی نشونما کرتی ہے۔ جہاں یہ جذبات ہیں وہیں استحکام ہے، زندگی ہے۔ جہاں ان کا فقدان ہے وہاں افتراق، خود پروری ہے، نفرت اور دشمنی اور موت ہے......ادب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے......اس کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ یہ اس کا مقصد اولیٰ ہے۔''

آگے چل کر پریم چند نے اس کو صاف کر دیا کہ جب وہ ادب میں حسن اور محبت کی جستجو کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ حسن اور محبت محض ایک ذاتی اور انفرادی شے نہیں ہے۔ وہ اس مبہم خود پرستی کے نظریے ''فن برائے فن'' کی تلقین نہیں کر رہے تھے بلکہ ایک اچھے فنکار کی خصوصیت ہی ان کے نزدیک یہ تھی کہ اپنے اِرد گرد جہاں بھی وہ دیکھے کہ ''ایک جماعت معاشرت و رسوم کی قیود میں پڑ کر اذیت پا رہی ہے''، اسے برداشت نہ کرے اور اس جماعت کو غلامی اور عسرت سے نجات دلانے کے اسباب مہیا کرے اور اس کی آزادی کے لیے بے چین ہو......

''وہ اس درد کو جتنی بے تابی کے ساتھ محسوس کرتا ہے، اتنا ہی اس کے کلام میں زور اور خلوص پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کو جس تناسب کے ساتھ ادا کرتا ہے، وہی اس کے کمال کا راز ہے۔''

پریم چند نے مزید وضاحت کرتے ہوئے بڑی خوبصورتی کے ساتھ یہ بات سمجھائی کہ حسن یا روحانی مسرت کوئی مطلق اور مادی زندگی سے بے تعلق چیز نہیں، بلکہ اس کا انسانوں کی زندگی سے تعلق ہے اور اس کا ہمیشہ ایک افادی پہلو ہوتا ہے......

''ایک ہی چیز سے ہمیں افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی ہے اور غم بھی۔ آسمان پر چھائی ہوئی شفق بے شک ایک خوش نما نظارہ ہے۔ لیکن کہیں اساڑھ میں اگر آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ ہمارے لیے خوشی کا باعث نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے۔ اس وقت تو ہم آسمان پر کالی کالی گھٹائیں دیکھ کر ہی مسرور ہوتے ہیں۔''

اسی طرح چند امیروں اور رئیسوں کی مسرت اور خوشی دوستوں کے لیے رنج کا سبب ہو

سکتی ہے۔ لیکن ایک سمجھدار اور باخبر انسان ''اس امارت کے لوازمے کو مکروہ ترین چیز سمجھتا ہے جو غریبوں اور مزدوروں کے خون سے داغدار رہی ہو۔''

انھوں نے کہا کہ انسانیت کے بہترین مذہبی، اخلاقی اور روحانی پیشواؤں نے انسانیت کے سامنے ہمیشہ اخوت، مساوات، تہذیب کا آدرش پیش کیا اور اپنے اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ انسانی آزادی، اخوت، مساوات کا یہ زریں خواب اسی صورت میں حقیقت میں بدل سکتا ہے، اور اس آئیڈیل کی تکمیل تب ہی ہوسکتی ہے، جب ہم ترقی کی قوتوں کا ساتھ دیں۔

''ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے۔ ایک نئے نظام کی تکمیل کرنی ہے جہاں مساوات محض اخلاقی بندشوں پر نہ رہ کر قوانین کی صورت اختیار کرے اور ہمارے لٹریچر کو اسی آئیڈیل کو پیش کرنا ہے۔''

پریم چند کی زبان سے سیاسی اور سماجی عوامی انقلاب کی ان لفظوں میں حمایت اور تلقین ثابت کرتی تھی کہ اب وہ عینیت پرستی اور اصلاح پسندی کے دائرہ سے نکل گئے ہیں۔ ان کی انسان دوستی اور گاندھیائی سیاست کے ناکام تجربے نے انھیں اس حقیقت تک پہنچا دیا تھا کہ جو لوگ صرف بڑے بڑے مذہبی اور اخلاقی اصولوں کی تبلیغ کر کے انسان کی مادی اور روحانی مشکلات کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں، وہ کامیاب نہیں ہوسکتے۔ موجودہ زمانے میں انصاف اور اخلاق اور انسانیت کی تعمیر اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ایک ایسا نیا معاشی اور سیاسی نظام قائم کیا جائے، جس میں انسانوں کی لوٹ انسانوں کے ذریعہ ممکن ہی نہ ہوسکے۔

انھوں نے ادیبوں سے کہا کہ عوام کی زندگی اور ان کی کشمکشِ حیات میں ''حسن کی معراج'' دیکھنے کی کوشش کریں اور یہ نہ سمجھیں کہ حسن صرف رنگے ہونٹوں والی، معطر عورتوں کے رخساروں اور ابروؤں میں ہے۔'' انھوں نے ادیبوں سے کہا کہ...... ''اگر تمھیں اس غریب عورت میں حسن نظر نہیں آتا جو بچے کو کھیت کی مینڈھ پر سُلائے پسینہ بہا رہی ہے، تو یہ تمھاری تنگ نظری کا قصور ہے۔ اس لیے کہ ان مرجھائے ہوئے ہونٹوں اور کمھلائے ہوئے رخساروں کی آڑ میں ایثار، عقیدت اور مشکل پسندی ہے۔ شباب، سینے پر ہاتھ دھر کر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج

ادائیوں کے شکوے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چونچلوں پر سر دھننے کا نام نہیں۔ شباب نام ہے آئیڈیل کا، ہمت کا، مشکل پسندی کا، قربانی کا۔''

انھوں نے کہا کہ...... ''جب ادیبوں میں اس طرح کی نئی ''نگاہِ حسن'' پیدا ہوگی تب ''ہم اس معاشرت کی جڑیں کھودنے کے لیے سینہ سپر سوار ہو جائیں گے اور اسے برداشت نہ کریں گے جہاں ہزاروں انسان ایک جابر کی غلامی کریں۔ تب ہماری خوددار انسانیت اس سرمایہ داری، عسکریت اور ملوکیت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی، اور ہم صفحۂ کاغذ پر تخلیق کر کے خاموش نہ ہو جائیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حسن اور مذاق اور خودداری اور انسانیت کے منافی نہیں ہے۔''

آخر میں پریم چند نے ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کی شاخوں کو جگہ جگہ قائم کرنے کے لیے کہا۔ ''جہاں ادب کے تعمیری رجحانات کے باقاعدہ چرچے ہوں، مضامین پڑھے جائیں، مباحثے ہوں، تنقیدیں ہوں، جبھی ایسی فضا پیدا ہوگی جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے اور اس کی نشوونما ہو سکے۔''

زبان کے مسئلہ پر انھوں نے کہا کہ ''آئیڈیل کی وسعت کے ساتھ زبان خود بخود سلیس ہو جاتی ہے...... جو ادیب امرا کا ہے وہ امرا کا طرز بیان اختیار کرتا ہے جو عوام الناس کا ہے وہ عوام کی زبان لکھتا ہے۔'' اور اس یادگار جملے پر اپنے خطبے کو ختم کیا......

> ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے...... سُلائے نہیں...... کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''

اس خطبے کو پڑھنے میں (جو بعد کو چھپا تو پندرہ صفحہ کا تھا) کوئی چالیس پینتالیس منٹ کے قریب لگے۔ میرا اب بھی خیال ہے کہ ہمارے ملک میں ترقی پسند ادبی تحریک کی غرض و غایت کے متعلق شاید اس سے بہتر کوئی چیز ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے۔ ہم پریم چند کے افسانے اور ناول سے تو واقف تھے لیکن اُردو میں ان کا کوئی ادبی مضمون کبھی نہیں پڑھا تھا۔ انھوں نے ایسی چیزیں شاذ و

نادر ہی لکھی ہیں۔ چونکہ یہ ہماری زبان کے عظیم ترین حقیقت پسند افسانہ نگار کے پُرخلوص خیالات کا اظہار تھا، اس لیے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ دراصل ہمارے نئے حقیقت پسند اور عوامی زندگی کے آئینہ دار ادب کا وہ کارواں، جس کی رہنمائی بیس سال سے خود پریم چند اپنی نگارشات سے کر رہے تھے، اب نئی اور زیادہ صاف اور اونچی سطح پر بڑھنے کے لیے تیار ہے۔ ہم نوجوان ترقی پسندوں کا نقطۂ نظر اس وقت شاید صاف اور واضح نہیں تھا اور ہم اپنے جوش اور غصے میں کبھی بائیں طرف کو جھک جاتے، تو کبھی احتیاط اور مصلحت کا تقاضہ سمجھ کر دائیں طرف لڑھک پڑتے۔ لیکن اس موقع پر ہمارے صدر پریم چند کی روش میں کوئی ہیر پھیر اور ان کی فکر میں کوئی اُلجھاؤ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اس کا سبب ظاہر ہے۔ پریم چند ایک محنتی، محبّ وطن اور بے لاگ ادیب تھے، جو اپنے فن کو بہتر بنانے اور اپنے تجربے اور علم میں اضافہ کرنے کی فکر میں ہمیشہ لگے رہتے تھے۔ ہم نوجوانوں میں سے اکثر اپنے نظریاتی فلسفے اور تعلیم کی بنا پر ترقی پسندی کے راستے پر ابھی آ کر کھڑے ہوئے تھے۔ پریم چند زندگی کی مشکل کشمکش اور فنی تخلیق کی کاوش، یعنی عمل اور تجربہ کی بنیاد پر وہاں پہنچے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے افکار میں توازن، تاریخی تسلسل، جامعیت اور بردباری تھی۔ ان کی بات سچی معلوم ہوتی تھی، وہ سمجھ میں آتی تھی، اسی وجہ سے اس کا دل پر اثر ہوتا تھا۔

منشی پریم چند کے صدارتی خطبے کے بعد میں نے انجمن کی اس وقت تک کی تنظیمی صورت حال کے متعلق ایک مختصر سی رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ یہ رپورٹ انگریزی میں لکھی گئی تھی۔ یہ ناگزیر حقیقت ہمارے سامنے تھی کہ اس وقت تک کسی بھی کل ہند کانفرنس میں انگریزی زبان ہی ایک ایسی زبان تھی جو ہر صوبے کے پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان اس ملک کی کسی بھی زبان سے زیادہ مشترک تھی۔ ہماری حب الوطنی کو اس سے کراہت ضرور ہوتی تھی، لیکن اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہی نہیں کہ ایک دوسرے کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے مختلف صوبوں کے پڑھے لکھے لوگ انگریزی استعمال کرنے پر مجبور تھے، بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ اپنے ہی ملک کی دوسری زبانوں کے ادب سے واقفیت ہم کو انگریزی کے ذریعہ سے ہی ہوتی تھی۔ مثلاً انگریزی جاننے والے اُردو داں لوگوں نے رابندرناتھ ٹیگور کی تصنیفات بیشتر انگریزی کے ترجموں میں ہی

پڑھی ہیں، اور ہماری اپنی زبانوں میں ہمارے ملک کی مختلف زبانوں کے ادب کے ترجمے انگریزی کے مقابلے میں بہت کم ہوتے ہیں۔

کانفرنس کا پہلا سیشن خاتمہ کے قریب رہا ہوگا کہ ساغر نظامی، اُفتاں وخیزاں وارد ہوئے۔ ہمیں اس کی پہلے سے اطلاع تھی کہ وہ کانفرنس میں شرکت کے لیے آرہے ہیں اور ان کے ابھی تک نہ آنے کے سبب سے ہمیں فکر لاحق تھی۔ ساغر نظامی اُردو کے ان ممتاز شعرا میں ہیں، جن کی شاعری میں حب وطن کی پرجوش آوازیں گونجتی ہیں۔ جیسے ان کے شعر سنانے کے دلکش انداز ہیں، اسی طرح ان کے کلام میں ایک جاذب ترنم اور نغمگی ہوتی ہے، اور ان کی غنائیہ نظموں کے گلزار میں بھی جدید ہندستان کی آزادی کی ہوائیں چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ 'ایشیا' اس وقت اُردو کے بہترین، روشن خیال اور دیدہ زیب رسالوں میں سے تھا۔ ہماری تحریک سے ان کا ارتباط ہم سب کے لیے اطمینان اور خوشی کا باعث تھا۔

ساغر نظامی چونکہ میرٹھ سے آنے والے تھے، اس لیے ہم نے سوچا شاید ٹرین لیٹ ہوگئی ہو۔ لیکن مولانا نیاز فتح پوری بھی ابھی تک تشریف نہ لائے تھے۔ وہ تو لکھنؤ میں ہی تھے۔ انھوں نے ہمارے اعلان نامہ پر دستخط بھی کیے تھے اور کانفرنس میں مدعو کیے جانے پر شرکت کا وعدہ بھی کیا تھا۔ آخر وہ کیوں نہیں آئے؟ مہینہ ڈیڑھ مہینہ پہلے 'نگار' کے معزز مدیر کے پاس ڈاکٹر علیم کے ساتھ میں خود گیا تھا اور ترقی پسند تحریک کے متعلق گفتگو کی تھی۔ مولانا نیاز فتح پوری سے یہ میری پہلی ملاقات تھی، اور اس عہد کے اکثر اُردوداں نوجوانوں کی طرح میں بھی اپنے کو ان کی نثر نگاری کے نیازمندوں میں شمار کرتا تھا۔ علاوہ بریں، مولانا نیاز نے ایک محدود طریقے سے ہی سہی، لیکن کافی شدومد کے ساتھ مسلمانوں میں مروجہ مذہبی عقائد کی تنگ نظری کے خلاف کئی ملاؤں سے لڑائیاں لڑی تھیں۔ ان کی ادبی تحریروں میں رومانیت زیادہ مسرت انگیز اور بھرپور زندگی کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ حالانکہ غیر حقیقی عناصر سے ملمع آرائی اور اس کے تصنع سے ذہن اور روح کو پوری طرح سے تسکین نہیں ہوتی تھی۔ بہرصورت مولانا نیاز کی ذات اس وقت تک ایک پورے ادارے کی شکل اختیار کرگئی تھی اور اُردو ادب میں ان کی ایک خاص جگہ تھی۔ ہماری تحریک کے ساتھ ان کی ہمدردی قابل قدر تھی۔

ساغر صاحب نے ہمیں بتایا کہ ان کو کانفرنس میں آنے میں دیر اس وجہ سے ہوئی کہ وہ صبح سے نیاز فتح پوری صاحب کے یہاں بیٹھے تھے، اور مولانا نیاز فتح پوری اس کے منتظر تھے کہ کانفرنس کے منتظمین میں سے کوئی ان کے لیے سواری لے کر ان کے مکان پر پہنچے، تب وہ تشریف لے چلیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے انتظار کے بعد ساغر تو تانگہ پر بیٹھ کر خود ہی کانفرنس تک آ گئے، لیکن مولانا نیاز اس لیے تشریف نہیں لائے کہ کوئی انھیں لانے کے لیے نہیں گیا۔ وہ ہم سے روٹھ گئے تھے۔ ساغر صاحب نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ مولانا نے کانفرنس میں پڑھنے کے لیے ایک مقالہ بھی سپرد قلم فرمایا تھا، اس وجہ سے وہ ہم سے اور بھی زیادہ ناخوش تھے۔

ان باتوں کو سن کر ہمیں اپنی کوتاہی پر شرمندگی ہوئی اور اپنی محرومی کا رنج۔ لیکن ہم یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ ہماری کانفرنس میں شریک ہونے والے دو ممتاز ادیب پریم چند اور حسرت موہانی بالکل دوسری طرح سے ہماری کانفرنس میں آ کر شریک ہوئے تھے اور ان کے علاوہ بہت سے اور نوجوان ادیب ملک کے دور دراز علاقوں سے کرایہ کا خرچ قرض لے کر، تیسرے یا ڈیوڑھے درجہ میں سفر کر کے لکھنؤ تک پہنچے تھے اور تکلیف دہ جگہوں پر ٹھہرے تھے۔ پنجاب کی انجمن کے نمائندے فیض احمد فیض نے رشیدہ کو چپکے سے بتایا کہ ان کے پاس بس لکھنؤ آنے جانے بھر کا کرایہ تو تھا لیکن اب سگریٹ یا تانگہ کے کرائے تک کے لیے جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ یقینی ان لوگوں اور مولانا نیاز میں نمایاں فرق تھا، جو اپنے لکھنؤ کے مکان سے جو رفاہِ عام سے کوئی میل بھر کے فاصلے پر تھا، کانفرنس کے ہال تک سواری نہ پہنچنے کی وجہ سے نہیں آ سکے تھے۔ ظاہر ہے کہ مولانا کا مزاج نئی ترقی پسند تحریک کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ نہ تھا۔

بعد کے اجلاسوں میں جن لوگوں نے مقالے پڑھے، ان میں احمد علی، محمودالظفر، فراق تھے۔ بنگال کی انجمن کے سکریٹری نے جدید بنگالی ادب کے رجحانات اور بنگالی میں انجمن کی تنظیم پر لکھی ہوئی ایک اچھی رپورٹ پیش کی۔ گجرات، مہاراشٹر اور صوبہ مدراس کی زبانوں کے نمائندوں نے زبانی تقریریں کیں۔ یہ سب مقالے اور تقریریں انگریزی زبان میں تھیں۔ ساغر نظامی نے حب الوطنی اور آزادی کے موضوع پر اپنی کئی نظمیں سنائیں۔ احمد علی نے ترقی پسند ادب پر جو مقالہ لکھا تھا، اس میں نئی ادبی تحریک کے مقاصد اور اصول بتائے گئے تھے۔ اس کی ایک نمایاں

خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ادبی تنقید کے بعض فلسفیانہ نکات ریاضی کے فارمولوں کے ذریعہ سے سمجھائے گئے تھے جو معمولی سمجھ اور تعلیم رکھنے والے لوگوں کی فہم سے باہر تھے۔ اقبال اور ٹیگور کا ضمنی تذکرہ تھا اور انھیں رجعت پرست قرار دیا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ احمد علی کے مقالے کی اکثر خامیاں ان کی ذاتی کجرویاں نہ تھیں، بلکہ ہم میں سے اکثر کی تنقیدی کم نظری کا اظہار کرتی تھیں۔ ضرورت اس کی تھی کہ ہم احمد علی کے مقالے پر اچھی طرح بحث کرتے، ان کی خوبیوں کو سراہتے اور خامیوں پر نکتہ چینی نہ کرتے۔

لیکن ہم میں سے کئی، جو اِن خامیوں کو کسی قدر محسوس بھی کرتے تھے، ہنس کر چپ ہو گئے، اور ہم نے ایسا نہیں کیا۔ مشکل یہ تھی کہ احمد علی تنقید برداشت نہیں کر سکتے تھے اور اگر کوئی ان پر اعتراض کرے تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ شخص ایسا حسد کی وجہ سے کر رہا ہے اور اس کا مقصد ان کی ادبی حیثیت کو گرا کر انھیں بدنام کرنا ہے۔ اس ڈر سے احمد علی کے دوست بھی ان پر تنقید کرنے سے جھجکتے تھے۔ لیکن یہ ہماری بہت بڑی غلطی تھی۔ غالبًا اسی کا نتیجہ ہے کہ احمد علی رفتہ رفتہ خود پرستی کے خول میں گھس کر ادبی دنیا سے غائب ہو گئے اور ان کی معتد بہ ادبی صلاحیتیں اتنا ترقی نہیں کر سکیں جتنا کہ ممکن تھا۔ خود پرستی اور رجعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر کسی کو ''ہمچو من دیگرے نیست'' کا زعم ہو جائے تو پھر اس کے لیے اللہ کی باقی مخلوق سے اُنس کرنا ذرا مشکل ہے، اور جب تک باقی انسانوں سے محبت اور اپنے علاوہ دوسروں کا بھی دُکھ درد محسوس کرنے اور اس کا مداوا ڈھونڈنے کی صلاحیت نہ ہوگی، ترقی پسندی کیسے ہو سکتی ہے؟

فراق کے مقالے میں ہمارے ملک کی اُنیسویں اور بیسویں صدی کی تہذیبی اور مذہبی تحریکوں پر روشنی ڈالی گئی تھی (برہمو سماج، آریہ سماج، وہابی اور سر سید احمد خاں کی تحریکیں)، اور ساتھ ہی ساتھ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہندستان کی مختلف زبانوں میں جدید ادب کا ارتقا بھی انھیں تحریکوں سے وابستہ تھا۔ آخر میں یہ کہا گیا تھا کہ ترقی پسند ادب کی نئی تحریک دراصل ہمارے ملک کے تہذیبی ارتقا کا منطقی نتیجہ ہے۔ یہ مقالہ بہت جلدی میں لکھا گیا تھا اور مکمل بھی نہ تھا۔ لیکن فراق بہت دلچسپ مقرر بھی ہیں۔ اس لیے انھوں نے صرف مقالہ پڑھا ہی نہیں بلکہ آخر میں ایک چھوٹی سی تقریر بھی کی۔

فراق کی شخصیت کے سلسلہ میں اس زمانہ میں جو بات عجیب معلوم ہوتی تھی، وہ یہ تھی کہ ان کی اپنی شاعری اور ان کے ترقی پسند نظریوں میں کوئی خاص تعین نہیں معلوم ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ان کی شخصیت مختلف خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس وقت تک ان کی شاعرانہ فکر روایتی حدود کو توڑ نہیں سکی تھی۔ ان کا وہ مخصوص رنگ جس سے وہ محبت کی محرومیوں اور حسرت ناکیوں کو اندھیری رات کے جھلملاتے ہوئے تاروں کی طرح خوبصورت بنا کر انسانی روح کو زیادہ دردمندی بخشتے ہیں، اور ان کا وہ دھیما لہجہ، جو درباری راگ کے سُروں کی طرح اپنی سنجیدہ غمناکی سے جیسے زندگی کے وقار کو بیدار کرتا ہے، ابھی تک نہیں ابھرا تھا۔ ان کی ذہانت اور آزاد منشی نے انھیں ذہنی طور پر ترقی پسند تو بنا دیا تھا اور وہ ہماری تحریک سے وابستہ بھی ہو گئے تھے، لیکن جہاں تک ان کے فن کا تعلق تھا، وہ قدیم اُردو شاعری کی ان روایات سے معنوی طور سے وابستہ تھا جنھیں بعد کو فراق خود بڑی حد تک ترک کرنے والے تھے۔ فراق کے فن پر فراق کی ذہنی تبدیلی کا اثر جیسے نہیں کے برابر تھا۔ ہمارے اور کئی فنکاروں کی طرح فراق، اس وقت اپنی دوہری شخصیت کے تضاد کو حل کرنے کی کوشش شروع کر رہے تھے اور ایک ایماندار اور اچھے فنکار کے لیے یہ مرحلہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

یہاں صرف اتنی بات نہیں ہے کہ پُرانی ڈگر کو چھوڑ کر نئی راہ اختیار کر لی جائے، یا رجعت پسندی کے لباس کو اُتار کر ترقی پسندی کا نیا جامہ زیب تن کر لیا جائے۔ ہمیں ماضی سے تہذیب، فن اور زبان کا ایک بیش قیمت ترکہ ورثے میں ملا ہے۔ اس میں ہم نے اپنی استعداد اور ضرورت کے مطابق دوسرے ملکوں اور قوموں کی تہذیب، علم اور فن کی آمیزش کی ہے۔ اگر ہماری موجودہ انفرادی اور اجتماعی حیات اس کی متقاضی ہے کہ مادی فلاح، ذہنی ترقی، اخلاقی اور روحانی عروج کے لیے ہم نئے اور انقلابی وسیلے اختراع اور اختیار کریں، تو عقل و ہوش اور تجربے کا یہ پیہم مطالبہ اور ناگزیر تقاضا ہے کہ تہذیب، علم اور اخلاق کی وہ سچی اقدار جو ہماری قدیم اور عظیم قوم کو ورثے میں ملی ہیں، ہماری نئی تہذیبی تعمیر کے ضمیر میں پیوست اور جذب ہوں۔ کوئی نئی عمارت جو دیرپا ہو، ہماری ضرورتوں کو اچھی طرح پوری کرتی ہو اور جس کا حسن ہمارے لیے انبساط اور روحانی تسکین کا باعث ہو، آسانی سے نہیں بنتی۔ اس لیے اگر ہمارا کوئی فنکار اس کام میں تفکر و تاخیر سے کام لیتا ہے،

اگراس کے بہت سے تجربے ناکام ہوتے ہیں، اگر وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے، اگر اسے ماضی کی ان تخئیلی اور فنی روایتوں کو مسترد کرنے میں دیر لگتی ہے جو ہماری نئی سمجھ کے نزدیک مضر ہیں لیکن جن کی حسن کاری ابھی تک ہم کو متاثر کرتی ہے، تو ہمیں صبر سے کام لینا چاہیے۔ تہذیبی تجزیہ، تحلیل اور تعمیر بڑی عرق ریزی اور باریک بینی، پاکیزگیٔ نظر اور روحانی مجاہدہ کا کام ہے۔ ہم ادیبوں اور فنکاروں کی غلط نگاہی، ذہنی تساہل اور فکری جمود پر نکتہ چینی کر سکتے ہیں، ان کی معنوی سطحیت اور فنی ناپختگی پر انگلی رکھ سکتے ہیں، ان کی خود پرستی، بزدلی یا عوام سے غداری پر معترض ہو سکتے ہیں اور ایسی صورتوں میں ترقی پسند نقاد کا چپ رہ جانا ہی اپنے فرائض سے افسوس ناک کوتاہی ہے۔ لیکن اگر کسی فنکار میں انسانی درد اور آزادی خواہی کا جوہر موجود ہے تو پھر ہمارا سب سے بڑا مطالبہ اس سے یہی ہوسکتا ہے کہ وہ کاوش کرے اور زندگی کی سچائیوں کا بہتر اور زیادہ موثر طریقے سے اظہار کرے۔

مولانا حسرت موہانی مُصر تھے کہ انھیں پہلے ہی دن تقریر کا موقع دیا جائے۔ لیکن ہم کامیاب کانفرنس کرنے کے کچھ داؤ پیچ تو آخر جان ہی گئے تھے۔ پہلے ہی دن ہم اپنے بزرگ ترین اور بہترین مقررین کو بلوا کر محفل کی رونق ختم کر دینا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے ان کی تقریر دوسرے دن شام کے اجلاس میں ہوئی۔ مولانا نے اپنی تقریر میں پہلے تو ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کے اعلان نامے اور اس کے مقاصد سے پورے اتفاق کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ادب کو قومی آزادی کی تحریک کی ترجمانی کرنی چاہیے، اسے سامراجیوں اور ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنی چاہیے، اسے مزدوروں اور کسانوں اور تمام مظلوم انسانوں کی طرفداری اور حمایت کرنی چاہیے۔ اس میں عوام کے دکھ سکھ، ان کی بہترین خواہشوں اور تمناؤں کا اس طرح اظہار کرنا چاہیے جس سے ان کی انقلابی قوت میں اضافہ ہو اور وہ متحد اور منظّم ہو کر اپنی انقلابی جدوجہد کو کامیاب بنا سکیں۔ مولانا اپنے خیالات کو چھپانے یا کسی مصلحت کی بنا پر اس پر پردہ ڈالنے کے قائل تو تھے ہی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ محض 'ترقی پسندی' کافی نہیں ہے۔ جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہیے۔ اسے انقلابی ہونا چاہیے۔ انھوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اسلام اور کمیونزم میں قطعی کوئی تضاد نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کا جمہوری نصب العین اس کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان، اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں۔

چونکہ موجودہ دور میں زندگی کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے۔ اس لیے ترقی پسند ادیبوں کو انھیں خیالات کی ترویج کرنا چاہیے۔

آخر میں مولانا نے خود اپنی شاعری کا ذکر کیا اور ہنستے ہوئے کچھ اس قسم کی بات کہی کہ......

''آپ سوچتے ہوں گے...... جب میں ادیبوں کے سامنے یہ نصب العین پیش کررہا ہوں تو خود اس پر عمل کیوں نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ میری شاعری میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ لیکن آپ کو اس طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے...... آپ کو زندگی کے زیادہ اہم اور سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کرنا چاہیے، اور میں اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے خاص طور پر اسی لیے آیا ہوں کہ آپ کے ان مقاصد کی طرف داری اور حمایت کا اعلان کروں جو آپ کی تخلیق ہو۔ پُرانی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ وہ محض دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔ شاعری کے معاملے میں آپ کو میری تقلید کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں خود اس قسم کے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق میں آپ کی پوری طرح مدد کروں گا......۔''

مولانا حسرت موہانی کی تقریر سے ہمارا بہت دل بڑھا، اور مولانا اپنے قول کے پورے اترے۔ کانپور میں جب انجمن کی شاخ بنی تو مولانا حسرت اس کے صدر ہوئے۔ جب کبھی انجمن پر وہ حضرات حملہ کرتے تھے جن کے مکروہ رجعت پرست چہرے مذہب کی نقاب سے ڈھکے ہوتے تھے، تو مولانا حسرت موہانی تحریک کے لیے ہر وقت سینہ سپر ہوجاتے تھے اور انھیں منہ توڑ جواب دیتے تھے۔ لیکن مولانا سیاست کی طرح ادب میں بھی متحدہ محاذ کے تصور کے سخت متنفر تھے۔ ہمارے خیال میں ترقی پسند ادبی تحریک میں محض سوشلسٹ یا کمیونسٹ نہیں بلکہ مختلف عقائد کے لوگوں کے لیے جگہ تھی۔ انجمن ان سے وطنی آزادی اور جمہوریت میں یقین رکھنے کا مطالبہ کرتی تھی، اشتراکیت میں نہیں۔ مولانا اس معاملے میں انتہا پسند تھے۔ ان کے نزدیک ترقی پسند کے لیے اشتراکی ہونا ضروری تھا۔ ہمارے لیے یہ ضروری نہیں تھا۔

غنائیہ یا عاشقانہ شاعری کے متعلق، جسے مولانا فاسقانہ شاعری کہتے تھے، ہم میں سے اکثر کی رائے وہ نہیں تھی جو مولانا کی تھی۔ یہ صحیح تھا کہ جاگیری عہد کی ایسی عاشقانہ شاعری جس کے ذریعہ سے پست ہمتی، اخلاقی ابتذال، تقدیر پرستی اور شکست خوردگی کی تلقین کی گئی تھی، ہمارے لیے ناقابل

قبول تھی۔ لیکن ایسی شاعری جس میں سچی محبت کی کسک ہو یا جس میں انسان کی ناکامیوں اور محرومیوں کا اظہار کر کے اس کا تزکیہ نفس کیا جائے، جو ہم میں دردمندی اور پاکیزگی پیدا کرے، جس میں انسانی خصائل کو بہتر بنانے کی غرض سے افراد اور معاشرت پر تنقید ہو، جس سے ہماری زندگی کی زینت بڑھے، اور انسانی جذبات میں بلندی اور لطافت پیدا ہو، ہرگز ایسی نہیں ہے جسے رد کیا جائے۔ ایک ترقی پسند یا انقلابی کے لیے ایسی شاعری اتنی ہی ضروری اور مفید ہے جتنا کہ کسی دوسرے مہذب انسان کے لیے ایسی شاعری کا منتخب کلام، اور خود حسرت کی بہترین شاعری اسی زمرے کی ہے۔ مولانا نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا وہ ان کی انتہا پسندی اور کسر نفسی پر مبنی تھا۔

کانفرنس کے آخری دن کے شام کے اجلاس میں منجملہ اوروں کے سوشلسٹ لیڈروں جے پرکاش نرائن، یوسف مہر علی، اندو لال جنک اور کملا دیوی چٹو پادھیائے اور میاں افتخار الدین نے بھی شرکت کی۔ یہ لوگ اس زمانہ میں ملک کے درمیانہ طبقے کے ان روشن خیال نوجوانوں کی نمائندگی کرتے تھے جو سامراج دشمن انقلاب چاہتے تھے اور سوشلزم کے نئے نظریے کو اپناتے تھے۔ کملا دیوی نے کانفرنس میں ایک چھوٹی سی پُر جوش تقریر میں نئی تحریک کا خیر مقدم کیا۔ محترمہ سروجنی نائیڈو، بلبل ہند، بھی کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے لکھنؤ میں موجود تھیں۔ انھوں نے ہماری کانفرنس میں بھی شرکت کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے عین وقت پر بیمار ہو گئیں۔ انھوں نے کانفرنس کو ایک پیام لکھ کر بھیجا جو سُنایا گیا۔

کانفرنس میں ترقی پسند مصنّفین کا اعلان نامہ بھی پیش کیا گیا، اور اتفاق رائے سے منظور ہوا۔ اس اعلان نامہ میں، اور اُس میں جس کا مسودہ شروع میں لندن میں تیار ہوا تھا اور جس پر اس وقت تک ہم نے دستخط لیے تھے، صرف چند لفظوں کا فرق تھا۔ یہ ترمیمیں مہاراشٹر کے نمائندوں نے پیش کی تھیں جن کو سب نے منظور کر لیا۔

انجمن کا ایک دستور بھی منظور ہوا۔ اس کا مسودہ ڈاکٹر عبدالعلیم، محمودالظفر اور میں نے مل کر تیار کیا تھا۔ مجھے انجمن کا جنرل سکریٹری چنا گیا اور میرے سپرد انجمن کے مرکزی دفتر کو الہ آباد میں قائم کرنے اور چلانے کا کام ہوا۔ انجمن کی مجلس عاملہ کے بارے میں یہ طے ہوا کہ اس کے ممبروں

کومختلف صوبوں یا لسانی علاقوں کی انجمنیں چنیں گی۔ یہ طے ہوا کہ اس کی کوشش کی جائے کہ ہندستان کی ہر بڑی زبان کے علاقے میں علاقائی انجمنیں ہوں اور تمام صوبائی انجمنوں کے منتخب نمائندوں کی ایک کل ہند کونسل ہو، جس کا اجلاس کم از کم سال میں دو مرتبہ ہو۔

ان کے علاوہ کانفرنس میں چند اور تجویزیں بھی منظور ہوئیں جن میں سے دو اس لحاظ سے اہم تھیں کہ ان سے نئی تحریک کی بعض خصوصیات کا پتہ چلتا تھا۔

ایک تجویز میں مسولینی کے حبش پر جارحانہ حملے اور جاپان کے چین پر حملے کی مذمت کی گئی۔ اس تجویز میں شہنشاہیت اور سامراجی جنگوں کی مذمت کی گئی اور ہندستانی ادیبوں کے آزادی خواہ جمہوری اور امن پسند جذبات کا اظہار کیا گیا۔ دوسری عالم گیر جنگ کے بادل اس وقت آسمان پر منڈلا رہے تھے۔ ترقی پسند ادیبوں نے کہا کہ ان کا فرض ہے کہ تمام دوسرے امن پسندوں کے ساتھ مل کر وہ اس جنگ کو روکنے کی کوشش کریں گے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کی تحریک اپنے قیام کی ابتدا سے ہی امن، آزادی اور جمہوریت کی طرف دار تھی اور قوموں کی آزادی اور عالمی امن کو تہذیب کی بقا اور نشو نما کے لیے ضروری خیال کرتی تھی۔

دوسری تجویز میں افراد، جماعتوں اور اِداروں کی آزادیٔ رائے اور خیال کے جمہوری حق کی حمایت میں آواز بلند کی گئی۔ برطانوی حکومت نے پریس کے قوانین، بغیر مقدمہ چلائے گرفتاری اور دوسری پابندیاں عائد کر کے ان حقوق کو چھین لیا تھا۔ تعزیرات ہند کی دفعہ 124 (حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے) کے ذریعہ، اخباروں اور رسالوں کو بند کر کے، اور ان کی اشاعت میں رکاوٹ ڈال کر، ترقی پسند کتابوں کو ضبط کر کے، ایڈیٹروں اور مصنفوں کو گرفتار کر کے ان انسانی حقوق کو بالکل سلب کر دیا تھا۔ ترقی پسند مصنّفین نے اس کی مذمت کی اور انجمن کو یہ ہدایت کی کہ ملک کی تمام دوسری جمہوری تحریکوں کے ساتھ تعاون کر کے وہ آزادیٔ رائے اور خیال کے بنیادی انسانی حق کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

تاریخ شاہد ہے کہ رجعت پرست حکمرانوں اور برخود غلط حکومتوں نے سچائی کی آواز کو ہمیشہ جبر اور تشدد کے ذریعے دبانے کی کوشش کی ہے۔ آزاد ذہن، راست گو زبان اور بے باک قلم

کو اگر وہ خرید نہیں سکے اور مرعوب نہیں کر سکے، تو انھوں نے آہنی زنجیر اور سلاخ، زہر کے پیالے اور جلاد کی تلوار سے کام لیا۔ لیکن تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان کی آزاد روح کو کبھی مقید نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی سچا مبلغ، شاعر، عالم یا فنکار، جس کے کلام یا نظریے میں اس کے زمانے کی ارتقا پذیر حقیقت کی جھلک اور چمک ہو، دبایا نہیں جا سکتا۔ اگر بہ جبر اس کی زبان بند بھی کر دی جائے اور اس کا قلم توڑ بھی دیا جائے تو وہی حقیقت جس کے آزادانہ اظہار کی اجازت نہیں دی گئی، ہزاروں، لاکھوں عوام کے دلوں سے صاف چشموں کی طرح پھوٹ پڑتی ہے۔ اخلاق، علم اور عمل کی نئی راہیں کھل جاتی ہیں اور نئے پُرانے کی کشمکش اور تصادم سے حرکت اور تیزی کرتا ہوا زندگی کا دھارا تاریخ اور تنگ وادیوں سے نکل کر شاداب اور روشن مرغزاروں کی طرف بڑھ جاتا ہے۔

ہماری یہ تجویزیں، جنھیں حکومت اور اس کے نقارچیوں نے سیاسی قرار دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ترقی پسند مصنّفین کی تحریک ادبی کم اور سیاسی زیادہ ہے اور اس لیے خالص اور اصلی ادیبوں کو اس سے علاحدہ رہنا چاہیے، فی الحقیقت ہماری تہذیبی زندگی میں ایک قدیم اور مستحسن تہذیبی روایت کا اعادہ کرتی تھیں، اور اسے منظّم شکل عطا کرتی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب سرزمین ہند کے ادیب باقاعدہ اور منظّم طور پر اور اپنے عہد کی ضرورتوں اور حالات کے مطابق یہ تہیہ کر رہے تھے کہ وہ آزادی اور سچائی کی خدمت کریں گے، اور کسی کی نہیں۔ فرق یہ تھا کہ جمہوری فتح کے اس نئے دور میں میر، سودا، غالب اور بہت سے دوسرے عظیم فنکاروں کی طرح انھیں امیر حکمرانوں کی کور باطنی اور جوہرِ اصلی کی بے قدری پر خون کے آنسو بہانے کے بجائے آزادی خواہ عوام کی پشت پناہی سے الہام اور قوت حاصل ہو سکتی تھی۔ اب ان کی تنہائی اور بیچارگی کا روح فرسا احساس مٹ سکتا تھا اور مٹ رہا تھا۔ انجمن میں ان کے بے شمار راز داں پیدا ہو گئے تھے۔ [1]

کانفرنس ختم ہوئی اور ہمیں اس کے خاتمہ پر اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا احساس اور نئی ذمہ داریوں سے پیدا ہونے والی فکر اور پریشانی، اُس خوشی سے بہت زیادہ تھی، جو کسی کام کے خیر و خوبی کے ساتھ خاتمہ کے بعد ہوتی ہے۔ کانفرنس نے ہمارے نصب العین کو متعین کر دیا تھا اور اس نقشے کو

---

[1] گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں ـــ یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

علامہ اقبال

بالآخر مکمل کردیا تھا، جس کے مطابق ملک کے تمام ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم ہونی چاہیے۔

ابھی بہت سے ادیب ہماری تحریک میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ انھیں منظّم کرنا، انجمن کی نئی شاخیں کھولنا اور انھیں چلانا، مرکز کو قائم کرنا اور باضابطگی سے چلاتے رہنا، ان کاموں کے لیے فنڈ جمع کرنا، مرکز سے اطلاع نامہ اور رسالہ شائع کرنا، جو ساری تحریک کو کل ہند پیمانے پر منسلک کر سکے...... یہ سب کام اہم اور مشکل تھے۔ لیکن ایک ادبی ادارے کے لیے تنظیم فروعی چیز ہے۔ اصل کام تو نئے اصولوں اور مقاصد کے مطابق، ملک کی مختلف زبانوں میں ادبی تخلیق اور تنقید ہے۔ شعر، افسانہ، ناول، ڈرامہ، مضمون لکھنا اور شائع کرنا ہے۔ یقیناً ہمارے ساتھ ملک کے چند بڑے ادیب تھے۔ وہ تو لکھتے ہی تھے اور اب بھی لکھتے رہیں گے۔ سوال اصل میں یہ تھا کہ ترقی پسند مصنّفین کی نئی تحریک، نئے لکھنے والے پیدا کرے گی یا نہیں......؟ نوجوان ادیبوں کو اپنے حلقے میں کھینچنے میں کامیاب ہوگی یا نہیں......؟ اور یہ نئے ادیب قابل توجہ اور اچھے ادب کی تخلیق کر سکیں گے یا نہیں......؟

اس دن شام کو جب سب کاموں سے فارغ ہوکر، تھکے ماندے ہم گھر آئے اور کھانا کھا کر بات چیت کرنے کے لیے بیٹھے تو منشی پریم چند اور رشید جہاں کے علاوہ ہم تین چار آدمی (محمود الظفر، فیض، علیم، میں) شاید کچھ چپ چپ تھے۔ علاوہ اور باتوں کے ایک تو یہی فوری پریشانی تھی کہ کانفرنس کے لیے کرایہ پر جو چیزیں آئی تھیں، ان کا کرایہ کہاں سے ادا کریں گے۔ پھر بابو جینندر کمار نے اُردو ہندی کی لاحاصل بحث چھیڑ دی تھی۔ اس سے مجھے کوفت ہو رہی تھی لیکن پریم چند خوش نظر آرہے تھے۔ وہ رشیدہ کی باتوں پر زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے، جو اپنے مخصوص انداز میں کبھی مولانا حسرت موہانی اور ڈاکٹر علیم کی داڑھیوں کا مقابلہ کر رہی تھیں، کبھی احمد علی کے مقالے میں ریاضی کے فارمولوں پر تبصرہ، کبھی ساغر نظامی کی چست شیروانی اور اس سے بھی چست چوڑی دار پائجامے پر تنقید۔ جب پریم چند کی باری آئی تو انھوں نے ہم نوجوان ترقی پسندوں کی حرکتوں پر مشفقانہ انداز میں نکتہ چینی شروع کی...... ''بھئی یہ تم لوگوں کا جلدی سے انقلاب کرنے کے لیے تیز تیز چلنا تو مجھے بہت پسند آتا ہے۔ لیکن میں ڈرتا ہوں کہ اگر کہیں تم بے

تحاشا دوڑنے لگے تو ٹھوکر کھا کر منہ کے بل ِگر نہ پڑو......اور میں ٹھہرا بوڑھا آدمی، تمھارے ساتھ اگر میں بھی دوڑا اور گرا تو مجھے تو بہت ہی چوٹ آجائے گی......'' یہ کہہ کر انھوں نے بڑی زور کا قہقہہ لگایا اور ہم سب بھی ان کے ساتھ ہنسنے لگے...... ''لیکن کچھ بھی ہو۔ ہم تو اب آپ کا ہاتھ نہیں چھوڑتے!'' رشیدہ نے ہنستے ہنستے جواب دیا۔

OOO

تحریک کے بنیادی مسائل

ابھی ہمارے کارواں کی صفیں مرتّب ہو ہی رہی تھیں، اور ترقی پسند اَدب کی تحریک نے بہ مشکل دشوار اور پیچیدہ راستے پر پہلے ڈگمگاتے قدم بڑھائے تھے کہ اس پر اَچانک حملے شروع ہو گئے، اور اِسے ایک ناگہانی اور المناک مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔

ہمیں اِس بات کا علم تھا کہ سرکار بہادر ہماری سرگرمیوں سے خوش نہیں ہے۔ اس کے نزدیک یہ بات ازحد مفسدانہ تھی کہ ہندستان کے اَدیب منظّم طور سے اور باقاعدہ اعلان کرکے یہ کہیں کہ اَدیبوں کو وطن کی آزادی کا طرف دار اور عوام کے دکھ سکھ کا ترجمان ہونا چاہیے۔ ترقی پسند اور آزادی خواہ تو ملک میں کافی تھے۔ لیکن ابھی تک ملک کی کسی اَدبی انجمن نے یہ جرأت نہیں کی تھی۔ استعمار پرستوں کی ایک واضح تہذیبی اور اَدبی پالیسی تھی۔ اس کا مقصد اپنی سرپرستی اور مدد سے ملک میں ایسی تعلیم دینا اور ایسے خیالات پھیلانا تھا، جو انگریز حکمرانوں اور مغربی سرمایہ دارانہ تہذیب اور تمدن کی فوقیت کا احساس پیدا کرکے ہماری قوم میں کمتری اور کمزوری کا احساس پیدا کرے، جو علم کے بجائے جہالت اور تعصب پھیلائے، اور جو سامراجی لوٹ اور ظلم اور اس کے تکبر اور بربریت پر پردہ ڈالے۔ اس کا مقصد ملک میں تمام ایسے رجعت پسند اور دقیانوسی خیالات اور عقیدوں کو ابھارنا تھا، جن سے اس نیم براعظم میں رہنے والی مختلف اقوام اور قوتوں میں نفاق اور افتراق بڑھے اور وہ آزادی کے لیے متحد ہونے کے بجائے ایک دوسرے سے خوف زدہ رہیں۔

ایک دوسرے سے لڑتے رہیں اوراس طرح بیرونی حکمرانوں کی چودھراہٹ کے لیے جواز باقی رہے۔ ان دقیانوسی خیالوں اور عقائد کا منبع اور مخرج یہاں کا فرسودہ جاگیری نظام تھا۔ اگر ان خیالات کے ذریعہ سے عوام کو اب بھی گمراہ کر کے ورغلایا جا سکتا تھا تو اس کا سبب صرف یہ تھا کہ انھیں ان رجواڑوں اور جاگیرداروں، اور چند اُن بڑے پونجی پتیوں کی، جو انگریز سرمایہ داری کے طرف دار تھے، اور خود سامراجی نظام حکومت کی حمایت اور پشت پناہی حاصل تھی۔

یہ خیالات اور عقیدے کبھی مذہب اور دھرم کے چولے میں پیش کیے جاتے، کبھی روحانیت کے، کبھی قدیم تہذیب اور تمدن کے نام پر، کبھی ان پُرانے قومی یا مذہبی تنازعوں کی یادوں کو تازہ کر کے جن کی تاریخی حیثیت تو تھی، لیکن جن کا زندہ کرنا یا برقرار رکھنا محض قومی اتحاد کو روکنے اور آزادی کی متحدہ جدوجہد میں رخنہ ڈالنے کی غرض سے ہوتا تھا۔

ترقی پسند اَدب کی تحریک کا مقصد اس قسم کے تمام غیر جمہوری اور وطن دشمن تصورات اور رجحانات کی مخالفت کرنا تھا۔ منظّم رجعت پرستی کی سب سے بڑی قوت، یعنی انگریزی سرکار نے اس ''خطرے'' کو محسوس کیا اور نہایت زیرکی کے ساتھ تحریک پر وار کیا۔ ہوا یہ کہ ہماری پہلی کانفرنس کے بعد جب ملک میں متعدد مقامات پر انجمن کی شاخیں قائم ہوگئیں، ان کے جلسے ہونے لگے اور اَدیبوں اور دانشوروں کے گروہ باقاعدگی سے جمع ہو کر ترقی پسند اَدب کے مسائل پر بحثیں کرنے لگے تو کلکتہ کے نیم سرکاری انگریز سرمایہ داروں کے اخبار ''اسٹیٹس مین'' میں قسطوار دو لمبے لمبے مضامین شائع کروائے گئے۔ لکھنے والے نے اپنا نام نہیں دیا، بلکہ یہ مضامین ''ہمارے خاص نامہ نگار کی جانب سے'' تھے۔ بعد کو ہمارے ایک دوست نے باوثوق ذریعہ سے بتایا کہ دراصل یہ مضامین حکومت ہند کے سنٹرل انٹیلی جنس بیورو (مرکزی سیاسی خفیہ پولیس) میں لکھے گئے تھے۔ ان مضامین میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ترقی پسند اَدب کی تحریک دراصل اس سازش کا نتیجہ تھی جو لندن میں رچی گئی تھی۔ اس کے پیچھے کمیونسٹ انٹرنیشنل کا ہاتھ ہے جو چند ہندستانی کمیونسٹ طلبا کے ذریعہ ہندستان کے دانشوروں میں اپنا جال بچھانا چاہتا ہے۔ اس کا اصلی مدعا ملک میں فساد اور خونی انقلاب برپا کرنا اور حکومت کا تختہ اُلٹنا ہے، ملک میں نراج پھیلانا ہے، مذہب اور دھرم اور اخلاق کو برباد کرنا ہے۔ اس لیے ہر اس آدمی کو جسے اپنا دین

ایمان عزیز ہے، جو امن و امان چاہتا ہے، جو سرکار کی مخالفت کر کے اپنے سر پر مصیبت مول لینا نہیں چاہتا، اُسے اس تحریک سے الگ رہنا چاہیے۔ مشرق کی روحانیت اور دین داری کا بھی یہی تقاضا بتایا گیا کہ اس قسم کی تحریک کو ایشیا کے ایک قدیم ''روحانیت پرست'' اور مادہ پرستی کے مخالف دیس میں پنپنے نہ دیا جائے۔

ترقی پسند اَدیب گزشتہ 16-15 سال میں اس قسم کے الزام سننے کے عادی ہو گئے ہیں اب ہمارے ملک میں نہ ترقی پسند اَدب کی تحریک نئی ہے اور نہ کمیونسٹ تحریک۔ دنیا کو ہٹلری پروپیگنڈہ کا تجربہ ہو چکا ہے اور آج کل امریکہ کی اسی قسم کی ہذیان سرائی سے سمجھدار آدمیوں کے دماغ پک گئے ہیں۔ لیکن اس وقت جبکہ ہماری تحریک کا آغاز تھا، ایسا نہیں تھا۔ ہم ترقی پسند اَدیبوں کی انجمن میں جو تھوڑے سے کمیونسٹ تھے وہ تو اس کے عادی ہو چکے تھے کہ خفیہ پولیس ان پر کڑی نگرانی رکھے اور وہ اکیلے بھی نہیں تھے۔ ہر وہ شخص جو ملک کی کسی بھی ایسی جماعت کا سرگرم کارکن تھا، جو آزادی خواہ تھی، انگریزوں کے راج میں بدمعاشوں کے زمرے میں شمار ہوتا تھا۔ اس کا روزگار ہر وقت خطرے میں رہتا تھا اور جیل کے دروازے اسے قید و بند میں لے لینے کے لیے ہمیشہ وا رہتے تھے۔ البتہ بہت سے بے ضرر قسم کے ایماندار دانشور جو کسی یونیورسٹی یا کالج میں پڑھاتے تھے، سرکاری دفتروں میں ملازم تھے، یا ایسے طالب علم، جو اَدب سے ذوق رکھتے تھے، لیکن سرکاری نوکری کے خواہاں تھے یا جن کے روزگار کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح کسی سرکاری محکمے سے دور سے بھی ملتا تھا، اب اسٹیٹس مین کے ان مضامین کے بعد سرکار کے عتاب اور خشونت کی زد میں آ گئے۔ ہر شخص یہ جانتا تھا کہ مضمون نگار کے خیالات سرکاری خیالات ہیں، اور اگر اس کے بارے میں کسی کو شبہ بھی تھا تو بہت جلد رفع ہو گیا۔ ہمیں پتہ چل گیا کہ ہمارے جلسوں میں خفیہ پولیس والے آنے لگے ہیں اور یہ کہ اپنے فرعونی دستور کے مطابق مقامی خفیہ پولیس اور سرکاری لوگ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ترقی پسند مصنّفین کی انجمن ایک باغیانہ جماعت ہے اور سرکار اس کے کارکنوں کے خلاف کارروائی کرے گی۔

ہماری تحریک پر اس صورت حال کا اثر مختلف طریقوں سے نمایاں ہوا۔ ہمارے بعض ہمدرد اور بہی خواہ سرکاری ملازم تھے۔ مثلاً پنڈت امرناتھ جھا، الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر۔

جھا صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اَدب اور اَدیبوں کی سرپرستی کرنے میں لطف آتا ہے۔ وہ اُردو شاید لکھ نہیں سکتے۔ لیکن اُردو شاعری کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ وہ اَدب میں فنی خوبی کے متلاشی رہتے ہیں اور ان کی نظر میں اگر نئے ترقی پسند اَدب کی کسی تخلیق میں فنی لطافت ہے تو وہ بھی اسی قدر توجہ کا مستحق ہے جتنا کہ اور کسی قسم کا اَدب۔ وہ ہندی کو اُردو پر ترجیح دیتے ہیں، ہندی کے اَدیب ہیں لیکن ایک سچے عالم کی طرح ان کے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک زبان کو پسند کیا جائے تو دوسری کی مخالفت اور مذمت کی جائے۔ ہمیں ان کے بعض نظریوں سے اختلاف تھا اور ان کو ہم سے۔ بعض لوگ ان کی پیٹھ پیچھے یہ کہتے تھے کہ جھا صاحب کا مبلغ علم دراصل اس سے کم ہے، جتنا وہ ظاہر کرتے ہیں اور ان کے مکان ''مایا'' کی خوبصورت اور اچھی اچھی تصویروں اور جدید ترین کتابوں سے بھری ہوئی لائبریری میں اکثر کتابیں پڑھی نہیں گئی ہیں۔ مجھے اس کا علم نہیں۔ بہرصورت علم اور آرٹ کی یہ نمائش بھی دلچسپ تھی۔ جھا صاحب جب ہمیں اپنی لائبریری میں الہ آباد کی انجمن کے جلسے کرنے کو بلاتے تھے تو اس کے حسن میں اور بھی اضافہ ہو جاتا تھا۔ لیکن اب جھا صاحب نے مجھے مطلع کیا کہ ایسا نہ ہو سکے گا۔ حالانکہ ان کی ہمدردی اَدب کی اس تحریک سے قائم رہی، لیکن چونکہ وہ انڈین ایجوکیشنل سروس کے آدمی تھے، اس لیے اب وہ تحریک کے ساتھ کھلا تعلق نہ رکھ سکیں گے۔ جھا صاحب نے ایک خط کے ذریعے سے ہمیں یہ بھی بتایا کہ میں نے انجمن کے اعلان نامہ پر دوسرے لوگوں کے دستخط کے ساتھ ان کے دستخط بھی اخباروں میں شائع کر کے غلطی کی۔ چنانچہ میں نے اخبار میں اس کی تردید کر دی۔ اس کے باوجود جھا صاحب کی ہمدردی اور حمایت مختلف طریقوں سے قائم رہی۔ اس طرح اور کئی صاحبان جو سرکاری ملازم تھے، با دل ناخواستہ انجمن سے علاحدہ ہو گئے۔

البتہ جو لوگ براہ راست سرکاری ملازم نہ تھے لیکن کسی یونیورسٹی یا کالج کے ملازم تھے، مثلاً فراق، فیض، احمد علی، ہیرن مکھرجی، ڈاکٹر علیم، احمد آباد کے گودی والا، ڈاکٹر اعجاز حسین وغیرہ، ان پر سرکار کے اس رویہ کا کوئی اثر نہیں پڑا اور وہ بدستور تحریک سے منسلک رہے۔

بعض ایسے طالب علم جو آئی۔ سی۔ ایس یا اور کسی سرکاری مقابلہ کے امتحان میں بیٹھنے کی تیاری کر رہے تھے، دور اندیشی اور احتیاط کا تقاضہ سمجھ کر انجمن کے جلسوں سے کنارہ کش ہو گئے۔

بعض ایسے بھی تھے جو انجمن کے جلسوں میں تو شریک ہوتے تھے لیکن انجمن کے ممبر نہیں تھے۔ یہ لوگ بدستور شرکت کرتے رہے۔

خود انجمن کے کارکنوں میں سرکاری حملے کے پیش نظر کئی قسم کے رجحانات پیدا ہو گئے۔ ایک طرف وہ جوشیلے لوگ تھے جن کے سینوں میں انقلاب کی آگ بھڑک رہی تھی، اور جو یہ سمجھتے تھے کہ حکومت یا اس کے اشارے پر ہم پر جو حملہ کیا جائے اس کی طرف توجہ کرنے کی مطلق کوئی ضرورت نہیں ہے، نہ ہی ہمیں اس کا جواب دینے کی ضرورت ہے۔ ہمیں تو مستعدی سے اپنی اپنی ڈگر پر چلتے رہنا چاہیے۔ اگر کچھ لوگ خائف ہو کر ہم سے کٹ بھی جاتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسا کر کے وہ خود اپنی بزدلی اور کمزوری کا مظاہرہ کریں گے، اور تحریک کے لیے صرف چند مضبوط اور سخت قسم کے لوگوں کی معیت ہی ایسے لوگوں کے ساتھ ہونے سے بہتر ہے۔ اس طرح تحریک مضبوط ہو گی، کمزور نہیں۔

دوسرے کنارے پر وہ لوگ تھے جو دبی زبان سے یہ کہتے تھے کہ انجمن ایک اَدبی ادارہ ہے، اور اس کا کام اَدب کی تخلیق ہے تو اگر وہ موجودہ حالات میں سیاست سے بالکل کنارہ کش ہی رہے تو کیا حرج ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے اعلان نامہ میں انجمن کے مقاصد میں اس جملہ کی موجودگی جس میں کہا گیا ہے...... ''رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کر کے اہل ملک کی آزادی کی کوشش کرنا'' غیر ضروری ہے۔ اس ایک جملہ کی وجہ سے انجمن کو اس کے مخالف سیاسی جماعت کہہ کر بدنام کرتے ہیں۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں کہ اسے حذف کر دیا جائے؟ اس کے بعد حکومت یا کسی اور کو یہ کہنے کا بالکل موقع نہیں رہے گا کہ انجمن سیاسی جماعت ہے یا سرکار کے خلاف ہے۔ زیادہ سے زیادہ اَدیب اس میں شریک ہو سکیں گے اور انجمن کا کام آسانی سے چلایا جا سکے گا۔

لیکن آپس میں صلاح و مشورے کے بعد ہم نے جو روش اختیار کی وہ ان دونوں سے مختلف تھی۔ اوّل تو یہ سمجھنا غلط تھا کہ حکومت کے جھوٹے پروپیگنڈہ اور اس کی دہشت انگیزی سے تحریک کو نقصان پہنچنے کا کوئی خطرہ نہیں، اور اگر کچھ لوگ ہم سے اس سبب سے الگ ہو جائیں تو تحریک کمزور نہیں، مضبوط ہو گی۔ انگریز سامراجیوں نے احمقانہ طریقہ سے نہیں بلکہ زیرکی اور

چالاکی کے ساتھ تحریک پر حملہ کیا تھا۔ استعمار پرست سمجھتے تھے کہ چونکہ ترقی پسند ادب کی تحریک سے دانشوروں میں اور ان کے ذریعہ سے عوام میں آزادی اور جمہوریت کے تصورات کا فروغ ہوگا، چونکہ ایسے ادب کے ذریعہ سے عوام میں پست ہمتی اور نفاق کی جگہ لوگوں میں غلامی اور استحصال کو ختم کرنے اور ایک نئی بھرپور اور حسین زندگی کی تعمیر کا جذبہ پیدا ہوگا، چونکہ اس کے ذریعہ سے تنگ نظری اور خودغرضی کی جگہ حُبّ الوطنی اور اونچے مقاصد کے لیے قربانی کا احساس بڑھے گا، اس لیے سامراجی اور اس کے حمایتیوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو، ایسی تحریک کو ابھرنے، بڑھنے اور پھیلنے سے روکا جانا چاہیے۔ لیکن قوموں اور عوام کی آزادی کو سلب کرنے والے اور انھیں لوٹنے والے حکمراں گروہ یا طبقے کبھی بھی اپنے اصلی مقاصد کا صاف اور سچا اظہار نہیں کرتے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ محض ظلم اور تشدد کے ذریعہ استحصال کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اس کے لیے لوٹے جانے والے عوام کو ذہنی اور جذباتی طور سے گمراہ کرنا بھی ضروری ہے۔ جس تناسب سے قوموں اور عوام کا شعور بیدار ہوتا ہے اور غلامی کے جوئے کو اُتار کر پھینکنے کے لیے ان میں حرکت اور زندگی کے آثار نمودار ہوتے ہیں اسی تناسب سے ایسے حکمرانوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ جبر، ظلم اور تشدد کے ساتھ ساتھ کذب، فریب اور ریاکاری کے اسلحہ کو زیادہ شدت اور بے حیائی کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ رائے جلی، رائے خفی میں اور رائے خفی، رائے جلی میں بدل جاتی ہے۔

انگریز سامراجی اس فن کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ چنانچہ ہمارے خلاف جو مضامین شائع ہوئے تھے ان میں دو باتیں نمایاں تھیں۔ پہلے تو ان میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ترقی پسند ادب کی تحریک اس ملک کی پیداوار نہیں ہے۔ وہ ایک بیرونی، غیر ہندستانی شے ہے۔ اس کا مقصد آزادی خواہی، عوام دوستی اور جمہوریت پسندی نہیں ہے۔ بلکہ ایک مکروہ سازش کے ذریعہ اور بدترین طریقوں کو استعمال کر کے وطن کو ایک ظالمانہ بداخلاق اجنبی طاقت (روس) کا غلام بنانا ہے۔ اس طرح ہماری تحریک کی بنیاد یعنی حب الوطنی اور آزادی خواہی کو ہی مشتبہ بتایا گیا۔

تحریک پر دوسرا حملہ اس پہلو سے کیا گیا کہ وہ ہماری قدیم مشرقی تہذیب، ہماری عظیم تمدنی، اخلاقی اور روحانی روایات کی منکر اور مخالف ہے۔ اس کا مقصد پاکیزہ ادب کی تخلیق اور تہذیبِ نفس نہیں بلکہ بے ادبی پھیلانا اور تذلیل نفس ہے۔ وہ انسانی دماغ اور روح کو بلندی کی

طرف لے جانے کے بجائے، دماغ میں انتشار اور نظام اخلاق میں بے ضابطگی پھیلا کر انسان کو حیوانیت اور مادہ پرستی کی طرف لے جائے گی۔

یہ الزامات جھوٹے تھے۔ ان کے ذریعہ لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہم پر یہ الزام دھرنے والے ریاکار تھے۔ کیونکہ انھیں ہمارے وطن، ہماری قوم اور اس کے تمدن سے محبت نہیں تھی۔ وہ تو خود اس کے سب سے بڑے دشمن اور برباد کرنے والے تھے۔

لیکن چند لوگوں کی نظر میں جو چیز صاف ہو، اس کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ سب کی نظر میں صاف ہے، دانشمندی نہیں۔ ہمارے مخالفین نے اپنے پروپیگنڈہ میں جھوٹ کے ساتھ سچ بھی ملایا تھا۔ انھوں نے ہماری قوم کے نازک ترین جذبات کو چھیڑ کر اس کے سخت عقائد اور اس کے قدیم اور اندھے تعصّبات کو اُبھار کر ایک ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی تھی، جس میں یہ احساس عام ہو جائے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک سے ہمارا سب سے بیش قیمت سرمایہ یعنی ہمارا تمدن، ہمارا اخلاق اور ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس طرح ہماری قوم سے ہمیں کاٹ کر اور تنہا کر کے سامراجیوں کے لیے آسان ہو جاتا کہ وہ ہمارے خلاف دہشت اور تشدد کے قانونی اور لاقانونی حربے استعمال کر کے ہمیں مجروح اور کمزور کر دیں۔

اس لیے ہمارے لیے یہ سب سے ضروری تھا کہ ہم بڑی سنجیدگی اور بُردباری کے ساتھ اس خطرناک پروپیگنڈہ کا جواب دیں، اپنے مخالفین کی کوششوں کو ناکام بنائیں اور اپنی قوم اور اس کے دانشوروں کے حلقے سے کٹنے اور علاحدہ ہونے کے بجائے یہ کوشش کریں کہ سچائی کی روشنی خود مخالفوں کے مکروہ چہروں پر پڑے اور لوگ جھوٹ سچ میں تمیز کر سکیں۔

چنانچہ ہم نے مختلف اخباروں اور رسالوں میں مضامین اور بیانات شائع کیے جن میں ''اسٹیٹس مین'' کے مضامین کا جواب دیا گیا تھا۔ ہم نے اپنے جلسوں میں اس مسئلہ پر عام بحث کی اور اپنے تمام ممبروں اور ہمدردوں کے سامنے انجمن کی صحیح پوزیشن پیش کی۔

اس سلسلہ میں یہ ضروری تھا کہ انجمن کے کمیونسٹ کارکنوں اور ممبروں کی پوزیشن، صفائی اور وضاحت کے ساتھ انجمن اور عام پبلک کے سامنے پیش کی جائے۔ مخالف مضمون نگار کے خاص موردِ عتاب ہم ہی تھے۔ ہم ہی وہ تھے جو گویا انجمن کے اندر ایک سازش کے ملزم بنائے گئے

تھے۔ ہم ہی کو کمیونسٹ، انٹرنیشنل اور روس کا آلہ کار گردانا گیا تھا۔ ہندستان میں کمیونسٹ پارٹی اس زمانے میں غیر قانونی تھی۔ لیکن ہمارے بارے میں عام طور سے یہ مشہور تھا کہ ہم کمیونسٹ ہیں۔ ہم میں سے چند ایسے بھی تھے جو انگلستان میں تعلیم حاصل کر چکے تھے (مثلاً ہیرن مکھرجی، محمود الظفر، سجاد ظہیر) اور ہم انجمن کے اہم عہدے دار تھے۔ اس لیے ''اسٹیٹس مین'' کے اس الزام میں کہ یورپ سے پڑھ کر آنے والے کمیونسٹ نوجوان اس تحریک میں پیش پیش ہیں، سچائی کا ایک شائبہ تھا۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ انجمن کی پہلی شاخ انھیں ہندستانی طلبا کے ایک گروہ نے سب سے پہلے لندن میں قائم کی تھی۔ باقی جو باتیں سازش، کمیونسٹ انٹرنیشنل کی گہری چال وغیرہ کے بارے میں تھیں، وہ جھوٹی تھیں۔ ان الزامات کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن تھوڑی سی سچائی کے ساتھ بہت سے جھوٹ ملا کر جو دلیل پیش کی گئی تھی اور جو نتائج اخذ کیے گئے تھے، وہ ایسے تھے جن کے سبب سے ایک غیر جانبدار اور ایماندار آدمی کے دل میں شبہ ضرور پیدا کیا جا سکتا تھا۔

ہم میں سے جو کمیونسٹ تھے انھوں نے اپنی سیاست بہت سوچ سمجھ کر اور جان بوجھ کر اختیار کی تھی۔ ان کے نزدیک کمیونسٹ تحریک موجودہ دور میں انسانیت کی سب سے شریفانہ اور مہذب تحریک ہے، اور ہر قوم اور ملک کے کمیونسٹ اپنی قوم کے بہترین اور جاں نثار خادم اور اپنے وطن کے سب سے وفادار فرزند بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر بھی کسی غیر کمیونسٹ ترقی پسند ادیب کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اس رائے سے متفق ہو۔

البتہ ترقی پسند مصنّفین کے رکن کی حیثیت سے ہم انجمن اور انجمن کے بہی خواہوں اور طرف داروں کے سامنے ضرور جواب دہ تھے، اور ہمارا فرض تھا کہ تمام ان شکوک اور شبہات کو رفع کریں جو اگر پیدا نہ بھی ہوں تو مخالف پروپیگنڈہ کے سبب سے جن کے پیدا ہونے کا امکان ہو، اور جن کی وجہ سے ہمارے اتحاد میں رخنہ پڑنے اور ہمارے اثر میں کمی پیدا ہونے کا خطرہ ہو۔

چنانچہ یہ بات واضح کی گئی کہ انجمن ترقی پسند مصنّفین ایک جمہوری جماعت ہے اور اس کا طریقۂ کار جمہوری ہے۔ اس کے اعلان نامہ کے مسودہ پر ایک سال تک بحث ہوتی رہی، اور جب اس سے متفق ہو کر بہت سے لوگوں نے اس پر اپنے دستخط ثبت بھی کر دیے، اس کے بعد بھی وہ مسودہ انجمن کا باقاعدہ اعلان اس وقت بنایا گیا جب کہ سارے ملک سے آئے ہوئے نمائندوں

نے ایک کھلی کانفرنس میں اسے منظور کرلیا۔اس اعلان نامہ کی نوعیت ایسی ہے کہ اسے منظور کر لینے کے بعد (جو انجمن کے ایک رکن کے لیے لازمی ہے) یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ اپنے تمام دوسرے عقائد اور تصورات سے دست بردار ہونے کا اعلان کر دیتا ہے۔اس اعلان کا لب لباب دو لفظوں میں آزادی خواہی اور جمہوریت پسندی ہے......حیات انسانی کے نمو اور ترقی سے لگاؤ ہے۔اس کم از کم شرط کو ماننا اس کے لیے ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک ادیب بیک وقت وطن کی آزادی اور جمہوریت کا مخالف اور ترقی پسند نہیں ہوسکتا۔لیکن اگر وہ آزادی خواہ اور جمہوریت پسند ہے تو اس کے بعد اسے اختیار ہے کہ چاہے وہ ہندو مت یا اسلام کے مذہبی تصور کو اپنائے، چاہے افلاطونی فلسفہ کو صحیح مانے، چاہے تصوف اور بھگتی کو، چاہے مارکس کی جدلی مادیت کو، چاہے گوتم بدھا کے نروان کے تصور کو، یا مہاتما گاندھی کی اہنسائیت کو......اسے اختیار ہے کہ اپنی ادبی کاوشوں میں وہ ان میں کسی بھی یا ان کے علاوہ کسی اور فلسفے یا عقیدے کی ترویج اور تبلیغ کرے۔

یہ معاملہ یہاں پر ہی ختم نہیں ہوتا۔مثلاً اگر کوئی لیکھک 'منوسمرتی' کا حوالہ دے کر ذات پات کی وحشیانہ تفریق کو آج بھی صحیح مانتا ہے اور اپنی تحریر میں ان تصورات کی ترویج کرتا ہے، یا کوئی دوسرا شاعر اسلام کا نام لے کر اس ملک میں رہنے والے مختلف مذہبی فرقوں کے مابین نفرت پھیلاتا ہے تو کیا ترقی پسند ادیب یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ یہ باتیں اس شخص کے مذہبی عقائد سے تعلق رکھتی ہیں جس پر قائم رہنے کا اسے پورا اختیار ہے، اس لیے ایسے ادیبوں کو بھی ترقی پسندوں میں شمار کیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں کیا جا سکتا۔اس لیے ہمیں لوگوں کے عقائد، خیالات اور عمل کو ان کی مجرد اور خیالی شکل میں نہیں، بلکہ اس طرح جانچنا ہوگا کہ ہمارے موجودہ معاشرتی مسائل پر ایک خاص خیال یا فنی تخلیق کس طرح سے اثر انداز ہوتی ہے۔اگر کسی مصنف کی تخلیق سے زندگی نکھرتی اور سنورتی ہے، انسان کی انسانیت میں اضافہ ہوتا ہے، دماغ میں روشنی اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے تو پھر چاہے یہ باتیں ہم میں سے کسی کے نزدیک کتنی تھوڑی اور ادھوری ہی کیوں نہ ہوں، چاہے ان کے اظہار و بیان میں پختگی نہ ہو، اور ہم میں سے بعض کو ان سے مکمل تسکین بھی نہ ہو، اور بہت سی باتوں میں ہمارا اور اس کا اختلاف ہو، ایسا مصنف ہمارے قبیلے میں سے ہے۔گو کہ اسے خود کسی سبب سے اس کا اعتراف یا اعلان کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مصنفوں میں بیک وقت کسی قسم کے رجحانات ہوتے ہیں۔ بعض باتوں میں ان کی تحریروں سے حقیقت پسندی اور ترقی پسندی جھلکتی ہے اور ان کے بعض نظریے ایسے ہوتے ہیں جن میں اُلجھاؤ ہوتا ہے۔ جو رجعت پرست تک ہوتے ہیں۔ ایسے مصنفوں کی تحریر کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ان نگارشات کا مجموعی اثر اچھا ہے، لطیف ہے، زندگی کی حرارت لیے ہوئے ہے اور اگر اس سے کسی حد تک بھی معاشرتی یا انفرادی حقیقت پر اسی طرح روشنی پڑتی ہے، جس کی مدد سے انسان زیادہ بہتر دیکھ سکتے ہیں اور ان کی زندگی کے مسائل کی سمجھ بڑھتی ہے، تو ہمیں ایسے مصنّفین کے رجعتی پہلوؤں کو رد کر کے ان کے حیات آفریں پہلوؤں کو اپنانا چاہیے۔ پھر ایسے بھی مصنف ہو سکتے ہیں جن کے کلام میں ظاہری چمک دمک اور چٹخارہ ہے، جو ہماری تاریخ یا روایات سے ایسے پہلو ابھارتے ہیں جو اپنے قدیم تاریخی ماحول میں ممکن ہے، درخشاں رہے ہوں، لیکن آج جن کو ابھارنے سے ہماری موجودہ زندگی کے مسائل سلجھتے نہیں بلکہ اور اُلجھتے ہیں، جن سے زندگی میں بالیدگی نہیں بلکہ انقباض ہوتا ہے، اور تاریخ کی آزاد اور ترقی پذیر رفتار تیز نہیں ہوتی بلکہ اس میں رُکاوٹ پڑتی ہے...... اس قسم کے تمام ادبی رجحانات کو ہم مسترد کرتے ہیں۔

اس بحث کا مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ ترقی پسند مصنّفین کی تحریک پر یہ الزام کہ وہ محض کمیونسٹوں کی یا ان کی آلۂ کار ایک تحریک ہے، یا اس کے کوئی خفیہ یا سازشی مقاصد ہیں، صحیح نہیں ہے۔ چونکہ انجمن ایک جمہوری طریقہ پر کاربند جماعت تھی، اس لیے اوروں کی طرح کمیونسٹوں کو بھی اس میں رہنے اور کام کرنے کا حق تھا۔ اگر وہ اس کے بعض عہدوں پر فائز تھے تو اس وجہ سے کہ عام ممبروں نے، جن کی اکثریت غیر کمیونسٹوں پر مشتمل تھی، ان کو چنا تھا۔ اس تحریک میں ایک دائرہ کے اندر (جو کہ انجمن کے اعلان نامہ کے ذریعہ سے قائم کیا گیا تھا) مختلف سماجی اور سیاسی، مذہبی اور فلسفیانہ عقائد اور خیال کے ادیب موجود تھے۔ ان کو اپنے خیال اور عقائد پر قائم رہنے اور ان کی ترویج کی آزادی تھی۔ اکثر جو کمیونسٹ نہیں تھے، انھیں بھی اور چند جو کمیونسٹ تھے انھیں بھی۔ اگر کسی عام سیاسی، معاشرتی یا ادبی مسئلہ پر کسی وقت انجمن کو اپنی رائے کا اظہار کرنا ہوتا ہے تو وہ...... جیسا کہ جمہوری جماعتوں میں ہوتا ہے، جمہوری طریقے سے سب کی رائے معلوم کر کے اور

اکثریت کے فیصلے کے مطابق ہوتا ہے۔ انجمن کی کوئی کارروائی خفیہ یا درپردہ نہیں ہوتی۔ ادیبوں کی انجمن کی حیثیت سے اس کی بنیادی نوعیت ہی اس قسم کی تھی کہ جو کچھ بھی اس کے اراکین یا ہمدرد لکھیں اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو۔ لوگ ان کے معروضات کو قبول یا رد کرنے کے لیے بالکل آزاد تھے۔ ان کی غلطیوں پر ان کو ٹوک سکتے تھے، ان کی خامیوں پر ان کی اصلاح کر سکتے تھے۔ انجمن کے اندر اور باہر ترقی پسند ادب کی تنقید کے دروازے ہمیشہ کھلے تھے۔ انگریزی یا کسی بھی حکومت کو اس کا حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ بہ جبر ترقی پسند ادیبوں کی آزادیٔ رائے یا خیال کو سلب کر سکے۔ ہمارے اس دعویٰ کا بین ثبوت یہ تھا کہ انجمن کے ہمدردوں اور بہی خواہوں میں ہمارے ملک کے بہترین اور معزز ترین ادیب اور عالم شروع سے ہی شامل تھے۔ مثلاً منشی پریم چند، مولانا حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، مسز سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر عابد حسین، قاضی عبدالغفار، سمترا نند پنت، جوش ملیح آبادی، عبدالمجید سالک، آچاریہ نرندر دیو، وغیرہ۔ اگر ان حضرات کی حب الوطنی یا تہذیب دوستی مسلم تھی، اگر یہ ملک کے بہترین ادیبوں یا عالموں میں شمار کیے جا سکتے ہیں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک، جسے ان کی سرپرستی حاصل تھی، وطن دشمنی، خارجی، سازشی، نقصان دہ، مخربِ اخلاق تحریک ہو؟

اس بات کا ایک سیدھا سا جواب یہ تھا کہ انگریز سامراجی جو آج ہم کو اپنے وطن کی تمدنی روایات اور ایشیا کی روحانیت کا دشمن کہہ کر ہماری قوم میں ہم کو بدنام کرنا چاہتے ہیں، خود ہمارے تمدن اور فنون لطیفہ، ہماری معاشرت اور اخلاق کے سب سے بڑے برباد کنندہ تھے۔ جس ملک میں سامراجی ملک کے باعث افلاس اور نکبت اور جہالت میں مسلسل اضافہ ہوتا جائے، وہاں کے بیشتر رہنے والے اجنتا کی حسین شہزادی کے آسمانی اور لطیف پیکر، روح کو گھلا دینے والے راگوں کے لرزتے ہوئے سروں اور انسانی نفس کا نفیس ترین تزکیہ کرنے والے فلسفے اور اخلاق سے بہرہ مند یا لطف اندوز کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہماری قوم کے جسم کو غذا اور دماغ کو علم سے محروم کرنے والے، دلوں سے خوشی اور لبوں سے مسکراہٹ چھین لینے والے آقا، کسی دوسرے پر کس منہ سے اخلاق اور روحانیت کی مخالفت کا الزام لگا سکتے ہیں؟

یہ جواب بالکل صحیح تھا، تاہم پوری طرح سے تشفی بخش نہ تھا۔ ضرورت اس کی تھی کہ ترقی

پسند ادب کی تحریک اس بات کی وضاحت کرے کہ ہمارے قدیم تمدن، اخلاق اور ادبی اور تہذیبی ورثہ کی جانب اس کا رویہ کیا تھا۔خود ہماری اپنی صفوں میں اس مسئلے کے بارے میں سب کے دماغ صاف نہیں تھے۔

ویسے تو یہ بات ظاہر ہے کہ کوئی فرد یا جماعت یا قوم اس تہذیب اور تمدن سے، ان علوم اور فنون یا نظام اخلاق و معاشرت سے، جو اسے اپنے اسلاف سے ترکہ میں ملتے ہیں، دست بردار نہیں ہوسکتی۔لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی مسلّم ہے کہ انسانوں کی معاشرت، ان کے عقائد، تصورات اور علوم وفنون، ان کے اخلاقی اصول، ان کے رہن سہن کے طریقوں میں تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں۔کبھی ان تبدیلیوں کی رفتار تیز ہوتی ہے اور کبھی سُست، لیکن ارتقا کا عمل بہرحال جاری رہتا ہے۔نوع انسان کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے۔صرف انجان اور جاہل لوگ اس سے انکار کرسکتے ہیں۔ترقی پسندی کے معنی یہ ہیں کہ ایک خاص زمانہ یا دور میں ہم ارتقا کی ان قوتوں کا ساتھ دیں جو انسانی معاشرے کو ترقی کے ممکن الحصول اگلے زینے یا اگلی منزل کی طرف لے جائیں۔لیکن انسان ترقی کی یہ راہ آسانی سے اور سیدھے راستے پر چل کر طے نہیں کرتے۔ترقی پُرانے اور نئے خیالات، پُرانے اور نئے معاشرتی اداروں اور نظام کے مابین پیکار اور جدوجہد کے ذریعہ سے ہی ہوسکتی ہے۔تاریخی تصادم کے ان انقلابی موقعوں پر جب پُرانا نظام بدلتا ہے اور نیا اس کی جگہ لینے کے لیے جدوجہد کرتا ہے، معاشی اور سیاسی میدان میں تصادم کے ساتھ ساتھ فلسفے، نظریے، اخلاق، ادب اور فنون لطیفہ......غرض کہ زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں متضاد، مخالف اور مختلف تصورات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور اپنی برتری اور فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ارتقا کا تاریخی قانون یہی ہے۔متضاد قوتوں کے اس ٹکراؤ کے بغیر ارتقا ممکن ہی نہیں ہے۔ترقی پسندی کا تقاضا اور منصب یہ ہے کہ اس تصادم کی ماہیت سمجھے، زندگی کے مختلف شعبوں میں ایک خاص وقت یا زمانے میں جو مختلف اور مخالف رجحانات نمایاں ہوں (ابھی پوری طرح ظاہر نہ ہوئے ہوں) انھیں معلوم کرے، گروہوں اور ان نظریوں اور اخلاق کے ابھارنے اور پھیلانے میں صرف کرے جن میں عامتہ الناس کی فلاح اور بھلائی ہے، جو انسانی معاشرت کی اس نئی تنظیم کے لیے مفید و مددگار ہیں، جس کے قائم ہوئے بغیر نوع انسانی شاہراہ حیات پر آگے

نہیں بڑھ سکتی۔

معاشرتی ارتقا کے اس عام کلیہ کو مان لینے کے بعد بھی ہماری دشواریاں ختم نہیں ہوتیں۔ بلکہ غالباً اُن کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ معاشرت، اخلاق، فلسفے، ادب یا فنون لطیفہ کا کوئی بھی پُرانا نظریہ جو مسترد کرنے کے لائق ہے، ہمارے سامنے کبھی اپنی اصلی رجعت پرست اور نقصان دہ شکل میں پیش نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر تو ترقی پسندوں کا کام بہت سہل ہو جاتا۔ وہ آسانی سے بتا سکتے کہ فلاں نظریہ یا اصول پر قائم کوئی ادارہ معاشرت کے لیے مضرت رساں ہے۔ اس لیے ہمیں اسے ترک کر دینا یا مٹا دینا چاہیے، تاکہ انسان کی مادی، ذہنی یا روحانی ترقی کی راہ سے وہ رکاوٹ ہٹ جائے۔ رجعت پرست نظریوں اور ان تصورات کو ماننے والے ہمیشہ ان کو اسی دعوے کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ وہ انسان کی بھلائی کے بہترین نظریے اور اصول ہیں۔ وہ یہ کبھی نہیں کہتے کہ ان نظریوں کا اصلی مقصد ایک ایسے نظام معاشرت کی ذہنی اور روحانی معاونت کرنا ہے جو اکثریت کے مادی اور ذہنی استحصال پر مبنی ہے اور جس سے ایک چھوٹا سا ظلم کرنے والا طبقہ یا گروہ مستفید ہوتا ہے۔ اگر وہ ایسا کریں تو مظلوم اکثریت ان کی مخالف ہو جائے اور ان کا سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔

رجعت پرستوں کا سب سے بڑا سہارا تاریخی روایات اور ان پر قائم رہنے والے اعتقادات اور عادات ہوتے ہیں جو عام لوگوں کے اذہان، اطوار، رہن سہن اور سوچنے کے طریقوں، شعور اور لاشعور میں صدیوں سے پیوست ہوتے ہیں۔ خیالات اور عقائد میں تبدیلیاں آسانی سے نہیں ہوتیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ سماج کا معاشرتی ڈھانچہ بدل جاتا ہے۔ ایک قسم کی معاشرت کی جگہ دوسری معاشرت لے لیتی ہے۔ (جیسے قبائلی نظام کی جگہ جاگیری نظام، یا جاگیری نظام کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام یا سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ اشتراکی نظام۔) لیکن سوچنے کے طریقے، تصورات، عادتیں، معاشرتی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ایک دم نہیں بدلتے۔ پُرانے عہدوں کے تصورات اور عقائد، رسوم اور عادتیں، جو تاریخی اعتبار سے اپنی افادیت کھو چکے ہوتے ہیں، بھوتوں کی طرح انسانوں کے ذہن پر حاوی رہتے ہیں۔ ہر نئے خیال اور معاشرت کو تبدیل کرنے کے مطالبے کے جواب میں رجعتی مبلغ یہ کہتے ہیں کہ جب ہمارے آبا واجداد اس قدیم معاشرت پر قائم

تھے، جب ان کے نزدیک یہی معاشرت، یہی اخلاق اور یہی عقائد درست تھے جن پر ہم آج کار بند ہونے کو کہتے ہیں، اور جب انھوں نے اس دنیا اور آخرت دونوں میں سرخروئی حاصل کی تو پھر کیا ہمارے لیے یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم بھی ان کے ہی نقش قدم پر چلیں؟ جو اصول اور طریقے ان کے لیے درست تھے وہ ہمارے لیے ٹھیک ہیں۔ تبدیلی چاہنے والے یا پاگل ہیں یا نا تجربہ کار ہیں، یا شیطانی گمراہی کے نقیب......اور اسی لیے ہمیں ان سے بچنا چاہیے۔

چونکہ ہر انسان اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ ساتھ اپنے قومی اور طبقہ وار خصائل بھی حاصل کرتا ہے اور اس کے عقائد، عادات، علوم وفنون، معاشرت کے عام طریقے اور انداز سے اپنے پہلے کی نسلوں سے ہی ورثے میں ملتے ہیں، اس کے شعور اور لاشعور میں روایتیں رچی ہوتی ہیں، اور اس لیے اس کے لیے متذکرہ بالا دلائل کا قبول کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ رجعت کی سب سے بڑی طاقت کی بنا یہی دلیل ہے جو کہ شاید ایٹمی قوت سے بھی زیادہ شدید ہے۔ ایٹمی قوت اگر مہلک طریقوں سے استعمال کی جائے تو وہ مادی بربادی کرتی ہے اور یہ عوام الناس کے دل ودماغ میں پیوست ہوکر ان کے ذہن اور روح کو اور اس لیے ان کی تبدیلی، انقلاب اور ترقی کی قوت کو ماؤف کر دیتی ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کا کام مکر وتلبیس کی اس طاغوتی قوت کو شکست دے کر انسان کے دل ودماغ کو آزاد کرنا اور اسے نئی ذہنی، اخلاقی اور روحانی بلندیوں کی طرف لے جانا ہے۔ ایک مشکل اور عظیم کام، لیکن جو ممکن بھی ہے اور طربناک بھی، اس لیے کہ وہ ہماری قوم کے موجودہ دور کے تاریخی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں شجر حیات کی آبیاری کرتا ہے، اور ہماری شاندار اعلیٰ قومی روایات کے مطابق ہے۔

روایات ہمارے قومی ضمیر کا جزو ہیں۔ ہمارے تصورات، علوم وفنون، عادات اور خصائل کا وہ ذہنی اور روحانی مصالح ہیں، جن سے ہماری تہذیب کی عمارت بنی ہے۔ روایات ہم سے پہلے کے انسانوں کی زندگی کے تصورات اور تجربات، زندگی کے علم، زندگی کے متعلق ان کے خوابوں کے رنگا رنگ نقوش ہیں۔ زبان، ادب اور اس کے مختلف اسلوب اور انداز، موسیقی، رقص، مصوری اور فن تعمیر ہماری روایات کے اجزا ہیں۔ لیکن جب ہم اپنی موجودہ مادی اور روحانی زندگی کی روشنی میں روایات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایک طرف یہ دکھائی دیتا ہے کہ یہی علمی،

روحانی اورفنی روایات ہمارے تمدن کے رگ و پے میں پیوست ہیں، ان کی شکل وصورت متعین کرتی ہیں اورانسانوں کوان قدیم تجربوں کا وہ شعورعطا کرتی ہیں جن کے بغیر تمدن اورتہذیب کے وجود کا تصور ہی غیرممکن ہے، تو دوسری طرف سماجی بنیادوں میں تبدیلیاں جب معاشرت کے ڈھانچے کو بدلتی ہیں تو علم وفن کے نئے تجربوں کی بنیاد پر نہ صرف علم و ہنراورفن میں تبدیلی اورترقی ہوتی ہے، بلکہ بہت سے قدیم تجربے اورروایتیں بُھلائی جاتی ہیں، اور ناکافی سمجھ کر مسترد کردی جاتی ہیں۔خود انسانی روح اپنے لیے نئے اور پہلے سماج کے مقابلہ میں زیادہ پیچیدہ واردات کا اظہارکرنے کے لیےفنون لطیفہ کے بھی نئے رنگ اور نئے سانچے دریافت کرلیتی ہے۔ یہ نئے سانچے اس لحاظ سے نئے ہوتے ہیں کہ وہ نئی اور پہلے سے مختلف زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ان میں انسان کا زیادہ بڑھا ہوا شعور جھلکتا ہے،مگر وہ پُرانے بھی ہوتے ہیں۔اس لحاظ سے کہ ان کا وجود میں آنا، بغیر پُرانے تجربوں اور پُرانی روایتوں کے لیےممکن ہی نہ ہوتا۔ یہ بالکل اس طرح ہے کہ اشتراکی نظام معیشت، سرمایہ دارانہ نظام کی ضد ہے۔ وہ سرمایہ داری کومسترد کرتا ہےاور مٹاتا ہے۔لیکن بغیراس بڑے پیمانے کی جدید مشینی صنعت کے جسے سرمایہ دارانہ نظام نے جنم دیا اور بڑھایا، اشتراکیت قائم نہیں کی جاسکتی۔سرمایہ دارعہد کی قدیم مشینی صنعت،اس عہد کا ہنراور فن،علم اورسائنس وتکنیک اشتراکیت کے قیام کے لیےضروری ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ ترقی پسندلوگ کلچریا تہذیب کے معاملات میں اگرایک طرف نئی اور پہلے سے مختلف کلچر کی تعمیر کی کوشش کرتے ہیں، اگر وہ پہلے کی بہت سی ایسی روایات کو، جو نئے حالات زندگی کے ارتقا کی راہ میں رُکاوٹ بن گئی ہیں، مسترد کرتے ہیں تو اسی کے ساتھ وہ اپنی قوم کی ایسی تہذیبی اورروحانی روایات کو برقرار بھی رکھتے ہیں جن سے آج بھی زندگی کا شعور اورحسن بڑھتا ہے۔جن سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے، جن سے انسانوں کی مادی، اخلاقی یا روحانی بہتری ہوتی ہے۔مثلاً اگر ہم اخلاق کے مسئلہ کو لیں (جس کی بنا پر ہم پر حملے کیے گئے تھے) تو ہمیں یہ نظرآتا ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف قوموں کےمختلف طبقوں میں ان اخلاقی اصولوں میں فرق ہے۔تاریخ کا ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب ہمارےاسلاف غلامی (یعنی انسانوں کی خرید وفروخت کرکے انھیں استعمال کرنا اوران کے تمام ذاتی حقوق کوسلب کرلینا)

کے دستور پر کاربند تھے۔ بعض قبیلوں میں جنگی قیدیوں کو قتل تک کر دینے کا دستور تھا۔ جنسی معاملات میں قبیلے وار شادیاں اور مادر سری (میٹری آرکی) کا دستور تھا۔ بادشاہوں کے لیے بڑے بڑے حرم رکھنا جائز تصور کیا جاتا تھا اور ان تمام دستوروں کو اخلاق اور مروجہ مذہب کا جواز حاصل تھا۔ لیکن یہ روایتیں آج سے صدیوں پہلے مسترد کی جا چکی ہیں۔ بعض سر پھرے کٹّر عقائد پرست غلامی کو اب تک جائز قرار دیتے ہوئے شرمندہ نہیں ہوتے لیکن غالباً سعودی عرب کو چھوڑ کر مسلمانوں کی بھی عظیم اکثریت دنیا کی دوسری مہذب اقوام کی طرح غلامی کے دستور کو غلط ناجائز اور غیر اخلاقی فعل سمجھتی ہے۔ اسی لیے حالانکہ بعض حالات میں چور کے ہاتھ کاٹنے یا قتل کرنے اور زانی اور زانیہ کو سنگ ساری یا کسی دوسرے طریقے سے ہلاک کر دینے کی سزا چند صدی پہلے تک دنیا کے اکثر ملکوں میں رائج تھی۔ لیکن اب دنیا کی ہر مہذب قوم قدیم اخلاق کی اس روایت کو وحشیانہ سمجھ کر ترک کر چکی ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اخلاقی قوانین بھی دوسرے دنیاوی قوانین کی طرح ہیں۔ وہ اٹل نہیں ہیں۔ وہ انسانی معاشرے کی پیداوار ہیں۔ وہ معاشرت میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ حکمران طبقہ اور گروہ پورے سماج پر ان قوانین کو نافذ کرتا ہے پورا سماج انھیں قبول کر لیتا ہے اس لیے کہ وہ اِن مخصوص حالات میں سماج میں پیداوار اور تخلیق کو جاری رکھنے، نسل کی بقا، سماج میں انتشار اور تنازع کو کم کرنے اور روکنے کے لیے وجود میں آتے ہیں۔ بعض ناسمجھ ترقی پسند اس پر حیرت اور تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ افلاطون اور ارسطو جیسے حکیموں نے یا اکثر مقدس مذہبی صحیفوں نے غلامی کو جائز قرار دیا ہے۔ عورتوں کو پست درجہ دیا گیا ہے، محنت کشوں کے استحصال کو روا رکھا گیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آج سے دو تین ہزار برس پہلے کے سماج کی معاشی ہیئت، انسانوں کے آلات، ذرائع اور فنون پیداوار آج سے بہت مختلف تھے، اور جس غیر طبقاتی نظام کو قائم کرنا آج مادی طور سے ممکن ہو گیا ہے، وہ اُس زمانہ میں ممکن ہی نہ تھا۔ مثلاً غلامی کا نظام اس کے پہلے عہد کے اس طریقہ سے بہتر اور ترقی پسند تھا کہ جنگ کے قیدیوں اور مفتوحین کو ہلاک کر دیا جائے۔ جنگ کے قیدیوں کو قتل کر دینے کے بجائے ان کو غلام بنا کر زندہ رکھنے کا دستور اس صورت میں وجود میں آسکا، جب ذرائع پیداوار اتنا ترقی کر گئے کہ غلاموں کو زندہ

رکھنے کے لیے کافی فاضل غذا مہیا کی جا سکے۔ پُرانے زمانوں میں بھی رجعت پرستی اور ترقی پسندی کی جدوجہد تھی۔ لیکن اس کی شکل آج سے بالکل مختلف تھی۔ بعض اخلاقی اصول جو یونان یا عرب یا ہند کے اس قدیم ماحول میں ترقی پسند تھے اور جن کی مدد سے سماج نے اپنی پہلی ہیئت کے مقابلے میں بہتر اور زیادہ خوشگوار معاشرتی کیفیت پیدا کی تھی، اگر آج کے حالات میں برتے اور قائم رکھے جائیں تو دقیانوسی اور مہمل معلوم ہوں گے۔

لیکن جب ہم بعض اخلاقی اصولوں، قدیم تمدن کے چند مظاہر، پُرانی فکر اور سوچنے کے کچھ انداز، تصور اور خیالی پیکروں کے چند مخصوص ہیولوں کو زمانہ حال کے معاشرتی تقاضوں کے غیر مطابق اور اس لیے انسان کی ترقی اور فلاح کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر کے انھیں خارج کرنے کی ضرورت کا اعلان کرتے ہیں تب رجعت پرست، وہ گروہ اور طبقے جن کے مفاد ان قدیم اور فرسودہ روایات سے وابستہ ہیں، یہ نہیں کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ان دعوؤں کے جواز سے سیدھا انکار کریں۔ وہ منہ میں جھاگ بھر کر ہاتھوں کو چاروں طرف گھما گھما کر پیروں کو پٹخ کر اور بہت ہنگامہ کر کے اونچی آواز سے یہ کہتے ہیں کہ ترقی پسند اخلاق، تہذیب، تمدن، اور ایمان کی تمام قدروں کے مخالف ہیں، اور سب کو مٹا دینے کے درپے ہیں۔ ان کا منشا یہ ہوتا ہے کہ ان کے اُڑائے ہوئے گرد و غبار میں لوگوں کو حقیقت صاف نظر نہ آئے، خلطِ مبحث ہو جائے اور اس گڑبڑ میں وہ اخلاق، ایمان، تمدن اور روایت کے طرف دار اور محافظ نظر آنے لگیں، اور ترقی پسند ان کے مخالف کی شکل میں عام لوگوں کو دکھائی دیں۔

ایسی صورت میں ہمارا کام اس مکدر فضا کو سنجیدگی، بُردباری اور تحمل کے ساتھ صاف کرنا ہے اور ٹھوس دلیلوں اور اپنے عمل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہے کہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ اپنی قدیم تہذیب کا ہر جواہر پارہ ہم کو رجعت پرستوں سے زیادہ عزیز ہے۔ اس لیے کہ اس میں نوعِ انسانی کے بہترین دماغوں اور شریف ترین نفوس نے اپنی غیر معمولی ذہانت، ذکاوت اور فنی صلاحیت سے کام لے کر اپنے عہد کی سماجی حقیقت، انسانوں کے تجربوں اور باہمی رشتوں، ان کی نفسیاتی کیفیتوں، ان کے سب سے حسین خوابوں اور فکر کی بلندیوں کو ہمیشہ کے لیے مسخر کر لیا ہے۔ وہ مسلسل ہمیں زندگی کو بہتر بنانے، برائی سے لڑنے، نفس کا تزکیہ کرنے، شعور اور

فہم کو جلا دینے اور انسانی ماحول کو حسین سے حسین تر کرنے اور لطیف سے لطیف تر بنانے کا پیام دیتے ہیں۔

یقیناً ہمیں ان جواہر پاروں کے اِردگرد کھوٹ اور میل بھی نظر آتا ہے۔ ہماری ترقی پسندی اس کی متقاضی ہے کہ ہم کھوٹے اور کھرے کی پرکھ کریں۔ ایسے فلسفے اور حیات کے نظریے جو انسانوں کی لاچاری یا بے بسی کی بنا پر، یا ظلم کرنے والے چھوٹے گروہوں کی خودغرضی اور عیش پرستی کے جذبہ کا اظہار کرکے زندگی کی تذلیل کرتے ہیں، جو زندگی کو لطیف اور منزہ کرنے کے بجائے اسے حقارت اور سفلگی کی طرف لے جاتے ہیں، جو دلوں میں نرمی اور رحمت نہیں، بلکہ نوع انسانی کے لیے سختی اور درشتی کا زہریلا اور کڑوا بیج بوتے ہیں، ایسے تصورات یا فن کے مظاہرے ہر ترقی پسند کو مسترد کرنا ہوں گے۔ ہمیں اپنے مخالفوں سے ڈر کر یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ہم ادبِ عالیہ یا اپنے پُرانے تمدن کے تمام تصورات، اس کے اسلوبوں اور رجحانات کا عقل سلیم اور ذوق صحیح کی روشنی میں تجزیہ نہ کریں۔ کوئی پُرانا خیال یا نظریہ حیات، قدیم، فنون لطیفہ کا کوئی ایسا تہذیبی مظہر جو ہماری قوم یا نوع انسانی سے علم یا سائنس کی روشنی کو چھپاتا ہے، جس کی وجہ سے ہماری قوم کی ایک بہتر معاشرتی اور تہذیبی تنظیم میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ مثلاً ہم غالب کا احترام کرتے ہیں اور اس کی شاعری سے ایک غیر معمولی روحانی حظ حاصل کرتے ہیں۔ غالب کی تیز نظر اور فکر رسا نے لطیف طنز، مترنم آہنگ میں ہماری زندگی اور اس کے بعض رشتوں اور ان سے پیدا ہونے والے جذبات اور نفسیاتی کیفیات کو بڑے خوبصورت، غیر متوقع، حیران کن زاویوں سے پیش کیا ہے۔ اس سے ہمیں نہ صرف پاکیزہ ترین مسرت حاصل ہوتی ہے بلکہ ہماری زندگی کے شعور، شرافت اور حسن میں ایک ناقابل اظہار اضافہ محسوس ہوتا ہے۔ صرف ایک عظیم فنکار ایسا کرسکتا ہے۔ تاہم ہمارے لیے یہ ضروری نہیں کہ غالب کے تمام فلسفیانہ تصورات یا زندگی کے متعلق اس کے ہر ایک نظریے کو قبول کریں۔ ہمارے لیے یہ لازمی نہیں ہے کہ ہم ''عالم تمام حلقہ دام خیال ہے'' کے نظریے کو صحیح سمجھیں یا رنج و آلام سے عاجز آ کر زندگی سے ایک عام بیزاری کا جذبہ، جو غالب کی شاعری میں دوسرے قدما کی شاعری کی طرف بعض مرتبہ جھلکتا ہے، اپنے اوپر طاری کرلیں۔

مثلاً پنچ تنتر اور گلستاں اور بوستاں کی حکایتیں معمولی انسان کے صدہا بلکہ ہزارہا سال کے تجربوں، ان کی سمجھداری اور ذہانت، ظلم، جھوٹ اور ریاکاری سے ان کی نفرت، تصنع، بناوٹ اور دھوکے بازی سے ان کا اجتناب، امن، ہنرمندی اور سچائی سے ان کا لگاؤ، علم دوستی اور ایمان نوازی کے نہایت دلچسپ اور مؤثر مرقع ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ وہ انسان کے معاشرتی تجربوں کا عطر ہیں جنھیں حیرت انگیز فنکاری کے ساتھ ایک دانا برہمن پنڈت وشنو شرما اور شیخ سعدی کے باریک بین اور شگفتہ دماغ نے الفاظ کے ایسے نپے تلے سانچوں میں ڈھال لیا ہے کہ انھیں ہم ادب کا اعجاز کہنے میں حق بجانب ہوں گے۔

پھر بھی یہ بالکل غیر ضروری ہے کہ اخلاق یا معاشرت کے تمام نظریے جو ادب عالیہ میں پیش کیے گئے ہیں، ہم ان سب کو قبول کریں۔ سعدی کی امرد پرستی کی حکایتیں پڑھ کر ہم مسکرا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ تُلسی داس کو جب یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ ''پلنگ، دھول، جانور اور عورت ڈنڈے سے مارے جانے کے مستحق ہیں'' تو ان کے تقدس اور عظمت سے مرعوب ہو کر ہم اس وحشیانہ نظریے کو قبول نہیں کرتے۔ ہم سوچتے ہیں کہ یہ خیالات ایک ایسی معاشرت کی عکاسی کرتے ہیں جس کی بہت سی باتیں جدید زمانے کے انسانوں نے مسترد کر دی ہیں۔ ایک ایسی معاشرت جس میں آج کی طرح طبقاتی استحصال، ظلم اور بربریت کے بہت سے مظاہرے ہوتے تھے، ظاہر ہے کہ ہم ان کی تقلید نہیں کر سکتے۔

بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری تحریک پر جو الزام لگائے گئے تھے وہ غلط تھے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک کسی بیرونی یا دشمن طاقت کے اشارے پر ہمارے ملک میں جاری کی گئی ہے۔ وہ ادب کی ایک ایسی تحریک ہے جس کی بنیاد حب الوطنی، انسان دوستی اور آزادی پر ہے۔ اس کا مقصد ہرگز ہمارے پُرانے تمدن اور اخلاق اور ان کے ادبی یا فنی مظاہروں کو مسترد کرنا نہیں۔ وہ اس ملک کی تہذیب کے بہترین عناصر کو زندہ کرنا، اجاگر کرنا اور ان کی بنیاد پر نئی زندگی کے حالات کے مطابق پُرانے تمدن کے خمیر سے نئے اور بہتر ادب، فنون لطیفہ اور کلچر کی تعمیر کی کوشش کرتی ہے۔ ان بڑے مقاصد کے دائرے میں رہتے ہوئے تہذیب اور ادب کے ان معماروں میں آپس میں نظریاتی یا اسلوبی اختلاف کی گنجائش ہے۔ آپس میں سنجیدہ بحث و مباحثہ، تنقید اور خود

تنقید کے ذریعہ ہم اپنی خامیاں اور کمزوریاں ہمیشہ دور کرتے رہیں گے اور وطن دشمنی اور رجعت پرست رجحانات اور طاقتوں کا مقابلہ کرتے رہیں گے۔ ہمیں مخالف طاقتوں کے حملے سے گھبرا کر اپنے بنیادی اصولوں کو ترک کرنا یا چھپانا نہیں چاہیے۔ ترقی پسند ادیبوں کی انجمن سیاسی پارٹی نہیں ہے۔ وہ ادب کی تخلیق اور ترقی پسند خیالات اور نظریوں کی ترویج کا ایک تہذیبی ادارہ ہے۔ اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ ادیب سیاسی امور پر کوئی رائے نہ رکھیں، یا اپنی انجمن کے ذریعہ وقتاً فوقتاً اس کا اظہار نہ کریں۔ ان کے قلم ہمیشہ قوم کی آزادی کے حق میں، انسانوں کے انسانوں پر ظلم اور ان کے استحصال کے خلاف، انسانوں کے بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے چلتے رہیں گے۔ وہ ہمیشہ سماج کی ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دیں گے۔ اسی میں ترقی پسند ادب کی خود اپنی طاقت مضمر ہے۔ رجعت پرستوں کے حملوں سے وہ کمزور نہ ہوں گے۔ اگر ان میں کمزوری آئے گی تو اس وجہ سے کہ وہ اپنی قوم اور اس کے معمولی اور شریف انسانوں کے بہترین جذبات، ان کے بلند ترین حوصلوں اور ولولوں، اور زندگی کی آزاد، خوشحال، حسین اور بھرپور بنانے کی بیتاب خواہشوں کا پوری طرح اور خوبصورتی کے ساتھ اظہار نہ کریں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ 1936 میں جب ہمارے خلاف ''اسٹیٹس مین'' میں مضامین شائع ہوئے، ہمارے تصورات اتنے ہی واضح تھے جتنا کہ یہاں انھیں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم میں سے بعض ایسے تھے جن میں انتہا پسندی کے غلط رجحانات تھے اور بعض ایسے تھے جن کا جھکاؤ مصلحت کے نام پر اپنے بنیادی اصولوں کو بدلنے یا کم از کم عارضی طور پر انھیں چھوڑ دینے کی طرف تھا۔ لیکن غالب رجحانات کچھ اس قسم کے تھے جو یہاں وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں۔ ان کا اظہار ہم نے اپنے بیانوں اور بحثوں میں کیا۔ اسی لیے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انگریز سامراجیوں کے اس حملے سے ہماری تحریک کو نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی ہوا۔ ملک کے وہ مقتدر ادیب جنھوں نے ہماری تحریک کی سرپرستی کی تھی (پریم چند، جوش، عبدالحق، قاضی عبدالغفار وغیرہ) اس قسم کے الزامات سے، جیسے کہ ان مضامین میں لگائے گئے تھے، اگر متاثر بھی ہوئے تو تحریک کے حق میں ہی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ حملہ محض نوجوان ترقی پسندوں پر نہیں بلکہ بالواسطہ ان پر اور تمام محبّ وطن لکھنے والوں پر تھا۔ جہاں تک نوجوانوں اور نئے لکھنے والوں کا تعلق

تھا، ان مضامین کے بعد بہت سے نئے لوگ تحریک کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے، اور انجمن میں شریک ہونے والوں کی تعداد میں فی الجملہ اضافہ ہی ہوا۔ نئی شاخیں قائم ہوتی رہیں۔

البتہ جس واقعہ سے ہمیں نا قابل تلافی نقصان پہنچا، وہ تحریک کے سالار منشی پریم چند کی ہماری پہلی کانفرنس کے چند ہی مہینوں بعد وفات تھی۔

لکھنؤ کانفرنس کے بعد پریم چند کی دلچسپی تحریک سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی اور اب وہ صحیح معنوں میں اس کے راہ نما اور معمار بن گئے تھے۔ یقیناً یہ ان کی طویل ادبی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ ان کے تعلقات انجمن ترقی اُردو، ہندی ساہتیہ سمیلن، بھارت ساہتیہ پریشد، اور ملک کے کئی دوسرے ادبی اداروں اور گروہوں سے تھے۔ گاندھی جی کی ہندستان کی تحریک سے بھی وہ منسلک رہے۔ انھوں نے یہ نہیں کیا کہ ان ادبی اداروں، گروہوں یا افراد سے اپنے تعلقات منقطع کرلیں۔ ترقی پسند انجمن کا یہ مقصد بھی نہیں تھا۔ لیکن اپریل 1936 سے لے کر اس وقت تک جب تک کہ وہ بیماری سے صاحب فراش نہیں ہو گئے، انھوں نے جو بھی کام کیے، جس ادبی کانفرنس یا مشورے میں وہ شریک ہوئے، وہاں پر انھوں نے ترقی پسند نقطۂ نظر ہی پیش کیا۔ وہ اس زمانہ میں میرے ساتھ مسلسل خط و کتابت کرتے تھے اور اپنے ہندی کے رسالے ہنس کو اس نئی تحریک کا پوری طرح ترجمان بنانا چاہتے تھے۔ وہ اس کے بھی خواہش مند تھے کہ ہمارا ایک مرکزی ادبی رسالہ انگریزی میں باقاعدگی سے شائع ہو اور ملک کی دوسری زبانوں میں یا تو نئے ترقی پسند رسالے شائع ہوں یا جو موجودہ رسالے ہیں، ان ہی کو نیا رنگ دیا جائے۔ وہ انجمن کے اعلان نامہ اور مقاصد اور لکھنؤ کانفرنس کی روداد کی زیادہ سے زیادہ ترویج چاہتے تھے۔ چنانچہ ہنس میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ انجمن کی روداد شائع کی اور اپنے ادبی نوٹ میں نئی تحریک کو سراہا۔ میں نے ان کے لکھنؤ کانفرنس کے خطبہ کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔ ہم نے یہ طے کیا تھا کہ منشی پریم چند کا خطبہ، انجمن کا اعلان نامہ، میری رپورٹ اور کانفرنس کے رزولیوشن اور دیگر مقالوں کو ملا کر کتابی شکل میں جلد از جلد شائع کیا جائے، تا کہ اس کے ذریعہ سے ملک میں نئی تحریک کو پھیلانے میں مدد ملے۔ پریم چند اس کام میں جلدی کرنے کے لیے برابر مجھ سے کہتے رہتے۔

جب یہ کتاب ''ترقی پسند ادب کی طرف'' (Towards Progressive Literature) کے نام سے شائع ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ انجمن کی شاخیں، ملک کے ہر لسانی علاقے میں قائم ہوں اور خود انھوں نے اس کا بیڑا اُٹھایا تھا کہ مختلف جگہوں پر جا کر اپنے اثر اور رسوخ کو کام میں لا کر انجمن کی نئی شاخیں قائم کریں گے۔ وہ چاہتے تھے کہ انجمن کی تنظیم کے لیے چند کل وقتی کارکن ہوں۔ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ میں اپنا سارا وقت اسی ضروری کام کے کرنے پر صرف نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ بیرسٹری کی دکان لگا کر بیٹھ گیا ہوں۔

اسی زمانہ میں انھوں نے اپنا لافانی افسانہ 'کفن' بھی لکھا۔ جب میں نے اس افسانے کو پڑھا (شاید وہ زمانہ (کانپور) میں پہلی بار شائع ہوا تھا) تو مبہوت رہ گیا۔ اس لیے کہ وہ اپنے دردناک حسن، صحیح سماجی شعور، گہری انسان دوستی اور دل میں چبھ جانے والی دھوپ کی طرح سے اجلی اور حرارت بھری، حقیقت نگاری کے لحاظ سے پریم چند کے فن کے عروج اور کمال کو ظاہر کرتا تھا، اور تمام نوجوان ادیبوں کے لیے اس کی ایک مثالی حیثیت تھی۔ میں نے اس کو پڑھ کر پریم چند کو فوراً بنارس خط لکھا جس میں یہ توقع اور امید ظاہر کی کہ اب وہ ہمیں اسی قسم کے افسانے اور ناول دیتے رہیں گے۔ غالباً اسی زمانہ میں رسالہ کلیم میں (جو جوش صاحب کی ادارت میں دہلی سے شائع ہوتا تھا) پریم چند کا مشہور مقالہ ''مہاجنی تمدن'' بھی شائع ہوا۔ اس مضمون میں پریم چند نے بڑے پُر جوش طریقے سے سرمایہ داری تمدن کے غیر انسانی، غیر شریفانہ اور بہیمانہ اطوار کی مذمت کی تھی اور اپنے قلم سے پہلی مرتبہ ایک ایسے انسانی سماج کی تعریف کی تھی جو باہمی اشتراک، تعاون اور انصاف کی بنیادوں پر قائم ہو اور جس کی زندہ مثال انھیں مغرب کے ایک ملک (روس) میں نظر آرہی تھی۔ اس لیے انھوں نے یہ امید اور یقین ظاہر کیا تھا کہ بالآخر نوع انسانی محبت، ایثار اور اشتراک عمل کے انھیں اصولوں پر کاربند ہوگی اور ساری دنیا سے انسانوں کے ذریعہ انسان کے استحصال کا چلن اُٹھ جائے گا۔

ان ہی دنوں میں ایک دن فراق کے یہاں گیا۔ باتوں باتوں میں انھوں نے ذکر کیا کہ پریم چند بیمار ہیں۔ بیماری ہمارے ملک میں کوئی غیر معمولی چیز نہیں...... پھر بھی مجھے فکر ہوئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انھیں ''انیمیا'' کی شکایت ہے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے تک اسی قسم کی خبریں

ملتی رہیں اور ہماری تشویش بڑھتی رہی۔ مجھے کسی سیاسی کام کے سلسلے میں کلکتہ جانا پڑا تھا۔ وہاں سے جب الہ آباد جانے لگا تو میں نے سوچا کہ پریم چند جی کی مزاج پرسی کرلوں۔

صبح کو میں بنارس پہنچا۔ اسی وقت اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر پریم چند جی کے گھر جانے کے لیے تانگہ پر نکلا۔ مجھے ان کے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ میرے دوست بنارس ہی کے رہنے والے تھے لیکن پریم چند جی کے گھر کا راستہ انھیں بھی نہیں معلوم تھا۔ میں پریم چند جی کو سرسوتی پریس کے پتہ پر خط لکھتا تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے سرسوتی پریس دریافت کیا، جو شاید تھوڑے ہی دن پہلے پریم چند جی نے قائم کیا تھا۔ وہاں بھی پوچھا تو کسی کو ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ پریم چند جی ان دنوں کہاں مقیم ہیں۔ بڑی مشکل کے بعد معلوم ہوا کہ بنارس کے ایک محلے میں کسی کا باغ ہے۔ آج کل پریم چند جی وہاں ہیں اور بیمار ہیں۔ کوئی دو تین گھنٹے شہر میں بھٹکنے کے بعد ہم اس باغ تک پہنچے۔ ایک اونچی سی چہار دیواری کے اندر سامنے کے کھلے دروازے سے ہم اندر داخل ہوگئے۔ یہ پُرانے قسم کا باغ تھا جو کافی اُجاڑ سا نظر آتا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ چاروں طرف جنگلی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ باغ میں چند ہی درخت رہے ہوں گے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی کافی تھی اور اس احاطے میں ہُو کا عالم تھا۔ ہم بڑھتے چلے گئے۔ باغ کے دوسرے سرے پر ایک پُرانے طرز کی حویلی کی قسم کی عمارت تھی، جس کے سامنے پکّا چبوترا تھا۔ وہاں بھی ہمیں کوئی آدمی نظر نہیں آیا کہ اس سے پوچھ گچھ کریں۔ ایک کنارہ کے کمرے پر چلمن پڑی تھی اور دروازہ کھلا سا نظر آتا تھا۔ ہم اس کی طرف بڑھے۔ اندر سے ایک خاتون برآمد ہوئیں۔ میں نے انھیں اپنا نام بتایا اور کہا کہ پریم چند جی سے ملنے آیا ہوں۔ ان کے شریف اور میٹھے چہرے سے دُکھ اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے...... ''بھیا، وہ تو کافی دنوں سے بیمار ہیں۔ تمھارا خط آیا تھا...... میں انھیں اطلاع کردیتی ہوں...... اندر آ کر انھیں دیکھ لو......'' میں سمجھ گیا کہ یہ خاتون پریم چند جی کی بیوی شیورانی ہیں۔ فوراً بعد انھوں نے مجھے اندر بلایا۔ پریم چند جی اسی کمرے میں تھے جس کے دروازے پر چلمن پڑی ہوئی تھی۔

یہ ایک بالکل چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے بیچ میں ایک پلنگ بچھا تھا۔ اس پر پریم چند جی لیٹے ہوئے تھے۔ وہ ویسے بھی بہت دبلے پتلے آدمی تھے۔ اب جو میں نے ان کے جسم اور چہرے پر نظر

ڈالی تو معلوم ہوتا تھا کہ بالکل ہی سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں۔ان کے گال کے اوپر کی ہڈیاں ویسے بھی ابھری ہوئی تھیں۔اب وہ اور بھی نمایاں ہو گئیں۔ان کے چہرے کا رنگ زردی مائل گورا تھا۔اب اس پر ایک بے جان سی سفیدی آ گئی تھی جس پر دھندلکا سا چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

میں نے انھیں سلام کیا تو جواب دیتے ہوئے ان کے چہرے پر وہی دلکش مسکراہٹ پھیل گئی جو اُن سے ملنے پر ہمیشہ مجھے مہکتے ہوئے موتیے کے پھولوں کے تحفے کی طرح ملا کرتی تھی۔ نحیف آواز میں وہ مجھ سے انجمن کے بارے میں پوچھتے رہے۔میں کلکتے سے واپس آ رہا تھا۔میں نے ان کو بتایا کہ بنگال میں کئی جگہ ہماری انجمن کی شاخیں قائم ہو گئی ہیں۔وہ اس بات پر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اپنی بیماری کے سبب سے اس وقت تک وہ خود اپنے پروگرام کے مطابق پٹنہ اور بنارس میں شاخیں قائم نہیں کر سکے۔لیکن جیسے ہی اچھے ہوں گے وہ ایسا ضرور کریں گے۔میں نے محسوس کیا کہ بات چیت سے انھیں تھکاوٹ ہو رہی ہے۔اس لیے یہی کوشش کرتا رہا کہ وہ زیادہ نہ بولیں،اور میں ہی ان سے بات کرتا رہوں۔

شیورانی جی سرہانے بیٹھی انھیں پنکھا جھل رہی تھیں۔علاج معالجے کی کافی دیر تک ان سے گفتگو رہی۔میں چاہتا تھا کہ زیادہ دیر تک وہاں بیٹھوں لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد یہ سمجھ کر کہ اس کی وجہ سے انھیں تھکاوٹ ہوگی،رخصت کی اجازت لے کر چلا آیا۔

جب میں واپس آیا تو پریم چند جی کی صحت کے بارے میں میری تشویش بڑھ گئی۔علاج کے متعلق جو کچھ مجھے معلوم ہوا اس سے بھی مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ان کی بیماری سخت تھی لیکن مرض کوئی ایسا زیادہ خطرناک یا مہلک نہ تھا جس کا مناسب علاج،دیکھ بھال،اچھے آرام دہ ماحول کے ذریعے سے انسداد نہ کیا جا سکے۔اس مکان میں جہاں پر پریم چند تھے،وہاں صاف ہوا تھی اور ان کی چاہنے والی بیوی سے بہتر اور کون ان کی تیمارداری کر سکتا تھا۔لیکن مفلوک الحالی اور بے سر و سامانی کی فضا جیسے وہاں چھائی ہوئی تھی،اور دل میں بار بار یہ اندوہناک خیال اُٹھتا تھا کہ پریم چند جی کی ساری بیماری کی بنیاد دراصل ان کی تنگ دستی ہے۔وہ ایک اتفاقیہ سانحہ نہیں بلکہ عمر بھر کی مالی اور جسمانی مصیبتوں،افکار و آلام کا ایک لازمی اور منطقی نتیجہ معلوم ہوتی تھی۔پھر بھی اس وقت ان سے ملنے کے بعد مجھے یہ وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ میں ان کا آخری دیدار کر کے واپس جا رہا ہوں۔

مجھے یقین تھا کہ وہ تھوڑے دنوں میں اچھے ہو جائیں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس یقین کی بنیاد میری خواہش پر زیادہ اور حقیقت پر کم تھی کیونکہ مشکل سے دو ہفتے گزرے ہوں گے کہ ہمیں یکا یک ایک دن صبح کو خبر ملی کہ پریم چند جی کا بنارس میں دیہانت ہو گیا۔ انسان کے لیے موت ایک بری چیز ہے۔ اپنی بے بسی اور لاچاری کو چھپانے کے لیے ہم لاکھ جتن کریں، دوسری اور بہتر زندگی کی باتیں کر کے دل بہلائیں، یہ کہیں کہ مرنے والے کی نیکیاں اور اچھے کام اس کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں، یہ سوچ کر دل کو تسکین دے لیں کہ زندگی کا دھارا بہر حال جاری ہی رہتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ موت سے جو نقصان اور رنج پہنچتا ہے اس کی تلافی ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی وجہ سے انسان کے غموں میں یہی غم سب سے بڑا اور شدید ہے۔ یہ غم اور بھی بڑھ جاتا ہے جب یہ احساس ہو کہ مرنے والے کو ابھی مرنا نہ تھا۔ ابھی اس کی عمرِ طبیعی نے اسے جواب نہ دیا تھا، بلکہ ایک بے رحم اور ناقدر شناس سماج نے اپنی بے رُخی اور لاپرواہی سے زندگی کے ایک بیش بہا ہیرے کو موت کے ہاتھوں کوڑیوں کے مول بیچ دیا۔ دنیا کی ایک عظیم ترین قوم کا ایک عظیم ادیب، دس کروڑ ہندی اور اُردو بولنے والوں کا سب سے بڑا افسانہ نگار، ضروری نہیں کہ اس طرح اور ان حالات میں یہاں سے اُٹھ جائے جیسا کہ پریم چند۔ وہ بڈھے نہ تھے، ابھی تو ان کی جوانی ختم ہوئی تھی اور درمیانہ پکی عمر کا آغاز تھا۔ ان کا آرٹ اب پختہ ہو کر حسن، فکر اور تاثر کی نئی بلندیوں پر پہنچ رہا تھا۔ اس میں حرکت اور نمو برابر جاری تھی۔ اپنی معاشرت کا شعور اپنی قوم کے عام محنت کرنے والوں، ایماندار لوگوں سے ان کا لگاؤ اور ان کے لیے ان کے سینے کا درد بڑھ رہا تھا...... ایسے میں وہ یکا یک دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔

شاید اس لیے کہ ایک اچھے معلّم اور راہنما کی طرح ہمیں سختی سے یہ سبق سکھائیں کہ دنیا کی ہر ایک زندہ اور سچائی پر مبنی تحریک کسی ایک فرد کی اتنی مرہون منت نہیں ہوتی کہ بغیر اس کے وہ چل ہی نہ سکے۔ پریم چند اُٹھ گئے لیکن ہمارے افسانوی ادب کے باغ میں حقیقت نگاری اور انسان دوستی کے نازک پودے جو انھوں نے لگائے تھے، آج وہ بارآور ہیں۔ ترقی پسند ادب کی تحریک جس کی انھوں نے، اس کے سب سے ابتدائی اور مشکل دنوں میں رہنمائی کی، آج ملک کی سب

سے بڑی اور سب سے اہم تحریک ہے۔

○○○

نـــوٹ:— خوش قسمتی سے منشی پریم چند جی کے چند خطوط جو لکھنؤ کانفرنس کے بعد انھوں نے مجھے لکھے، میرے پاس محفوظ رہ گئے۔ وہ 'نیا ادب' (لکھنؤ، جنوری، فروری، مارچ 1940 جلد نمبر 1,2,3) میں شائع کر دیے گئے تھے۔ چونکہ رجعت پرست حلقوں نے پریم چند کی انجمن سے دلچسپی کو چھپانے اور اس کے ساتھ ان کے قریبی تعلق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے، اس لیے ان کے تین خطوں کے اقتباس یہاں پر پیش کیے جاتے ہیں۔

پہلا خط......

دفتر ہنس، بنارس

17 اپریل 1936

ڈیئر سجاد ظہیر! لاہور سے آج ہی پلٹا ہوں۔ تم جانتے ہی ہو کہ ہم لوگ 24، 25/ اپریل کو مہاتما جی کی صدارت میں ناگپور میں ایک آل انڈیا لٹریری جلسہ کرنے والے ہیں۔ اُردو کے ادیب بھی مدعو کیے گئے ہیں۔ لیکن مجھے ان کے آنے کا کچھ زیادہ یقین نہیں۔ میں نے مولانا عبدالحق صاحب سے ناگپور آنے کی ذاتی طور پر درخواست کی ہے، لیکن مجھے شبہ ہے کہ لاہور کے سفر کے بعد (میں ان سے لاہور میں ملا تھا) وہ ناگپور پہنچنے کی تکلیف گوارا کریں گے۔ کیا تم 23 اپریل کو میرے ساتھ ناگپور چل سکتے ہو؟ بھائی انکار نہ کرنا، اس سے ہمارے مقاصد کا بھی تھوڑا بہت پروپیگنڈہ ہو جائے گا۔ پی۔ ای۔ این۔ کا ایک خط بھیج رہا ہوں۔ مادام صوفیہ وادیا لکھنؤ کے جلسے کی ایک رپورٹ چاہتی ہیں۔ مہربانی کر کے انھیں بھیج دو۔ وہ ایک مذہبی خاتون ہیں۔ میں بھی انھیں جواب لکھ رہا ہوں۔ رپورٹ ان کے پاس ضرور بھیج دو۔ وہ اُسے اپنے ماہنامہ رسالہ پی۔ ای۔ این۔ میں چھاپیں گی۔ جواب کا انتظار رہے گا۔

تمہارا پریم چند

دوسرا خط......

بنارس، 10 مئی 1936

ڈیئر سجاد ظہیر! تمھارا خط ملا۔ شکریہ۔ میں ایک دن کے لیے ذرا گورکھپور چلا گیا تھا اور وہاں دیر ہوگئی۔ میں نے یہاں ایک برانچ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ تم اس کے متعلق جتنا لٹریچر ہو، وہ سب بھیج دو تو میں یہاں کے ''لیکھکوں'' کو ایک دن جمع کر کے بات چیت کروں۔ بنارس قدامت پرستوں کا اڈا ہے اور ہمیں شاید مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑے۔ لیکن دو چار بھلے آدمی تو مل ہی جائیں گے جو ہمارے ساتھ اشتراک کرسکیں۔ اگر میری اسپیچ کی ایک اُردو کاپی (پہلی ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس کا خطبۂ صدارت) بھی بھیج دو اور اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو گیا ہو اور چھپ بھی گیا ہو تو اس کی چند کاپیاں اور مینی فیسٹو کی چند کاپیاں اور ممبری کے فارم کی چند پرتیں اور لکھنؤ کانفرنس کی رپورٹ وغیرہ، تو مجھے یقین ہے کہ یہاں شاخ کھل جائے گی۔ پھر میں پٹنہ جاؤں گا اور وہاں بھی ایک شاخ قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔ آج بابو سنپورنانند سے اسی کے متعلق کچھ باتیں ہوئیں۔ وہ بھی مجھی کو آگے کرنا چاہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ پیش قدمی کرتے۔ مگر شاید انھیں مصروفیتیں بہت ہیں۔ بابو جے پرکاش نارائن سے بھی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے پروگریسیو ہفتے وار ہندی میں شائع کرنے کی صلاح دی، جس کی انھوں نے کافی ضرورت بتائی۔ ضرورت تو میں بھی سمجھتا ہوں، لیکن سوال پیسے کا ہے۔ اگر ہم کئی شاخیں ہندی والوں کی قائم کرلیں تو ممکن ہے ماہوار یا ہفتہ وار اخبار چل سکے۔ انگریزی میگزین کا مسئلہ بھی سامنے ہے ہی۔ میں سمجھتا ہوں ہر ایک زبان میں ایک پروگریسیو پرچہ چل سکتا ہے۔ ذرا مستعدی کی ضرورت ہے۔ میں تو یوں بھی بُری طرح پھنسا ہوا ہوں، فکرِ معاش بھی کرنی پڑتی ہے اور فضول کا بہت سا لٹریری کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی ہول ٹائم (پورا وقت دینے والا) کام کرنے والا نکل آئے تو یہ مرحلہ بڑی آسانی سے طے ہو جائے۔ تمھیں بھی قانون نے گرفت کر رکھا ہے۔ خیر......ان حالات میں جو کچھ ممکن ہے، وہی کیا جاسکتا ہے۔

تمھارا ''بیمار'' تو مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ مسٹر احمد علی کیا الہ آباد میں ہیں؟ انھیں دو ماہ کی

چھٹی ہے۔ وہ اگر پہاڑ جانے کی دھن میں نہ ہوں تو کئی شہروں کے دورے کر سکتے ہیں اور آگے کے لیے انھیں تیار کر سکتے ہیں۔

یہ خبر بہت مسرت ناک ہے کہ بنگال اور مہاراشٹر میں کچھ لوگ تیار ہیں۔ ہاں وہاں صوبہ جاتی کانفرنسیں ہو جائیں تو اچھا ہی ہے، اور اگلا جلسہ پونا ہی میں ہونا چاہیے۔ کیونکہ دوسرے موقعوں پر رائٹروں کا پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ فاقہ مستوں کی جماعت جو ٹھہری۔ وہاں تو ایک پنتھ دو کاج ہو جائے گا۔

ہندی والے Inferiority Complex سے مجبور ہیں۔ مگر غالبًا یہ خیال تو نہیں ہے کہ یہ تحریک اُردو والوں نے انھیں پھنسانے کے لیے کی ہے۔ ابھی تک ان کی سمجھ میں اس کا مطلب ہی نہیں آیا ہے۔ جب تک انھیں جمع کر کے سمجھایا نہ جائے گا، یوں ہی تاریکی میں پڑے رہیں گے۔ ایک نوجوان ہندی ایڈیٹر نے (جو دہلی کے ایک سنیما اخبار کے ایڈیٹر ہیں) ہمارے جلسے (لکھنؤ کانفرنس) پر اعتراض کیا کہ اس جلسے کی صدارت تو کسی نوجوان کو کرنی چاہیے تھی۔ پریم چند جیسے بوڑھے آدمی اس کے صدر کیوں ہوئے۔ اس احمق کو یہ معلوم نہیں کہ یہاں وہی جوان ہے جس میں پروگریسیو (ترقی پسند) روح ہو۔ جس میں ایسی روح نہیں، وہ جوان ہو کر بھی مردہ ہے۔ ناگپور میں مولوی عبدالحق صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ ان سے دو روز خوب باتیں ہوئیں۔ مولانا اس سِن میں بھی بہت زندہ دل انسان ہیں۔

کیا بتاؤں...... میں زیادہ وقت نکال سکتا تو کانپور کیا، ہر ایک شہر میں اپنی شاخیں قائم کرتا۔ مگر یہاں تو پروف اور خطوط نویسی سے فرصت نہیں ملتی۔ ہاں چوری ہوئی مگر تشفی اس خیال سے کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مجھے ایک ہزار روپے اپنے پاس رکھنے کا کیا حق تھا؟

مخلص پریم چند

تیسرا خط......

سرسوتی پریس، بنارس کینٹ، 14 جون 1936

ڈیئر ظہیر......بھئی معاف کرنا تمھارے خط کا جواب جلد نہ دے سکا اور نہ الہ آباد ہی آسکا۔

میں نے اپنی تقریر کا ترجمہ ہندی میں کرالیا ہے، اور اسے جولائی کے ''ہنس'' میں نکال رہا ہوں۔ ابھی مدرسے اور یونیورسٹی بند ہیں۔ اسی لیے یہاں ایسوسی ایشن کی شاخ شاید اگست سے پہلے نہ کھل سکے گی۔ آج کل تو الہ آباد میں سناٹا ہوگا...... میری تقریر کا انگریزی ترجمہ جو کر رہے تھے؟

مخلص پریم چند

OOO

ترقی پسند تحریک کے مقاصد

اُن دنوں زندہ رہنا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے ملک میں جیسے ایک نئی صبح پھوٹ رہی تھی۔ دل اور دماغ پر سے اندھیرے کی بھاری سلیں جیسے کسی نے آہستہ سے کھسکا دی ہوں۔ رات کی گھٹن اور بے آرامی کے بعد جس طرح ٹھنڈی ہوا کے نرم جھونکوں سے جسم کو تسکین محسوس ہوتی ہے، ویسے ہی ہماری نوجوان روحوں میں ایک انبساط کی سی کیفیت تھی۔ وطن کے اُفق پر سرخی ابھی سیاہی سے ملی ہوئی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ آزادی کے آسمانی نور کی نازک اور بے آواز پھوار فضا سے پھیل کر ہمارے رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔

1936 سے لے کر 1939 کے ختم تک کا زمانہ (جب دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہوا) ہمارے ملک میں نئے خیالات، انقلابی تحریکوں، بلند عزائم، اور جھلملاتی ہوئی اُمیدوں کا زمانہ تھا۔ یوں تو سامراجی محکومی کے دور میں کوئی بھی وقت ایسا نہیں آیا جب ہماری قوم کے دل سے آزادی کی لگن مٹی ہو۔ بغاوت بار بار ہوتی رہی، بے اطمینانی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی رہی، بیرونی تسلط کے خلاف نفرت اور غصہ کا مختلف طریقوں سے اظہار ہوتا رہا۔ بیرونی حکمرانوں کا ساتھ دینے والے اور ان کے ساتھ مل کر خود اپنی قوم پر سختی اور ظلم کرنے والے حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے رہے۔ انگریز حاکموں کی وضع قطع اور طرزِ زندگی کی نقالی کرنے والوں کو عام لوگوں نے کبھی پناہ نہیں

دی، اوران کو ہمیشہ تمسخراور ذلت کی نظر سے دیکھا گیا۔ ہمارے ادب میں سوڈیڑھ سو سال سے ان قومی جذبات اور تاثرات کا برابر اظہار رہا۔

لیکن زیرِ نظر دَور کی بیداری کی چند نمایاں خصوصیات تھیں۔ اب جب قومی آزادی کا تذکرہ ہوتا تھا تو ملک میں ایک بڑا گروہ قوم کے مزدوروں، کسانوں اور درمیانہ طبقے کے معمولی لوگوں کو سمجھتا تھا۔ آزادی کے یہ معنی بتائے جانے لگے کہ بیرونی سامراجی اقتدار اور استحصال سے نجات حاصل کر کے ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کیا جائے جس میں حکمرانی محنت کش عوام کے ہاتھ میں ہو۔ ان کی لوٹ ختم کی جائے اور ذرائع و وسائلِ پیداوار ان کے قابو میں ہوں تاکہ تعاون اور اشتراک کی بنا پر دولت کی پیداوار ہو، اور انصاف کے اصولوں پر اس کی تقسیم۔ یوں تو انقلاب روس کے بعد سے ہی، اس قسم کے خیالات ملک کے بعض حلقوں میں موجود تھے لیکن اس زمانے میں غیر معمولی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگے۔ خاص طور پر دانشور، طالب علم، نچلا درمیانہ طبقہ اس زمانہ میں اشترا کی خیالات سے عام طور سے بڑی تعداد میں متاثر ہوا۔ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگریس میں بائیں بازو کے خیالات رکھنے والوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ نہرو اور بوس کے علاوہ کانگریس کے اندر سوشلسٹ پارٹی قائم ہوئی اور بہت سے نوجوان سیاسی کارکن 1930 اور 1936 کی سول نافرمانی میں جیل جانے کے بعد جب رہا ہوئے تو وہ کمیونسٹ بن چکے تھے۔

ایک دوسری خصوصیت اس دور کی یہ تھی کہ کسانوں کی تنظیم، ان کی ہلچل اور بیداری کے ساتھ ساتھ خود ان کے اپنے آزاد ادارے (کسان سبھا) میں ہونے لگی۔ اس کسان تحریک کی رہنمائی بھی بائیں بازو کے کمیونسٹوں یا سوشلسٹوں یا کانگریس کے ''گرم دل'' کے لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ مزدوروں کی ٹریڈ یونین تحریک میں اتحاد ہوا اور اس میں نئی جان آئی۔ بڑی تعداد میں بڑی یونینیں بنیں۔ ان کے رہنما بھی بائیں بازو والے تھے۔ طالب علموں کی تنظیم کی راہ نمائی بھی سوشلسٹ یا کمیونسٹ خیال کے نوجوانوں کے ہاتھ میں تھی۔

1937 میں الیکشن ہوئے اور کانگریس کی وزارتیں کئی صوبوں میں بن گئیں۔ الیکشن میں کانگریس کی جیت خود سامراجیوں کی شکست تھی اور حالانکہ وزارتوں پر داہنے بازو کے اصلاح پسند گاندھیائیوں کا قبضہ تھا، لیکن عوام کے دباؤ سے ملک میں شہری آزادیاں زیادہ ہوئیں اور دو تین سال

کے عرصہ میں مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں اور بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کا زبردست فروغ ہوا۔اس عام سیاسی ہلچل اور بیداری کے بنیادی قومی اور بین الاقوامی معاشی اسباب تھے۔ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کو ہم اس سے علاحدہ کر کے نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک کے دانشوروں کے گروہ میں اس وقت ایک سیاسی اور معاشرتی ہیجان تھا۔گاندھیت اور احیا پرستی کے نظریے، اصلاح پسندی کی سیاست، مبہم قوم پرستی، گزشتہ بیس پچیس سال کے تجربے کے بعد ان کی نظروں میں مشتبہ معلوم ہونے لگی تھی۔ بین الاقوامی افق پر سوویت یونین میں پنج سالہ منصوبے اسکیم کی کامیابی اور اشتراکی سماج کی شاندار تعمیر ایک طرف، دوسری طرف سرمایہ داری کا فاشزم کے ہولناک روپ میں مغربی یورپ میں مظاہرہ، دانشوروں کے ایک حصے پر گہرا اثر ڈال رہا تھا۔خود کانگریس کے اندر سے جس پر ہندستانی سرمایہ داروں کی سیاست حاوی تھی، جواہر لعل نہرو کی زبان سے (لکھنؤ میں منعقد ہونے والے کانگریس کے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں) یہ اعلان ہو رہا تھا کہ سوویت اشتراکیت کا تجربہ کامیاب ثابت ہوا ہے۔اور جلد یا بدیر ساری دنیا کو سرمایہ داری ترک کر کے اسی معاشی نظام کو اپنانا ہوگا۔کانگریسی وزارتوں کے قائم ہونے کے بعد ہندستانی کمیونسٹ پارٹی گو کہ غیر قانونی ہی رہی، لیکن اس کے کارکنوں کو عوام میں کام کرنے اور اپنے سیاسی خیالات کی ترویج کرنے کی نسبتاً زیادہ آزادی ملی۔

اب ترقی پسند دانشوروں کے لیے یہ آسان ہو گیا تھا کہ وہ بورژوا طبقے کی سیاست، طرز فکر اور طریقۂ عمل کو ترک کر کے مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں میں حصہ لیں اور ان کی تنظیم میں شریک ہوں۔قوم یا عوام کا تصور مبہم یا غیر حقیقی ہونا ضروری نہیں تھا۔ اب جب وہ ''انقلاب زندہ باد'' یا ''مزدور کسان راج زندہ باد'' کے نعرے لگاتے تھے تو ان کی نظروں میں وہ مزدور اور کسان تھے جن کے جلسوں میں وہ شریک ہوتے تھے اور تقریریں کرتے تھے، جن کی ہڑتالوں میں وہ حصہ لیتے تھے، جن کے لال جھنڈے کی وہ سلامی کرتے تھے۔ پریم چند کے ناولوں کے لکھے پڑھے دیش بھگت جب دیہات میں جاتے تھے تو گاندھی جی کے گرام سدھار اور اچھوت اُدّھار کا تصور لے کر۔اس کے برخلاف دور حاضر کے نوجوان کسان سبھا کا لال جھنڈا لے کر دیہات میں داخل ہوتے تھے اور

کسانوں کی چھوٹی بڑی شکایتوں کی بنیاد پر اتحاد، تنظیم اور انقلابی جدوجہد کے پیامبر ہوتے تھے۔

آج کل بار بار یہ آواز سنی جاتی ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کو محض ایک ادبی جماعت بن کر رہنا چاہیے۔ اسے سیاست سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سرکاری حلقے یہ کہہ کر کہ انجمن ایک سیاسی جماعت ہے، اس کے کارکنوں پر سختیاں کرتے ہیں، انھیں نوکریوں اور تمام ایسے سرکاری وسائل سے جہاں آمدنی کا کوئی ذریعہ ہو، محروم کیا جاتا ہے، اور سرکاری محکموں میں ملازم دانشوروں کو اس میں شامل ہونے سے منع کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترقی پسند ادیبوں اور ترقی پسند ادب کی تحریک پر زیادتی کرنے اور اسے کچلنے اور دبانے کا ایک بہانہ ہے، اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ تمام ایسے سرکاری نوکر جو حکمراں جماعت کی سیاست کا ساتھ دیتے ہیں، اور جا بے جا سرکاری وسائل اور اداروں کو حکمراں جماعت کے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں، ان کی کوئی بازپُرس نہیں ہوتی بلکہ ایسے جانب دار اور خوشامدی افسروں کو مختلف طریقوں سے حکمراں گروہ رعایتیں اور سہولتیں دیتا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنّفین کبھی بھی سیاسی پارٹی نہیں تھی اور نہ اب ہے۔ انجمن کا اصلی کام ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترویج ہے، سیاسی عمل نہیں ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ رجعت پرست حکمرانوں کی دھمکیوں اور سختیوں سے ڈر کر ترقی پسند ادیب اور ان کی انجمن اپنی آزاد سیاسی رائے رکھنے اور اس کے اظہار کرنے کے حق سے دست بردار ہو جائے یا انجمن کے ایسے ممبر جو سیاسی پارٹیوں کے رکن ہیں، اور ادیب کی حیثیت کے علاوہ ان کی ایک سیاسی حیثیت بھی ہے، انجمن سے کنارہ کش ہو جائیں۔ رجعت پرست ہمیں ایسی پوزیشن میں پہنچانا چاہتے ہیں، لیکن ایسا کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ انجمن کے بال و پر کاٹ دیے جائیں۔ ملک کی عوامی انقلابی رَو سے اس کا قطع تعلق کر دیا جائے، وہ رشتے جن کے ذریعے سے انجمن کا تعلق عوام اور ان کی جدوجہد سے ہے، منقطع کر دیے جائیں، اور اس طرح انجمن کے جسم سے نئے اور تازہ خون کی گردش اور روانی بند کر کے اسے مردہ کر دیا جائے۔ اگر انجمن ترقی پسند مصنّفین میں ایسے ''عالم'' پیدا ہو گئے ہیں جنھیں دھول اور پسینہ سے لت پت عوام، ان کے جلسوں اور مظاہروں، ان کے ''غیر مہذب'' طور طریقوں، کبھی کبھی سخت جدوجہد کے بعد خون سے بھیگ جانے والے ان کے میلے کپڑوں اور

ان کی اندھیری اور بیماریوں سے بھری ہوئی بدبودار بستیوں سے کراہیت آتی ہے، اور یہ باتیں انھیں ''غیرادیبانہ'' اور ''غیرشاعرانہ'' معلوم ہوتی ہیں، تو ایسے ثقہ حضرات کے لیے حلقہ ارباب ذوق اور اسی قسم کی کئی دوسری ادبی انجمنوں کے دروازے کھلے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ وہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کو آختہ کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے، خود ایسی جگہ پر چلے جائیں جہاں اسی قسم کے لوگوں کا اجتماع ان کا خیر مقدم کرے گا۔

ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کے جس ابتدائی تین چار سال کا ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں، اس وقت ان باتوں کی طرف خیال بھی نہیں جاتا تھا۔ انجمن کے زیادہ تر سرگرم کارکن کسی نہ کسی بائیں بازو کی عوامی تنظیم، کمیونسٹ پارٹی، کانگریس سوشلسٹ پارٹی، اسٹوڈینٹس فیڈریشن، کسان سبھا، ٹریڈ یونین وغیرہ کے کارکن بھی تھے۔ انجمن کی کانفرنسوں میں بائیں بازو کے سیاسی لیڈر اور عام کارکن، سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے مزدور اور کسان، اور سیاست میں حصہ لینے والے طلبا وغیرہ عام طور سے شریک ہوتے تھے۔ چونکہ اس زمانہ میں بائیں بازو والے کانگریس میں شریک تھے، اس لیے بارہا ایسا بھی ہوا کہ کانگریس کے کسی بڑے اجلاس کے ہی موقع پر انجمن کا ہی کل ہند اجتماع کرلیا جاتا تھا۔ نوجوان ترقی پسند شعرا مزدوروں، کسانوں اور طلبا کی کانفرنسوں اور عام سیاسی جلسوں میں شریک ہوتے تھے، اور ان میں اپنی نظمیں پڑھتے۔ جلسوں اور کانفرنسوں میں نظمیں پڑھنے کا دستور پُرانا تھا۔ اب زیادہ تر ترقی پسند شعرا اس فرض کو انجام دینے لگے۔

1936، 1937، اور 1938 کے درمیان ہماری تحریک کا سب سے زیادہ فروغ اُردو، ہندی اور بنگالی کے نوجوان ادیبوں میں ہوا۔ اُردو اور ہندی کا علاقہ چونکہ مشترک تھا اس لیے اس علاقے میں انجمن کی جو شاخیں بنیں ان میں اُردو اور ہندی کے ادیب دونوں شامل تھے۔ لیکن عام طور سے اُردو والوں میں تحریک کا اثر زیادہ تھا اور ہندی والوں کے مقابلے میں وہ انجمن میں زیادہ تھے۔ اس کے باوجود یہ ہمارے لیے بڑے فخر اور خوشی کی بات تھی کہ ٹھیک ایسے زمانے میں جب اُردو ہندی کا جھگڑا بڑی سنگین شکل اختیار کر رہا تھا اور فرقہ وار رجعت پرست سیاست کی زہریلی فضا سے ادب کی محفل بھی مسموم ہو رہی تھی، ترقی پسند مصنّفین کی انجمن، اس کی کانفرنسیں اور اس کے جلسے، وہ واحد مقامات تھے جہاں دونوں زبانوں کے ادیب ایک ساتھ جمع ہوکر ایک دوسرے کی

لکھی ہوئیں چیزیں سنتے تھے اوران پر بحث کرتے تھے۔

اب اُردو اور ہندی کے علاقے میں انجمن کی شاخیں پٹنہ، بنارس، الہ آباد، لکھنؤ، کانپور، آگرہ، علی گڑھ، دہلی، امرتسر، اور لاہور میں قائم ہو گئیں۔ ان کے علاوہ بھی مختلف مقامات پر چھوٹے چھوٹے ترقی پسندوں کے گروپ تھے۔ دور افتادہ مقامات پر جو ترقی پسند شاعر یا ادیب تھے وہ براہ راست مرکزی انجمن (الہ آباد) سے خط و کتابت کرتے تھے۔ حیدرآباد دکن میں بھی سبط حسن کی کوششوں سے ترقی پسندوں کا حلقہ قائم ہو گیا۔ مخدوم محی الدین، جو اُن دنوں وہاں کے ایک کالج میں معلّم تھے، اس حلقے کے روح رواں تھے۔ قاضی عبدالغفار جو روزنامہ پیام (حیدرآباد) دکن کے مالک اور مدیر تھے، اس نوجوان گروہ کے حامی اور سرپرست تھے۔

بعض جگہوں پر انجمن کی شاخ قائم تو ہوئی لیکن کچھ دن زندہ رہنے کے بعد مردہ یا نیم مردہ ہو گئی......مثلاً دہلی اور علی گڑھ۔ دہلی میں انجمن کے کرتا دھرتا شاہد صاحب مدیر ''ساقی'' تھے۔ انھوں نے چند مہینے بڑے جوش سے انجمن کے باقاعدہ جلسے کیے، جہاں پر ترقی پسند افسانے اور نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ اختر حسین رائے پوری (اس وقت تک وہ ڈاکٹر نہیں تھے)، مولوی عبدالحق صاحب سے لڑ بھڑ کر انجمن ترقی اُردو کے مرکز سے علاحدہ ہو گئے تھے جو ان دنوں اورنگ آباد میں تھا، اور دہلی میں آ کر رہنے لگے تھے۔ وہ بھی انجمن میں شریک تھے اور اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ شاہد احمد صاحب نے ایک رسالہ ''شاہجہاں'' بھی جاری کیا جو خاص طور پر ترقی پسند مصنّفین کا ترجمان بنایا گیا۔ اس کے علاوہ جوش صاحب بھی دہلی میں تھے اور کلیم نکالتے تھے۔ جامعہ ملیہ کے بعض اساتذہ اور طلبا بھی انجمن کے رکن تھے، اور اس کے کاموں میں دلچسپی لیتے تھے۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب (جامعہ ملیہ) حالانکہ خود فلسفہ، تعلیم، اور انجمن ترقی اُردو کے کاموں میں مشغول رہتے تھے، لیکن ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کو ان کی ہمدردی اور سرپرستی حاصل تھی۔ مجاز علی گڑھ سے نکل کر دہلی آ گئے تھے اور آل انڈیا ریڈیو میں کام کرنے لگے تھے۔ لیکن ان بڑے بڑے جید ادیبوں، شاعروں اور عالموں کی موجودگی کے باوجود دہلی کی انجمن اس زمانہ میں پنپ نہ سکی۔

اس کے اسباب پر غور کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔

اُن دنوں میں ایک مرتبہ میرا دلی جانا ہوا۔ میں اختر حسین رائے پوری سے ملنے کے لیے

ان کے فلیٹ پر گیا جو غالباً دریا گنج میں تھا۔ اختر علی گڑھ کے اس نوجوان اور ذہین ترقی پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے دوسرے اراکین مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، حیات اللہ انصاری، سبط حسن، شہاب ملیح آبادی، شرف اطہر علی، محسن عبداللہ، علی اطہر (بہار کے) وغیرہ تھے۔ یہ اور ان کے دوسرے ساتھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بڑے بااثر طلبا میں سے تھے۔ ان کی حب الوطنی، روشن خیالی، اور ان کا ادبی و علمی ذوق اور زندگی میں ایک عام گرم جوشی اور آزاد روی ایسی دلکشی رکھتی تھی، جس کی داستانیں جب میں انگلستان سے واپس آیا تو میں نے بھی سنیں۔ یونیورسٹی کے انگریز پرست ٹوڈی مہتم جن کے سرغنہ ڈاکٹر ضیاء الدین اور پروفیسر حلیم تھے، ان جیسے لوگوں اور ان کے خیالات کو ناپسند کرتے تھے۔ اس لیے کہ مسلمان نوجوانوں میں ترقی پسندی کو انگریزی سرکار بالخصوص اپنی اجارہ داری پر حملہ تصور کرتی تھی۔ اس لیے اس سے اور یونیورسٹی کے اصحاب اقتدار سے ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی۔ چنانچہ علی سردار جعفری اور کئی اور ترقی پسند لڑکوں کو کسی بہانے یونیورسٹی سے نکال بھی دیا گیا (جس کے بعد سردار نے لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔ اے میں پڑھنا شروع کیا)۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر اشرف کو بھی یونیورسٹی سے علاحدہ ہونا پڑا۔ وہ اسلامی تاریخ کے شعبہ میں عارضی لکچرار تھے۔ ان کو مستقل نہیں کیا گیا۔

1936 یا شاید اس سے بھی کچھ پہلے اختر حسین رائے پوری نے اپنا مشہور مضمون ''ادب اور زندگی'' لکھا جو انجمن ترقی اُردو (ہند) کے سہ ماہی رسالے ''اُردو'' میں شائع ہوا۔ میرے خیال میں یہ ہماری زبان میں پہلا مضمون ہے جس میں مبسوط اور مدلل طریقے سے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق کی ضرورت بتائی گئی، اور پُرانے ادب کی رجعت پرست قدروں کی تشریح کر کے اس کی سخت مذمت کی گئی۔ اس اہم مضمون کے مصنف کی حیثیت سے اختر حسین رائے پوری کو اُردو کے ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں اوّلیت حاصل ہے۔ یقینی اس مضمون میں خامیاں اور کجرویاں ہیں۔ مثلاً ہمارے قدیم ادب کا تجزیہ اس میں صحیح طور سے نہیں کیا گیا تھا اور انتہا پسندانہ رویہ اختیار کر کے تقریباً تمام پُرانے ادب کو تنزل پذیر جاگیری عہد کی پیداوار قرار دے کر معتوب کیا گیا تھا۔ لیکن اس زمانے میں یہ انتہا پسند کجروی عام تھی۔

بہر حال جب میں اختر حسین رائے پوری سے دہلی میں ملا اور وہاں کی انجمن کے بارے

میں گفتگو شروع کی تو انھوں نے ایک عجیب وغریب داستان سنائی۔

دہلی کی انجمن کے متعلق بھی خفیہ پولیس کے لوگوں نے پوچھ گچھ شروع کر دی تھی۔ جیسا کہ ان کا دستور ہے، عام خوف اور دہشت کی فضا قائم کرنے کے لیے وہ انجمن کے ایسے کارکنوں کے پاس گئے جن کو وہ اپنی نظر میں کمزور سمجھتے تھے، اور خیر خواہ بن کر ان سے کہا کہ ان کے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ وہ انجمن سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اس لیے کہ سرکار اسے بُری نظر سے دیکھتی ہے۔ ان لوگوں سے یہ بھی کہا گیا کہ انجمن کے ہر ایک جلسے کی کارروائی کی پولیس رپورٹ لیتی ہے اور اس میں اس کے مخبر موجود رہتے ہیں۔ خفیہ پولیس کی ان حرکتوں کے سبب بعض لوگ دراصل پریشان ہو گئے۔ غضب یہ ہوا کہ انجمن کے سکریٹری شاہد احمد صاحب نے انجمن کی مکمل ''ادبی'' اور غیر سیاسی نوعیت کو ثابت کرنے کے لیے خفیہ پولیس کے آدمیوں سے یہ کہا کہ وہ باقاعدہ انجمن کے جلسوں میں خود شریک ہوں تا کہ اس کے متعلق انھیں اطمینان ہو جائے۔ چنانچہ انجمن کے سکریٹری کی دعوت پر خفیہ پولیس کے ایک انسپکٹر باقاعدہ اور کھلے بندوں انجمن کے محتسب کے فرائض انجام دینے کے لیے ایک دو جلسوں میں شریک بھی ہوئے۔ شاہد احمد صاحب نے یہ حرکت بغیر انجمن کے ممبروں کی اجازت کے کی تھی اور غالباً انجمن کی ایگزیکیٹو کمیٹی کی بھی اس بارے میں رائے نہیں پوچھی گئی تھی۔ بہرحال عام ممبروں نے سکریٹری کے اس فعل پر سخت نکتہ چینی کی اور اسے ان کی اخلاقی کمزوری اور بُزدلی پر محمول کیا۔ انھوں نے کہا کہ خفیہ پولیس سے نیک نامی کا سرٹیفکیٹ لے کر ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کبھی چلائی نہیں جاسکتی۔ ان کے عناد اور مخالفت کا سبب یہ نہیں کہ انجمن کوئی سازشی یا سیاسی جماعت ہے۔ بلکہ وہ چونکہ ایک رجعت پرست حکومت کے کارندے ہیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ انجمن اور ترقی پسند ادب کی تحریک کو کسی نہ کسی طرح ناکام بنایا جائے۔ اگر ہم اُن کو اپنے جلسوں میں مدعو بھی کرلیں پھر بھی وہ اپنی تخریبی کوششوں سے باز نہ آئیں گے۔ رجعت پرستوں یا ان کے ایجنٹوں کی خوشامد کر کے ہم ان کے حملوں سے بچ نہیں سکیں گے۔ بلکہ ہمیں تو ان کی مخالفت اور بغض کے باوجود اطمینان سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھنی چاہیے۔ دلجوئی تو ایسے شخص یا گروہ کی کی جاتی ہے جو کسی غلط فہمی کی بنا پر ہمارا مخالف ہو۔ ایسے لوگوں کو سمجھانے یا ان کی شکایتوں کو دور کرنے کی کوشش کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں جو بنیادی طور سے، اور اپنے مادی

مفاد کی بنا پر ہمارے دشمن ہوں اور ہماری بیخ کنی اپنا فرض سمجھتے ہوں۔ ایسے لوگوں کا کامیاب مقابلہ صرف اپنی قوت کو بڑھا کر، عوام میں اپنے حامی اور مددگار پیدا کر کے، اپنے کام کو اور زیادہ تندہی اور خوبی کے ساتھ انجام دے کر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم وقت بے وقت اور خواہ مخواہ ان سے لڑائی مول لیتے پھریں۔ کسی خاص مشکل کے وقت ہمیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے، اس کا فیصلہ ہمیں ان حالات کو دیکھ کر کرنا ہوگا۔ لیکن کسی بھی صورت میں ہم اپنے بنیادی اصولوں کو خیر باد نہیں کہہ سکتے۔ انجمن کے بنیادی مقاصد بھی بدلے جا سکتے ہیں، لیکن یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب سارے ملک کے ممبروں کی اکثریت باہمی بحث مباحثے کے بعد جمہوری طور سے اس کا فیصلہ کرے، اور یہ صرف دو صورتوں میں ہونا چاہیے...... یا تو ایسے موقع پر جب ہماری موجودہ معاشرت میں انقلابی تبدیلی ہو جائے اور اس لیے ترقی پسندی کے تقاضے بدل جائیں، یا ایسی صورت میں جب تجربے کی بنا پر ہم اس نتیجے پر نہیں پہنچیں کہ ہمارے موجودہ نصب العین میں کوئی بنیادی غلطی یا خامی ہے جو پہلے ہمیں نظر نہیں آئی تھی اور جسے ہم نے بعد کو دریافت کیا۔

اس جھگڑے کے بعد شاہد احمد صاحب اور ان کے گروہ کے چند اور اصحاب انجمن کے کاموں سے کنارہ کش ہو گئے۔ ''شاہجہاں'' کی اشاعت بھی بند ہو گئی۔

میں نے اختر حسین سے کہا کہ خیر اگر شاہد صاحب پولیس کی ایک دھمکی سے ہی گھبرا کر انجمن سے الگ ہونا ہی پسند کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے لوگ انجمن کا کام کیوں نہ جاری رکھیں۔ اب انھوں نے نئی مشکلات بیان کیں۔ جو بڑے اور بھاری بھر کم قسم کے ادیب ہیں، ان کے لیے اپنے ذمے کوئی تنظیمی کام لینا ناممکن ہے۔ جلسوں میں شرکت کے لیے بھی بغیر بار بار کے تقاضے کے وہ نہیں آتے۔ اس کے لیے تو کوئی نوجوان قسم کا جوشیلا آدمی درکار ہے جو دوڑ دھوپ کر کے انجمن کے رجسٹر رکھے، جلسے کی جگہ مقرر کرے، لوگوں کو چیزیں لکھنے کے لیے آمادہ کرے اور دلچسپ پروگرام بنائے۔ پھر دہلی ایک ایسی جگہ ہے جہاں فاصلے بڑے جان لیوا ہیں۔ کشمیری گیٹ ایک سرے پر، دریا گنج اور جامع مسجد دوسری طرف۔ جامعہ ملیہ (اس وقت جامعہ ملیہ قرول باغ میں تھی۔ بعد کو جامعہ نگر میں منتقل ہو گئی جو دہلی کے باہر ہے۔) اور نئی دہلی دو الگ الگ کناروں پر۔ لوگوں کو ایک حصے سے دوسرے حصے تک پہنچنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ جلسے کی جگہ بھی بڑی

مشکل سے دستیاب ہوتی ہے۔

اصل میں، میں اختر رائے پوری سے یہ توقع کرتا تھا کہ وہ دہلی کی انجمن کی صرف رہنمائی ہی نہیں بلکہ ان مشکلات پر قابو حاصل کرنے کے لیے خود ایک جوشیلے اور دوڑ دھوپ کرنے والے نوجوان بنیں گے۔ لیکن ان سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ وہ بھی اب ''بڑے'' ادیبوں کے زمرے میں آ گئے ہیں۔ کچھ نجی مالی مشکلات، کچھ دنیا میں ''ترقی'' کرنے کی خواہش، ترقی پسند ادب کی مشکل ذمہ داریوں سے انھیں دور کھینچتی جا رہی ہے۔

دہلی کی انجمن غالباً ٹوٹی تو نہیں لیکن کافی عرصہ تک نیم مردہ حالت میں رہی۔ جنگ کے زمانے میں 1942 کے بعد جب ہماری تحریک میں دو سال کے تنظیمی تعطل کے بعد نئے سرے سے جان آئی تو قاضی محمد احمد صاحب انجمن کے معتمد بنے۔ اس وقت دہلی میں ڈاکٹر تاثیر، فیض احمد فیض، کانتی چرن سون رکھشا اور ان کی افسانہ نگار بیوی اور کئی اور نوجوان ادیب موجود تھے۔ لیکن میں جب دہلی جاتا تو وہاں کی انجمن کو نیم مردہ ہی پاتا۔ البتہ جامعہ ملیہ میں وہاں کے بعض ترقی پسند نوجوان معلموں اور طلبا کی کوشش سے ترقی پسند حلقہ مسلسل قائم رہا۔ 1946 کے بعد حالات بدل گئے۔ اس وقت شیو دان سنگھ چوہان اور شمشیر سنگھ نرولا کی کوششوں سے انجمن میں نئے سرے سے زندگی اور حرکت پیدا ہوئی اور اس کے جلسے ہونے لگے۔ دریا گنج کے تعلیمی اداروں میں سے کہیں نہ کہیں چھوٹا سا ہال جلسے کے لیے لیا جاتا اور دلچسپ جلسے ہوتے۔ دو تین جلسوں میں میں بھی شریک ہوا۔ لیکن یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ 1946 میں انجمن کا چلانا، جب کہ تحریک دس سال سے جاری تھی، 1936 اور 1937 کے مقابلہ میں بہت زیادہ سہل تھا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی شروع کے زمانہ میں انجمن کے راستے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ جس ترقی پسند گروہ کا ہم نے اوپر ذکر کیا، 1936 تک وہ علی گڑھ سے رخصت ہو چکا تھا اور فرقہ پرست سیاست سے پشت پناہی حاصل کر کے علی گڑھ میں ترقی پسند سیاسی یا ادبی خیالات رکھنے والے اساتذہ اور طلبا دونوں کے لیے حالات بہت مشکل بنا دیے گئے تھے۔ رجعت پرستی کی جب بھی کوئی تیز رو چلتی ہے، اور وہ جب عوامی قوتوں پر حملہ آور ہوتی ہے تو سب سے پہلے نچلے درمیانہ طبقے کے بعض افراد اس سے متاثر ہو کر ترقی پسندی کو خیر باد کہتے ہیں، اور اپنی ہزیمت

اور عافیت کوشی کو خوش نما رنگ دینے کے لیے طرح طرح کے فلسفیانہ، اخلاقی، مذہبی یا فنی اور علمی جواز تلاش کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض ایسے اساتذہ جو ادب میں شغف اور ذوقِ سلیم کے لیے مشہور تھے اور جن کی راہ نمائی میں اس سے پہلے ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ اچھا ادبی اور علمی ذوق طلبا میں پیدا ہوا تھا، اب ترقی پسندی کے نام سے گھبرانے لگے۔ فرقہ پرست رَو سے اپنی مطابقت کا اظہار کرنے کے لیے وہ پرہیز گار اور زاہد کی حیثیت سے اپنی نمائش کرنے لگے۔ ایک صاحب نے اپنے کتب خانے سے تمام ترقی پسند کتابیں ہٹا کر گودام میں ڈال دیں جہاں انھیں کیڑے کھا گئے۔ ایک دوسرے صاحب جو اُردو ادب کے عالم اور ادیب شمار کیے جاتے تھے اور ترقی پسند نوجوانوں کے اگر ساتھ نہیں تھے تو ان کے سرپرست ضرور شمار کیے جاتے تھے، اس قدر جوش میں آئے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک کو اُردو ادب اور مسلمانوں کے اخلاق کے لیے خطرہ تصور کر کے، اس کے کھلے اور پست ترین مخالفوں کی صف میں آگے بڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس کے برخلاف بعض دوسرے اساتذہ جو نسبتاً نوجوان تھے اور جو رجعت پرستوں کے حملے سے زیادہ خطرے میں تھے، ثابت قدم رہے، اور طلبا میں ایک چھوٹا سا گروہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی ترقی پسند ادب کا پرچم بلند کیے رہا۔

اگر دہلی اور علی گڑھ میں ہماری تحریک کی یہ کیفیت تھی تو دوسری جگہوں پر نوجوان ترقی پسند ادیبوں کا گروہ اور ان کے کارکن انجمن کو مزدوروں، کسانوں اور دوسری بائیں بازو کی عوامی تحریکوں سے زیادہ سے زیادہ قریب لانے کے کوشاں تھے اور کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ''آبگینہ'' ''تندیِ صہبا'' سے پگھل جائے گا۔ ایسے موقعوں کی نشہ آور سرخوشی کا احساس صرف انھیں کو ہو سکتا ہے جو خود اس قسم کی بزموں میں شریک رہے ہوں۔

1937 کی گرمیوں کے شروع میں پنجاب کسان کمیٹی کا سالانہ اجلاس امرتسر میں ہونا قرار پایا۔ صوبہ متحدہ کی کسان سبھا کے کارکنوں کی حیثیت سے ڈاکٹر اشرف کو اور مجھے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ ہم دونوں اس کے آرزومند بھی تھے۔ اس لیے کہ پنجاب کی کسان تحریک ہمارے صوبہ کی کسان تحریک سے زیادہ مضبوط تھی اور ہم چاہتے تھے کہ اپنی آنکھوں سے پنجاب کے جری اور آزادی خواہ کسان عوام کو ہزاروں کی تعداد میں ایک جگہ پر جمع دیکھیں، ان

کے اتحاد، طاقت اور انقلابی جذبے کا ذاتی تجربہ کریں، اور اس طرح خود اپنے انقلابی شعور کو وسعت دیں۔

اس کے چند دنوں بعد مجھے اطلاع ملی کہ اسی موقع پر پنجاب کے ترقی پسند مصنّفین نے بھی امرتسر میں اپنی کانفرنس کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ چونکہ یہ ان کی پہلی صوبائی کانفرنس ہے، جس کے بعد لاہور اور امرتسر کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی انجمن کی شاخیں قائم ہونے کی امید کی جاتی ہے، اس لیے انجمن کے کل ہند جنرل سکریٹری کی حیثیت سے میری شرکت اس کانفرنس میں ضروری ہے۔

اب میرے لیے امرتسر پہنچنا اور بھی ضروری ہو گیا۔ کسان کانفرنس جلیاں والا باغ میں تھی، جہاں پر ہزاروں پنجابی کسان اکٹھا ہوئے تھے۔ ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس بھی یہیں ہونا قرار پائی۔ فیض اس کے مہتمم تھے۔ کسان کانفرنس کے موقع پر وہ ایک بستہ ہاتھ میں لیے جلیانوالا باغ میں اِدھر اُدھر مسکراتے گھومتے ہوئے مجھے کبھی کبھی نظر آجاتے۔ میں نے ان سے کہا کہ...... ’’اس ہنگامہ اور مجمع میں مصنّفین کی کانفرنس کیسے ہوگی؟ کسان سبھا کے سیشن جب ختم بھی ہو جاتے ہیں اس وقت بھی کافی بڑا مجمع کانفرنس کے پنڈال میں موجود رہتا ہے۔‘‘ فیض نے کہا کہ کیا کریں، ہم نے بہت کوشش کی کہ مقامی کالجوں یا اسکولوں میں سے ہمیں کوئی دو دن کانفرنس کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا ہال دے دے لیکن کوئی بھی راضی نہ ہوا۔ آخر کار ہم نے کسان کانفرنس والوں سے کہا۔ وہ بڑی خوشی سے خالی وقت میں اپنا پنڈال دینے کے لیے راضی ہو گئے۔ اچھا ہے...... پنجاب کے کسان اپنے عوامی مصنّفین کی صورتیں تو دیکھ لیں، اور مصنّفین کے لیے بھی کسانوں کے سایہ میں اپنی کارروائی کرنا مفید ہوگا۔‘‘ مجھے تعجب اس پر تھا کہ ایم۔ اے۔ او کالج والوں نے بھی ہال نہیں دیا۔ تاثیر اس کے پرنسپل تھے اور فیض وہاں پڑھاتے تھے۔ فیض نے کہا کہ...... ’’بس سمجھ لیجیے کہ یہاں کے بعض حلقے ہماری انجمن کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔‘‘ جس شان سے ترقی پسندوں کی یہ کانفرنس ہوئی ویسی شاید ہی کوئی اور ہوئی ہو۔ پنڈال تو بہت بڑا تھا جس میں دس ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ ہماری کانفرنس میں زیادہ سے زیادہ دو سو آدمی شریک ہوئے۔ اس لیے آخر وقت میں یہ فیصلہ ہوا کہ پنڈال کے ڈائس پر ہی (جو جلیاں والا باغ

کے درمیان کے پکے چبوترے پر تھا) کانفرنس کر لی جائے۔ سارے پنڈال کو ہم استعمال نہ کریں۔

ایک دن صبح کے سیشن کے بعد دو پہر کو کسان کانفرنس کا اجلاس نہیں تھا، اسی دن تیسرے پہر کو مصنّفین کی کانفرنس جلیاں والا باغ کے چبوترے پر ہوئی اور ایک پھٹا سا شامیانہ تھا اور نیچے ایک میلی پُرانی دری، جو صبح کے کسان جلسے کے بعد اور بھی مٹی میں لتھڑ گئی تھی اور جسے کوئی صاف کرنے والا نہیں تھا۔ کرسیاں یا میزیں وہاں بالکل نہ تھیں، اس لیے سب لوگ دری پر بیٹھ گئے۔ کانفرنس میں شریک ہونے والوں میں سب تو مجھے یاد نہیں، لیکن وہ جن کی صورتیں ابھی تک نظروں میں ہیں، یہ تھے...... چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر تاثیر، فیروز دین منصور، ٹیکا رام سخن، پروفیسر محبّ الحسن، رگھونش کمار کپور (ڈی۔اے۔وی کالج)، رگھو پتی چوپڑا، پروفیسر سنت سنگھ (خالصہ کالج)، ڈاکٹر اشرف، فیض۔ ان کے علاوہ پنجاب کے کئی عوامی کسان شاعر بھی تھے۔ مجھے ظہیر کاشمیری یا کرشن چندر کی اس کانفرنس میں شرکت یاد نہیں۔ ممکن ہے رہے ہوں۔ اس وقت ادیب کی حیثیت سے ہم انھیں نہیں جانتے تھے۔ اجلاس میں پنجاب کے دوسرے شہروں کے بھی نمائندے تھے جن کی کل تعداد پچیس تیس رہی ہوگی۔ لیکن حاضرین کی تعداد کئی سو تھی جو پورے چبوترے پر سمٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان میں اکثر طالب علم، شہر کے نوجوان، دانشور اور وہ کسان تھے جن کو ادب اور شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔

اس کانفرنس کی روداد مجھے یاد نہیں۔ ممکن ہے فیض کو یاد ہو یا ان کے پاس کانفرنس کی تجاویز اور بحثوں کی رپورٹ محفوظ ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کانفرنس کی روداد سے زیادہ اہم اس کا ماحول اور اس کی فضا تھی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ اس کانفرنس کی بے سروسامانی اور بے ترتیبی پر مجھے کسی قدر جھنجلاہٹ اور بے اطمینانی ہوئی تھی۔ اس ہنگامہ میں سنجیدہ ادبی بحث ممکن نہ تھی۔ مگر ادب میں محض سنجیدگی ہی تو ضروری نہیں۔ درمیانہ طبقے کے دانشور جو اپنے کو عام طور سے تنہا، کمزور اور بے بس تصور کرتے ہیں، کیا محنت کش عوام کے مجمع کی طاقت سے اپنی روح اور نفس کو تازہ اور جاندار بنانا نہیں چاہتے؟ بوڑھے، نوجوان، اور درمیانہ عمر کے محنت کشوں کی ہزاروں آنکھیں چاروں طرف سے تعجب اور ہمدردی کے ساتھ جلیاں والا باغ کے چبوترے پر بیٹھے ہوئے اس مجمع کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں ان کی بہت سی باتیں نہ آتی ہوں، لیکن وہ یہ جانتے تھے کہ یہ ادیب ان کی

طرف ہیں، یہ ان کے ساتھ ہیں۔ ان کے دل میں یہ خواہش ضرور ہوگی کہ کاش یہ ایسی زبان میں بات کرتے جو اُن کی سمجھ میں پوری طرح آتی...... اور ادیب بھی سوچتے ہوں گے ابھی ہم ان کے بیچ میں بیٹھ تو گئے ہیں لیکن ان کی زبان میں ان کے دل کی بات کہنے کے لیے ہمیں اور زیادہ ان کے پاس جانا ہوگا۔ حب الوطنی کا وہ شعلہ جو جلیاں والا باغ کے شہیدوں نے اپنا خون بہا کر روشن کیا تھا، کیا ایک نہ ایک دن ہمارے قومی ادب کی لکیروں کو بھی تابندہ نہیں کرے گا۔ ایسی لکیریں اور ایسے لفظ جو عوام کے دلوں میں کھب جائیں اور ان کے دماغ میں اُجالا کریں، اور ان کو آزادی اور ترقی کی شاہراہ پر زیادہ تیزی اور ثابت قدمی سے آگے بڑھائیں۔

پنجاب کے اسی سفر میں مجھے علاّمہ اقبال سے ملنے کی بھی سعادت نصیب ہوئی۔ پہلی بار جب میں لاہور آیا تھا تو ڈاکٹر صاحب سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ ظاہر ہے اقبال سے ملنا اور ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق ان سے گفتگو کرنا ہمارے لیے ضروری تھا۔ تاثیر نے امرتسر میں ہمیں بتایا کہ انھوں نے علاّمہ سے نئی تحریک کے بارے میں گفتگو کی ہے اور انھوں نے اس سے ہمدردی اور دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔

امرتسر سے ڈاکٹر اشرف اور میں لاہور آئے اور میاں افتخار الدین کے یہاں ٹھہرے۔ میاں صاحب نے علامہ اقبال سے ہمارے ملنے کا وقت مقرر کیا۔ ہم تیسرے پہر، چائے کے بعد ان کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ گرمیوں کے دن تھے اور اقبال اپنی کوٹھی کے باہر ایک کھردری بان کی چارپائی پر نیم دراز اپنے بستر کا تکیہ لگائے بیٹھے تھے اور حقہ پی رہے تھے، وہ اشرف سے اور مجھ سے بڑے تپاک اور شفقت سے ملے۔ ان کے پلنگ کے گرد جو تین چار مونڈھے رکھے ہوئے تھے، ہم ان پر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے داہنے ہاتھ کی طرف تھے۔ ہم نے دیکھا کہ بائیں طرف ایک صاحب اور وہاں پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارا ان کے ساتھ تعارف نہیں کروایا۔ اس پر مجھے کسی قدر تعجب ہوا۔ اقبال سے پہلی بار ملاقات کا تجربہ میرے لیے کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ان کا کلام بچپن سے ہمارے ذہن اور روح بلکہ خون میں رچا ہوا تھا۔ چھوٹی عمر میں جب ہماری زبان میں لکنت تھی۔ ہم کو ان کے قومی اور ملی ترانے یاد کرائے گئے تھے۔ جوں جوں عمر بڑھی اور شعور آیا، ''مسدس حالی'' کے ساتھ ساتھ ''شکوہ، جواب شکوہ، شمع وشاعر'' کے

بیشتر حصے ورد ِزبان رہتے تھے۔ ’’بانگ درا‘‘ شائع ہوئی تو اس کی ’’تلاوت‘‘ ادبی اور قومی سمجھ کر ہوتی رہی۔ انگلستان کی تعلیم کے زمانے میں اقبال کا فارسی کلام پڑھتے رہے۔ میں خود جب اپنی ذہنی اور ادبی تربیت کے متعلق اپنی طالب علمی کے زمانے کا خیال کرتا ہوں تو اُردو کے شاعروں میں انیس، غالب، حالی اور اقبال کا اس میں سب سے زیادہ حصہ نظر آتا ہے۔

اور اب ہم اسی اقبال کے پاس بیٹھے ہوئے تھے! اس وقت معلوم نہیں کیوں مجھے ان کی نظم ’’تنہائی‘‘ یاد آ گئی۔ عہدِ شباب میں جب کبھی محبت کا شدید غم دل کو خون کر دیتا تھا، ہم اسے گنگناتے تھے......

به بحر رفتم و گفتم ز موج تنهائی ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلے داری

ساری کائنات سے غم گساری کی طلب کے بعد......

شدم بہ حضرتِ یزداں، گذشتم از مہ و مہر
کہ در جہانِ تو یک ذرہ آشنائم نیست
جہاں تہی ز دل و مشتِ خاکِ من ہمہ دل
چمن خوش است ولے در خورِ نوائم نیست
تبسّمے بہ لب او رسید و ہیچ نہ گفت

ہمارے ساتھ علامہ اقبال کے التفات وعنایت کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ مجھے جرأت ہوئی کہ سب سے پہلے ان سے ہمیں جو اختلاف اور شکایتیں تھیں، وہی ان کے سامنے پیش کروں اور محض عقیدت مندی کی باتیں نہ کروں۔ سوشلزم کے بارے میں گفتگو شروع ہوگئی اور شاید میں نے ان سے کہا...... ہماری نظر میں قوم کی غلامی، بین الاقوامی جنگ، محنت کشوں کے ظالمانہ استحصال کا علاج، موجودہ دور میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن انھوں نے بعض مقامات پر اپنے کلام میں اشترا کی نظریہ پر غلط نکتہ چینی کی ہے۔ خود ان کی آزادی خواہی اور انسان نوازی کی منطق، ہمیں سوشلزم کی طرف لے جاتی ہے اور ہماری نظر میں نوع انسانی کی موجودہ ارتقا کی منزل وہی ہے۔ میں نے کہا کہ نوجوان ترقی پسند ادیبوں کا گروہ اس نئے نظریے سے کافی متاثر ہے۔ وہ بڑی توجہ اور سنجیدگی سے میری باتیں سنتے رہے۔ بلکہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں کے لیے

میری ہمت افزائی فرما رہے ہیں۔ پھر انھوں نے کہا...... ''تاثیر نے مجھ سے ترقی پسند تحریک کے متعلق دو ایک بار باتیں کی تھیں اور مجھے اس سے بڑی دلچسپی ہوئی ہے...... ممکن ہے سوشلزم کے سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہو...... بات یہ ہے کہ میں نے اس کے متعلق کافی پڑھا بھی نہیں ہے۔ میں نے تاثیر سے کہا تھا کہ وہ اس موضوع پر مجھے مستند کتابیں دیں۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا، لیکن ابھی تک پورا نہیں کیا...... میرا نقطۂ نظر آپ جانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے۔ آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیے۔''

ابھی ہماری گفتگو بالکل ابتدائی منزل میں ہی تھی کہ میرے رفیق ڈاکٹر اشرف نے خالص سیاسی موضوع پر علاّمہ سے باتیں شروع کر دیں۔ جب ڈاکٹر اشرف گفتگو کا سرا اپنے ہاتھ میں لے لیں تو پھر گفتگو نہیں، گفت وشنید ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں صوبہ متحدہ میں قوم پرور مسلمانوں اور مسلم لیگ والوں میں سخت سیاسی کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ علامہ اقبال خاموشی سے اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اشرف کی دلچسپ اور تیز طنز کلامی سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اس درمیان میں نے دیکھا کہ وہ تیسرے صاحب، جو وہاں بیٹھے تھے اور جن کا ڈاکٹر اقبال نے ہم سے تعارف بھی نہیں کروایا تھا، کافی جز بز ہو رہے تھے۔ آخر میں ان کی شامت آئی اور انھوں نے اشرف کو ٹوک کر شاید کچھ ایسی بات کہی جس سے یہ مفہوم نکلتا تھا کہ قوم پرور مسلمان، کانگریسی لیڈروں کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں۔ اشرف بھلا یہ بات کہاں برداشت کر سکتے تھے؟ انھوں نے چھوٹتے ہی کہا...... ''اس قسم کے لغویات صرف سرکاری ٹوڈی یا سی۔ آئی۔ ڈی کے لوگ کہہ سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ ان ہی جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔'' اس پر ان صاحب کا رنگ زرد پڑ گیا اور ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ علامہ اقبال اس بے لطفی کے سبب سے گھبرا گئے۔ انھوں نے بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کی، اور خود اشرف سے مخاطب ہو گئے۔ اشرف کی باتوں کا انداز اب آتش بازی کا تھا جس میں حرارت، تیزی اور گل فشانی تھی۔ سب مبہوت سے ہو کر انھیں سن رہے تھے۔ اتنے میں مغرب کا وقت ہو گیا۔ اشرف کی باتوں میں مداخلت کرنے والے صاحب بڑے اہتمام اور اعلان کے ساتھ وضو کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم بھی علامہ اقبال سے سمع خراشی کی معافی مانگ کر رخصت ہوئے۔ بعد کو جب ہم نے اپنے دوستوں سے اس ملاقات کا ذکر کیا اور ان

صاحب کا حلیہ بتایا جو علامہ اقبال کے پاس بیٹھے ہوئے ہمیں ملے تھے، تو انھوں نے کہا وہ ضرور چودھری محمد حسین رہے ہوں گے اور اشرف کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے۔ یہ حضرت پنجاب سرکار کے محکمہ اطلاعات میں محتسب کی حیثیت سے کافی بدنام تھے۔ سعادت حسن منٹو پر فحاشی کے مقدمے چلوانے میں ان کا ہی ہاتھ تھا۔ تمام محبّ وطن اور ترقی پسند اخباروں، رسالوں اور پریسوں سے ضمانتیں طلب کرنے اور ان پر مقدمہ چلانے کی وجہ سے وہ کافی بدنام تھے۔ منٹو نے اپنے افسانوں کے ایک مجموعے کو ان کے نام معنون کر کے یہ مشہور شعر لکھا تھا......

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

علامہ اقبال سے ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق ہماری بات چیت تشنہ اور نامکمل رہی۔ اس کا مجھے افسوس رہا۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ علامہ اقبال نے ہماری تحریک کے ساتھ دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے تہیہ کیا کہ اگلی بار جب پنجاب آؤں گا تو ان سے پھر مل کر تحریک کے متعلق زیادہ وضاحت سے گفتگو کروں گا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کا موقع نہیں ملا۔ جب میں دوبارہ لاہور گیا تو وہ طائر قدسی اس جہان سے پرواز کر چکا تھا۔

○○○

تحریک کی عوام و خواص میں مقبولیت

1937، 1938، اور 1939 میں ہم نے اُردو اور ہندی کے ترقی پسند ادیبوں کی تین کانفرنسیں منعقد کیں۔ پہلی دو الہ آباد میں اور تیسری لکھنؤ میں۔ ہمیں الہ آباد میں بڑے غیر متوقع حلقوں سے مدد مل جاتی تھی۔ الہ آباد کی انجمن کے کارکنوں میں ایک نوجوان خاتون شریمتی شیام کماری نہرو بھی تھیں۔ نہرو خاندان کی فرد ہونے کی حیثیت سے انھوں نے سیاست میں حصہ تو لیا ہی تھا اور 'سول نافرمانی' کی تحریک میں جیل جا چکی تھیں۔ (ان کی والدہ شریمتی اوما نہرو بھی کانگریس کی ایک لیڈر تھیں۔) وہ غالباً صوبہ متحدہ میں پہلی خاتون تھیں جنھوں نے ایل۔ ایل۔ بی کر کے الہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس بھی شروع کر دی تھی۔ ان دونوں ماں بیٹی کو ترقی پسند ادب سے دلچسپی تھی اور وہ خود بھی کبھی کبھی مختصر افسانے لکھتی تھیں۔ لیکن ادب سے زیادہ انھیں اچھے کاموں اور تحریکوں کی تنظیم کا شوق تھا۔ شیام کماری جب کسی کام کے کرنے کا ارادہ کر لیتیں تو انھیں ایک دم کے لیے چین نہیں آتا تھا۔ کانفرنس کی خواہش تو ہم میں سے بہتوں کو تھی لیکن اس کے انتظامات، اس کے لیے چندہ جمع کرنا، جگہ کا بندوبست کرنا، اس کا پروپیگنڈہ کرنا، مہمانوں کے ٹھہرنے کا بندوبست کرنا، ان سب مشکلوں کا خیال کر کے ہمارے حوصلے پست ہو جاتے تھے...... لیکن شیام کماری کے نہیں۔ انھوں نے کہا کہ کانفرنس ہو سکتی ہے اور ایک سال نہیں، دو سال کانفرنس کر کے انھوں نے دکھا دیا کہ ہو سکتی ہے۔ ضرورت صرف ہاتھ پاؤں ہلانے، اپنے تمام اور ہر قسم کے اثر و رسوخ استعمال کرنے کی ہے۔ الہ آباد میں سودیشی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ایک انجمن

تھی۔اس کی طرف سے ہر سال الہ آباد میں ایک نمائش ہوتی تھی، جس کے ذریعے سے سودیشی انجمن کے پاس کافی سرمایہ بھی جمع ہو گیا تھا۔شیام کماری اس کی سکریٹری تھیں۔انھوں نے کہا کہ سودیشی نمائش کے دنوں میں اور اسی کے احاطے میں ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس کی جاسکتی ہے۔ سودیشی نمائش ویسے بھی ہر سال نمائش کے موقع پر ایک مشاعرہ اور کوی سمیلن کرتی تھی جس کے لیے پنڈال لگتا تھا۔آخر ترقی پسند ادب کی تحریک بھی تو قومی اور سودیشی ہے۔اس کی کانفرنس بھی کیوں نہ اسی پنڈال میں ہو جائے۔سودیشی انجمن کی کمیٹی کے باقی ممبر بھی اس پر راضی ہو گئے...... اور اس طرح پنڈال، روشنی، کرسیاں، وغیرہ تو ہمیں مفت مل گئے۔ باقی اخراجات کے لیے بھی شیام کماری اور ان کے دو ایک ساتھیوں نے یونیورسٹی کے ہر ایک پروفیسر، ہائی کورٹ کے ہر ایک وکیل، اور بیرسٹر کے گھر کا چکر لگایا اور تھوڑا تھوڑا کر کے کافی چندہ جمع کر لیا۔

ہم سر تیج بہادر سپرو سے بھی اپنی کانفرنس کے لیے چندہ لے آئے۔سپرو صاحب ادب کے معاملے میں بے حد قدامت پرست واقع ہوئے تھے،اور ترقی پسندی کے نام سے انھیں کوفت ہوتی تھی۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھیں اُردو ادب سے اتنی محبت تھی اور ان کی طبیعت میں اتنی شرافت تھی کہ ہم نوجوانوں کی درخواست پر ان سے کبھی بھی نہیں کہتے نہ بنتی تھی۔موصوف میرے والد کے پرانے دوست ہونے کی حیثیت سے مجھ پر خاص شفقت کی نظر رکھتے تھے۔ مجھے اس کی اجازت تھی کہ ان کے لاجواب کتب خانے سے کتابیں لے جاؤں اور پڑھوں۔اپنی تمام عنایتوں کے ساتھ ساتھ آنجہانی ہمیشہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ کمیونزم سے سوائے ملک کی تباہی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔لیکن جب بھی میں نے ان سے کسی بھی ترقی پسند ادبی یا سیاسی کام کے لیے چندہ مانگا تو ہنس کر اپنے منشی سے چیک بک منگوا ہی لیتے تھے۔ چیک لکھتے جاتے اور کہتے جاتے......''آپ لوگ بزرگوں کی باتیں مانتے کب ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے ری ایکشنری سمجھتے ہیں۔'' ان کی باتیں اتنی دلچسپ ہوتی تھیں اور ان باتوں کے دوران میں وہ ایسے ایسے لطیفے اور چٹکلے سناتے تھے اور فارسی اور اُردو کے برجستہ شعر پڑھتے تھے کہ ان سے بحث کرنے سے زیادہ ان کی بات سننے میں مزہ آتا تھا۔ ہندی کی مخالفت اور اُردو کی حمایت میں وہ غلو سے کام لیتے تھے، اور گاندھی جی اور جناح صاحب سے منجملہ اور باتوں کے، ان کی ناراضی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ان میں سے دونوں کو اُردو بولنا تک ٹھیک سے نہیں آتا تھا۔لیکن دونوں قومی زبان کے مسئلے پر رائے رکھتے تھے۔ سپرو

صاحب خود اُردوئے معلیٰ بولتے تھے اور اپنے دہلی نژاد ہونے پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے۔ ان کی مجلس میں بیٹھ کر جدید ہندستان کا نہیں بلکہ مغلوں کے زمانے کا رنگ نظر آتا تھا۔ انیسویں صدی کی انگریزی لبرل روایتوں اور آئین پرستی کے ساتھ ساتھ شاہانِ اودھ کے عہد کی تہذیبی چاشنی اور آن بان کو ملانا مشکل تھا۔ لیکن سر تیج بہادر سپرو کا خمیر انھیں عناصر سے مل کر بنا معلوم ہوتا ہے۔

اب ہم نے اپنی کانفرنسوں کے لیے ایک شخص کی نہیں، بلکہ کئی اشخاص کی صدارتی مجلس منتخب کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اس میں ایک تو یہ فائدہ تھا کہ کئی زبانوں کے عالم یا مصنف کانفرنس کے صدر ہو سکتے تھے۔ چونکہ ہماری کانفرنسوں میں ایک سے زیادہ زبانوں والے حصہ لیتے ہیں، اس لیے یہ ضروری تھا۔ دوسرے یہ کہ ادبی کانفرنس میں مختلف شعبے ہوتے ہیں......تنقید، افسانہ، شعر وغیرہ۔ صدارتی مجلسوں میں ہم ان مختلف شعبوں کی نمائندگی کر سکتے تھے اور ہر ایسے اجلاس میں جس میں کسی خاص صنفِ اَدب سے بحث ہو، اسی کے ماہر کو صدر بنا سکتے تھے۔ عام طور سے ہم صدارتی مجلس میں چار یا پانچ صدر رکھتے تھے۔ چنانچہ 1937 کی کانفرنس کی صدارتی مجلس میں مولوی عبدالحق، آچاریہ نریندر دیو اور پنڈت رام نریش ترپاٹھی منتخب ہوئے۔ شاید ایک یا دو صاحب اور تھے لیکن ان کے نام یاد نہیں۔ صدر کو چنتے وقت ہم انجمن کی تمام شاخوں کی رائے لیتے تھے اور ان کے سامنے مختلف ناموں کو رکھ دیتے تھے۔ عام طور سے ہماری تجویز پر اتفاق رائے ہوتا تھا۔ لیکن ہماری یہ کوشش ہوتی تھی کہ صدارتی مجلس میں ہم ایسے لوگوں کو رکھیں جو چاہے ہماری انجمن سے تنظیمی طور پر منسلک نہ بھی ہوں، لیکن جن کے علم اور تجربے سے ہم کو فائدہ پہنچے۔ اس طرح ہم اپنی تحریک اور اس کے نوجوان مصنّفین کا اپنے ملک کی تہذیب اور ادب کے علما کے ساتھ قریبی تعلق قائم کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ بغیر ان کی ہدایت اور تعلیم کے، بغیر اپنے ملک کے علوم اور اس کی تاریخ اور تہذیب کی واقفیت حاصل کیے ہوئے اچھا جدید ادب بھی پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

بدقسمتی سے مولوی عبدالحق عین وقت پر بیمار ہو گئے اور کانفرنس کی صدارت کے لیے الٰہ آباد نہیں آ سکے۔ لیکن انھوں نے اپنا خطبہ صُدارت ہمیں بھیج دیا۔ مولوی عبدالحق کی ذات ہماری ادبی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اُردو زبان کی ارتقا کی تاریخ میں ان کی ایک مستقل جگہ ہے۔ مولوی عبدالحق کی شخصیت میں دلچسپی اور دلکشی ان کی مختلف اور متضاد خصوصیتوں کے سبب سے ہے۔

وہ علی گڑھ یونیورسٹی اور علی گڑھ تحریک کی سر سید احمد خاں اور مولانا حالی کے زمانے کی ان

روشن خیال روایات سے وابستہ ہیں جن کے سرے انیسویں صدی کی انگریزی فلسفیانہ آزاد خیالی سے ملتے تھے۔ چنانچہ وہ مذہبی احیائیت کی اس تحریک کو ناپسند کرتے ہیں جو مولانا شبلی کے زیر اثر علی گڑھ اور شمالی ہندستان کے مسلمانوں میں جاری ہوئی۔ سر سید احمد خاں اور مولانا شبلی کے تنازعوں میں وہ سر سید احمد کے حامی اور شبلی کے سخت مخالفوں میں تھے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جدید سائنس کے خیالات اُردو کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ ملک میں پھیلیں۔ ملاّئیت اور مذہبی عصبیت اور تنگ نظری کے وہ سخت مخالف ہیں اور اس لحاظ سے ان کا ''مولوی'' کا لقب بالکل ناموزوں ہے۔ چنانچہ ان کے دیباچوں میں سے اس دیباچے کا ایک حصہ اُردو ادب میں ایک یادگار جگہ رکھتا ہے، جہاں پر انھوں نے دہلی کے مولویوں کی بڑے پُر جوش الفاظ میں مذمت کی ہے۔ جنھوں نے مولوی نذیر احمد کی کتاب ''امہات الامہ'' کے نسخوں کو کافی ہنگامہ کرکے آگ میں جلا دیا تھا۔ وہ جدید اشتراکیت کے علمی فلسفہ کو بھی پسندیدہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ 1936 میں انھوں نے ڈاکٹر محمد اشرف کو انجمن ترقی اُردو کی طرف سے معاوضہ دے کر اس کام پر متعین کیا کہ سوشلزم کی ایک علمی اور مبسوط تاریخ اُردو میں لکھیں۔ بدقسمتی سے ڈاکٹر اشرف چند ماہ تک اس کام کو کرنے کے بعد اپنی سیاسی مشغولیتوں میں اس قدر گرفتار ہو گئے کہ یہ کتاب پوری نہ ہو سکی۔ مولوی صاحب اس بات کی وجہ سے ڈاکٹر اشرف سے شاید مستقل طور پر ناراض ہو گئے۔ پاکستان آنے کے بعد اور اس ضعیفی کے عالم میں بھی مولوی صاحب نے اپنی اس آزاد خیالی کے مسلک کو ترک نہیں کیا تھا۔ چنانچہ کراچی کی رجعت پرست فضا میں بھی جب روسی ادب کا نام لینا ہی خطرناک سمجھا جاتا ہے، انھوں نے تین سال ہوئے ''یوم میکسم گورکی'' کے جلسے کی صدارت کی، اور گورکی کی زندگی کے متعلق نمائش کا افتتاح کیا، جس موقع پر پاکستان میں روسی سفیر نے بھی جلسے میں شرکت کی۔ انھوں نے ادیبوں کو گورکی کی ادبی عظمت اور حقیقت نگاری کی پیروی کرنے کی تلقین کی۔ جب پنجاب گورنمنٹ نے لاہور کے ترقی پسند رسالوں (ادب لطیف، سویرا، اور نقوش) کو ایک جنبش قلم سے بند کر دیا تو اس حکم کے خلاف پاکستانی ادیبوں کے احتجاج نامہ پر انھوں نے بھی دستخط کیے اور جب 1952 کے پُر آشوب حالات میں پاکستان ترقی پسند مصنّفین کی دوسری کل پاکستان کانفرنس کراچی میں ہوئی تو پھر مولوی عبدالحق نے عبدالمجید سالک کے ساتھ اس کی صدارت کرکے اس بات کا ثبوت دیا کہ ترقی پسند ادب کی تحریک سے ان کی دلچسپی اور ہمدردی اس کے آغاز سے لے کر آج

تک بدستور قائم ہے۔

ان کی نگارشات میں فکر کی گہرائی نہیں ہوتی، لیکن ان کے طرز کی سادگی اوران کی عقل پسندی دلکشی رکھتی ہے۔ان کی علم دوستی مسلم ہے۔ان کی راہ نمائی میں انجمن ترقی اُردو نے اُردو ادب کے قدیم تذکروں اوراساتذہ کے کلام کوشائع کر کے انھیں نئی زندگی بخشی ہے۔ان کی اُردو قواعد اور انگریزی اُردو ڈکشنری (۱) ہمارے ادب کے لیے نہایت مفید چیزیں ہیں۔ ان کی ایڈیٹری میں انجمن کے رسالوں اوراُردو کا معیار ہمیشہ بلند رہا ہے۔اگر چہ اس کی فضا قدامت کا رنگ لیے ہوئے ہوتی ہے۔لیکن اس میں ادبی ریسرچ اور تحقیق محدود حد تک پھر بھی مفید ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مولوی صاحب کی اُردو زبان کی ترقی کے لیے لگن، اپنی ساری زندگی، اور سارے نجی سرمایہ کواس ایک کام کے لیے وقف کر دینا قابل احترام ہےاور مثالی حیثیت رکھتا ہے۔

البتہ سوال یہ ہے کہ مولوی عبدالحق اوران کی رہنمائی میں 1947 تک متحدہ ہندستان میں اوراس کے بعد پاکستان میں اُردو کی ترویج، تحفظ اورترقی کے لیے جوراہ اختیار کی گئی وہ کس حد تک کامیاب ثابت ہوئی ہے؟

ہمیں افسوس کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اُردو زبان کے تحفظ اور ترقی کے لیے جن عظیم وسائل اورعوامی قوتوں کو بروئے کارلایا جاسکتا تھا، اسے حرکت میں لانے اور منظّم کرنے میں مولوی صاحب نے اُردو کی تحریک کو کبھی جمہوری یاعوامی تحریک بنانے کی کوشش نہیں کی۔معلوم ہوتا تھا مولوی صاحب اس بات کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ زبانیں دراصل عوام کی ہوتی ہیں اور انھیں سے ان کوتقویت ملتی ہے۔ وہ اس بات پر خوش ہو لیتے تھے کہ ڈاکٹر جان گل کرائسٹ نے کلکتہ میں اُردو کی کتابیں لکھوا کر اُردو کی بڑی ''خدمت'' کی، انگریزی حکومت نے فارسی کی جگہ اُردو کو کچہری کی زبان بنا کر اُردو پر بڑا ''احسان'' کیا ہے، اوراعلیٰ حضرت آصف جاہ عثمان علی خاں ''خلد اللہ ملکہٗ'' نے ریاست حیدرآباد سے انجمن ترقی اُردو کوعطیہ دے کر بڑی ''اُردونوازی'' کی۔

---

(۱)-انجمن ترقی اردو کی انگریزی اردو ڈکشنری کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کا بیشتر حصہ ڈاکٹر عابد حسین کی کاوشوں کا نتیجہ ہےاور غالباً اس لحاظ سے مولوی صاحب سے زیادہ وہ اس کی تالیف کے ذمہ دار ہیں۔سنا جاتا ہے کہ مولوی صاحب اردو کی ایک جامع اور مستند لغت تیار کر رہے ہیں۔(کتاب مولوی صاحب کی زندگی میں لکھی گئی۔)

ان لوگوں کی عنایتوں سے (جو ہمیشہ اُردو کی ترقی کے لیے نہیں بلکہ سیاسی مقاصد کے لیے ہوتی تھیں) اُردو کی چند کتابیں ہی تو شائع ہوسکتی ہیں اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اُردو زبان کے مددگار اور بچانے والے ان درمیانہ طبقے اور محنت کشوں کے علاوہ اور کوئی کیسے ہو سکتے ہیں جن کی وہ زبان ہے، جو اسے بولتے ہیں، اسے لکھتے پڑھتے ہیں۔ اس لیے جب تک ان کی ضرورتوں، ان کے جذبات، ان کی امیدوں اور خواہشات کا اظہار اُردو ادب میں نہیں ہوگا، جب تک ان کی تعلیم کا بندوبست اُردو میں نہیں ہوگا، جب تک وہ اپنی قسمت کے مالک نہیں ہوں گے، اُردو ترقی کس طرح کرے گی؟

اگر اس معیار سے ہم انجمن ترقی اُردو کی کارگزاری کو دیکھیں تو ہمیں کیا نظر آتا ہے؟

اوّل تو یہ کہ انجمن کی تنظیم، اس کے عہدے داروں، اس کے روزمرہ کے کاموں میں کبھی اُردو کے ''جمہور'' کو فیصلہ کن حیثیت نہیں دی گئی۔ مولوی عبدالحق کا چنا ہوا ایک مختصر سا گروہ جن میں سے اکثر صاحبان کوئی اہم ادبی حیثیت بھی نہیں رکھتے، بلکہ محض مولوی صاحب کے درباری اور خوشامدی ہونے کی وجہ سے انجمن سے مستفید ہوتے تھے، فی الحقیقت انجمن کے کرتا دھرتا بن بیٹھے تھے۔ بہت سے باذوق، ایماندار اور ادبی شخصیت کے مالک حضرات جو انجمن کا کام کرنے کے خواہشمند تھے، اس چھوٹے سے گروہ کی وجہ سے بددل ہوکر انجمن سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ کسی اچھے ادیب کو انجمن کی تنظیم میں مشکل سے پناہ ملتی تھی۔ مولوی صاحب کے اردگرد ہمیشہ اس طرح کی ایک سازشی فضا رہتی تھی، جیسی کہ پُرانے عہد کے بادشاہوں اور نوابوں کے یہاں بیان کی جاتی ہے۔ بعض نااہل لوگ جو مولوی صاحب کی ناک کے بال بن گئے تھے، ہمیشہ ان کو ایسے قدم اُٹھانے سے روکتے تھے جس کے سبب سے انجمن میں ان لوگوں کی اجارہ داری کو ذرا بھی نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو۔ وہ انجمن کے بند چور محل میں جمہوریت کی کھلی فضا قائم نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔

چنانچہ عہد جدید کے اُردو کے تقریباً تمام بڑے ادیب، مصنف، شاعر، عالم، انجمن اور اُردو کی ترقی کی تحریک سے پوری ہمدردی رکھنے کے باوجود اور مولوی عبدالحق کا احترام کرنے کے باوجود انجمن کے کاموں سے ہمیشہ علاحدہ رکھے گئے اور انجمن کبھی بھی جدید اُردو ادب اور جدید علمی تحقیق و تفتیش کا ایک بڑا زندہ اور متحرک ادارہ نہیں بن سکی۔

پھر مولوی صاحب کی سمجھ میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ ہمارا ملک ایک زبان کا نہیں بلکہ کئی

زبانوں کا ملک ہے، جن میں کوئی بھی زبان اُردو سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے اور جو پیچھے بھی ہیں، ان کے بولنے والے اپنی زبان سے اتنی ہی محبت رکھتے ہیں جتنا کہ اُردو بولنے والے اُردو سے۔ ہندی کے ان رجعت پرست حمایتیوں سے اُردو کو ضرور بچانا چاہیے اور ان کا مقابلہ کرنا چاہیے جو اُردو کو مٹانے کے درپے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُردو کی حمایت میں ہم ہندی کی مخالفت کرنے لگیں یا بنگالی کی مخالفت کرنے لگیں، اور جس طرح ہندی والے زبردستی ہندی کو سارے ملک پر ٹھونسنا چاہتے ہیں اسی طرح اُردو کو اس ملک میں رہنے والی ہر ایک قوم کی زبردستی زبان بنانے کی کوشش کی جائے۔ انجمن ترقی اُردو کو ''اُردو سامراج'' کی اس سیاست سے الگ رہنا چاہیے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔

اس کے سبب سے ایسے حلقوں میں بھی جن کی زبان اُردو نہیں تھی، لیکن جن میں اُردو پڑھنے اور سیکھنے کا شوق تھا، اُردو کی سخت مخالفت کھڑی ہوگئی (جیسے آج کل مشرقی بنگال میں)۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان اور تہذیب کا مسئلہ بھی سیاسی مسئلہ کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ جس طرح سے رجعت پرستوں کی سیاست آخر میں ہمیشہ دیوالیہ ثابت ہوئی ہے اور عوام جب اس کا ساتھ دیتے ہیں تو ان کو آخر میں اس کا سخت خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، اسی طرح زبان اور تہذیب اور علوم کی ترقی بھی رجعت پرستوں کی سیاست کا آلہ کار بن کر نہیں ہوسکتی۔ جن لوگوں کی سیاست قوم کو کھانا، کپڑا اور رہنے کے لیے مکان فراہم نہیں کرسکتی وہ انھیں تعلیم بھی نہیں دے سکتی، ان کی زبان وتہذیب کو بھی فروغ نہیں دے سکتی۔ کاش کہ پاکستان میں آنے کے بعد مولوی عبدالحق کو جو متواتر تلخ تجربے ہوئے ہیں، اس کی بنا پر انھیں اِن حقائق کا احساس ہوجاتا۔

1937 میں مولوی عبدالحق نے ہماری کانفرنس کے لیے جو خطبہ لکھا تھا وہ آج بھی اگر پڑھا جائے تو اس سے فائدہ ہوگا۔ اس میں انھوں نے ہمیں اچھی، عام فہم اور صاف زبان لکھنے، زندگی کے تجربوں سے سبق سیکھنے اور حقیقت نگاری کی تلقین کی۔ انھوں نے ہمیں نصیحت کی کہ ہم اپنے پُرانے ادب سے تعلق رکھیں اور اس سے اس کی خوبیاں سیکھیں۔ انھوں نے کہا......

''ترقی پسند جماعت کو اپنے مقاصد کے عمل میں لانے کے لیے اخلاقی آزادی اور اخلاقی جرأت سے کام لینا پڑے گا۔ اگر آپ نے مقبولیت یا ہردلعزیزی یا کسی قسم کی امداد حاصل کرنے کے لیے یا اپنی تعداد بڑھا کر دکھانے کی خاطر ذرا بھی رجعت

پرستی کی طرف میلان ظاہر کیا تو یاد رکھیے کہ معقول پسند اور حقیقی ترقی پسند لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے..........رجعت پرستی کے بل پر کھڑے ہونے سے بہتر ہے کہ آپ کھڑے ہی نہ ہوں۔

حقا کہ باعقوبتِ دوزخ برابر است رفتن بہ پائے مردیِ ہمسایہ در بہشت!

(اپنے ہمسایہ کی طاقت کے بل پر بہشت میں جانا، یقینی دوزخ کے عذاب کے برابر ہے۔)

مولوی صاحب نے آخر میں ہمیں ان پُر جوش الفاظ میں تاریخ کی ایک زبردست مثال دے کر اپنے خیالات کی ترویج کرنے کے لیے کہا......

''آپ کا کام اس وقت وہی ہے جو اٹھارھویں صدی میں انسائیکلو پیڈسٹ (Encyclopaedist) نے فرانس میں کیا تھا۔ انھوں نے رجعت پسندوں کے ہاتھوں کیسی کیسی سختیاں جھیلیں، قید میں رہے، جلا وطن کیے گئے، کتاب چھپنے کی ممانعت کر دی گئی، آخری مسودوں میں تحریفیں کی گئیں اور اصل مسودے جلا دیے گئے...... یہ سب سہا، مگر اپنے عزم سے نہ پھرے۔ اس کتاب میں صرف معلومات ہی نہیں فراہم کی گئیں بلکہ انسان کی روشن خیالی، خیالات کی انقلاب انگیزی اور تعصّبات اور توہمات کی بیخ کنی کا سامان بھی جمع کیا گیا تھا۔ اس کے مولفین کی غایت نظریات نہیں، بلکہ عمل تھا، ادبی شان دکھانی مقصود نہ تھی، بلکہ ان کا منشا زندگی کی تعمیر تھی۔ یہ لوگ سچے مجاہد تھے۔ باوجود مسخ ہونے کے اس کتاب کا اثر صرف فرانس ہی تک نہیں رہا، بلکہ دور دور تک پہنچا۔ انیسویں صدی میں جو عقلیت کی ہوا ہندستان میں چلی تھی، اس کا اگر آپ سراغ لگائیں گے تو اس کا سلسلہ بھی انھیں چند نفوس تک پہنچے گا۔ اس کتاب کو اب کوئی نہیں پڑھتا، اور بہت ہی کم ایسے لوگ ہوں گے جنھیں اس کی کبھی زیارت نصیب ہوئی ہوگی۔ لیکن اس کا اثر اور فیض اب تک جاری ہے۔''

''یہ صرف چند نفوس تھے، مگر دھن کے پکے اور عقیدت کے سچے تھے۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کیجیے، ان کے کاموں کو دیکھیے اور ان کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کیجیے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ کامیاب نہ ہوں۔''

میرے خیال میں ترقی پسند مصنّفین کی پندرہ سال کی تاریخ اس کی شہادت دے گی کہ

انھوں نے حتی المقدور اس نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ کاش کہ مولوی عبدالحق انجمن ترقی اُردو میں بھی کسی حد تک سہی، وہی جذبہ پیدا کر سکتے جس کی وہ ہماری انجمن سے بجا طور پر توقع رکھتے تھے۔

آچاریہ نریندر دیو اور پنڈت رام نریش ترپاٹھی کی صدارت اس کی ضمانت تھی کہ اب ہماری تحریک میں ہندی کے ادیب بھی خاصی تعداد میں شریک ہوں گے۔ آچاریہ نریندر دیو سنسکرت اور پالی کے عالم تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بدھ فلسفہ کا مطالعہ ان کا بہت گہرا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اس زمانے میں کاشی ودیا پیٹھ (بنارس کی قومی یونیورسٹی جو 'نان کوآپریشن' کی تحریک کے زمانہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کے ساتھ قائم ہوئی تھی) کے پرنسپل بھی تھے۔ وہ کانگریس سوشلسٹ تحریک کے بانیوں اور ملک کی نئی بائیں بازو کی تحریک کے راہ نماؤں میں سے تھے۔ اُردو اور ہندی دونوں کے بڑے جید مقرر تھے۔ ان کے خطبے اور صدارت سے کانفرنس میں شریک ہونے والے نوجوان ادیبوں میں کافی جوش پیدا ہوا۔ افسوس ہے کہ ان کا خطبہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

پنڈت رام نریش ترپاٹھی ہندی ادب میں اس لیے خاص مقام رکھتے تھے کہ انھوں نے ہمارے ملک (خاص طور پر ہندستانی بولنے والے علاقے) کے لوک گیتوں کو بڑی محنت سے جمع کر کے شائع کیا ہے۔ اس حیثیت سے عوامی ادب کی تحریک میں یقینی ان کی ایک ممتاز جگہ ہے۔ پنڈت جی نے ہندی میں کئی جلدیں ''کویتا کمودی'' کے نام سے شائع کی ہیں۔ یہ ہندی شاعری کا، اس کے آغاز سے لے کر آج تک کا بہترین انتخاب ہے۔ پنڈت جی سے اس زمانے میں مجھے اکثر ملنے کا بھی اتفاق ہوا اور ان کی علمیت کے باوجود مجھے ہمیشہ ان سے مل کر کسی قدر مایوسی ہوتی تھی۔ پہلے تو اس وجہ سے کہ انھیں ان حسین لوک گیتوں کی سماجی اہمیت کا کوئی اندازہ نہیں معلوم ہوتا تھا جو خود انھوں نے اتنی محنت کر کے جمع کیے تھے۔ ان کے پاس ایک خزانہ تھا لیکن اس کی اصل قیمت سے وہ ناواقف تھے۔ ان گیتوں میں ہمارے سماج کے محنت کش طبقوں، خاص طور پر عورتوں کے دکھ سکھ، ان کی نفسیات، ان کی سماجی دشواریوں کی پوری تصویر ہمیں نظر آتی ہے۔ ان سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ محنت اور استحصال کے بوجھ سے دبے ہونے کے باوجود کسان عوام کس طرح اپنی زندگی میں رنگینی اور حسن پیدا کرتے ہیں اور ان میں کتنی زبردست تخلیقی قوت چھپی ہوئی ہے۔ لیکن

ترپاٹھی جی کی نظران باتوں کی طرف نہیں گئی۔ دوسری چیز جوترپاٹھی جی سے ملنے پرمحسوس ہوتی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ کسی قدر تجارتی آدمی بن گئے تھے۔اپنی کتابوں کواسکولوں اورکالجوں کے نصاب میں داخل کرانے اورانھیں شائع اورفروخت کرکے روپیہ کمانے کی طرف ان کی دلچسپی اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ اس ڈرسے کہ کہیں سرکاراوراس کے افسر ناراض نہ ہوجائیں، سیاست کی بات کرنے سے بھی گھبراتے تھے۔ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس کی صدارت توانھوں نے کرلی،لیکن بعدکووہ ہماری تحریک سے دورہی دوررہے۔

ہماری الہ آباد کی کانفرنس میں حصہ لینے والوں، مقالہ پڑھنے والوں اوراس کا انتظام کرنے والوں میں اب کی دفعہ الہ آبادیونیورسٹی کےنوجوان طلبا کاایک اچھاخاصا گروہ موجودتھا۔

ان میں شیوداس سنگھ چوہان،نریندرشرما، رمیش چندرسنہا،اوراوم پرکاش سہگل خاص طور پرقابل ذکرہیں۔چوہان اورنریندرتواب ہندی کےممتازادیب ہیں۔رمیش اورسہگل نے بعدکواپنا زیادہ وقت سیاسی کاموں میں صرف کیااورکمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار ہندی اخبارکےایڈیٹرہونے کااعزازحاصل کیا۔

اس کانفرنس میں بابوجے پرکاش نارائن اوردہلی کے ہندی ادیب جنیندرکمارخاص طورپر مجھے یادہیں۔جے پرکاش نارائن اُس وقت بہارمیں ہندی کےان نوجوان ادیبوں اورسوشلسٹ ترقی پسندوں کی راہ نمائی کرتے تھے،جنھوں نے بعدکورام کرشن بینی پوری کی ادارت میں ہفتہ وار ہندی اخبار’’جنتا‘‘ شائع کیا۔

بدقسمتی سے دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے رہنماؤں کی کمیونسٹ دشمنی جنون کی حدتک بڑھ گئی،اورانھوں نے تمام ان جماعتوں سےعلاحدہ ہو جانے کا فیصلہ کیاجس میں ایک بھی کمیونسٹ کام کرتاہو...... یہ اس رجحان کی ابتداتھی جس نے رفتہ رفتہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے بعض لیڈروں کو رجعتی کیمپ میں پہنچا دیا۔لیکن سوشلسٹ لیڈروں کی اس رجعت سےاورترقی پسندتحریک سےان کے بےتعلق ہوجانے سےصرف یہ ثابت ہواکہ ان کاعدم تعاون ملک کی زندہ اورترقی پذیرادبی تحریک کوکوئی خاص نقصان نہیں پہنچا سکا۔ آچاریہ نریندردیوکےعلاوہ ان کے زیراثریاان کی جماعت میں کوئی ہندی یا اُردوکا وقیع شاعر، ادیب یاعالم تھاہی نہیں۔

اُردو ہندی کے ترقی پسند مصنّفین کی دوسری کانفرنس الہ آباد میں ہی 1938 میں ہوئی۔ غالبًا مارچ یا اپریل کا مہینہ تھا۔ گزشتہ سال کی طرح اب کی دفعہ بھی کانفرنس سودیشی نمائش کے موقع پر اور اس کے احاطہ میں ہوئی۔ اس سال کانفرنس کے خاص مہتمم پنڈت بشمبر ناتھ پانڈے تھے، جو الہ آباد کے بہت پُر جوش کانگریسیوں میں سے تھے۔ بشمبر پنڈت سندر لال کے خاص چیلوں میں سے تھے۔ وہ گنتی کے ان مخلص کانگریسیوں میں شمار کیے جاتے تھے جن کی گاندھیت کی بنیاد آزادی خواہی، ہندو مسلم اتحاد اور سادہ زندگی پر تھی۔ پنڈت سندر لال کے زیر اثر انھیں بھگتی اور تصوف کے اس پہلو پر بھی عقیدہ تھا، جس کے نزدیک ہمہ اوست کی بنیاد پر سب انسان بھائی بھائی ہیں اور امارت اور سرمایہ داری بُری چیزیں ہیں۔ ہم میں سے جو اشتراکی خیال کے تھے، لامحالہ ایسے مخلص لوگوں کی طرف کھنچتے تھے اور وہ ہماری طرف۔ الہ آباد کی کانگریس اور مزدور اور کسان تحریک میں بھی بشمبر ناتھ اور ہم ایک ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ بہت سی باتوں میں ہمارا اختلاف بھی تھا (جو 1940 کے بعد کافی شدید ہو گیا)، لیکن عوامی تحریکوں میں ایک ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ اختلاف ہمیں روکتا نہ تھا۔ بشمبر ہندی کے کوی اور لیکھک بھی تھے، اور پنڈت سندر لال کے اس ادبی اور علمی ماہوار رسالے کے ایڈیٹر تھے جو ہندی اور اُردو، دونوں میں شائع ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں وہ الہ آباد کی ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کے سکریٹری تھے۔

یہ کانفرنس گزشتہ سال کے مقابلہ میں زیادہ نمائندہ تھی اور اس میں ادبی مسائل پر زیادہ مفید اور سنجیدہ بحثیں ہوئیں۔ یہ کانفرنس اس بات کو ظاہر کرتی تھی کہ ہماری تحریک نے دو ڈھائی سال کی مدت میں کتنی ترقی کی ہے اور اس کی خامیاں کیا ہیں۔

صدارتی مجلس میں جوش ملیح آبادی، پنڈت آنند نرائن ملا اور سمترا نند پنت شامل تھے۔ ان کے علاوہ ایک دو صاحب شاید اور بھی تھے۔

ہمارے معزز مہمانوں میں، جنھوں نے کانفرنس میں شرکت کی اور اس میں تقریر کی، پنڈت جواہر لعل نہرو، اور کاکا کالیلکر بھی تھے۔ ہندی کے بزرگ شاعر بابو میتھلی شرن گپت بھی اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے اپنی کویتا سنائی۔ ہمارے لیے سب سے زیادہ فخر اور خوشی کی بات یہ تھی کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی کانفرنس کو ایک پیغام بھیجا تھا۔

کانفرنس سے چند دن پہلے مجھے کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس وقت ملک بھر میں سبھاش

چندر بوس کے کانگریس کے صدر ہو جانے اور داہنے بازو کے نمائندے پٹا بھی سیتا را مایہ کو شکست دے دینے کا غلغلہ تھا۔ کلکتہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا وہ تاریخی اجلاس ہونے کو تھا جس میں داہنے بازو والوں نے سبھاش چندر بوس کو کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا۔ میں بھی اس وقت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر تھا اور اس کے اجلاس میں شرکت کے لیے کلکتہ گیا تھا۔

ٹیگور سے ملنے کا مجھے بہت اشتیاق تھا۔ اس سے پہلے طالب علمی کے دنوں میں لکھنؤ اور آکسفورڈ میں، میں نے ان کو جلسوں میں دیکھا تھا اور انھیں تقریر کرتے ہوئے سنا تھا۔ پہلی بار جب غالباً میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا، میں نے لکھنؤ یونیورسٹی اور قیصر باغ کی بارہ دری میں رابندر ناتھ ٹیگور کو دیکھا اور ان کی تقریر سنی۔ اس وقت میں ان کے معترفوں میں تھا۔ ٹیگور کی گیتانجلی، اور ان کی نظموں کی دوسری کتابیں اور ان کے تمام ناول اور ڈرامے، غرض کہ انگریزی میں ان کی جو بھی تصانیف دستیاب ہو سکتی تھیں، میں نے پڑھ لی تھیں۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ سنہری تخیل، لطیف درد انگیزی اور میٹھے خواب آور سروں سے معمور وہ حسین اور جمیل دنیا، جس کی ٹیگور نے اپنے باریک اور نازک قلم سے تصویر کھینچی تھی، ایک نوجوان دل کو کتنی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ان کی مشہور نظم نے مجھے کتنا زیادہ متاثر کیا تھا......

جہاں ذہن پر خوف نہیں طاری ہے
جہاں لوگ سر اُٹھا کر چلتے ہیں
جہاں علم آزاد ہے
جہاں کمال حاصل کرنے کے لیے
انتھک کوشش اپنے بازو پھیلاتی ہے
جہاں مردہ عادتوں کے خشک ریگزار میں
عقل کے صاف چشمے کھو نہیں گئے ہیں
جہاں تنگ نجی دیواروں سے دنیا
ٹکڑے ٹکڑے نہیں کر دی گئی ہے

اے میرے مولیٰ......

آزادی کی اس جنت میں

میرے وطن کو بیدار کر!

اس کے بعد میں نے ٹیگور کو (غالباً 1930 میں) آکسفورڈ میں دیکھا۔ اپنے یورپ کے دورے کے زمانے میں وہ وہاں بھی آکر کچھ دنوں رہے تھے اور آکسفورڈ میں انھوں نے لکچر بھی دیے۔ ہندستانی طلبا کی انجمن میں بھی (جس کا نام آکسفورڈ مجلس تھا) ان کا استقبال ہوا، جہاں میں نے انھیں قریب سے دیکھا۔ لیکن اب میں ان کی عظمت کا منکر تھا۔ اوّل تو مجھے ان کا ذاتی ڈرامائی انداز پسند نہیں آیا۔ دوسرے ان کی فکر میں جو مبہم سا ویدانتی عنصر تھا، اور وہ جو کبھی کبھی گاڑھے شہد کی سی ایک جذباتیت ان کے کلام سے ٹپکتی تھی، ان کے مخصوص امیرانہ شان اور عجیب سی پل پلی بین الاقوامیت، اور ان کا وہ پہلو جس کے سبب سے وہ ہمارے وطن کی انقلابی تحریک کی کھلے لفظوں میں حمایت کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے...... یہ باتیں مجھے ناپسند ہی نہیں تھیں بلکہ اس کی وجہ سے مجھے ان پر غصہ بھی آنے لگا تھا۔ چنانچہ جب مجلس میں وہ تقریر کر چکے تو میں نے کسی قدر بدتمیزی کے ساتھ ان سے ایسے سوالات بھی کیے جن میں میری ذہنی کیفیت کا اظہار رہا تھا۔ آکسفورڈ میں میرے بعض ہم مکتب ان کو ایک دیوتا کی طرح سمجھتے تھے۔ میرا یہ رویہ غالباً ان کے اس مہمل رجحان کا ردعمل تھا۔

لیکن جب میں تیسری اور آخری بار ان سے ملا تو غالباً ان کے تخلیقی کارناموں کے متعلق میرا شعور زیادہ متوازن تھا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع کے ہر بڑے ہندستانی مفکر، مصلح اور فنکار کی طرح ٹیگور کی فکر اور فن میں متضاد کیفیتیں تھیں۔ بعض جنھوں نے فی الجملہ ترقی پسندانہ اثر ڈالا اور بعض جو اپنے زمانے، ماحول اور طبقے کی کمیاں اور خامیاں لیے ہوئے تھیں۔ لیکن ایک غیر معمولی طور پر بڑی اور عظیم فنکارانہ صلاحیت کے مالک ہونے کی حیثیت سے ٹیگور نے اپنی بہترین تخلیقات میں اپنی قوم اور خاص طور پر بنگالی قوم کے اس عہد کے بلند ترین، شریف ترین اور حسین ترین جذبات کا اظہار بڑے موثر اور دلکش طریقے سے کیا، جس کی وجہ سے وہ ساری قوم کے مغنی اور مصور بن گئے۔ پھر لوگ مدتوں تک ان کی زبان اور لہجے میں بولنے لگے۔ گو کہ ان کی فکر اور ذہن قوم کے جدید ترین عوامی انقلابی تقاضوں سے مکمل طور سے ہم آہنگ

نہ تھے،لیکن اپنی زندگی کے آخر دنوں میں اپنی فنکارانہ ذہانت سے وہ خود اس کمی کو کسی قدر محسوس کرنے لگے تھے۔

میں چاہتا تھا کہ ان ہی موضوعات پر اگر ممکن ہو تو ان سے گفتگو کروں۔ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کے متعلق انھیں مطلع کروں، ان کی رائے معلوم کروں اور ان کے عظیم تجربہ اور صلاحیتوں سے کچھ سبق سیکھوں۔

بدقسمتی سے وہ ان دنوں بڑی شدید بیماری کے بعد ابھی اٹھے ہی تھے۔ ویسے بھی وہ بڑھاپے کی وجہ سے کافی ضعیف ہو چکے تھے۔اس لیے زیادہ بولنے چالنے کی ڈاکٹروں نے انھیں اجازت نہیں دی تھی۔

غالباً ان کے سکریٹری نے میرے بارے میں پہلے سے انھیں کچھ بتا دیا تھا کہ میں ترقی پسند مصنّفین کی کل ہند انجمن کا سکریٹری ہوں، نیز کمیونسٹ ہوں۔ جب میں کوٹھے کے اس برآمدے میں گیا،جس میں وہ ایک نیچی سی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے،تو انھوں نے شفقت سے میرے سلام کا جواب دینے کے بعد مجھے اپنے بالکل قریب بیٹھ جانے کو کہا۔

اور اس کے قبل میں کچھ کہہ سکوں،انھوں نے خود ہی گفتگو شروع کر دی۔صبح کا وقت تھا اور شاید انھوں نے اسی وقت اخباروں کی خبریں سنی تھیں۔کلکتہ کے اخبارات سبھاش چندر بوس اور کانگریس کے داہنے بازو کے تصادم کے واقعات سے بھرے تھے۔تقریباً سارے بنگالی جس میں ٹیگور بھی شامل تھے، سبھاش بوس کے ساتھ جو زیادتی ہو رہی تھی، اس سے بے حد برافروختہ تھے۔کمیونسٹ بھی اس معاملے میں سبھاش بابو کی طرف تھے۔چند منٹ اس پر گفتگو کرنے کے بعد ٹیگور نے ''بندے ماترم'' کے متعلق باتیں شروع کیں۔ اسی ہفتے کانگریس ورکنگ کمیٹی نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا خیال کر کے ''بندے ماترم'' کے ترانے سے وہ ٹکڑا خارج کر دیا تھا جس میں کالی مائی کو مخاطب کیا گیا تھا۔لیکن بنگال کے تمام کانگریسی اخبار اس بات پر بھی ورکنگ کمیٹی کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کی آواز مہین تھی۔ وہ بیماری اور بڑھاپے کی وجہ سے اور بھی دھیمی ہو گئی تھی۔لیکن یکبارگی مجھے محسوس ہوا کہ انھیں غصہ آ گیا ہے اور ان کی آنکھیں چمکنے لگیں اور کوشش کر کے وہ اونچی آواز میں مجھ سے کہنے لگے......

''میری سمجھ میں یہ تعصب اور تنگ نظری بالکل نہیں آتی۔ ورکنگ کمیٹی نے ''بندے ماترم'' کے ترانے سے اس ٹکڑے کو حذف کر کے بالکل ٹھیک کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ نہرو نے اس کے بارے میں میری رائے پوچھی تھی اور میں نے خود ان کو یہی رائے دی تھی۔ ہمارا قومی ترانہ ایسا ہونا چاہیے جسے اس ملک کا ہر ایک رہنے والا خوشدلی اور عقیدت سے گا سکے۔ مسلمان جو بت پرستی کے خلاف ہیں، کس طرح ایسے ترانے کو گا سکتے ہیں، جس میں کالی کو خطاب کیا گیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ خود میرے عقائد یہی ہیں اور میں اسے پسند نہیں کرتا۔ لیکن بعض لوگ اتنے تنگ نظر اور جاہل ہوتے ہیں کہ دوسرے کے جذبات اور عقیدوں کا کچھ خیال نہیں کرتے۔'' میں نے گرودیو سے کہا کہ پھر آپ اپنی رائے اس مسئلہ کے متعلق ضرور شائع کریں۔ آپ کی رائے سننے کے بعد شاید مخالفوں کا جوش ٹھنڈا ہو جائے۔ انھوں نے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا......

''تمھیں معلوم نہیں کہ تعصب سے لوگ کتنے اندھے ہو جاتے ہیں۔ وہ میری رائے کی کب پرواہ کرتے ہیں۔''

میں نے سمجھا کہ اب ترقی پسند مصنّفین کی گفتگو شروع کرنے کا اچھا موقع ہے، آخر ہماری تحریک بھی اسی قسم کی تنگ نظری اور جہالت کے خلاف ہے۔ لیکن میں نے ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ اڑیسہ کے کانگریسی وزیر اعلیٰ بشوناتھ داس وہاں پہنچ گئے اور آتے کے ساتھ ہی پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ زمین پر تقریباً لیٹ کر ٹیگور کے پاؤں کا سجدہ کیا۔ گرودیو نے انھیں آشیرواد دی اور بیٹھنے کو کہا۔ مجھے بشوناتھ داس کے سلام کرنے کے اس طریقے سے سخت کوفت ہوئی۔ لیکن غالباً ان کے یہاں اونچی ذات کے بزرگ سے یوں ہی ملتے ہیں۔ بشوناتھ داس، خوش قسمتی سے صرف ٹیگور کی مزاج پرسی اور انھیں اڑیسہ مدعو کرنے کے لیے آئے تھے۔ چند منٹ کی رسمی بات چیت کے بعد وہ چپ ہو گئے اور گرودیو کی عقیدت بھری نظروں سے دیکھنے پر اکتفا کی اور ہماری بات چیت پھر شروع ہوئی۔ میں خود زیادہ بات چیت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے دو تین منٹ میں بہت ہی اختصار کے ساتھ میں نے ان کو ترقی پسند مصنّفین کی تحریک اور اس کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ اس کے بارے میں ان کی رائے اور نصیحت پوچھی۔ انھوں نے تحریک کے ساتھ موافقت اور ہمدردی کا اظہار کیا اور اس کے بعد مجھ سے اُردو ہندی کے جھگڑے کے بارے میں پوچھنے لگے۔ میں نے انھیں بتایا کہ کس طرح فرقہ پرست، سیاستداں، ہندی اور اُردو کی آڑ لے کر

ملک میں نفرت پھیلا رہے ہیں، اور ان دو زبانوں میں جو یگانگت ہے، اس کی بنا پر انھیں قریب لانے کی کوشش کرنے کے بجائے انھیں ایک دوسرے سے دور کھینچا جا رہا ہے۔ ترقی پسند مصنّفین کی تحریک اس لسانی رجعت پرستی کے خلاف ہے۔ ہم چونکہ عوام کے نقطۂ نظر اور ان کی ضروریات کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، اس لیے ہماری انجمن میں اُردو اور ہندی کے ادیب ایک ساتھ مل کر کام کر سکتے تھے۔ میں نے اب اپنی کانفرنس کا ذکر کیا اور ان سے درخواست کی کہ اس کے لیے ہمیں ایک پیام لکھ کر دیں۔ انھوں نے اس بات سے بخوشی رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کچھ اس قسم کے الفاظ کہے......

''میری سمجھ میں یہ اُردو اور ہندی کا جھگڑا نہیں آتا۔ آخر تم لوگ ایک زبان بولتے ہو، اسے جو بھی چاہو نام دے لو۔ اور اگر تم اپنی بات عوام کو سمجھانا چاہتے ہو اور ان کے لیے لکھنا چاہتے ہو تو پھر تو فرق اور بھی کم ہو جاتا ہے۔''

اب میرا وقت ختم ہو رہا تھا۔ گرودیو کے سکریٹری بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ میں چلتے وقت کانفرنس کے پیام کا تقاضہ کر کے رخصت ہو گیا۔

میں ابھی کلکتہ میں ہی تھا کہ ٹیگور نے کانفرنس کے لیے اپنا پیام ایک خط میں مجھے بھیج دیا۔ یہی پیام کانفرنس میں پڑھا گیا۔ یہ پیام رسمی نہ تھا۔ اس کے پہلے حصے میں ٹیگور نے خود اپنے اوپر کڑی نکتہ چینی کی تھی۔ انھوں نے ادیبوں کو نصیحت کی کہ عوام سے مل جل کر رہیں۔ انھیں پہچانیں، ان کے حالات معلوم کریں......

''عزلت پسندی میری طبیعت ثانیہ ہو گئی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماج سے الگ تھلگ رہنے والا ادیب بنی نوع انسان سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ بہت سے لوگوں سے مل کر جو تجربہ حاصل ہوتا ہے، الگ رہ کر ادیب اس سے محروم ہو جاتا ہے۔ سماج کو جاننے پہچاننے کے لیے اور اس کی ترقی کی راہ کا پتہ دینے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہم سماج کی نبض پر ہاتھ رکھیں اور اس کے دل کی دھڑکنیں سنیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم انسانیت کے غم گسار اور ہمدرد ہو جائیں۔ انسان کی روح صرف اسی صورت میں ہم پہچان سکتے ہیں......ظاہر ہے کہ عوام سے الگ رہ کر ہم بیگانہ محض رہ جائیں گے۔ نئے ادیبوں کو انسانوں سے مل جل کر انھیں پہچاننا ہے۔

میری طرح گوشہ نشین رہ کر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ زمانۂ دراز تک سماج سے الگ رہ کر اپنی ریاضت میں، میں نے جو بڑی غلطی کی ہے، اب میں اسے سمجھ گیا ہوں...... اور یہی وجہ ہے کہ یہ نصیحت کر رہا ہوں۔ میرے شعور کا تقاضہ ہے کہ انسانیت اور سماج سے محبت کرنی چاہیے۔ اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہوگا تو وہ ناکام اور نامراد رہے گا۔ یہ حقیقت میرے دل میں چراغ کی طرح روشن ہے اور کوئی استدلال اسے بجھا نہیں سکتا۔''

اس کے بعد ہمارے اس عظیم فنکار نے واضح لفظوں میں بتایا کہ ہمارے ملک میں ''انسانیت سے ہم آہنگ'' ہونے کے مطلب کیا ہیں......

''آج ہمارا ملک ایک لق و دق صحرا ہے جس میں شادابی اور زندگی کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ ملک کا ذرہ ذرہ دکھ کی تصویر بنا ہوا ہے۔ ہمیں اس غم واندوہ کو مٹانا ہے اور از سرِ نو ع زندگی کے چمن میں آبیاری کرنا ہے۔ ادیب کا فرض ہونا چاہیے کہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے، بیداری اور جوش کے گیت گائے، ہر انسان کو امید اور مسرت کا پیام سنائے اور کسی کو ناامید اور ناکارہ نہ ہونے دے۔ ملک اور قوم کی بہی خواہی کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینے کا جذبہ ہر چھوٹے بڑے میں پیدا کرنا ادیب کا فرض عین ہونا چاہیے۔ قوم، سماج اور ادب کی بہبودی کی سوگندھ جب تک ہر انسان نہ کھائے گا، اس وقت تک دنیا کا مستقبل روشن نہیں ہوسکتا۔ اگر تم یہ کرنے کے لیے تیار ہو تو تم کو پہلے اپنی متاع کھلے ہاتھ لٹانی ہوگی...... اور پھر کہیں تم اس قابل ہوگے کہ دنیا سے کسی معاوضے کی تمنا کرو۔ لیکن اپنے کو مٹانے میں جو لطف ہے، اس سے تم محروم نہ ہو جاؤ......''

''یاد رکھو کہ تخلیقی ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ سچائی اور حسن کی تلاش کرنی ہے تو پہلے اَنا (خود پرستی) کی کینچلی اُتار دو۔ کلی کی طرح سخت خول سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو۔ پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے، روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے۔'' (نیا ادب، جنوری، فروری 1941)

رابندر ناتھ ٹیگور کا ترقی پسند مصنّفین کے نام یہ پیغام بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس

سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسان دوستی اور حسن کاری کی وہ روایات اور فکر کا وہ اسلوب، جس سے کہ وہ پچاس سال سے زیادہ سے وابستہ تھے، اب ان کی نظر میں ناکافی نظر آنے لگا تھا، اور جب ان کی عمر کا چراغ اپنے آخری لمحوں میں ٹمٹمارہا تھا، تب ان کے ذہن کی روشنی اور تیز ہوگئی تھی، اور وہ اپنے نئے عہد کی ضرورتوں کو سمجھ کر ایک نئے قسم کے آرٹ اور فن کے تقاضوں کو محسوس کرنے لگے تھے۔ ایسا آرٹ اور فن جو وطن کے عوام کی زندگی سے پیوست ہو، اور جو انھیں نئی اور بہتر زندگی کی شدید جدوجہد کے لیے ذہنی اور روحانی طور پر تیار اور آمادہ کرے۔ وہ یہ محسوس کررہے تھے کہ اس قسم کا ادب ایسے لوگ تخلیق نہیں کرسکتے جو اپنے کو معمولی انسانوں اور ان کی زندگی سے دور رکھیں، چاہے وہ کسی عذر کی بنا پر ہو۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہمارے ملک میں ایسا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ فنکار بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار ہو...... دانشوروں کے طبقے کی انانیت اور خودغرضی کی قربانی اور عوام کی جدوجہد میں شامل ہوکر اپنے جسمانی عیش و آرام کی قربانی۔ یہ ٹیگور کی عظمت کی نشانی ہے کہ اس معیار سے سب سے پہلے انھوں نے خود اپنے کو جانچا اور صاف لفظوں میں اعتراف کیا کہ...... ''سماج سے زمانۂ دراز تک الگ رہ کر میں نے بڑی غلطی کی ہے۔ اب میں اسے سمجھ گیا ہوں اور یہی وجہ ہے جو یہ نصیحت کررہا ہوں۔''

آج ہمارے ملک میں رجعت پرست حلقے اور ان کے خریدے ہوئے نقارچی ٹیگور اور پریم چند کے تمام اس قسم کے ملفوظات کو جن سے ان کا ترقی پسند مصنّفین کی تحریک سے گہرا تعلق اور دلچسپی معلوم ہوتی ہے، چھپانے اور ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ان کی تخلیق سے انسان دوستی کے پہلو کو دبا کر ان کے آرٹ کے مجروح حسن، ان کی اصلاح پسندی، ان کی فکر میں بعض قدیم مذہبی تصورات سے لگاؤ...... یہی باتیں سامنے کرتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے ان عظیم فنکاروں کے متعلق اس بددیانتی کا پردہ چاک کریں اور یہ دکھائیں کہ ان کی ادبی تخلیق میں حسن اور اثر بنیادی طور پر ان کی حقیقت پسندی اور انسان دوستی اور آزادی خواہی کے سبب سے ہے اور یہ کہ ان کی انسان دوستی کا تصور بھی بدلتے ہوئے زمانے اور حالات کے ساتھ ساتھ بدل رہا تھا۔ اسی وجہ سے انھوں نے ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کو سراہا اور اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔

پنڈت جواہر لعل نہرو بھی ہماری کانفرنس میں شریک ہوئے اور اس میں تقریر کی۔ حیات اللہ انصاری نے اس تقریر کے نوٹ بڑی تیزی اور خوبی سے لیے اور بعد کو یہ لکھنؤ کے ہفتہ وار

''ہندستان' اور ''نیا ادب'' میں شائع ہوئی اور آج بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ یہ پنڈت نہرو کی ترقی پسندی کے عروج کا زمانہ تھا۔ بہرحال ایک کامیاب اور ترقی پسند مصنف کی حیثیت سے بھی پنڈت جی کو ہماری کانفرنس میں شریک ہونے اور تقریر کرنے کا پورا حق تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اس بات کی تردید کی کہ سوشلزم کے قیام سے انسان یا فنکار کی انفرادیت دب جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ ادیب کو حقیقت کی بنیاد پر ایک خوبصورت اور حسین دنیا کا تصور لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے......

''لکھنے والے کے دماغ میں ایک خیالی دنیا ہوتی ہے جس کے بارے میں وہ سمجھتا ہے کہ دنیا اس تک پہنچ سکتی ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ اور لوگوں کو بھی یہ دنیا دکھائی جائے۔ اپنی خیالی دنیا اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک پُل باندھا جائے۔ زمانے کے شاہکار اسی قسم کے پُل ہوتے ہیں۔ پہلے تو چلنے والے حسرت سے خیالی دنیا کو دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر اُدھر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

آخر میں انھوں نے کہا......

''ہندستان میں بھی ادیبوں نے بڑا اثر ڈالا ہے، مثلاً ٹیگور نے بنگال میں۔ لیکن ابھی تک ایسے ادیب کم پیدا ہوئے ہیں جو ملک کو زیادہ آگے لے جا سکیں۔ اسی لیے انجمن ترقی پسند مصنّفین کا قیام ایک بہت بڑی ضرورت کا پورا ہونا ہے، اور اس سے ہماری بڑی بڑی امیدیں ہیں۔''

یہ کانفرنس گزشتہ سال کے مقابلہ میں زیادہ نمایاں حیثیت رکھتی تھی۔ ہم نے اس کی خاص کوشش کی تھی کہ اس میں یو۔ پی اور بہار کے علاوہ پنجاب کی انجمن کے نمائندے بھی شامل ہوں۔ چنانچہ پنجاب سے فیض اس میں شرکت کے لیے الہ آباد آئے تھے۔ اب لکھنؤ میں ترقی پسندوں کا کافی بڑا اجتماع ہو گیا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے لکچرار ہو کر آ گئے تھے۔ ان کی نگرانی اور حیات اللہ انصاری کی ایڈیٹری میں ترقی پسند سیاسی اور ادبی ہفتہ وار ''ہندستان'' وہاں سے بڑی آب و تاب سے نکلنے لگا تھا۔ مجاز بھی دہلی ریڈیو سے علاحدہ ہو کر لکھنؤ میں ٹھہرے تھے، اور علی سردار جعفری نے لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ جوش صاحب نے بھی کلیم کو خیر باد کہہ کر لکھنؤ میں ہی رہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سب لوگ مع پنڈت آنند نرائن ملّا کے لکھنؤ

سے کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے۔علی گڑھ کی انجمن سے دو بے حد نوجوان طلبا کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے۔شاہد لطیف اور علی اشرف...... یہ دونوں جو اَب ایک فلمی اور ایک سیاسی دنیا میں بڑی حیثیت رکھتے ہیں، اُس وقت بی۔اے کے طالب علم تھے۔ بنارس سے پریم چند کے چھوٹے صاحبزادے امرت رائے، سریندر بالوپوری، اور دوسرے ہندی کے نوجوان لکھنے والوں کا گروہ تھا۔الہ آباد کا گروہ ظاہر ہے سب سے بڑا تھا۔یہاں کے ہندی کے چند نوجوان ادیبوں کے نام میں اوپر لکھ چکا ہوں۔اُردو والوں میں سید اعجاز حسین، فراق اور ان کے علاوہ سید احتشام حسین، وقار عظیم (جو شاید ایم۔اے میں پڑھتے تھے) مجھے یاد ہیں۔تقریروں اور ریزولیوشنوں کے علاوہ کانفرنس میں مختلف ادبی موضوعات پر مقالے بھی پڑھے گئے۔

اس زمانے میں ہم میں سے کافی لوگوں کی یہ رائے تھی کہ اُردو اور ہندی کو قریب تر لانے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اُردو اور ہندی دونوں کے موجودہ رسم الخط کو ترک کر کے رومن رسم الخط کو اپنا لیا جائے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم، پنڈت بشمبر ناتھ اور میں خاص طور پر اس خیال کے تھے۔ چنانچہ علیم نے اس خیال کی تائید میں ایک مقالہ بھی پڑھا۔ہم نے اس کانفرنس کے دعوتی خط اور دوسرے چند اشتہار بھی تجربہ کے طور پر رومن رسم الخط میں شائع کیے تھے۔الہ آباد کی انجمن کے اکثر لوگ اس خیال کے تھے۔چنانچہ اس موضوع پر کانفرنس میں بڑی بحث ہوئی جس میں اس خیال کی موافقت بھی ہوئی اور مخالفت بھی۔مخالفت میں کاکا کالیلکر گاندھی جی کے خاص بھگتوں میں تھے اوران کی ہندستانی تحریک کے بڑے کارکن تھے۔اس موضوع پر غیر رسمی گفتگو کے دوران میں وہ اِتنے جلال میں آ گئے کہ انھوں نے علیم سے کہا کہ...... ''میں ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کا ہمدرد ہوں۔لیکن اگر انجمن نے رومن لپی کی تجویز کو باقاعدہ اپنا نصب العین بنا لیا تو پھر میں پوری ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کی سخت مخالفت کروں گا۔'' ہمیں ان کی تعصّبانہ بات بہت بُری معلوم ہوئی۔ ہم نے کہا کہ انجمن کی آفیشیل پالیسی نہیں ہے، لیکن بہرحال ہم میں سے جو لوگ اس خیال کے ہیں، وہ کاکا صاحب کی دھمکی سے دب کر اپنے خیال کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے سے باز نہیں رہیں گے۔لیکن تھوڑے عرصے کے بعد رومن رسم الخط کے حامیوں نے بھی اپنی تجویز کو فی الحال غیر عملی سمجھ کر اس کا پروپیگنڈہ ترک کر دیا۔

کیا ہم ان کانفرنسوں کو کامیاب کہہ سکتے ہیں؟

ان سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہماری تحریک سے تعلق رکھنے والے مصنّفین اور ان کے ہمدرد عوام میں یکجہتی، یگانگت اور ہم خیالی پیدا ہوئی۔ صرف ترقی پسند مقاصد کا اعلان کر دینا کافی نہیں۔ اس لیے مختلف لوگ اس کی تاویلیں الگ الگ طریقے سے کر سکتے ہیں۔ ایک ساتھ ملنے، اپنے خیالات کا اظہار کرنے، ادب کے مختلف پہلوؤں اور دشواریوں پر بحث کرنے سے سب کے خیالات صاف ہوتے ہیں اور وہ ایک طرح سوچنے لگتے ہیں۔ یہی نظریاتی یکجہتی ہماری قوت ہے۔ تحریک کی ابتدا میں خاص طور سے اس کی بڑی ضرورت تھی۔ ان کانفرنسوں نے اس ضرورت کو پورا کیا۔

ان کانفرنسوں میں صرف نوجوان ادیب ہی نہیں تھے۔ بلکہ ایسے ادیب اور عالم بھی شامل ہوئے تھے جن کی ادبی حیثیت مسلم تھی۔ ان کا اور نئے ترقی پسند ادیبوں کا ایک ساتھ ملنا دونوں کے لیے مفید تھا، اور پوری تحریک کے لیے یہ اتحاد اور میل، جس سے ہماری تحریک کا ایک زندہ تعلق پہلے کے بہترین ادب سے قائم ہوتا تھا، تحریک کے استحکام اور مضبوطی کا باعث تھا۔ اس طرح ترقی پسند مصنّفین کی تحریک ہمارے قومی ادب کے سلسلے کی اگلی اور منطقی کڑی معلوم ہوتی ہے۔

ہماری کانفرنسوں میں صرف ادیب ہی شامل نہیں ہوتے تھے۔ ہم کوشش کرتے تھے کہ ان میں طلبا، عام دانشور، قومی اور عوامی ادب سے دلچسپی رکھنے والے سیاسی کارکن، ٹریڈ یونین کے کارکن، کسانوں اور مزدوروں کی تحریکوں میں حصہ لینے والے عام محنت کش بھی شامل ہوں۔ ان کے لیے خاص طور پر ہم مشاعرے اور کوی سمیلن بھی کرتے تھے۔ اس طرح ان کانفرنسوں کے ذریعے سے ہم ملک کے ترقی پسند عوام اور ان کی تحریکوں کے نزدیک آتے تھے۔ ہمارے خیالات زیادہ سے زیادہ پھیلتے تھے۔ عوام اور ان کے ادیبوں کا اتحاد مضبوط ہوتا تھا۔

اس طرح ان کانفرنسوں سے ہماری تحریک کو فائدہ پہنچا۔ اس کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔ وہ پھیلیں اور بڑھیں۔ لیکن ان میں خامیاں اور کمزوریاں بھی تھیں۔ سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ کانفرنس میں ادبی تخلیق کے سلسلے میں مصنفوں کو جو دشواریاں پیش آتی ہیں...... فنی اور نظریاتی...... ان کے متعلق ابھی تک ہم سنجیدگی سے اور تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کرتے تھے۔ اس کے لیے ضرورت اس کی تھی کہ پہلے کے مقابلے خاص خاص موضوعات پر تیار ہوں اور صرف ڈیلی گیٹس کے اجلاس میں وہ پڑھے جائیں، یا پہلے سے چھاپ کر تقسیم کیے جائیں اور پھر ان پر بحث ہو۔ لیکن

کچھ ناتجربہ کاری، کچھ وقت کی کمی، کچھ تساہل (کیوں کہ اچھے اور سنجیدہ مقالے لکھنے کے لیے وقت اور محنت درکار ہے) کے سبب سے ابھی تک ہماری کانفرنسوں کا یہ پہلو کمزور تھا۔ اگر ایک دو اچھے مقالے ہوئے بھی تو ان پر سیر حاصل بحث نہیں ہوئی۔ اگر بحث چھڑ گئی تو اس میں خودروی کا عنصر زیادہ اور فکر کا کم۔ آگے چل کر ہم نے ان خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔

○○○

تحریک کی کمزوریاں اور ولولے

بعض لوگ فن اور فرد کی آزادی کے نام پر ترقی پسند ادب کی تحریک پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ فنکار کے تخیل کی آزادی کو چند خانوں میں مقید کر کے اس کی تخلیقی صلاحیت کو پابند کرتی ہے۔ چونکہ ان کے نزدیک فنون لطیفہ الہامی اور باطنی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں، اس لیے موضوعِ خیال یا وسیلۂ اظہار کے قواعد کی پابندی بھی اس باطنی تجربہ کی راہ میں خلل اندازی ہے۔ فنکار کو اس کی مکمل آزادی ہونی چاہیے کہ جس طرح چاہے، اپنی اس باطنی کیفیت کا اظہار کرے۔ ان کے نزدیک بہترین اور حسین ترین شاعری، مصوری، موسیقی اور رقاصی یوں ہی ہو سکتی ہے۔ آرٹسٹ یا شاعر کی اس ''آزادیٔ کامل'' کا مطالبہ ہمارے ملک یا مشرق میں عام طور سے موجودہ زمانے سے پہلے کبھی نہیں کیا گیا۔ یورپ میں اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے دوران میں جب جدید سرمایہ داری کا عروج ہوا اور فرد کی سیاسی اور معاشی آزادی کا نعرہ بلند ہوا، اسی کے ساتھ فن اور فنکار کے تخیل کی آزادی کا بھی مطالبہ ہوا۔ جس طرح جاگیری سماج نے فرد کو طبقوں میں منقسم کر کے معاشی اور سیاسی طور پر جکڑ کر بند کر دیا تھا اور غیر عاقلانہ عقائد اور رسوم کی پابندی سے انسانی ذہن کو پابند کر دیا تھا، اسی طرح ادب اور فنون لطیفہ بھی قدیم یونانی اور رومی فنی اصولوں کے نام پر، اور ان کی غلط تعبیر کر کے عجیب و غریب قواعد و ضوابط کے پابند کر دیے گئے تھے۔ یورپ میں انقلاب فرانس کے تصورات کے ساتھ ساتھ ادب کی رومانوی تحریک بھی اُٹھی اور اس نے ادب اور تمام

فنون لطیفہ میں آزادی کی نئی روح پھونک دی۔ اٹھارھویں صدی کے ختم اور اُنیسویں صدی کے شروع کا یورپی ادب، شاعروں میں جس کے بہترین نمائندے گوئٹے، شلر (جرمنی)، وکٹر ہیوگو (فرانس)، ورڈز ورتھ، بائرن شیلے (انگلستان) ہیں، اس تحریک سے وابستہ تھے۔

لیکن آج کل جب سرمایہ داری دنیا سامراج کی شکل اختیار کرکے اپنے انحطاط اور زوال کے دور میں ہے اور عوام کی انقلابی جدوجہد کو فروغ ہے، الہام، باطنیت اور تصورِ مطلق کے پرستار فنکار کی آزادی کے نام پر اس کے تخیل، اس کی شدت احساس اور نکتہ رسی، اور اس کے اعلیٰ وارفع اور حسین تصورات کو فی الحقیقت دبانا چاہتے ہیں۔ وہ تخیل اور فن کی آزادی کا مطالبہ اس لیے نہیں کر رہے ہیں کہ انسانیت کے شریف ترین، اور بلند ترین، جذبات اور احساسات کا فنکارانہ اور حسین اظہار کریں، بلکہ اس لیے کہ مبہم طور سے فن کا نام لے کر اور قدامت اور روایت کے سہارے ان تصورات کو پھیلائیں اور برقرار رکھیں، اور ان جذبات کو ابھاریں جن کے اثر سے انسانوں میں زندگی اور اس کی ترقی پذیر جدوجہد سے گریز کی کیفیت پیدا ہو، جو اُن کے قلب کو انکشاف اور روح کو طمانیت اور سرور بخشنے کے بجائے اس میں پژمردگی اور ژولیدگی کی سمیّت ڈال دے اور ان کے ذہن میں جلا کرنے کے بدلے اس میں دھندلکے اور انتشار کی فضا پھیلائے۔

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ فن جب بھی اور جس صورت میں بھی وہ بری ہو یا بھلی، مکمل ہو یا نامکمل، سہل اور صاف ہو یا پیچیدہ اور دقیق، جب فنکار کے ذہن سے نکل کر کوئی ایسی شکل اختیار کرتا ہے جسے دوسرے لوگ دیکھ پڑھ یا سن سکیں تو اس کے کوئی نہ کوئی معنی ہوتے ہیں۔ اس کا کچھ نہ کچھ منشا ہوتا ہے۔ فنون لطیفہ میں معنی اور مطلب کا اظہار جذبات کو متحرک کرکے، آہنگ، ترنم، تناسب، حسین اور موئثر تشبیہوں اور استعاروں، دلکش اشاروں، یا اگر تصویر ہے تو رنگوں، سائے اور روشنی کے حسین اور متناسب استعمال کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ فنکار کی انگلیاں ہماری روح کے ان تاروں کو آہستگی سے مترنم کر دیتی ہیں جو ہمارے شعور اور ادراک میں خود ہمارے اپنے علم یا تجربے کی بنا پر موجود تو ہوتے ہیں، لیکن جن کا ہمیں اس سے پہلے یا تو بالکل احساس نہیں ہوتا یا دھندلا اور مبہم سا احساس ہوتا ہے۔ فنکار کا کوئی تخئیل، اس کی کوئی بھی الہامی کیفیت، اگر اس کا اظہار کیا جائے گا، تو شعور اور فہم سے مبرا نہیں ہوسکتی۔ جذبات کے بھی معنی ہوتے ہیں۔ وہ بھی کسی نہ کسی مطلب کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس پر تو بحث کی جاسکتی

ہے کہ ایک شاعر یا ادیب کون سے ذرائع استعمال کر کے، ان قلبی واردات کا اظہار بہترین، حسین ترین اور مؤثر ترین طریقے سے کر سکتا ہے جو اس کے سینے میں موجزن ہوتی ہے۔ لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ ان کیفیتوں کو انسانی شعور سے کوئی سروکار نہیں۔ معنی اور مطلب بغیر شعور کے پیدا نہیں ہو سکتے۔ اس شعور کا ہونا فنکار اور ان میں جو اس کی تخلیق کو دیکھتے، پڑھتے یا سنتے ہیں، دونوں میں ضروری ہے۔

ترقی پسند، فنکار کی آزادی کے منکر نہیں ہیں، وہ بہترین فنی تخلیق کے لیے آزاد اور پاکیزہ اور صحت مند فضا کے متمنی ہیں اور اسے قائم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ بہت تلخی کے ساتھ اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں کہ خود ہمارے ملک میں دانشور اور فنکار آزاد نہیں ہیں۔ معاشی اور سیاسی دباؤ اور سماج کے رجعت پرست حلقوں کی طرف سے کبھی کھلی اور کبھی ڈھکی ہوئی زبردستیاں اور مکروہ سازشیں، ان کی آزادئ تخلیق کی راہ میں کوہِ گراں کی طرح حائل ہیں۔

البتہ ترقی پسند، فنکار کو فہم اور شعور سے آزاد کر دینے کے قائل نہیں ہیں۔ دراصل یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ جو لوگ اس کا مطالبہ کرتے ہیں، ان کا منشا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خود ان کے پست، الجھے ہوئے، انسانیت سے گریزاں اور نفس کش خیالات کو تو فن کے مقدس اور حسین نام پر اظہار کی پوری آزادی ملے اور ترقی پسند اور روح پرور، دل کُشا انسانیت کا سوز رکھنے والے تصورات اور جذبات، جو ہر اچھے اور بڑے فنکار کی جان ہوتے ہیں، کو پنپنے کا موقع نہ دیا جائے۔

ہم ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کے شروع کے تین چار سال پر اگر نظر ڈالیں تو اس کی دو سب سے نمایاں خصوصیتیں نظر آتی ہیں۔

اوّل تو یہ کہ اس زمانے میں، ان مقاصد کا تعین کیا گیا جو ہماری نظر میں، ہمارے ملک اور اس کی معاشرتی کیفیت کے پیش نظر، ہماری ادبی تخلیق کے خاص اور سب سے اہم مقاصد ہونے چاہئیں۔ یہ مقاصد ان سے ہی متعلق تھے، جو کہ اس دور میں ہماری قوم، اس کے محنت کشوں، دانشوروں، اس کے اور تمام شریف انسانوں کے عام مقاصد تھے۔ آزادی، جمہوریت، خوشحالی، امن، فلاح اور تہذیب کے مقاصد۔ اس طرح گویا ہم اپنے ملک کے ادیبوں اور دانشوروں کا رشتہ اپنی قوم اور دور حاضر کے اعلیٰ ترین اور بلند ترین نصب العین سے جوڑ کر انھیں ملک کی متحرک انقلابی اور ترقی پذیر عوامی زندگی سے منسلک کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے نزدیک موجودہ دور میں

ہمارے وطن میں بہترین جاندار اور حیات افروز ادب کی تخلیق کا یہی ایک واحد ذریعہ تھا۔ ہم تمام ان رجحانات کو مسترد کرتے تھے جو قدیم ادبی یا باطنیت کی روایات، قاعدوں یا فرسودہ رسوم وعقائد کی پناہ لے کر، ادیب کو اس کے صحیح منصب سے دور رکھتے تھے۔ ہماری نظر میں ایسی مادی اور ذہنی قوتوں کا منبع یا تو ہماری معاشرت کے وہ عناصر تھے جنھیں ہم زوال پذیر جاگیری عناصر کہتے تھے، یا پھر بیرونی سامراج اور ان کی پروردہ اور ان کے بل پر قائم رہنے والی سرمایہ داری۔ یہ تھے ادب اور تہذیب کے ''وہ خانے اور بند شیں'' جن سے ہم اپنی تہذیب کو نکالنا چاہتے تھے۔

اس تہذیبی کاوش کا کبھی یہ مقصد نہیں تھا کہ شاعروں کو محبت کے میٹھے گیت گانے اور حسن و عشق کی حکایتوں اور واردات کے بیان کرنے سے روکا جائے...... یا وہ نغمے جن سے دلوں میں سوز اور دردمندی پیدا ہو، جان میں گھلاوٹ اور آنکھوں میں نمی، نہ چھیڑے جائیں۔ ہمارا مقصد ادیب کی نظر کو محدود کرنا نہیں بلکہ اسے اور زیادہ وسیع کرنا تھا۔ باریک بینی کے ساتھ اس میں گہرائی پیدا کرنا تھا۔ اس میں وہ کسک اور ٹیس پیدا کرنا تھا جو خود پرستی کے تنگ گھروندے سے باہر نکل کر ساری نوع انسانی کے دکھ درد، رنج وراحت کا شریک ہونے اور اسے ہمدردی اور بصیرت کے ساتھ سمجھنے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ انجمن کی طرف سے متعدد کانفرنسیں منعقد کر کے، انجمن کی مختلف شاخوں اور خود ادبی حلقوں میں نئی طرح کے افسانے، نظمیں، تنقیدی مضامین پڑھ کر اور ان پر بحث اور مباحثہ کر کے، متعدد رسالوں کا اجرا کر کے یا پہلے سے جاری شدہ رسالوں کو نیا رنگ دے کر، ان میں ادب کے نئے مقاصد پر بحث چھیڑ کر، اپنے مخالفوں اور نکتہ چینوں کو سنجیدگی سے جواب دے کر اور اس پر اصرار کر کے، کہ نئے لکھنے والے عوام کی زندگی نیز ان کی ترقی پسند تحریکوں کی زیادہ سے زیادہ سچی اور گہری واقفیت حاصل کریں۔ ہم نے وہ ذہنی اور عملی بنیاد رکھی جو ادب کے رجعت پسند رجحانات کو پسپا کرنے اور شکست دینے اور نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق کے لیے ضروری تھی۔

اس نظریاتی اتحاد کی کوشش کے ساتھ ساتھ دوسرا سب سے اہم کام، جو اس زمانے میں انجام دیا گیا، وہ نئے ترقی پسند لکھنے والوں اور ترقی پسند ادب میں دلچسپی رکھنے والوں کی سارے ملک میں اور اس کی اکثر بڑی بڑی زبانوں میں ایک ابتدائی قسم کی تنظیم تھی، اور ان کے ایک مرکز کا قائم ہونا تھا۔ ہمارا وطن لسانی اعتبار سے کئی بڑی بڑی زبانوں کے علاقوں میں بٹا ہوا ہے۔ ان

مختلف زبانوں میں سے ہر ایک کو کروڑوں یا لاکھوں انسان بولتے ہیں۔ اُردو، ہندی (جو بنیادی طور پر ایک ہی کھڑی بولی کی دو علاحدہ شکلیں ہیں)، بنگالی آسامی، اڑیہ، تامل، تیلگو، ملیالم، کنڑ، مرہٹی، گجراتی، سندھی، پنجابی، پشتو، کشمیری، تو ایسی زبانیں ہیں جو کافی ترقی یافتہ اوران میں صدیوں پُرانا ادب بھی موجود ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی زبانیں ہیں جو ابھی اتنی ترقی نہیں کرسکیں ہیں۔ مثلاً بلوچی یا شمالی اورشمال مشرقی پہاڑی قبیلوں کی زبانیں۔ غالبًا ہماری تحریک سے پہلے ملک میں کوئی ایسا ادبی ادارہ یا تنظیم نہیں تھی جس میں یہاں کی مختلف زبانوں کے ادیب ایک واحد نصب العین کے تحت منظّم کیے گئے ہوں۔ 1936 میں ہی مسٹر کنھیا لال منشی نے گاندھی جی کی سرپرستی حاصل کرکے اِس قسم کے ایک کل ہند ادارے بھارتیہ ساہتیہ پریشد (یعنی ہندستانی ادبی انجمن) قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئی۔اس کا ابتدائی جلسہ 1936 میں ناگپور میں ہوا۔اس کے بعد سے اس انجمن کا نام ہی نہیں سنا گیا۔

بنگال میں ہماری تحریک بہت تیزی کے ساتھ پھیلی اور کلکتہ کے علاوہ اور بھی کئی شہروں میں انجمن کی شاخیں قائم ہوئیں۔ سلہٹ اور گوہاٹی میں بنگالی اور آسامی کے ادیبوں نے مل کر انجمن قائم کی۔ غالبًا بنگال کی انجمن وہ پہلی شاخ تھی جس نے اپنا ایک دفتر اور ایک کتب خانہ اور ریڈنگ روم بھی قائم کیا۔ اس کے ہال میں سو دوسو آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی اور اس میں انجمن کے جلسے وغیرہ ہوتے تھے۔ بنگال کی انجمن کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی تھی کہ آرٹسٹ بھی اس میں شامل تھے۔ اس لیے بعد کو اس کا نام ''بنگال کے ترقی پسند مصنّفین اور آرٹسٹوں کی انجمن'' میں بدل دیا گیا۔ انجمن نے بنگالی کے مشہور ادبی ماہنامہ ''پریچے'' کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور وہ ہماری بنگالی شاخ کا ترجمان بن گیا۔

سلہٹ کی انجمن نے اپنا ایک الگ بنگالی ماہنامہ جاری کیا۔

احمد آباد میں بھوگی لال گاندھی اور پروفیسر ہیرالال گودی والا کی کوششوں سے گجراتی کی انجمن قائم ہوئی جس میں نئے نوجوان ادیبوں کے علاوہ گجراتی کے اور بھی کئی ممتاز ادیب (مثلاً اوما شنکر جوشی) وغیرہ شامل ہوئے۔

پونا اور ناگپور میں مرہٹی ادیبوں کے ترقی پسند حلقے تھے۔ بمبئی میں جہاں گجراتی اور مرہٹی دونوں کے ادیب تھے، شروع شروع میں اندولال یاجنک (گجراتی ادیب اور کسان رہنما) نے

انجمن قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہاں انجمن بنتی اور ٹوٹتی رہی۔ 1942 میں جا کر وہاں پر ایک مضبوط اور باعمل شاخ قائم ہوئی جس میں مرہٹی، گجراتی، ہندی اور اُردو کے ادیب شامل تھے۔

میسور، مالابار اور بیجواڑہ میں بھی ترقی پسند ادیبوں کے کنٹری، ملیالم اور تیلگو کے حلقے قائم ہوئے۔ تامل بولنے والے علاقے میں، سندھ میں اور کشمیر میں حالانکہ انجمن کی شاخ باقاعدگی سے قائم نہیں ہوئی، لیکن وہاں کے چند نوجوان لکھنے والے انجمن کے مرکز سے ملحق تھے جو اُن علاقوں میں نئی تحریک کے تصورات اور کام کو پھیلاتے تھے۔

اِس دن بہ دن بڑھتے اور پھیلتے ہوئے کام کو چلانے کے لیے اس کی بے حد ضرورت تھی کہ اول تو انجمن کا ایک مضبوط اور باعمل مرکز ہوتا۔ دوسرے ان لسانی علاقوں میں جہاں انجمن کی کئی شاخیں قائم ہوگئی تھیں۔ مثلاً بنگال، صوبہ متحدہ، پنجاب، مضبوط صوبائی مراکز ہوتے۔

ہم کانفرنس کرنے میں تو بڑی مستعدی، جوش اور خوش تدبیری کا ثبوت دیتے تھے لیکن ایک مستقل اور مستحکم تحریک کے روز مرّہ کے نسبتاً غیر دلچسپ دفتری کام کو چلانے کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے، ان کی ہم میں بہت کمی تھی۔ انجمن کے مرکز کے لیے یہ ضروری تھا کہ تمام شاخوں سے تعلق قائم رکھنا، ان کے کام کی رپورٹیں حاصل کرنا، اور اپنی طرف سے ہر شاخ کے پاس بلیٹن روانہ کرنا، جس میں سارے ملک کی تحریک کی کارگزاریوں کی رپورٹ ہوتی، شاخوں کو بتایا جاتا کہ ممبروں کا رجسٹر رکھنے، ان سے ممبری چندہ وصول کرنے، اپنی باقاعدہ میٹنگیں کرنے اور ان کی اچھی اور دلچسپ رپورٹ لکھنے کی ضرورت ہے۔ مرکز کی طرف سے ایک انگریزی کے ماہنامہ یا سہ ماہی رسالے کی بھی ضرورت تھی جس میں مختلف زبانوں میں لکھے جانے والے بہترین افسانے، نظمیں، اور مقالے وغیرہ ترجمہ کرکے شائع ہوتے، ملک کی عام ادبی سرگرمیوں پر رپورٹیں اور ساتھ ساتھ بین الاقوامی ترقی پسند ادبی تحریک اور دنیا کے عام کلچرل مسائل کی خبریں ہوتیں اور ان پر تبصرہ ہوتا۔ نیز یہ بھی ضروری تھا کہ جنرل سکریٹری یا کوئی دوسرا مرکزی کارکن وقتاً فوقتاً صوبوں کا دورہ کرتا، مختلف شاخوں کی میٹنگوں میں شریک ہوتا، ان کی مشکلات اور کمزوریوں اور ان کی کارگزاریوں کی ذاتی واقفیت حاصل کرتا اور انجمن سے ملحق ادیبوں سے مل کر انجمن اور تحریک کے مسائل پر ان کے ساتھ صلاح ومشورہ کرتا۔ کانفرنسوں میں ہماری ملاقاتیں ایک دوسرے سے ہوتی تھیں۔ لیکن یہ کافی

نہ تھا۔ ادب کے مسائل پر روا روی میں گفتگو نہیں ہو سکتی۔ اکثر ادیب قلم چلانے کے تو ماہر ہوتے ہیں لیکن ان کی زبان مشکل سے چلتی ہے۔

یہ سب کام ہوتے تو تھے لیکن ان میں باقاعدگی نہیں تھی۔ ہر کام میں دیر ہوتی تھی اور کئی کئی مہینے گزر جاتے تھے۔ انجمن کی شاخوں کو مرکز کی طرف سے کوئی مراسلہ نہیں ملتا تھا۔ مثلاً ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہر ماہ مرکز کی طرف سے ایک بلیٹن شائع ہوگا، جس میں پوری تحریک کے کاموں کی خبریں ہوا کریں گی۔ لیکن اس طرح کے بلیٹن ماہوار نہیں، بلکہ تین تین چار چار مہینے بعد شائع کیے جا سکے۔ کئی شاخیں بھی ایسی تھیں جو اپنے یہاں سے رپورٹ بھی نہیں بھیجتی تھیں۔ لیکن یہ ایک ایسی خامی تھی، جو بڑی حد تک مرکز کی مستعدی اور تقاضے سے دور کی جا سکتی تھی۔

ظاہر ہے کہ مرکز کے کاموں اور اس کی تنظیم کی سب سے بڑی ذمہ داری جنرل سکریٹری کی تھی۔ اس کا کام صرف یہی نہیں تھا کہ باقاعدہ دفتر قائم کرے جس میں وہ خود مسلسل کام کرے، بلکہ اس کے ساتھ کام کرنے کے لیے کم از کم ایک دو آدمی اور بھی ہوں۔ پھر دفتر چلانے کے لیے، بلیٹن نکالنے کے لیے اور کل وقت کام کرنے والوں کی کفالت کے لیے سرمایہ کی ضرورت تھی، جو ہمارے پاس نہیں کے برابر تھا۔ دفتر میں کام کرنے والوں کی کفالت تو درکنار، خط و کتابت اور بلیٹن کے اخراجات کے لیے بھی وہ سرمایہ کافی نہیں تھا۔ اس وقت میری کفالت کی انجمن کو ضرورت تھی۔ لیکن میری دشواری یہ تھی کہ 1938 کے دوران، اس کے بعد رفتہ رفتہ کر کے میری سیاسی مشغولیتیں بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ اس کی وجہ سے میں انجمن کو جتنا کہ ضروری تھا، وقت نہیں دے سکتا تھا۔ الہ آباد میں میری مدد کرنے کے لیے ایک دو طالب علم تھے لیکن وہ بھی باقاعدگی سے کام نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ پڑھنے کے علاوہ بھی سیاسی کاموں میں پھنسے رہتے تھے۔ اصل میں 1938 کے شروع میں ہی مجھے انجمن کے جنرل سکریٹری کے عہدے سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے تھا۔ جو اس کام پر زیادہ وقت دیتا، بدقسمتی سے اس کے لیے کوئی دوسرا شخص تیار نہیں ہوتا تھا۔ جو لوگ ''باقاعدہ قسم'' کے اور ''مستند'' ادیب تھے، ان میں عام طور سے تنظیمی کام کی یا تو اہلیت نہیں تھی، یا پھر وہ اپنے سر یہ مصیبت مول لینا اپنے فن کے لیے مضر سمجھتے تھے۔

جب ہم کسی نئی تحریک کی تنظیم شروع کرتے ہیں تو اس میں حصہ لینے والے کارکن اپنے بلند نصب العین کے نشہ میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ جوش میں آ کر وہ اس تحریک کو چلانے،

بڑھانے اور پھیلانے کے لیے اپنی خوش اعتقادی اور خوش فہمی کی بنا پر اچھے سے اچھا منصوبہ بناتے ہیں۔ مثلاً ہم نے ایک مضبوط مرکز کے لیے اس کا باقاعدہ دفتر، چندکل وقتی مرکزی کارکن، بلیٹن، ماہنامہ رسالہ، سالانہ کل ہند کانفرنسیں اور سال میں دو بار کل ہند انجمن کی کونسل کا پروگرام جھٹ سے بنالیا۔ ظاہر ہے کہ اس پروگرام میں کوئی ''خرابی'' نہیں تھی۔ تحریک کو پائدار، مضبوط کرنے کے لیے اور اسے زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کے لیے اس سے بہتر صورت ممکن ہی نہیں۔ لیکن ماحول اور فضا اگر سازگار بھی ہو، لوگوں کی عام ہمدردی بھی ہمارے ساتھ ہو، اور سماجی دھارے کا رُخ بھی ہمارے موافق ہو، پھر بھی محض نیک ارادے اور بہترین پروگرام کامیابی کی ضمانت نہیں ہو سکتے۔ ہوتا اصل میں یہ ہے کہ تحریک کو قائم کرنے اور چلانے کے سلسلے میں جو چھوٹے چھوٹے اور ڈگمگاتے ہوئے ابتدائی قدم اُٹھائے جاتے ہیں، ان کے ساتھ ساتھ اور ان کے دوران میں ہی ایک طرف تو ہمیں نئی اور غیر متوقع مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا ہوتا ہے (ایسی مشکلات جن کا ہمیں اپنا منصوبہ بناتے وقت تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے خیال ہی نہیں آیا تھا اور ہم نے اپنے پروگرام میں ان کے لیے گنجائش نہیں رکھی تھی)، دوسری طرف عمل کے وہی قدم جو اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ہم اُٹھاتے ہیں، طرح طرح کی مشکلوں پر قابو پانے کی وہی کوشش جو ہم کرتے ہیں، ہم کو تجربہ کار بناتی ہے۔ ہم میں کسی قدر سمجھداری اور حقیقت شناسی پیدا کرتی ہے اور اس طرح ہم اپنے مقصد کی جانب اور آگے بڑھنے کے لیے اپنے کو زیادہ اہل اور زیادہ طاقتور بناتے ہیں۔

بہرصورت، تجربے نے ہمیں بتایا کہ ہم نے جس قسم کا مرکز قائم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، وہ تحریک کے اس دور میں ممکن نہیں تھا۔ مضبوط مرکز، مضبوط اور متعدد اور باعمل شاخیں خود ہماری تحریک کے زیادہ پُراثر ہونے اور زیادہ مقبول ہونے سے ہی قائم ہو سکتی تھیں۔ اس زمانہ میں جو چیز ممکن تھی، اور جو ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ مرکزی طور پر ہم وقتاً فوقتاً باضابطہ یا بے ضابطہ طور پر ملک کے مختلف حصوں کے ترقی پسند ادیبوں کا اجتماع کر لیتے تھے۔ مرکزی کارکن خاص خاص موقعوں پر اور کافی وقفے کے بعد انجمن کی مختلف شاخوں کو ایک دوسرے کی کارروائیوں سے مطلع کرتے رہتے اور تحریک میں ایک عام یکجہتی قائم رکھنے میں مددگار ہوتے۔ رفتہ رفتہ انجمن ملک کے مختلف ادبی مرکزوں میں اپنی شاخوں کے ذریعہ سے نظری اور تنظیمی اعتبار سے مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ یہ

مضبوطی بھی لگا تار اور مسلسل نہیں تھی۔ بلکہ کہیں اس کی رفتار تیز تھی، کہیں سست، کہیں پر انجمن کی تنظیم محض نام کے لیے تھی اور کہیں پر اس کی نشو نما جاری تھی۔

ہم 1937 میں کل ہند سالانہ کانفرنس نہیں کر سکے لیکن اس سال دو بار ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کے کارکنوں کا اجتماع ہوا۔ ایک مرتبہ دہلی میں (غالباً 1936 کے جاڑوں میں) اور ایک بار اپریل 1937 میں ہری پور (صوبہ بمبئی) میں، جہاں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔

انجمن کی کل ہند کونسل کی میٹنگ دہلی میں ہوئی جس میں ملک کے مختلف حصوں سے کونسل کے تقریباً دس پندرہ ممبر شریک ہوئے تھے۔ ان میں ڈاکٹر علیم، سومندرا ناتھ ٹیگور، فیض، اندولال یا جنک کے نام مجھے یاد ہیں۔ اس زمانے میں وہاں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس تھا اور انھیں دنوں میں کل ہند کسان کمیٹی کا بھی وہاں جلسہ تھا۔

اس زمانے میں اسپین کی خانہ جنگی جاری تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کو کونسل نے اسپین کے جمہوریت پسندوں کی حمایت اور فاشسٹ فرانکو اور اس کے حمایتیوں کی مخالفت میں ایک بیان منظور کر کے شائع کیا۔ اس کے ساتھ ہی جمہوری اسپین کی امداد کے لیے بھی ایک کمیٹی دہلی میں بنائی گئی، جس میں ملک کی مختلف جمہوری جماعتیں اور ممتاز ہستیاں شریک تھیں۔ ہماری انجمن مجموعی حیثیت سے بھی اس کمیٹی میں شامل ہوئی۔ انجمن کا جنرل سکریٹری اس کمیٹی کا بھی سکریٹری منتخب کیا گیا۔ ہماری بنگال کی شاخ کے کارکنوں نے اسپین کی جمہوریت کی حمایت اور فاشسٹوں کی مخالفت میں رابندر ناتھ ٹیگور سے بھی ایک بیان حاصل کر کے شائع کیا۔

ہری پور میں ترقی پسند مصنّفین کا جو اجتماع ہوا، وہ اس لحاظ سے غیر رسمی تھا کہ اس میں مختلف شاخوں کے چنے ہوئے نمائندے شریک نہیں تھے اور نہ اس میں نئے انتخابات ہوئے۔ لیکن وہاں کے جلسے میں ملک کے تقریباً تمام بڑے لسانی علاقوں کے چند ترقی پسند ادیب اور تحریک میں دلچسپی رکھنے والے کافی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ اس جلسہ کی صدارت محترمہ سروجنی نائڈو نے کی۔ انھوں نے اپنے مخصوص طریقے سے صدارتی تقریر کی اور اپنی فصاحت اور رنگین بیانی سے سب کو تھوڑی دیر کے لیے مبہوت کر دیا۔ ملک کے مختلف حصوں سے آنے والے ادیبوں نے مختصر الفاظ میں اپنے علاقے میں تحریک کے متعلق رپورٹ دی اور جنرل سکریٹری نے تحریک کی عام صورت حال بیان کی۔ اس جلسہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار رہی ہوگی۔

غالباً 1938 کے وسط میں ڈاکٹر ملک راج آنند انگلستان سے ہندستان آ گئے اور انھوں نے پورے جوش وخروش کے ساتھ ترقی پسند مصنّفین کی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا۔ وہ ہندستان آنے سے پہلے اسپین بھی گئے تھے اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ کس طرح انگلستان، فرانس، بلکہ تمام یورپ اور امریکہ کے ترقی پسند ادیب اور دانشور، اسپین میں فاشزم کی تہذیب کش وبا کو روکنے کے لیے دوسرے جمہوریت پسندوں کے ساتھ مل کر جدوجہد کر رہے ہیں۔ ادیبوں کی یہ جدوجہد محض زبانی یا قلمی نہ تھی بلکہ بہت سے ادیب اور دانشور وردیاں پہن کر جمہوری فوج کی معاون، انٹرنیشنل بریگیڈ میں شامل ہو گئے تھے، اور ترقی پسندوں اور رجعت پرستی کے سب سے فیصلہ کن اور پُرخطر محاذ پر اپنا خون بہا کر اور اپنی جانیں دے کر امن اور تمدن کی دشمن قوتوں کے سیلاب کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو محاذ پر نہیں گئے تھے، وہ ہسپانوی جمہوریت کی مددگار کمیٹیوں میں شامل ہو کر جمہوری فوج کے لیے سامان اور روپیہ پیسہ جمع کرتے تھے اور اپنے ملکوں میں مختلف طریقوں سے رائے عامہ کو بیدار کر کے فاشزم کے حملے کو پسپا کرنے کے لیے آمادہ کرتے تھے۔ یورپ اور امریکہ کے تمام ترقی پسند یہ خوب اچھی طرح جانتے اور محسوس کرتے تھے۔ اگر اسپین میں فاشزم کو شکست نہ دی جا سکی تو دوسری عالمگیر جنگ کو روکا نہ جا سکے گا۔ اس لیے کہ فرانکو، ہٹلر اور مسولینی کے بل پر اور ان سے ہر طرح کی مدد حاصل کر کے ہی لڑ رہا تھا۔ فرانکو کی فتح کے معنی ہٹلر اور مسولینی جیسے جنگ بازوں کی جیت کے تھے اور ان کی جیت عالمگیر جنگ کی مترادف تھی۔ انگلستان سے انٹرنیشنل بریگیڈ میں شامل ہو کر حصہ لینے والوں میں رالف فاکس، کارنفورڈ، ڈیوڈگسٹ اور کاڈویل خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ سب محاذ جنگ پر لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

آنند فطرتاً بڑی جوشیلی طبیعت کے آدمی ہیں۔ ان کا قلم جس تیزی سے چلتا ہے اس سے زیادہ تیزی سے ان کی زبان چلتی ہے۔ اور اگر ان میں کسی بات کی دُھن سوار ہو جائے تو پھر وہ اپنی بات کو منوانے کے لیے یا اپنے کام کو انجام دینے کے لیے زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ وہ ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں جو کتاب لکھنے پر ہی نہیں، بلکہ اس کی طباعت اور اشاعت پر بھی اتنی ہی محنت کرتے ہیں۔ ایک ہندستانی ادیب کے لیے انگلستان میں انگریزی میں ناول لکھ کر انگلستان کی کتابوں کی منڈی میں اپنے لیے ایک اونچی جگہ بنا لینا آنند کا ہی کام تھا۔ بعض مرتبہ تو آنند کے دوست یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک اچھے اور حساس مصنف ہی نہیں

بلکہ اپنی کتابوں کے مستعد تاجر بھی ہیں۔ اس کے باوجود ان کا ادبی مرتبہ کم نہیں ہوتا۔ وہ تمام تہذیبی اور ادبی ترقی پسند تحریکوں میں آگے بڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور اگر ایسے موقع پر کسی خاص کام کی انھوں نے اپنے اوپر ذمہ داری لے لی تو پھر وہ نچلے نہیں بیٹھتے۔ وہ اپنے ساتھ اپنے اردگرد بلکہ دور کے لوگوں کو بھی ملنے ڈولنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور جیسے بھی ہو، وہ اس کام کو اس طرح انجام دیتے ہیں کہ معلوم ہونے لگتا ہے وہ ان کا کوئی ذاتی یا نجی کام ہے۔ بعض لوگ آنند کے ان طریقوں میں خودنمائی کا پہلو دیکھتے ہیں۔ لیکن آنند کو اس کی بالکل پرواہ نہیں ہوتی اور وہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ اعصابی ہیجان اور اضطراب کی کیفیت جوان کی فطرت میں داخل ہے، ان میں احساس کی شدت اور ذہن کی تیزی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے اور جب ان میں جذبات کا وفور ہوتا ہے تو اس سے ان کی خود پرستی نہیں بلکہ دل کی گداختگی کا اظہار ہوتا ہے۔

آنند اس زمانہ میں جب اپنے وطن کو واپس آئے تو ان میں اسپین کے میدانِ کارزار کی تپش اور حرارت تھی۔ انھوں نے ہندستان کے دانشوروں اور ادیبوں میں بھی وہ برقی رو پیدا کرنے کی کوشش کی جو اس وقت مغربی یورپ کے دانشوروں میں دوڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں طلبا، ادیبوں اور دانشوروں کے جلسوں میں اسپین کی لڑائی کی عالمگیر اہمیت پر پُرجوش تقریریں کیں اور اپنے ہم پیشہ ادیبوں کے گروہ کو خاص طور پر دنیا کے تمام انسان دوست دانشوروں کے دوش بدوش کھڑے ہو کر جنگ اور رجعت کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اس مہم میں ترقی پسند مصنّفین کی انجمن پیش پیش تھی، اس لیے اس کے ساتھ ہماری تنظیم بھی آگے بڑھتی تھی۔

آنند جب شمالی ہندستان میں ہوتے تو ان کا قیام اکثر لکھنؤ میں ہوتا تھا۔ 1938 کے وسط اور 1939 میں ہماری انجمن کا مرکزی کام بھی زیادہ تر لکھنؤ سے ہی ہونے لگا تھا۔ میں بھی لکھنؤ میں کافی وقت گزارنے لگا تھا۔ احمد علی بھی اب الہ آباد یونیورسٹی سے منتقل ہو کر لکھنؤ یونیورسٹی میں آگئے تھے اور ڈاکٹر عبدالعلیم بھی اب لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے لکچرار کی حیثیت سے آگئے تھے۔ اب علیم اور آنند نے انجمن کے مرکزی کاموں کو، جو میں عدیم الفرصتی کی وجہ سے نہیں کر سکتا تھا، سنبھال لیا اور علیم کا بیرؤ روڈ کا چھوٹا سا مکان ہمارا مرکز بن گیا۔

انجمن کے مرکز کی طرف سے انگریزی میں ایک سہ ماہی رسالہ نکالنے کا خیال شروع سے

ہی ہمارے ذہن میں تھا۔ احمد علی نے اس میں خاص دلچسپی لی تھی اور اس کے لیے اسکیم تیار کر لی تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ رسالہ میں ملک کی بڑی بڑی زبانوں میں لکھے ہوئے ادبی مضامین اور افسانوی وشعری ادب کے چنے ہوئے نمونے پیش کیے جائیں۔ جدید بین الاقوامی ادب بھی اس کا ایک حصہ ہو، اور انجمن کی اور ملک کی عام تہذیبی سرگرمیوں کی خبریں اس میں ہوں۔ کتابوں پر تبصرے وغیرہ بھی ہوں۔ لیکن کئی اور اچھی اسکیموں کی طرح یہ اسکیم بھی آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ آنند جب آئے تو ہم نے ان کو اس رسالے کے کام کو سرانجام دینے کے لیے سب سے مناسب شخص سمجھا۔ یوں تو اس رسالے کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ ایک شخص کے چلائے چل نہیں سکتا تھا اور وہ اپنے اصلی صحیح منصب کو اسی صورت میں پورا کر سکتا جب ملک کے بڑے تہذیبی مرکزوں میں انجمن کی شاخیں کم از کم ایک شخص ایسا مقرر کریں جو اچھی انگریزی جانتا ہو اور جو اپنی زبان کے حصے کے لیے رسالہ کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دے۔ اس کام کو مستعدی کے ساتھ کرنے کے لیے آنند سے بہتر اس وقت اور کوئی شخص نہیں تھا۔ نیز اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر بھی وہ یورپ کے بڑے اور مشہور ادیبوں سے ہمارے رسالے کے لیے تعاون حاصل کر سکتے تھے۔

آنند نے اس کام کو بڑے انہماک سے شروع کر دیا۔ انھوں نے بمبئی، کلکتہ، لاہور، امرتسر، اور کئی شہروں میں گھوم گھوم کر رسالے کے مستقل سالانہ خریدار بنائے اور اس کے علاوہ لوگوں سے چندہ بھی جمع کیا۔ اس طرح ہمارے پاس قریب دو ہزار روپے جمع ہو گئے۔ چونکہ شروع میں لکھنے والوں کو کوئی معاوضہ دینے کا ارادہ نہیں تھا، اس لیے تین چار نمبر نکالنے کے لیے یہ رقم کافی تھی۔ چھپنے کے بعد کچھ رقم اس کی پھٹکر بکری سے بھی مل جانے کی امید تھی۔ اس کے علاوہ خوش فہمی اور نیک نیتی کا ہمارے پاس بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ دانش مندی کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اتنی قلیل رقم سے رسالہ جاری نہ کیا جائے، لیکن ہم کو اپنے ''مال'' کی عمدگی اور اس کی مقبولیت پر اتنا ضرورت سے زیادہ بھروسہ تھا کہ ہم سمجھتے تھے کہ اس کو دیکھتے ہی ملک کے تمام انگریزی داں بس اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ وہ ہاتھوں ہاتھ بک جائے گا۔ ہمیں نفع ہوگا۔ اس کے بعد ہم اپنے رسالے میں لکھنے والوں کو معقول معاوضہ بھی دے سکیں گے۔

لیکن انقلابی خیالات کے مبلغ اور رجعت پرستی کے خلاف لڑنے والے اگر احتیاط اور سلامت روی کا ہر گھڑی دامن پکڑے رہیں اور اپنے مقاصد کے لیے جدوجہد کرنے کے دوران

میں ایسی غیر یقینی یا پُر خطر راہوں پر چلنے سے کترائیں، جہاں صرف غیر معمولی ہمت اور صف شکن حوصلے سے آگے بڑھنے کا راستہ نکلتا ہو، تو پھر انھیں قصرِ اُمید کے چمکتے ہوئے مینارے تو شاید دور سے نظر آ جائیں۔ اس کی تسخیر ان کی قسمت میں نہ ہوگی۔

ڈاکٹر علیم کا گھر اس رسالہ کا بھی دفتر قرار پایا اور بالآخر ان کی اور آنند کی سخت کوشش کے بعد ہمارے انگریزی رسالے ''نیو انڈین لٹریچر'' (نیا ہندستانی ادب) کا پہلا نمبر 1939 کے شروع میں شائع ہو گیا۔ اس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں ڈاکٹر ملک راج آنند، احمد علی اور ڈاکٹر عبدالعلیم تین ایسے آدمی تھے جو لکھنؤ میں رہتے تھے۔ (آنند کا مرکز بھی لکھنؤ تھا، حالانکہ ان کا قیام کسی ایک جگہ پر مستقل نہیں تھا۔) علیم کے ذمہ منیجری کا کام بھی تھا۔ یہ پہلا نمبر بہت خوبصورت چھپا تھا۔ اس کی طباعت الہ آباد کے لا جرنل پریس میں ہوئی تھی جو ملک میں انگریزی چھپائی کے بہترین پریسوں میں سے ایک ہے۔

اس میں چار مقالے تھے۔ بنگال کے سدھیندر ناتھ دت کا مقالہ بنگالی ادب پر، علیم کا ہندستانی زبان کے مسئلہ پر، آنند کا مقالہ ترقی پسند مصنّفین کی تحریک پر اور ڈی۔ پی۔ مکھرجی کا مضمون جدید بنگالی مصوری پر۔ افسانوں میں منشی پریم چند کی کہانی ''کفن'' کا ترجمہ جو احمد علی نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کیا تھا، شائع ہوا تھا۔ سدھن دت اور آنند کے مقالے ان کے وہ صدارتی خطبے تھے جو انجمن کی دوسری کانفرنس میں (جو دسمبر 1938 میں کلکتہ میں منعقد ہوئی تھی) پڑھے گئے تھے۔ ان کے علاوہ کتابوں پر تبصرے، انجمن کا اعلان نامہ اور اس کا نیا دستور العمل بھی اس میں شامل کیے گئے تھے۔

رسالے کے اس پہلے شمارے کی ملک کے انگریزی داں ادبی حلقوں میں کافی شہرت ہوئی، اس لیے کہ اتنے اونچے اور اچھے معیار کا اور اتنا دیدہ زیب رسالہ انگریزی میں اس وقت تک ملک بھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ لیکن اس میں کئی خرابیاں بھی تھیں، جن کا اس وقت ہمیں مبہم سا احساس ہوا تھا، لیکن اب جو بالکل صاف نظر آتی ہیں۔ رسالے کے معیار کو بلند کرنے کی فکر میں ہم نے اس بات کو اچھی طرح ذہن میں نہیں رکھا کہ ہمارے ملک کے انگریزی داں لوگوں کی بڑی تعداد ادبی تنقید اور آرٹ کی ان موشگافیوں میں بہت کم دلچسپی رکھتی ہے جو یورپی دانشوروں کے تہذیبی حلقوں یا خود ہمارے ملک کے بہت تھوڑے سے انگریزی دانوں میں عام ہیں۔ اگر ہمیں کلچر کے

ان مسائل سے بحث بھی کرنا ہے تو ہمیں وہ بہت سیدھے سادے اور عام فہم انداز میں کرنا ہوگی۔ ایسا انداز جو مثلاً ہماری یونیورسٹیوں کے طلبا، ٹیچروں اور جرنلسٹوں وغیرہ کی بخوبی سمجھ میں آئے۔ ہم اپنے مضامین اور مقالوں میں یورپ کی ادبی تحریکوں اور ادیبوں کا ذکر کرتے ہیں، اور زیادہ تر ہمارے پڑھنے والے ایسے ہوتے ہیں جو بمشکل ان ناموں سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ ان تحریکوں یا ادیبوں کے فنی تصورات یا اثرات سے واقفیت تو در کنار، یہ کوئی شرمندہ ہونے کی بات نہیں ہے۔ ایک ہندستانی پڑھے لکھے آدمی کے لیے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ وہ یورپی تہذیب کے تفصیلی مسائل سے واقفیت رکھتا ہو۔ لیکن چونکہ اپنی لیاقت کو درحقیقت کہ وہ جتنی ہے اس سے زیادہ ظاہر کرنا اور چند ایسے ناموں کا تذکرہ کرنا جس سے سننے یا پڑھنے والے پر رعب پڑے، انگریزی داں پڑھے لکھوں کی آج کل ایک عام کمزوری ہے۔ اس لیے کسی کو ایسے مضامین پر ٹو کنے کی، جس میں اس قسم کے غیر معروف حوالے اور اشارے ہوں، انھیں ہمت نہیں ہوتی۔ لوگ ڈرتے ہیں کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو اس سے ان کی کم علمی کھل جائے گی اور ان کے مصنوعی ادبی وقار کو بٹّہ لگے گا۔ لیکن ایک مقبول عام رسالہ نکالنے والوں کو لوگوں کی اس کمزوری کو مدنظر رکھنا چاہیے اور یہ جاننا چاہیے کہ چاہے لوگ گنجلگ یا مشکل یا غیر معروف مضمون یا طرز تحریر سے مرعوب ہوکر اس پر اعلانیہ اعتراض نہ کریں...... لیکن وہ ایسی چیزیں پڑھیں گے بھی نہیں اور خریدیں گے تو ہرگز نہیں۔ اس قسم کے مضامین شائع کرنے والے رسالہ کا ایک نمبر خرید بھی لیں تو دوسرا کبھی نہ لیں گے۔

ہم نے اس بات کا اپنے رسالے میں کافی خیال نہیں کیا تھا۔ اس میں دو بڑے مقالے (خاص طور پر سدھین دت اور ڈی۔ پی۔ مکرجی کا) سلیس اور عام فہم نہیں تھے۔ لیکن وہ اتنے گہرے بھی نہیں تھے جن کے لیے مشکل ہونا ناگزیر ہو۔ ان میں ایک طرح کی مصنوعی موشگافی تھی اور سچے اور مخلصانہ تصورات کا عنصر کم تھا۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے تھی کہ ہمارے رسالے میں تہذیبی مسائل اور ادبی تنقید پر جو مضامین ہوں، وہ صاف اور عام فہم ہوں اور ان کا پس منظر، ان کے اشارے اور حوالے زیادہ تر ہندستانی تہذیب اور ہمارے موجودہ کلچرل مسائل سے لیے گئے ہوں اور اگر بیرونی ادب یا تہذیب کے حوالے ہوں تو انھیں وضاحت سے بیان کیا گیا ہو۔

یہ خامیاں ایسی نہیں جنھیں آسانی سے دور کیا جا سکتا۔ سہل اور دلچسپ نئے اور اچھے اور

اپنے وطن اور عصر حاضر کی ترقی پذیر روح سے مملوتحریر اور وہ بھی ایک بیرونی انگریزی زبان میں غیر معمولی ذہانت اور صلاحیت کا مطالبہ کرتی ہے۔خود ملک راج آنند کی تحریروں میں ہمیں بعض مرتبہ یہ خاص بات محسوس ہوتی ہے (حالانکہ وہ انگریزی زبان پر قدرت رکھتے ہیں) کہ جیسے وہ ہمارے لیے نہیں بلکہ یورپی پبلک کے لیے لکھ رہے ہیں۔ان کے موضوع ہندستانی ہوتے ہیں۔لیکن ان کے ناول پڑھتے وقت کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کے مخاطب خود ان کی قوم کے لوگ نہیں بلکہ ایسے انگریز ہیں، جن کا مقصد ہندستانی زندگی کی حقیقت سے واقفیت اور اس سے ہمدردی نہیں بلکہ اس کے عجوبہ پن سے اپنے تماشہ دیکھنے کے جذبے کو تسکین دینا ہے۔ یہ رجحان احمد علی کے انگریزی ناول ''ٹوائی لائٹ اِن دہلی'' (دہلی کی شام) میں بھی نمایاں ہے۔

رسالہ کا دوسرا نمبر پہلے سے بہتر تھا اور اب اس کی بِکری سے جو رقم وصول ہوتی تھی، وہ بھی منیجر تک تھوڑی بہت پہنچنے لگی تھی۔انجمن کی شاخیں رسالے کی کاپیاں آرڈر کرتیں، لیکن رسالے کی فروخت ہماری اُمید کے مقابلے میں کم تھی۔ پھر بھی منافع نہ سہی، اگلا نمبر شائع کرنے کے لیے روپیہ کی کمی نہ تھی، اور مستقبل اگرچہ ہماری ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی امیدوں کے مطابق نہ بھی تھا، لیکن خوش آئند تھا۔سارے ملک کی انجمنیں ہم کو یہی بتا رہی تھیں کہ رسالے کی مدد سے ان کو اپنی تحریک کو بڑھانے اور اس کے نئے ہمدرد اور معاون پیدا کرنے میں بڑی مدد مل رہی ہے۔

لیکن پے در پے چند ایسے واقعات ہوئے جن کی وجہ سے ہمارے منصوبوں کو بار آور ہونے کا موقع نہ ملا، اور ایک بار پھر ہمیں اس کڑوی حقیقت کا تجربہ کرنا پڑا کہ ترقی کی راہ سیدھی، مسطح اور برابر اوپر کو اُٹھی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ غیر متوقع اور غیر معمولی رکاوٹیں اور نقصانات کبھی کبھی ہمیں نیچے ڈھکیل دیتے ہیں۔تاریک اور پیچیدہ پگڈنڈیوں سے گزر کر ہی ہم بلندی کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔کامیابی کی منزل تک وہی پہنچتے ہیں جو ٹیڑھے میڑھے، صعوبت سے بھرے ہوئے راہگزر پر بھی قدم بڑھانے کی ہمت رکھتے ہیں۔

پہلے تو ہمارے تین آدمیوں (آنند، احمد علی، اور علیم) کے ایڈیٹوریل بورڈ میں گڑبڑ ہوئی۔ احمد علی اس بات پر ناراض تھے کہ ملک راج آنند کیوں رفتہ رفتہ کر کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ وہ آنند کے ساتھ مل کر کام نہیں کر سکتے تھے۔ان کی کشیدگی بڑھتی ہی گئی اور آخر کار رسالے کے تمام کاموں سے احمد علی نے ہاتھ کھینچ لیا۔تقریباً ہم خیال دو لوگوں کی یہ رقابت اور

کشیدگی اس وقت میرے لیے ایک نئی چیز تھی۔ بعد میں مجھے اس کا کافی تجربہ ہوا۔ میری چونکہ دونوں سے ذاتی دوستی بھی تھی، اس لیے میں نے باہمی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر احمد علی رسالے کے لیے کام کرنے کے واسطے تیار نہیں ہوئے۔ پھر بھی آنند علیم کے ساتھ مل کر کام چلا سکتے تھے، اور چلا رہے تھے۔ لیکن 1939 کے وسط میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اپنی کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں ان کو چند مہینوں کے لیے انگلستان جانا ضروری ہے۔ ان کے اس وعدے پر کہ وہ یقینی طور پر تین مہینے بعد واپس آجائیں گے، ہم ان کے جانے پر راضی ہو گئے۔ انھوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ انگلستان سے بھی ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ بہرصورت ہم رسالہ کا تیسرا نمبر نکال سکتے تھے۔ بشرطیکہ میں یا کوئی دوسرا شخص علیم کی مدد کرتا۔

اب ایک بہت بڑی مصیبت ہمارے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ ستمبر 1939 میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوگئی۔ آنند کا انگلستان سے واپس آنا ناممکن ہوگیا۔ کاغذ کمیاب ہوگیا۔ چھپائی کا نرخ بڑھ گیا۔ کانگریس کی وزارتیں ٹوٹ گئیں۔ پریس کے قوانین سخت کردیے گیے تھے۔ تمام آزادی خواہوں اور ترقی پسندوں کی رفتہ رفتہ گرفتاریاں بھی شروع ہوگئیں۔ جن لوگوں سے ہمیں مالی امداد ملتی تھی، ان میں سے بھی کئی طرح طرح کی پریشانیوں میں پھنس گئے۔ پھر بھی ان باتوں کے باوجود رسالے کو جاری رکھا جاسکتا تھا گو کہ اس کی اشاعت دیر سے ہوتی۔ لیکن 1940 میں علیم اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی گرفتاری نے اسے بالکل ناممکن بنادیا۔

دوسری عالمگیر جنگ کی سیاہ آندھی یورپ سے اُٹھ کر رفتہ رفتہ دنیا کے ہر کونے اور زندگی کے ہر گوشے میں تاریکی اور اندوہ پھیلا رہی تھی۔ تہذیب اور ادب کی شمعیں ایک ایک کرکے گل ہوتی جارہی تھیں۔ ہماری تحریک کے ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے......اور زیادہ مشکل دور کا آغاز تھا۔

ooo

دُوسری کُل ہند کانفرنس 1938

دسمبر 1938 کے آخری ہفتہ میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی دوسری کل ہند کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس ہماری پہلی کانفرنس کے کوئی پونے تین سال بعد ہو رہی تھی اور دونوں میں کتنا فرق تھا! یہ فرق ظاہر کرتا تھا کہ ڈھائی سال میں ہماری تحریک نے کتنی ترقی کی۔

لکھنؤ کانفرنس کی نمایاں خصوصیت اس کی بے سروسامانی تھی۔ چند نوجوانوں میں جوش اور ہمت کی فراوانی، چند ممتاز ادیبوں اور ملک کی معزز ہستیوں نے ہماری تحریک کی سرپرستی کی تھی۔ اس کانفرنس کا کارنامہ نئے ترقی پسند ادبی مقاصد کا بہت وسیع اور عام لفظوں میں بآوازِ بلند اعلان اور اس خواہش کا اظہار کرنا تھا کہ اب محبّ وطن ادیبوں کو اپنی کاوشوں کا سب سے اہم مقصد عوام اور سماج کی آزادی، فلاح اور بہبود کے مسائل کو بنانا چاہیے۔ ادیبوں کو آزادی اور ترقی کی اس عوامی رَو کا ایک جز و اور ایک حصہ بننا چاہیے، اور اس سے ہم آہنگ ہونا چاہیے جو رجعت پرستی اور ہمیں غلام بنانے والی طاقتوں کے خلاف ہمارے وطن میں چل رہی تھی۔ لکھنؤ کانفرنس نے اس نئی ادبی تحریک کی تنظیم کی داغ بیل ڈالی۔

کلکتہ کانفرنس یہ ظاہر کرتی تھی کہ ملک کے بعض حصوں میں (اور بنگال تہذیبی اور ادبی لحاظ سے ملک کا سب سے آگے بڑھا ہوا علاقہ تھا) ہماری تحریک اب نیک خواہشوں اور مرتعش آرزوؤں کی فضاؤں سے گزر کر بہت سے دلوں اور دماغوں کے کشتِ زار میں ایک نئی اور تازہ فصل کی طرح

اُبھر آئی تھی۔ اور اب وہ زمین اور ہوا سے ہی نہیں بلکہ سورج کی گرم اور تیز شعاعوں سے بھی نمو کی قوت کھینچ سکتی تھی۔

کلکتہ کانفرنس ہر لحاظ سے ایک باقاعدہ کانفرنس تھی۔ ہماری بنگال کی ترقی پسند مصنّفین کی انجمن نے ڈھائی سال میں اتنا اثر اور رسوخ پیدا کر لیا تھا کہ نہ صرف کلکتہ بلکہ بنگال کے اور بھی کئی شہروں اور سلہٹ اور آسام میں انجمن کی شاخیں یا حلقے قائم ہو گئے تھے۔ کلکتہ کی ادبی زندگی خود ایک صوبے کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس زمانے میں بنگال میں خاص طور پر بائیں بازو کی جمہوری تحریکیں بہت تیزی سے پھیل رہی تھیں۔ مزدور طبقے میں ایک نئی بیداری اور ہلچل تھی۔ کسانوں میں اپنے حقوق کے لیے جدوجہد جاری تھی، اور کسان تحریک لاکھوں دیہاتی محنت کشوں کو متحرک کر رہی تھی۔ طلبا کی زبردست تنظیم قائم ہو گئی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی مدتوں کے بعد تقریباً قانونی طور سے کام کرنے لگی تھی۔ دہشت پسند نوجوان انڈمان اور دوسری جیلوں سے رہا ہو کر بڑی تعداد میں اپنے پُرانے طریقوں کو ترک کر کے مارکسی سوشلزم کی راہ اختیار کر رہے تھے۔ اس تمام جمہوری ہلچل اور تنظیم کا دانشوروں پر بھی اثر پڑ رہا تھا اور وہ بھی ترقی پسند اور مارکسی نظریوں کو قبول کرنے لگے تھے۔ بنگال میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے تیزی سے پھیلنے اور مضبوط ہونے کا بنیادی سبب یہی تھا۔ وہ وہاں کی عام جموری تحریک کا ایک حصہ تھی۔

چنانچہ ہم نے دیکھا کہ بنگالی ادب کے اکثر بڑے اور ممتاز اور مشہور لکھنے والے کانفرنس میں رکن کی یا معزز مہمان کی حیثیت سے موجود تھے، اور ہمارے لیے سب سے زیادہ اعزاز اور خوشی کی بات یہ تھی کہ رابندرناتھ ٹیگور نے کانفرنس کا افتتاح کرنا منظور کر لیا تھا۔ ڈاکٹر ٹیگور کی دلچسپی ہماری تحریک کے ساتھ روز افزوں تھی۔ حالانکہ ان کے گرد ان کے حواریوں اور چیلوں کا جو عجیب و غریب مجمع رہتا تھا، ان میں بعض ایسے تھے جو اس کی پوری کوشش کرتے تھے کہ ٹیگور ترقی پسند مصنّفین سے دور ہی رہیں۔ یہ لوگ حسبِ معمول کمیونزم کا ہوا کھڑا کر کے انھیں ہمارے خلاف کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ٹیگور کمیونزم کے بعض پہلوؤں سے اختلاف رکھتے تھے، اس زمانے میں جب کہ وہ سوویت روس کا دورہ کر کے واپس آ چکے تھے اور اپنے تاثرات کا انھوں نے کھلے بندوں

اپنی ''روسی چٹھیوں'' میں اظہار کیا تھا، اس قسم کے پروپیگنڈہ سے گھبرانے والے نہیں تھے۔ بہرحال، گو وہ اپنی ضعیفی اور علالت کی وجہ سے شانتی نکیتن (بول پور) سے چل کر کانفرنس کے لیے کلکتے نہیں آ سکے، انھوں نے اپنا افتتاحی خطبہ لکھنؤ میں ہمیں بھجوا دیا اور کانفرنس میں وہ پڑھا گیا۔

مجھے یاد ہے پہلے دن صبح کو جب کانفرنس کا اجلاس شروع ہو گیا تھا اور سارا ہال تقریباً ایک ہزار آدمیوں سے بھرا ہوا تھا، میں نے دیکھا کہ سامنے کے دروازے سے ایک دبلے پتلے بزرگ، جن کے سر کے بال اور مونچھیں سفید تھیں، اور جو اس قدر ضعیف تھے کہ انھیں دو آدمی بازوؤں سے سہارا دیے ہوئے تھے اور جن کی آنکھوں سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اچھی طرح سوجھتا نہیں ہے، آہستہ آہستہ ڈائس کی طرف آ رہے ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ لائے جا رہے ہیں، ان کو آتا دیکھ کر ڈائس پر سے جو تقریر ہو رہی تھی، بند کر دی گئی۔ ہیرن مکرجی اور کانفرنس کے دوسرے خاص کارکن تیزی سے ڈائس سے اُتر کر ان بزرگ کے استقبال کے لیے لپکے۔ جب کئی آدمیوں کی مدد سے ان کو زینوں پر چڑھا کر ڈائس پر پہنچا دیا گیا تو سارے مجمع نے انھیں دیکھا اور معاً کھڑے ہو کر اور تالیاں بجا کر ان کا استقبال کیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ بزرگ، جن کی عمر اس وقت 75 برس کے قریب رہی ہوگی، بنگال کے مشہور ناول نگار پرماتما چودھری ہیں اور ترقی پسند مصنّفین کی تحریک سے اپنی ہمدردی کا اظہار کرنے اور اسے آشیرواد دینے کے لیے اس ضعیفی کے عالم میں کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ انھوں نے چند منٹ کی تقریر بھی کی۔ ان کے علاوہ اور بھی بنگال کے معمر اور مستند ادیب کانفرنس میں موجود تھے۔ کانفرنس کی صدارتی مجلس میں ڈاکٹر جے۔ این۔ سین گپتا تھے۔ ان کی عمر کوئی پچاس پچپن کی ہوگی۔ میں ان کے بارے میں پرماتما بابو کے مقابلے میں زیادہ واقفیت رکھتا تھا۔ اس لیے کہ ان کے بڑے بیٹے لندن میں اسی زمانہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ جب میں وہاں طالب علم تھا اور ہم دونوں دوست ہم خیال بھی تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے والد کے ناولوں کا ذکر کرتے اور ہنس کر کہا کرتے تھے کہ وہ قوم پرست ''بورژوا ریفارمسٹ'' (اصلاح پسند) نظریہ رکھتے ہیں۔ ہم جو بڑے فخر سے اپنے کو مارکسی اور انقلابی کہتے تھے، اکثر اپنے باپوں کو اسی زمرہ میں شامل کرتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ کئی ''لندنی انقلابی'' وطن واپس آنے کے بعد ''بورژوا ریفارمسٹ'' کے درجے سے بھی پست درجے میں پہنچ گئے۔

کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر سدھیندر ناتھ دت تھے۔ وہ مشہور بنگالی ماہنامہ ''پریچے'' کے مدیر تھے اور بنگال کے نقادوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ کانفرنس کے اوقات کے علاوہ بھی ان سے ہمیں ملنے کا کافی موقع ملا۔ اس لیے کہ ان کا گھر اور ان کی بہت سی اچھی اچھی انگریزی اور فرانسیسی کتابوں سے بھری ہوئی لائبریری کا خوبصورت کمرہ انجمن کے کارکنوں کا مستقل اڈا تھا۔ ان کی عمر کوئی چالیس کی ہوگی اور وہ چھریرے بدن کے دراز قد اور بہت حسین آدمی تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ کیمبرج یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے ہیں اور انگریزی ادب میں بہت اچھی دست گاہ رکھتے ہیں۔ وہ شاید کافی خوشحال زمیندار تھے، اس لیے اپنی روزی کمانے کے لیے کوئی کام کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ خوش کلامی، طنزیہ گفتگو، ادب اور آرٹ، موسیقی اور مصوری سے گہرا لگاؤ ان کی زندگی کا مقصد معلوم ہوتا تھا۔ وہ بنگالی ادب کے اُس نئے رجحان سے تعلق رکھتے تھے جو رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری اور تصورات پر نکتہ چینی کرتا تھا، بنگال کے پُرانے بھگتی کے کویوں اور سنتوں (چنڈی داس وغیرہ) کو ٹیگور کے مقابلے میں زیادہ پسند کرتا تھا۔ دوسری طرف ان لوگوں پر جدید انگریزی ادیبوں میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا سب سے زیادہ اثر معلوم ہوتا تھا۔ فرانسیسی ادیبوں میں وہ فلابیئر، ورلیس، ریم بو اور سوریالسٹوں سے متاثر تھے۔ سُدھین دت نے جو مقالہ کانفرنس میں پڑھا اس پر انھوں نے ترقی پسند تحریک کی اہمیت کو اس نقطۂ نظر سے سراہا کہ وہ عوام کی ادبی روایات پر نئے ادب کی بنیاد رکھنا چاہتی تھی۔ انھوں نے اپنے اس نظریے کو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے روایت پر مبنی اور قدامت پرستی کے نظریے سے ملانے کی کوشش کی تھی۔ غرضیکہ ان کے خیالات میں رجعت پرستی اور ترقی پسندی، خوش مذاقی اور جدت پرستی کا عجیب وغریب میل تھا، اور ان کی دلچسپی ترقی پسند تحریک سے تفریحی زیادہ اور حقیقی کم معلوم ہوتی تھی۔ جب مجھے دو سال بعد یہ اطلاع ملی کہ سدھین دت ترقی پسند تحریک سے ہی نہیں، بلکہ ادبی میدان سے ہی نکل گئے ہیں اور اپنی زندگی کو لطافت اور تفریح کا مستقل ہیجان بنانے کے لیے محض حسن اور دختِ زر کی سرکار میں چاکری کو کافی سمجھتے ہیں تو مجھے افسوس ہوا۔ لیکن تعجب نہیں......

ناز پروردِ تنعّم نہ برد راہِ بدوست
عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

دوسرے ہنگامی ادیبوں میں جو کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، بدھ دیو بوس، مانک بنرجی اور تاراشنکر بنرجی مجھے خاص طور پر یاد ہیں۔ بدھ دیو بوس ایک نوجوان شاعر تھے، جو نئے طرز کی آزاد اور مغلق شاعری کرتے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ دراصل ترقی پسند نظریے کو قبول نہیں کرتے۔ لیکن اس زمانے میں کسی قدر اس کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ مجھے ان کے بارے میں یہی معلوم ہوا کہ وہ اس مکتب خیال سے تعلق رکھتے تھے جس کا مظہر اُردو میں حلقۂ ارباب ذوق کی شاعری میں ہونے والا تھا۔

مانک بنرجی بنگال کے ان نئے ناول نگاروں میں سب سے اونچا درجہ رکھتے تھے جنھوں نے مشرقی بنگال کے دیہاتی محنت کش عوام کی زندگی کو اور ان کے مسائل کو اپنے ادب کا موضوع بنایا تھا۔ ان کا ناول ''پدما کے مانجھی'' بہت مشہور ہوا تھا۔ غالبًا یہ اس قسم کا پہلا بنگالی ناول ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا تھا۔ اس کے مترجم ہیرن مکرجی ہیں۔ بعد میں مانک بنرجی بنگالی ترقی پسند ادب کی تحریک کے ایک مضبوط ستون بن گئے اور انھوں نے انجمن کو منظّم کرنے میں بھی بڑا حصہ لیا۔

تاراشنکر بنرجی کی عمر اس وقت کوئی پچاس باون برس کی ہوگی اور مجھے بتایا گیا کہ ٹیگور اور شرت چند چٹرجی کے بعد وہ بنگال کے سب سے بڑے ناول نگار ہیں۔ ان کے اس وقت تک دس بارہ ناول شائع ہو چکے تھے اور انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

اس کانفرنس میں پہلی بار میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے بھی ملا، جو کلکتہ کے مشہور اُردو اخبار روزنامہ ''ہند'' کے ایڈیٹر تھے۔ ان کی شکل، صورت، اور جثّہ ملیح آباد کے پٹھانوں کا سا تھا یعنی گول کھوپڑی، اوپر سے چپٹی، طباقی چہرہ، گٹھا ہوا گول مٹول بدن۔ مولانا عبدالرزاق سخت اور کٹر قسم کے جدید علما میں سے تھے جن کے نزدیک ایک مسلمان کے لیے اشتراکی ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں اپنے اخبار میں وہ کمیونسٹ تحریک اور سوویت روس کی پُرجوش حمایت اسلامی نقطۂ نظر سے کرتے تھے۔ ویسے ان کی عام سیاست نیشنلسٹ مسلمانوں کی تھی۔ مولانا ترقی پسند ادب کی تحریک کے حامیوں میں تھے اور کلکتہ کانفرنس کے انعقاد میں انھوں نے آگے بڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا کے اخبار کا دفتر کلکتہ کے اُردو داں ترقی پسند ادیبوں کا مرکز تھا۔

کلکتہ کانفرنس ایک اسکول کے ہال میں منعقد ہوئی تھی جو ان دنوں کرسمس کی چھٹیوں کے لیے بند تھا۔ یہ نیا بنا ہوا جدید اسٹائل کا ایک خوبصورت ہال تھا، جس کے تین طرف ایک کشادہ گیلری تھی، اور ہال اور گیلری میں کل ملا کر کوئی پانچ چھ سو آدمیوں کی گنجائش تھی۔ ڈائس کے لیے ایک کنارے پر پختہ چبوترہ تھا جس پر بیس پچیس آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ رہی ہوگی۔ کانفرنس کے ہال میں چاروں طرف بنگالی اور انگریزی میں کتبے لکھ کر لٹکا دیے گئے تھے۔ حاضرین کی تعداد پانچ چھ سو سے ڈیڑھ سو تک ہوتی تھی۔ کلکتہ کے تمام بڑے انگریزی اور بنگلہ کے روزنامہ اخباروں میں کانفرنس کی مفصل روداد اور پروگرام چھاپے جاتے تھے۔ ہمارے دشمن اور مخالف انگریز سرمایہ داروں کے اخبار ''اسٹیٹس مین'' کو بھی کانفرنس کی روداد شائع کرنی پڑی۔

ظاہر ہے کہ حاضرین اور نمائندوں میں بہت بڑی اکثریت بنگالیوں اور دوسرے غیر بنگالی مقامی لوگوں کی تھی۔ ان میں کلکتہ اور اس کے مضافات کے اُردو اور ہندی بولنے والے باشندوں کے نمائندے بھی تھے جن میں سے زیادہ تر مزدور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ کلکتہ صرف بنگالی نہیں بلکہ اُردو اور ہندی، اڑیا اور جنوبی ہندستان کے تیلگو بولنے والے محنت کشوں کا بھی شہر ہے۔ جیسے جیسے ان مزدوروں میں طبقاتی شعور اور انقلابی تحریک بڑھتی ہے، ان کے آگے بڑھے ہوئے حصے میں ستھرا ادبی شعور بھی بیدار ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ کلکتہ کے اُردو بولنے والے مزدوروں نے اس زمانے میں اپنی بستیوں میں خاص طور پر اُردو کے ان شاعروں اور ادیبوں کو سننے کے لیے کئی جلسے کیے، جو کانفرنس میں شریک ہونے آئے تھے۔ مجاز اور سردار جعفری نے ان جلسوں میں نظمیں پڑھیں۔ مجاز بہت جلد اُردو بولنے والے مزدوروں میں مقبول ہو گئے اور ان کا ترانہ...... ''شیر ہیں چلتے ہیں درّاتے ہوئے، بادلوں کی طرح منڈلاتے ہوئے، زندگی کی راگنی گاتے ہوئے، لال جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں......'' بہت جلد کلکتہ کے مزدوروں کا محبوب ترین ترانہ بن گیا۔ ہم نے بڑی خوشی سے دیکھا کہ کلکتہ کے مزدوروں کے نمائندے ہماری کانفرنس میں صرف تماشائی اور ''حاضرین'' کی حیثیت سے ہی نہیں موجود تھے، بلکہ ان کی اچھی خاصی تعداد منتظمین اور ڈیلی گیٹس کی حیثیت سے بھی کانفرنس میں حصہ لے رہی تھی۔

اس کانفرنس کے ڈیلی گیٹس میں آسام، اڑیسہ، آندھرا اور تامل ناڈو کے چند نوجوان ادیب

بھی تھے۔ گجراتی اور مرہٹی ادب کے بھی شاید چند نمائندے موجود تھے۔

ہندی کی نمائندگی کرنے والے بہار اور کلکتہ کے دو تین نوجوان تھے۔ ان کے علاوہ بلراج ساہنی اور ان کی بیوی دمینتی بھی کانفرنس میں شرکت کے لیے شانتی نکیتن سے آئے تھے۔ ان دونوں نے اس وقت تک فلمی اداکاری نہیں شروع کی تھی۔ بلراج ساہنی اس زمانے میں ٹیگور کے شانتی نکیتن میں ہندی ادب کے لکچرار تھے۔

حیدرآباد دکن میں اس وقت تک ترقی پسندوں کا حلقہ قائم ہو چکا تھا، لیکن شاید انجمن کی باقاعدہ تشکیل نہیں ہوئی تھی۔ وہاں سے سبط حسن کانفرنس میں شرکت کی غرض سے روانہ ہوئے۔ لیکن وہ لکھنؤ میں پہنچ کر کسی سبب سے وہاں اٹک گئے اور کلکتے نہیں آئے۔

پنجاب کی انجمن نے کرشن چندر کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔ وہ حضرت کانفرنس شروع ہونے کے بعد افتاں وخیزاں کانفرنس میں پہنچے۔ میں اس سے پہلے کرشن چندر سے نہیں ملا تھا اور نہ اس بات سے ہی واقف تھا کہ اس نام کا کوئی ادیب پنجاب میں ہے۔ ان کو جب دیکھا تو کافی مایوسی ہوئی۔ وہ فیض سے بھی کچھ آگے بڑھے ہوئے تھے۔ صورت شکل سے بالکل ایف۔ اے کے طالب علم معلوم ہوتے تھے۔ اس وقت ان کے سر پر بال زیادہ تھے اور بات کا صاف جواب دینے کے بجائے بہت میٹھی طرح مسکرا کر کچھ آہستہ سے منمنا دینا زیادہ پسند کرتے تھے۔ جب ہم نے پوچھا کہ پنجاب سے اور نمائندے کیوں نہیں آئے تو انھوں نے وہی جواب دیا جو ہر جگہ سے ہمیں ملتا تھا۔ یعنی کرایہ کے خرچ کی کمی، اور اس سوال کے پوچھے جانے پر اپنے بشرہ سے ظاہر کر دیا کہ لاہور جیسے دور دراز مقام سے ایک ہی آدمی کا آ جانا غنیمت سمجھنا چاہیے۔ پھر پنجاب ملک راج آنند کو اپنا ہی نمائندہ سمجھتا تھا اور وہ اس کانفرنس کی صدارتی مجلس کے رکن ہی نہیں، کافی حد تک اس کے روح رواں بھی تھے۔ بہر حال کرشن چندر نے پنجاب کی انجمن کی کارگزاریوں کی رپورٹ کانفرنس میں پیش کی۔ بعد کو بہت جرح کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ کرشن چندر خود بھی افسانہ نویس ہیں اور پنجاب کی انجمن کے نئے سکریٹری ہیں۔

لکھنؤ سے کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے ڈاکٹر عبدالعلیم، مجاز، احمد علی، علی سردار جعفری، رضیہ سجاد ظہیر، اور میں گئے تھے۔ اور بھی بہت سے لوگ جا سکتے تھے۔ لیکن ترقی پسند ادیبوں کی

مستقل دشواری ان کا افلاس ہے۔ سردار جعفری نے بڑی مشکل سے کہیں سے قرض لے کر اپنا سفر خرچ فراہم کیا۔ میری اسی ہفتے شادی ہوئی تھی اور میرے پاس کچھ روپے فاضل تھے۔ اس لیے مجاز کی کفالت ہم نے کی۔ رضیہ گو اس وقت تک ترقی پسند ادیب نہیں تھیں۔ لیکن غالباً اپنے ذہن میں انھوں نے بھی ادیب نہیں تو ترقی پسند بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہماری شادی پُرانی وضع سے اور بڑے دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ اس لیے شاید اس بدعت کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ہم دونوں نے شادی کی بہت سی رسموں اور تقریبوں کو ادھورا چھوڑ کر، اور اپنے بزرگوں کو کافی حیران اور ناراض کر کے ایک ہی ہفتے بعد کلکتہ بھاگ جانے کا فیصلہ کیا۔ رضیہ کو ان کے میکے لے جانے کے لیے ان کے بھائی اجمیر سے چل کر جب لکھنؤ اسٹیشن پر پہنچے تو انھوں نے یکا یک دیکھا کہ ان کی بہن سرخ کپڑوں میں لپٹی ہوئی کلکتہ جانے والی گاڑی کے ایک ڈیوڑھے ڈبے میں دوڑ کر سوار ہو رہی ہے اور گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم سے سرک رہی ہے۔

ہمارے کلکتہ کے رفیقوں نے ہمیں اور کانفرنس کے دوسرے ڈیلی گیٹس کو کلکتہ میں مختلف بنگالی گھرانوں میں ٹھہرانے کا اچھا خاصہ انتظام کیا تھا۔ اس لیے کلکتے میں رہنے اور کھانے پینے کا ہمیں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑا۔ مجاز سُدھین دت کے یہاں ٹھہرائے گئے تھے لیکن ان کے ساتھ یہ افتاد ہوئی کہ انھیں سونے کے لیے ایک بہت بڑا چھپر کھٹ ملا، جس پر صرف منحنی مجاز ہی کی نہیں اور بھی کئی آدمیوں کی گنجائش تھی۔ چنانچہ جگہ کی کمی کے سبب سے ڈاکٹر علیم صاحب کو بھی مع ان کی رِیش اور بزرگی کے اسی پلنگ پر رات بسر کرنے کی جگہ ملی۔ دوسرے دن مجاز ہم سے ملے تو بڑی حسرت سے اپنا ہی مصرع گنگنا رہے تھے......

جوانی کے حسیں خوابوں کی حسرتناک تعبیریں

احمد علی کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے آئے تو تھے، لیکن اب وہ شاید یہ بات بہت زیادہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ترقی پسند انجمن کے نوجوان اراکین ان کی ادبی صلاحیتوں کو نہ تو سمجھتے ہیں اور نہ ان کا کافی احترام کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک بھی تھا کہ علی سردار جعفری، سبطِ حسن، مجاز وغیرہ، جو اس زمانے میں لکھنؤ میں نوجوان ترقی پسندوں کے سب سے بلند آہنگ، ہنگامہ خیز بلکہ کسی قدر شوریدہ سر مبلغ تھے، احمد علی کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ان کے آرٹ کو بھی مشتبہ

نظروں سے دیکھتے تھے اوران کی ترقی پسندی میں خلوص اور گہرائی کی کمی پاتے تھے۔ اِدھراحمد علی اپنے مقابلے میں ان لوگوں کونو آموز اور کم علم سمجھتے تھے۔ ایسی صورت میں باہمی کشیدگی لازمی تھی۔ احمد علی چونکہ نازک مزاج زیادہ تھے، اس لیے وہ وقتاً فوقتاً روٹھ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ کلکتہ کانفرنس کے موقع پر بھی وہ ناراض ہی رہے اور بڑی بددلی کے ساتھ کانفرنس میں شریک ہوئے۔ گومیرے اوران کے ذاتی تعلقات اچھے رہے اور میں غالبًاان کے ترقی پسند دوستوں میں واحد شخص تھا جس کی تنقید وہ برداشت کرلیتے تھے۔ لیکن میں نے محسوس کرلیا کہ وہ زیادہ دن شاید ہماری تحریک سے منسلک نہ رہیں گے۔ یہ میرے لیے بڑے رنج کی بات تھی۔ اس لیے کہ میرے اچھے دوست ہونے کے علاوہ احمد علی ادبی ہنراور ذوق رکھتے تھے اوراگر وہ اُردو چھوڑ کرانگریزی میں لکھنا شروع نہ کر دیتے اور نظری طور پر انسان دوستی، حقیقت نگاری اور ترقی پسندی کی روش پر قائم رہتے ہوئے اپنے علم اور فن کو ترقی دیتے تو یقینی آج وہ ہمارے اچھے اور ممتاز ناول اور افسانہ نگاروں میں ہوتے۔

کلکتہ کانفرنس میں انجمن کے آئین میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ لکھنؤ کی پہلی کانفرنس کے موقع پر آئین کا جوخاکہ منظور ہوا تھا اس کی بنیاد پر آئین کومکمل کر کے منظور کرلیا گیا۔ آئین کو ٹھیک سے مرتب کرنے کا کام اور گزشتہ برسوں کے تجربے سے جو ترمیمیں ضروری سمجھی گئیں، انھیں لکھنے کا کام ڈاکٹرعلیم نے انجام دیا۔ ہم میں سے وہی سب سے زیادہ منطقی اور سلجھا ہوا دماغ رکھتے تھے۔

انجمن کی نئی کل ہند ایگزیکیوٹیو کمیٹی اور عہدے داروں کا بھی اس کانفرنس کے ڈیلی گیٹس نے انتخاب کیا۔ اس میں سب سے اہم تبدیلی یہ تھی کہ ڈاکٹرعلیم، سجادظہیر کے بجائے انجمن کے نئے سکریٹری چنے گئے۔ اس طرح اب گویا باقاعدہ طور پر انجمن کا مرکزی دفتر بھی الہ آباد سے لکھنؤ منتقل ہوگیا۔ ڈاکٹر ملک راج آنند نے انجمن کے مرکزی انگریزی رسالے ''نیو انڈین لٹریچر'' کو شائع کرنے کی اسکیم بھی کانفرنس سے منظور کروائی۔ اس کے اجرا اور ادارت کی ذمہ داری آنند، علیم اور احمد علی کے سپرد ہوئی اور یہ طے ہوا کہ تمام لسانی علاقوں کی انجمنیں، اس کے ایڈیٹوریل بورڈ کے لیے اپنے اپنے علاقوں سے خود ایڈیٹر مقرر کریں گی۔ بنگال سے ہیرن مکرجی

اس کے بورڈ کے لیے چنے گئے۔ (گزشتہ باب میں ہم اس رسالے کے متعلق لکھ چکے ہیں۔)

انجمن ترقی پسند مصنّفین کی دوسری کانفرنس نے ہماری تنظیم کو اور مضبوط کیا، ہم میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ خوداعتمادی اور نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق کے لیے جوش اور ولولہ پیدا کیا۔ ہمارے وطن کے مختلف زبانوں کے ادیب عام طور سے نہ صرف ملک کی دوسری زبانوں اور ان کے ادب سے ناواقف ہوتے ہیں، انھیں ایک دوسرے سے ملنے اور دوسری زبانوں کے ادیبوں سے ذاتی واقفیت حاصل کرنے کا اور بھی کم موقع ملتا ہے۔ اس کانفرنس میں ہمیں بنگال کے ادیبوں سے ملنے، ان سے گفتگو کرنے، انھیں جاننے اور پہچاننے اور ان کے خیالات کو معلوم کرنے کا موقعہ ملا۔ ڈیلی گیٹس کے اجلاس میں جب مختلف صوبوں کی رپورٹیں پڑھی گئیں تو ہمیں احساس ہوا کہ سارے ملک کی بڑی بڑی زبانوں میں ویسی ہی ہلچل اور جنبش ہے جیسی کہ ہم اپنی زبان کے ادب میں محسوس کرتے تھے۔ ہر جگہ وہی قوتیں اور محرکات، ادب میں نئی عوامی راہیں نکالنے پر ادیبوں اور دانشوروں کو آمادہ کر رہی تھیں جو ہمارے اپنے ادب میں کارفرما تھیں۔ یہ ہم سب کے لیے حوصلہ افزا چیز تھی۔ ایک ادیب کے لیے خاص طور پر جب وہ مخالف رجعتی طاقتوں کے نرغے میں گھرا ہو، اس کی نظر کا وسیع ہونا، اس کا یہ احساس کہ اس کے ساتھی اور ہم خیال اور مددگار صرف اس کے اپنے محدود حلقے میں ہی نہیں بلکہ ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں، بہت ہی مفید اور ہمت افزا چیز ہے۔ مثلاً اس کانفرنس میں مجھے بار بار اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ بنگالی کے ادیب ہم چند اُردو کے ادیبوں اور شاعروں سے اتنی گرمجوشی سے ملتے تھے، اور اچھی طرح نہ سمجھنے پر بھی مجاز اور سردار جعفری کی نظمیں اتنی توجہ اور التفات سے سنتے تھے، جیسے وہ کوئی نئی اور بیش قیمت چیز دریافت یا حاصل کر رہے ہیں۔ ایسی چیزیں جس کا پہلے انھیں کوئی علم نہ تھا لیکن جو اُن کے دل کو بھاتی تھیں، انھیں مرغوب تھیں۔ بالکل یہی کیفیت ہماری ہوتی تھی۔ جب ہم کسی مانک بنرجی، تارا شنکر سین گپتا یا کسی آسام کے شاعر، یا تیلگو کے افسانہ نویس سے ملتے تھے اور اس کی باتیں سنتے تھے، تہذیب اور کلچر کے اس صاف ماحول میں تنگ نظری، عصبیت اور فرقہ پرستی کے بادل چھٹ جاتے تھے اور انسانیت کی وحدت اور اقوام کی اخوت اور حریت کے پرچم فضا میں پھرپھراتے ہوئے سنائی دینے لگتے تھے۔ کون سی موسیقی اس سے بہتر ہے؟

لیکن اس روحانی اور نفسیاتی تسکین اور تنظیمی استحکام کے باوجود اس کانفرنس کے بعد بھی ہمیں یہ محسوس ہوا کہ جیسے اس میں کسی چیز کی کمی رہ گئی ہے۔ یہ کمی وہی تھی جو پہلے کی کانفرنسوں میں بھی محسوس ہوتی تھی۔ یعنی ادبی تحریر اور تخلیق کے مسائل پر کافی تعداد میں اچھے لکھے ہوئے مقالے جن پر ادیب آپس میں سنجیدگی سے بحثیں کریں۔ اس قسم کے جو چند مقالے کانفرنس کے لیے لکھے بھی جاتے تھے تو ان پر بحث اور تبادلۂ خیال کے لیے کافی موقع اور وقت ان کانفرنسوں میں نہیں ملتا تھا۔ مثلاً اس کانفرنس کے لیے علیم نے اُردو، ہندی، ہندستانی پر ایک مقالہ لکھ کر پڑھا لیکن اس پر تشفی بخش بحث نہ ہوسکی۔ اسی طرح سُدھین دت کے مقالے پر بھی بحث نہ ہوئی۔ غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ کھلے اجلاس کے بعد ڈیلی گیٹوں کی میٹنگوں اور کمیٹیوں کے لیے کافی وقت نہیں ملتا تھا۔ تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ ادبی کانفرنس کے لیے یا تو کم از کم ایک ہفتہ کا وقت ہونا چاہیے یا پھر یہ ہو کہ تنظیمی پالیسی اور عام تہذیبی امور پر بحث اور فیصلے کرنے کے لیے علاحدہ کانفرنس منعقد کی جائے اور ادب کے دوسرے مسائل اور مضامین پر متعلقہ ادیبوں کے چھوٹے چھوٹے اجتماع ہوں، جن میں صرف متعین موضوعات پر مقالے پہلے سے تیار ہوں اور ان کی بنیاد پر تبادلۂ خیال اور بحث کی جائے۔ مثلاً قومی زبان اور اُردو ہندی کے مسئلہ پر علاحدہ اجتماع ہو۔ اُردو کے ادیب جدید اُردو شاعری اور افسانے کے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کے لیے اپنا اجتماع کریں۔ اس طرح کے اجتماع چھوٹے ہوں اور ان کے منعقد کرنے میں زیادہ انتظام کی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ بات تو اب ثابت ہوگئی ہے کہ بڑی کانفرنسوں کے موقع پر اس قسم کا کام نہیں ہوسکتا۔ غالباً ضرورت دو قسم کی کانفرنسوں کی ہے۔ مختلف زبانوں کے لکھنے والوں کی علاحدہ صوبائی یا ایک لسانی علاقے کی کانفرنس میں ادب کے تفصیلی مسائل پر زیادہ اچھی طرح بحث اور فیصلے کیے جاسکتے ہیں۔ کل ہند کانفرنسوں میں ان لسانی کانفرنسوں اور سارے ملک کی ادبی تحریک کے تجربوں کا نچوڑ پیش ہو۔ اس کی دشواریاں اور خامیاں اور آگے بڑھنے کے ذرائع اور طریقوں پر غور کیا جائے۔ لیکن ان تمام کاموں کے لیے زیادہ مضبوط مرکزی اور مقامی شاخوں اور زیادہ محنت اور عرق ریزی کی ضرورت ہے۔

ہم اپنے اجتماعوں کی اس کمی کو بنیادی طور پر صرف اسی صورت میں پوری کر سکتے تھے جب ہمارے یہاں تنقید کا فن، اور تنقید اور خود تنقیدی کی عادت ترقی کرتی۔ جہاں تک اُردو کا تعلق ہے

میرا خیال ہے کہ ہم بڑی حد تک اس کمی کو دور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اُردو کے ترقی پسند مصنّفین کی جو کانفرنسیں حیدرآباد (دکن) اور لکھنؤ میں 1945 اور 1947 میں ہوئیں۔ ان میں اچھے مقالوں کی کمی نہ تھی۔ ادب کی مختلف اصناف اور زبان کے مختلف مسائل پر ترقی پسند نقادوں نے مقالے لکھے جن میں سے چند بڑی محنت اور خوبی سے لکھے گئے تھے۔ اب ہمارے سامنے ایک دوسری مشکل کھڑی ہو گئی۔ مقالے زیادہ تھے اور ان پر بحث کا وقت کم! پھر یہ کہ اچھی تقریر کے مقابلہ میں لکھا ہوا مضمون پڑھنا غیر دلچسپ ہوتا ہے، اور لوگ انھیں سننے سے اکتانے لگتے ہیں۔ خاص طور پر دقیق علمی موضوعات پر مقالے عام سننے والوں کے لیے ایک مصیبت بن جاتے ہیں۔ ادھر ان کا لکھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی محنت اکارت جا رہی ہے۔ لیکن اگر موضوعات کی اہمیت اور دلچسپی اور وقت کا پہلے سے صحیح اندازہ کر لیا جائے تو یہ مشکلیں رفع ہو سکتی ہیں۔ تمام مقالوں کو پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، وہ چھاپ کر پہلے سے تقسیم کیے جا سکتے ہیں اور جیسا کہ دوسری علمی کانفرنسوں میں ہوتا ہے، ایک مجموعہ کی شکل میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ بحث طلب موضوعات پر ہمارے رسالوں میں تحریری بحث اور تنقید کی جا سکتی ہے۔

1938 کی گرمیوں میں (غالباً جون کا مہینہ تھا) ہم نے فرید آباد (ضلع گڑگاؤں) میں ترقی پسند مصنّفین کی طرف سے ایک کانفرنس منعقد کی، جو ہماری تمام دوسری کانفرنسوں سے مختلف تھی، اور جو شاید اپنی نوعیت کی ہمارے ملک میں پہلی کانفرنس تھی۔ یہ دہلی کے اطراف، یو۔ پی اور پنجاب کے ہندستانی بولنے والے دیہاتی علاقے کے شاعروں اور کویوں کی کانفرنس تھی جو برج بھاشا یا ہریانی میں کویتا لکھتے تھے۔ اس کانفرنس کو منعقد کرنے کا خیال سید مطلبی فرید آبادی کا تھا۔

ترقی پسند مصنّفین کی تحریک میں سیّد مطلبی کی ایک نمایاں اور منفرد حیثیت ہے اور وہ بڑی دلکش اور دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔ سیّد مطلبی دہلی کے مضافی قصبہ فرید آباد کے ایک مشہور اور ممتاز سیدوں کے خاندان کے ایک فرد ہیں، ایک ایسا خاندان جو اپنی شرافت دینی اور ادبی تبحر اور علمیت کے لیے دہلی کے نواح میں احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن اس شرافت اور افتخار کا سبب محض علم اور ہنرمندی نہیں تھی۔ اس کی مادی بنیاد عہد مغلیہ کی جاگیریں اور نوابیاں تھیں۔ انگیزوں نے بہت سی ان جاگیروں کو ختم کیا۔ کئی نئی نوآبادیاں قائم کیں اور بہت ساری پہلی شان و

شوکت کے ساتھ نہ سہی، لیکن لٹی پٹی حالت میں قائم رکھیں۔ جو زمانہ گزرنے پر عام ابتری اور مفلوک الحالی کی شکار ہوتی گئیں۔ سید مطلبی کا خاندان مؤخر الذکر زمرے میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ وہ کھاتے پیتے اور تعلیم یافتہ گھرانے کے تھے۔ لیکن اس گھرانے کی امارت ختم ہو چکی تھی۔ فرید آباد میں ان کی قدیم، بلند اور بڑی لیکن بوسیدہ حویلی کو دیکھ کر اس کا اندازہ ہوتا تھا۔ عام طور سے ایسے خاندان کے افراد اپنی پُرانی امارت اور بری قسمت کا رونا روتے رہتے ہیں۔ معدودے چند کو چھوڑ کر زیادہ تر جاہل ہوتے ہیں اور انھیں اس کا قطعی شعور نہیں ہوتا کہ جس نظام کے وہ پروردہ ہیں، اگر اس میں کبھی کوئی خوبیاں بھی تھیں، تو اب اس کے دن بیت چکے ہیں اور اب دیہاتی محنت کشوں کے استحصال پر مٹھی بھر لوگ عیش نہیں کر سکتے۔ اس قسم کے بگڑے نواب زادوں کو تو اگر اب بھی موقع مل جائے تو کسانوں سے بدسلوکی اور ان پر ظلم کرنا وہ اپنا پیدائشی اور فطری حق سمجھتے ہیں۔

سیّد مطلبی کا کارنامہ یہ ہے کہ ایسے قدامت پرست ماحول کا ایک فرد ہوتے ہوئے انھوں نے اس کے ذہنی اور نفسیاتی شکنجے کو توڑ دیا۔ یہ ایک ایسا شکنجہ ہے جو اب صرف اپنے قیدیوں کو تساہلی، تعصب اور تنگ نظری کا شکار بنا کر زندگی کے نئے تقاضوں سے دور اور دلوں کو مردہ کر دیتا ہے، اور تنزل اور ترقی کی جدوجہد میں ہمیشہ ان قدامت کے غلاموں اور مٹے ہوئے ماضی کا خواب دیکھنے والوں کو غلط اور زوال پذیر سمتوں کی طرف لے جاتا ہے۔ سیّد مطلبی کو دیہات کی زندگی اور دیہات کے لوگوں سے والہانہ محبت ہے اور وہ اپنے گاؤں اور اس کے اطراف کے رہنے والے کسانوں، دیہاتی مزدوروں، بڑے چھوٹے زمینداروں، بنیوں اور بیوپاریوں، پڑھے لکھے وکیلوں، پنڈتوں، منشیوں اور مولویوں، غرض گاؤں کے ہر طبقے اور ہر گروہ کی خوبیوں اور کمزوریوں، ان کی عادات اور رسموں، ان کے سوچنے کے انداز اور کام کرنے کے ڈھنگ سے ایسے واقف ہیں، جیسے کوئی مچھلی تالاب سے۔ زندگی کے طویل اور گوناگوں تجربوں کے بعد چالیس سال کی عمر کے قریب سیّد صاحب نے اپنے کو دل و جان سے دیہات کے محنت کشوں کے مفاد سے وابستہ کر دیا۔ گڑگاؤں، الور اور بھرت پور کے میو کسانوں کے وہ گویا گوشت پوست بن گئے، اور ان پر ہونے والے ریاستی اور حکومتی مظالم اور دست بُرد کے خلاف ہمیشہ آگے بڑھ کر جدوجہد کرتے رہے۔ بعد کو انھوں نے اپنے ضلع گڑگاؤں اور حصار میں کسان تحریک کو منظّم کرنے اور

ایک مضبوط بائیں بازو کی تشکیل میں حصہ لیا۔ اپنے اسی کام کے سلسلہ میں انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ہمارا موجودہ مروجہ اُردو یا ہندی ادب دیہاتی محنت کش عوام کی نفسیاتی، ذہنی اور جمالیاتی تسکین نہیں کرسکتا اور اگر ہمیں انھیں متحرک کرنا ہے تو ان کی ہی مقامی بولیوں میں اور ان کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے لیے ادب تیار کرنا ہوگا۔

ہمارے ملک میں جدید شہری تمدن نے ابھی تک مغرب کے اکثر ملکوں کی طرح جنتا کے دیہاتی گانوں، کویتاؤں، سوانگوں اور ناچوں کی زندگی اور متحرک روایت کو ختم نہیں کیا ہے۔ عوامی تہذیب کی ان تخلیقوں میں دیہاتی زندگی کا رس اور حسن، دیہاتی محنت کشوں کے ذہن کی قدامت پرستی کے ساتھ ساتھ اس کا ٹھوس حقیقتوں سے لگاؤ جھلکتا ہے۔ ان میں قسمت (یا کرم) پر عقیدے کے ساتھ ساتھ سچائی اور پاکیزگی اور اخلاق کے بلند اصولوں پر ثابت قدمی نظر آتی ہے۔ ان میں اگر ایک طرف گروپ بندی اور فرقہ پرستی کے دقیانوسی رجحانات نظر آتے ہیں تو دوسری طرف کسان عوام میں نئے انقلابی خیالات اور کسان اتحاد، تنظیم اور جدوجہد کے حوصلے بھی بڑھتے اور پھیلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں جاگیری اور سامراجی استحصال اور لوٹ سے رہائی اور ایک آزاد اور خوشحال دیہاتی سماج کا خاکہ ذہنوں میں ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔

سیّد مطلبی سے ملنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے دیہات میں پُرانی، ٹھہری ہوئی زندگی کی سطحوں پر جدید قوتوں اور اثرات کے سبب سے جو نئی حرکت اور آویزش ہے وہ اس کا مجسمہ ہیں۔ وہ اپنے دیہاتی علاقے کی زندگی کے ہر پہلو اور گوشے سے واقف ہیں اور اس کی زندہ روح ان میں رچی ہوئی ہے۔

ہمارے ملک میں کسان تحریک کے رہنماؤں اور کارکنوں میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو سیّد مطلبی کے مقابلے میں تنظیمی صلاحیت زیادہ رکھتے ہیں، جن کا سیاسی شعور ان سے زیادہ گہرا ہے، جن کو کسان جدوجہد کا زیادہ وسیع اور عملی تجربہ ہے۔ لیکن دیہات کے محنت کش عوام اور وہاں کے دوسرے رہنے والوں کی نفسیاتی کیفیت، ان کا مزاج، ان کی روایات، ان کی اچھی خصلتیں اور ان کی کمزوریاں سمجھنے میں اور محنت کشوں کے ساتھ غیر معمولی لگاؤ، ان سے محبت کرنے میں شاید ہی کوئی سید صاحب کی برابری کرسکتا ہے اور چونکہ وہ نہایت ستھرا اور لطیف ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں،

ہماری جدید ادبی تحریک میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے گاؤں کی زندگی کو سچائی، حسن اور ترقی پسندی کے ساتھ شعر اور نظم کے پیرایہ میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ وہ جس علاقے کے رہنے والے ہیں، وہاں کی زبان ہریانی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اسی زبان میں ایک منظوم ڈرامہ ''کسان رُت'' لکھا جس میں اُردو اور ہریانی کو ملا کر (جو نہایت فطری معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ اُردو کی بنیاد بھی کھڑی بولی ہے، جو ہریانی کی طرح کی اور اس کے پاس کے علاقے کی ہی بولی ہے) ایسی زبان استعمال کی گئی ہے جس میں دیہاتی بولی کے الفاظ اور محاورے اسے نہ صرف اس علاقے کے دیہی باشندوں کے لیے قابل فہم بناتے ہیں، بلکہ اس میں ایک دلکش اور دل نشیں تاثر اور زور بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ بعد میں اسی زبان میں سید صاحب نے سیاسی اور سماجی موضوعات پر اور بھی کئی عمدہ اور اچھوتی نظمیں لکھیں۔ خالص اُردو زبان میں بھی سیّد صاحب کی نظموں سے دیہات کی زمین کی سوندھی خوشبو آتی ہے۔ ٹھیٹھ الفاظ اور گٹھے ہوئے دیہاتی محاورے استعمال کر کے وہ اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ عوامی زندگی اور بولی سے قریبی تعلق رکھنے سے ہی ہمارے ادب کو ہمیشہ نیا اور صاف خون مل سکتا ہے، وہ جھوٹے اور بے اثر تصنع سے پاک ہو سکتی ہے اور اس کے الفاظ کے ذخیرے اور تراش خراش میں سلاست اور عام فہمی کی خصوصیت کو باقی رکھتے ہوئے اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

فرید آباد کے دیہاتی شاعروں کی کانفرنس میں سید مطلبی نے متھرا، گڑگاؤں، روہتک اور دہلی کے نواح کے ان دیہاتی شاعروں کو جمع کیا جو ان اضلاع کی سیاسی اور کسانی تحریک سے منسلک تھے اور جو انھیں عوامی تحریکوں سے متاثر ہو کر کویتا لکھتے تھے۔ اس اجتماع کے کرنے میں انھوں نے خود اپنے اور اپنے اطراف کے اضلاع کے سیاسی راہ نماؤں سے مدد حاصل کی۔ متھرا کے حکیم برج لال متھرا کے گرام کویوں کو جمع کر کے لے آئے۔ دہلی کے بائیں بازو کے سیاسی لیڈر بہال سنگھ نے دہلی کے اطراف کے گرام کوی جمع کیے۔ انھیں صاحبوں نے کانفرنس کے اخراجات کے لیے بھی سیّد صاحب کے ساتھ مل کر تین چار سو روپے جمع کیے۔

اس کانفرنس میں اُن کوِیوں کے شرکا فرید آباد اور نواحی ضلعوں کے کوئی چار پانچ سو کسان تھے۔ شہریوں میں انجمن کے مرکز کی طرف سے احمد علی اور میں، دہلی کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چند

اساتذہ اور طلبا اور دہلی کے آس پاس کے شہروں اور قصبوں کے دس پانچ سیاسی کارکن تھے۔اس کی فضا ایک کسان کانفرنس کی تھی۔سید مطلبی کے خاندان کی حویلی کے ایک کشادہ احاطے میں کسان زمین پر بیٹھے تھے۔چار چھ تختوں کو ایک کنارے پر رکھ کر ڈائس بنا دیا گیا تھا۔کانفرنس کوئی چار بجے شام سے شروع ہوتی تھی اور رات کو دیر تک جاری رہتی تھی۔اس وقت تک کسان کانفرنسوں اور ادبی کانفرنسوں اور سیاسی جلسوں میں شریک ہونے اور حصہ لینے کی میری عادت کافی ہوگئی تھی۔ لیکن یہ کانفرنس ان سب سے مختلف تھی۔سید مطلبی کے پاس تمام کوِیوں کی جو وہاں موجود تھے، فہرست تھی۔ وہ ان کے نام لے لے کر پکارتے۔ نیچے سے ایک کسان کھدر کی دھوتی، کُرتا پہنے، جھینپتا ہوا اُٹھتا، اس کے ساتھ دو تین آدمی اور ہوتے۔کوی عام طور سے ایک تارا بجا کر اور گا کر اپنی کویتا سناتا۔اس کے ساتھی ڈھولک بجاتے۔ عام طور سے بیچ بیچ میں رک کر چند منٹ کے لیے تقریر بھی کرتا، جب وہ اپنی کویتا کے معنی سمجھاتا یا جس واقعہ سے وہ متعلق ہوتی، اس پر تبصرہ کرتا۔ گانے کے وہی پُرانے طرز تھے جو صدیوں سے ہمارے دیہات میں رائج ہیں۔ بارہ ماسا، چوماسا، بھجن، ہولی برج دیس کی وہ دلکش طرز جنھوں نے ہماری ساری موسیقی اور ادب پر اپنا اثر ڈالا ہے۔لیکن کویتاؤں اور گانوں کے موضوع سب جدید سیاسی اور سماجی تھے۔ سیاسی تحریکوں میں لوگوں کا جیل جانا، آزادی کے لیے بھگت سنگھ کا پھانسی کے تختہ پر چڑھ جانا، بڑے راجاؤں، نوابوں اور جاگیرداروں اور سودخور بنیوں کے ہاتھوں کسانوں کی لوٹ، لیڈروں کے بڑے بڑے وعدے کرنا، ووٹ لینے کے لیے جھوٹ بولنا اور پھر انھیں بھلا دینا، وغیرہ۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شاعر نے سب کو اتنا متاثر کیا تھا کہ سارا مجمع رونے لگا تھا۔اس نے ایک طویل نظم سنائی تھی جو شہید بھگت سنگھ کی ماں اور اس کی بہن کی زبان میں اپنے چہیتے لڑکے اور بھائی کے متعلق تھی۔

اس کا بھولا بچپن، اس کی جوانی، اس کی انقلابی جدوجہد، اس کی پھانسی اور اس کی لاش کا بھی اس کے رشتہ داروں کو نہ دیا جانا...... ماں اور بہن کا بین...... آخر میں بیکنٹھ سے بھگت سنگھ کی آواز کا آنا کہ میرے مرنے پر کوئی آنسو نہ بہائے۔ وطن کے لیے جان دینے والے کبھی نہیں مرتے۔ وہ تو دیس کے ہر اس نوجوان کے دل میں زندہ رہتے ہیں جو آزادی کے سپاہی ہوتے ہیں۔ برج کے ایک کوی سواتکی شرما نے کئی نظمیں گا کر سنائیں، جن میں حیرت انگیز طنز اور حسنِ

بیان کے ساتھ رسیلی برج بھاشا میں دیہات کے کسانوں کی اصلی حالت کا نقشہ تھا۔ گزشتہ بیس پچیس سال میں آزادی کی جدوجہد کی تاریخ تھی اور ساتھ ساتھ اس کی کمزوریوں اور خامیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ سید مطلبی نے بھی اپنی کتاب ''کسان رُت'' میں سے کویتا پڑھ کر سنائیں۔

یہ میرے لیے بالکل ایک نیا تجربہ تھا۔ یہ تھے ہمارے دیس کے اسّی فیصدی باشندے...... خاص اس دیس اور علاقے کے جہاں سے اُردو زبان نکلی ہے۔ لیکن یہیں پر اگر اُردو کی نظمیں پڑھی جاتیں تو قطعی بے کار اور بے اثر ہوتیں۔ جامعہ ملیہ کے ایک صاحب نے حبِ وطن پر ایک اُردو نظم سنائی تھی جو کافی سہل زبان میں لکھی ہوئی تھی۔ لیکن وہ اس مجمع کے جذبات کو چھو تک نہیں سکی۔ غالباً اگر جدید سنکرت آمیز ہندی کی کوئی کویتا بھی یہاں سنائی جاتی تو اس کا بھی یہی حشر ہوتا۔

دوسری طرف دیہات کے تھوڑا بہت پڑھے ہوئے کسان اپنی ذہانت اور ہمارے دیہات کی قدیم، زندہ اور خوبصورت روایتی گانوں، بھجنوں وغیرہ کی بنیاد پر نئے ترقی پسند خیالات اور تجربوں کو دیہاتی عوام کے سامنے پیش کر رہے تھے، جس سے ان کو جمالیاتی حظ بھی ہوتا تھا، جو ان کی موجودہ زندگی اور مسائل کا بہترین شعور ان کو عطا کرتے تھے اور سماجی جدوجہد میں ان کے جذبات کو صحیح طریقے سے ابھارتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ ان گانوں اور طویل کویتاؤں میں خامیاں اور کھردرا پن نہیں تھا یا ان میں کم علمی کی نشانیاں نہیں تھیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند مصنّفین کو اگر اپنے ملک کی اکثریت یعنی دیہاتی عوام کے لیے بھی ادب تیار کرنا ہے، انھیں بھی محظوظ کرنا ہے، انھیں نئے خیالات سے متعارف کرانا ہے، ان کی توہم پرستیوں کے خلاف لڑنا ہے، دیہات میں رجعت پرست اثرات کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے اور انھیں نئی زندگی کی جانب بڑھانے کے واسطے متحرک کرنا ہے تو اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ ان کی زبان اور ان کی روایت اور ثقافت کی بنیاد پر ہی ان کے لیے نیا ترقی پسند ادب تیار کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ شہر کا رہنے والا ہر ترقی پسند ادیب یہ کام نہیں کر سکتا۔ بیشتر اس قسم کا ادب وہی مصنف تیار کریں گے جو خود دیہات کے ہیں، وہاں کی زبان کو جانتے ہیں، وہاں کے طرز پر عبور رکھتے ہیں یا عبور رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جو کام جسے آتا ہے، اور جس بات کی جو شخص سب سے زیادہ

صلاحیت رکھتا ہے، اسے وہی کرنا چاہیے۔ خوشی کی بات ہے کہ کسان تحریک کے پھیلنے اور مضبوط ہونے کے ساتھ ترقی پسند ادبی تحریک نے دیہات کے کویوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹنا شروع کر دیا ہے۔ تقریباً ہر ضلع اور علاقے کی کسان تحریک کے کوی بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کی تنظیم ہو، ان کی تعلیم کی جائے، ان کی لکھی ہوئی چیزوں کو چھپوانے میں ان کی مدد کی جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ شہر کے اور دیہات کے ادیب ایک دوسرے سے ملیں جلیں، ایک دوسرے سے سیکھیں، ایک دوسرے کے تجربے اور ہنر کو اپنے مخصوص فن میں شامل کر کے اسے زیادہ اچھا اور پُرتاثیر بنائیں۔ ترقی پسند مصنّفین کی تحریک اسی طرح صحیح معنوں میں عوامی ادب کی ہمہ گیر تحریک بن سکتی ہے۔ فرید آباد کے دیہاتی شاعروں کی کانفرنس اس سمت کو پہلا قدم تھی۔ احمد علی نے اس کانفرنس کی بہت اچھی اور مفصل رپورٹ انگریزی میں لکھی جس میں کانفرنس میں شریک ہونے والے کویوں کی نظموں کے ترجمے بھی دیے گئے تھے۔ یہ رپورٹ مدراس کے ترقی پسند سیاسی ماہنامہ ''نیو ایرا'' میں شائع ہوئی۔ کئی سال بعد جب رجنی پامدت کی مشہور کتاب ''ماڈرن انڈیا'' شائع ہوئی تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اس کا وہ باب جو ہندستان کی زرعی زندگی کے متعلق ہے، برج کے شاعر سواتکی شرما کی نظم کے ایک بند سے شروع ہوتا ہے، جو فرید آباد کی کانفرنس میں پڑھی گئی تھی اور جس کا احمد علی کا کیا ہوا انگریزی ترجمہ ''نیو ایرا'' والے مضمون میں شائع ہوا تھا۔

○○○

تحریک کے فنکار

اُردو کے ترقی پسند مصنّفین اس بات پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ ہمارے وطن کی تمام دوسری زبانوں کے مقابلے میں اُردو ادب پر ہماری تحریک نے سب سے جلدی، وسیع اور گہرا اثر کیا۔

1938 کے تقریباً وسط سے اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کے تین اہم مرکز قائم ہونے لگے تھے، لاہور، لکھنؤ اور حیدرآباد (دکن)۔

لاہور سے اس زمانے میں ''ہمایوں'' اور ''ادبی دنیا'' دو اچھے ادبی رسالے نکل رہے تھے۔ ''ہمایوں'' کے ایڈیٹر میاں بشیر احمد اور حامد علی خاں تھے، اور ''ادبی دنیا'' کے مولانا صلاح الدین احمد۔ فیض، تاثیر، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی اور اُپندر ناتھ اشک کی لکھی ہوئی چیزیں ان ہی رسالوں میں شروع شروع میں شائع ہوئیں۔ اسی زمانہ میں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوکر اور نئے ترقی پسند ادیبوں کا سہارا لے کر چودھری برکت علی اور چودھری نذیر نے 'ادب لطیف'' جاری کیا اور نئے ترقی پسند ادب کی اشاعت کے لیے ''مکتبہ اُردو'' قائم کیا۔ یہ وہ مادی محور تھا جس کے ارد گرد نئی ادبی تخلیقوں کی پنجاب میں تشکیل ہوئی۔ ''ادب لطیف'' کے مالک ادب نواز اور ترقی پسند تحریک کے معاون ہوتے ہوئے تجارت پیشہ بھی تھے۔ چنانچہ تجارتی امور میں نئے ادیب اگر ان سے ایک طرف مدد پاتے تھے، تو دوسری طرف ہمیشہ یہ بھی شکایت کرتے

تھے کہ روپے پیسے اور معاوضے کے معاملہ میں ان سے خاطر خواہ سلوک نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ ''ادب لطیف'' کا ایڈیٹر گوکہ ہمیشہ ترقی پسندوں کی جماعت کا ہی کوئی شخص ہوتا تھا اور اس رسالہ کا غالب رنگ ترقی پسند تھا لیکن اس میں کبھی کبھی ایسی چیزیں بھی شائع ہوتی تھیں جو صرف مبہم ہی نہیں بلکہ رجعت پرست تک ہوتی تھیں۔ اس صورت حال کا الزام غالباً رسالے کے مالکوں پر لگانا صحیح نہ ہوگا اس لیے کہ خود ترقی پسندوں کے ذہن میں بہت سی باتیں صاف نہ تھیں۔ ایک طرف ان کی بالکل ٹھیک اور صحیح کوشش یہ تھی کہ وسیع المشربی اور آزاد خیالی کے اصول کو ادب میں پوری طرح برتا جائے۔ کسی ادیب کے لیے اگر وہ مخلص اور سنجیدہ ہے اور اس کی تحریروں میں ادبی روح ہے، ہمارے رسالوں کے صفحے بند نہ ہونے چاہئیں۔ ادب کی ترقی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب مختلف خیال اور نظریوں کے لوگوں اور مختلف اسالیب برتنے والوں کو اظہار خیال کی آزادی دی جائے اور تنقید کرنے والوں کو اس کا موقع ملے کہ وہ بغیر کسی جھجک اور رکاوٹ کے ادب پر نکتہ چینی کرسکیں، اس کے عیوب اور محاسن ظاہر کرسکیں۔ اس اصول کے ماتحت ترقی پسندوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوسرے سنجیدہ رسالوں میں اپنی چیزیں چھپوائیں اور ایسی محفلوں اور مجلسوں میں اپنا کلام سنائیں جہاں ان کے طرفدار اور ہم خیال ہی نہیں بلکہ غیر جانبدار یا ان کے مخالف ادیب اور اہل علم بھی موجود ہوں۔ اپنی محفلوں میں بھی انھیں وقتاً فوقتاً اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کو بھی مدعو کرنا چاہیے، اور ان کی باتیں غور اور سنجیدگی سے سننی چاہئیں۔ ایک طرف تو ہمارا یہ اصول تھا۔ دوسری طرف یہ چیز تھی کہ ترقی پسند مصنّفین ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں۔ ان کے اپنے رسالوں کا بنیادی مقصد اس نظریہ کو ادب کی مختلف اور متنوع شکلوں میں پیش کرنا ہے۔ اس لیے ان کے رسالوں کا ایک خاص مزاج اور ان کی چند خصوصیتیں ہونی چاہئیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وسیع المشربی کے نام پر رسالہ کا یہ خاص مزاج، اس کا یہ نمایاں رجحان اور مقصد ہی فوت ہو جائے۔ ایسا کرنے سے تحریک اس شراب کی طرح ہو جائے گی جس میں اتنا پانی ملا دیا جائے کہ اس میں نشہ ہی باقی نہ رہے۔ اس طرح تحریک کی دھار کند ہو جائے گی، وہ بے اثر ہو جائے گی اور ذہنوں اور دلوں کو متاثر اور منقلب کرنے کے بدلے وہ صرف دماغی پریشانی اور اُلجھاؤ پیدا کرے گی یا محض وقتی تفریح۔ آزادیٔ رائے اور خیال کے معنی یہ نہیں ہونے چاہئیں کہ ہم اپنے نقطۂ نظر اور

رائے پر مضبوطی سے قائم نہ رہیں اور جن خیالات کو صحیح، سچے اور اچھے سمجھتے ہیں انھیں اپنی پوری قوت اور صلاحیت کے ساتھ مقبول بنانے کی کوشش دھیمی کر دیں۔ ہمارے وطن میں رجعت پسندوں کے وسائل، ترقی پسندوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں، اور وہ اپنے رسالوں، کتابوں، اخباروں، مدرسوں، ریڈیو اور سنیما وغیرہ کے ذریعہ سے برابر اپنے نظریوں کا پرچار کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم اپنے محدود وسائل کو اور اپنے رسالوں کے زیادہ تر صفحوں کو اپنے خیالات اور تصورات کے افسانوں، مضامین اور شعر کی اشاعت کے لیے محفوظ رکھتے ہیں اور ان صاحبوں کی چیزوں کو شائع کرنے سے گریز کرتے ہیں جو اعلانیہ تاریکی اور تعصب کے مبلغ ہیں تو اس کی بنا پر ہم پر تنگ نظری کا الزام لگانا درست نہیں ہوگا۔

ان اصولوں کو وضع کر لینا آسان ہے۔ لیکن ان پر ٹھیک سے عمل کرنا نسبتاً مشکل ہے۔ اس لیے بالغ نظری اور تجربے اور ادب کے مسائل پر عبور کی ضرورت ہے۔ جس کی ہمارے نوجوان اڈیٹروں میں کمی تھی۔ پھر بعض رسالوں کے مالکوں کے تجارتی یا سیاسی مفاد بھی اس پالیسی پر صحیح عمل کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے تھے۔ بہرصورت ہماری تحریک کے شروع زمانوں میں جب پختہ کار لکھنے والوں کی کمی تھی اور جب خود بہت سے ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں میں نظریاتی الجھاؤ، ترقی پسند خیالات کے ساتھ ساتھ رجعتی رجحانات کی جھلک، اسلوب کا کھردرا پن، علم کی کمی موجود تھی اور جب حقیقت نگاری کے معنی بھی واضح طور سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے تھے...... یہ بہتر تھا کہ ہمارے رسالے اور ناشر ہر قسم کے اچھے اور ہونہار لکھنے والوں کی چیزیں چھاپتے، ہر نئی اور سنجیدہ اور قابل اعتنا ادبی تخلیق کو اپنے صفحوں پر جگہ دیتے، اگرچہ ان تحریروں کے بعض رجحانات سے انھیں اختلاف ہی کیوں نہ ہوتا۔ ادب اور فنون لطیفہ کے معاملہ میں تنگ نظری اور سخت گیری، ضرورت سے زیادہ وسیع المشربی کے مقابلہ میں زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہے۔ یہ بہتر ہے کہ مشتبہ اور ایسی چیزیں، جن سے ہم اختلاف بھی رکھتے ہوں، شائع کی جائیں اور عام پڑھنے والوں اور نقادوں کو خود ان کے بارے میں اپنی رائے قائم کرنے اور ان پر نکتہ چینی اور تنقید کا موقع دیا جائے۔ بجائے اس کے کہ اختلاف یا ناپسندیدگی کی بنا پر بعض ادیبوں کی تحریروں کو دبا دیا جائے۔ ادب اور فنون لطیفہ میں سنجیدہ احتساب اور تنقید ضروری ہے۔ لیکن آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار

اس سے زیادہ ضروری ہے۔ رجعت پرستوں اور جمہوریت پسند ترقی خواہوں میں بنیادی فرق یہی ہے کہ اوّل الذکر جبر، غیر سنجیدہ اور ریا کارانہ احتساب اور دباؤ سے کام لے کر نئے ادبی خیالات اور نظریوں کی اشاعت کو روکتے ہیں اور عوام کو اس کا موقع نہیں دیتے کہ ان خیالات کو پرکھ کر انھیں قبول یا رَد کریں۔ ترقی کے طرف دار چاہتے ہیں کہ ہر قسم کے خیالات اور نظریے منظر عام پر لائے جائیں اور لوگ خود اس کا فیصلہ کریں کہ کون سے خیالات اور کس قسم کا ادب قابل اعتنا ہے، ان کی صحت مند ذہنی، روحانی اور جمالیاتی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور کون اس کا سزاوار ہے کہ اسے رد کیا جائے اور قبولیت عام کی عزت نہ بخشی جائے۔

اگر ہم اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ لاہور کے رسالہ ''ادب لطیف'' نے ترقی پسند ادب کی عام طور پر بہت اہم خدمت انجام دی ہے۔ 1939 اور 1940 میں غالبًا فیض، امرتسر سے لاہور آ گئے تھے۔ ایک کالج میں انگریزی کے لکچرر ہونے کے ساتھ ساتھ اس رسالے کے بھی ایڈیٹر ہو گئے۔ ان کے اداریوں اور تنقیدی مضامین نے ترقی پسند نقطہ نظر کو واضح کیا۔ میرے لیے (تفصیلی ناواقفیت کی بنا پر) یہ ممکن نہیں کہ پنجاب میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے اس دور کے واقعات کماحقہ بیان کروں۔ یہ کام فیض یا کرشن چندر کے کرنے کا ہے، جو اس زمانہ میں انجمن کے سرکردہ کارکنوں میں تھے۔ ''ادب لطیف'' کے ساتھ ساتھ ادارہ ''مکتبہ اُردو'' کی بھی بحیثیت ایک ناشری ادارے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس ادارے نے پنجاب اور بعد میں پنجاب کے باہر بھی ترقی پسند ادیبوں کی کتابوں کو بڑی خوبی اور حسن کے ساتھ شائع کیا۔ اس نے اُردو طباعت کا بہت بلند معیار قائم کیا، اور ساتھ ساتھ ان کتابوں کی اشاعت اور فروخت سارے ملک میں بڑی مستعدی کے ساتھ انجام دی۔ اس کے برخلاف ترقی پسند مصنّفین کی جو کتابیں لکھنؤ یا دوسرے شہروں میں شائع ہوئیں، وہ نہ تو اتنی اچھی چھپیں جتنا کہ ''مکتبہ اُردو'' کی کتابیں تھیں، اور نہ ہی ان کی اشاعت و فروخت ٹھیک سے اور وسیع پیمانے پر ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ مصنّفین کو اس ادارے سے یہ شکایت رہتی تھی کہ انھیں کافی معاوضہ نہیں ملتا۔ لیکن پھر بھی مکتبہ کے مالکوں، چودھری برکت علی اور چودھری نذیر سے ان کا ربط رہا اور دونوں جانب سے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون بدستور قائم رہا۔ انصاف کا تقاضہ ہے کہ ترقی پسند مصنّفین اس کا اعتراف کریں کہ

اگر ایک طرف اس ادارے نے نئے مصنّفین کی کتابیں شائع کر کے منافع کمایا، تو دوسری طرف یہ ادارہ حکمرانوں کے قہر و غضب کا بھی وقتاً فوقتاً نشانہ بنتا رہا۔ اس پر مقدمے چلائے گئے، اس کی شائع کی ہوئی کتابیں ضبط ہوئیں، اور اس پر جرمانے کیے گئے۔ لیکن اس نے اپنی روشن خیالی کی روش ترک نہ کی۔

1939 میں لکھنؤ میں اُردو کے نوجوان ترقی پسند ادیبوں کا جو گروہ جمع ہو گیا تھا وہ اپنی نیرنگی اور رنگینی، ذہانت اور اُپج، شوخی اور سنجیدگی کے لحاظ سے مجموعی حیثیت سے کچھ عجیب سی دلکشی رکھتا تھا۔ اس زمانہ میں ہمارے ملک میں حب وطن اور انقلاب کی جو جانفزا ہوائیں چل رہی تھیں، اس سے یہ سرشار معلوم ہوتے تھے۔ ان میں علی سردار جعفری تھے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اپنی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر نکالے جانے کے بعد اب لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔ اے کرنے کے لیے داخل ہو گئے تھے، لیکن اپنا بیشتر وقت اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور ترقی پسند مصنّفین کی تحریکوں کو دیتے تھے۔ دبلے پتلے، ڈھلتا ہوا رنگ، چمکتی ہوئی آنکھیں، درمیانہ قد، ان کی گفتگو میں ویسی ہی جدت اور روانی تھی جیسے ان کی تقریر یا ان کی شاعری میں۔ اپنے مخالفوں سے نرمی برتنے کا فن انھیں بالکل نہیں آتا۔ مخالف سے گفتگو کو وہ فوراً بحث میں بدل دیتے تھے اور دلائل اور منطق کے انبار کے ساتھ ساتھ وہ اس کی کمزور رگوں پر تیر و نشتر کی بھی بوچھار کرتے جاتے اور جب تک فی الواقع اس کا ناطقہ نہیں بند کر دیتے تھے، انھیں چین نہیں پڑتا تھا۔ کرشن چندر نے ان کے بارے میں ٹھیک ہی کہا ہے کہ ان سے ملو تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی تحریک سے مل رہے ہیں۔ ان کی طبیعت کی مٹھاس اور تبسم، مزاج کی فیاضی، ان کی رقت قلبی اور دردمندی صرف اپنے ملک کے عوام یا ان کے دوستوں کے لیے ہے جنھیں وہ ان کا طرف دار یا ہمدرد سمجھتے ہیں۔ لیکن ان دوستوں میں بھی کمزوری یا کجروی یا مخالف اور دشمنوں کے ساتھ ملنے اور ان سے ذرا سا بھی سمجھوتہ کرنے کے رجحان کو وہ برداشت نہیں کر سکتے، اور ایسے موقعوں پر دوستی بھی سردار کو سخت گیری اور سخت کلامی سے نہیں روکتی۔ اسی سبب سے رجعت پرست، اہل حکم اور ادیب ہماری تحریک کے راہ نماؤں میں غالباً سب سے زیادہ سردار جعفری سے نفرت کرتے ہیں اور جب بھی ترقی پسندی پر حملہ ہوتا ہے سب سے پہلا وار انھیں پر پڑتا ہے۔ سردار ہماری تحریک کی ''شمشیر بے نیام'' ہیں۔ دشمن ان سے پناہ مانگتے ہیں اور

احتساب کے وقت ان کے دوست اور رفیق بھی کسی قدر گھبراہٹ کے ساتھ ان کی تنقید سننے کے منتظر رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ سردار ان لوگوں میں ہیں جو پیہم اپنے علم وفن کو ترقی دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور خود آگے بڑھ کر قربانی یا محنت کرنے سے جی نہیں چراتے، خواہ وہ سیاسی عمل کے سلسلے میں ہو، اپنے شعور کو بڑھانے اور جلا دینے کے لیے یا ادبی تخلیق کے واسطے۔ اس لیے صرف ان کے ساتھی ہی نہیں، بزرگ اور معمر ادبا بھی ان کی رائے اور تنقید کی وقعت کرتے ہیں، چاہے کبھی کبھی انھیں ان کے ساتھ اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔

لکھنؤ کے اسی گروہ میں اسرارالحق مجاز تھے۔ یہ علی گڑھ سے بی۔اے پاس کرنے کے بعد دہلی چلے گئے تھے اور وہاں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے تھے۔ لیکن سال ڈیڑھ سال کے اندر اندر وہاں کی فضا کو ناسازگار دیکھ کر، کسی چھوٹی سی بات پر لڑ کر مستعفی ہو گئے اور لکھنؤ آ گئے۔ یہاں ان کے والد ایک سرکاری نوکری سے رٹائر ہونے کے بعد آ کر بس گئے تھے۔ مجاز ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ ان کا قد بھی سردار جعفری کے برابر ہوگا۔ لیکن ان سے بھی زیادہ دبلے تھے۔ ان کی ہڈیاں بہت پتلی تھیں، اور جسم پر گوشت نہ ہونے کی وجہ سے وہ جسم کے ہر کھلے ہوئے حصے سے ابھرتی نظر آتی تھیں۔ مجاز کے چہرے پر نظر ڈالنے سے بہت سی مہین مہین نوکوں کا احساس ہوتا تھا۔ دونوں گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کی نوک، ناک کی نوک، دو بڑے ہی پتلے ہونٹوں اور غیر معمولی چھوٹے سے منہ کی نوک اور پھر اس الٹے تکون کے نیچے ایک بہت چھوٹی سی ٹھڈی کی تیز نوک، پھر جب کبھی وہ سر پر بڑی سی بال دار اور اونچی کیپ نہایت ترچھے زاویے پر پہن لیتے تھے تو گویا وہ اس نوکیلے سلسلے کی سب سے اونچی چوٹی ہوتی تھی۔ لیکن اس ہلکے پھلکے اور نوکیلے شخص میں اپنی جوانی کے اس زمانہ میں بھی نیش کے معنوں میں بھی نوک نہ تھی۔ وہ تو اس لحاظ سے سرتا سر نوش تھا۔ نہایت منکسر مزاج اور شرمیلا اور کم سخن۔ مجاز کی طبیعت کی لطافت اور بذلہ سنجی صرف اپنے مخصوص دوستوں اور یاروں کی بے تکلف محفلوں اور ملاقاتوں تک محدود تھی۔ سردار جعفری اگر مباحثہ کے میدان کے شہسوار تھے تو مجاز کو اس میدان کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ حالانکہ اپنی ذہانت طبع کی بنا پر وہ اشتراکیت کے علمی اور فلسفیانہ نظریوں اور مروجہ سیاسی خیالات سے واقفیت رکھتے تھے۔ لیکن تحصیل علم کی کاوش ان میں نہیں تھی۔ کسی کام کو بھی نظم اور ضبط کے ساتھ کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کے مزاج

میں ایک لطیف اور دلکش رنگینی تھی۔خوبصورت اور مترنم الفاظ اور ترکیبوں کا مناسب استعمال کر کے کیف ونشاط، رومانیت اور وارفتگی کی اپنے شعر میں وہ ایک ایسی حسین فضا بنانے پر قادر تھے جس کے ذریعہ سے وہ اس زمانہ کے اپنے طبقے کے آزادی خواہ نوجوانوں کی مضطرب روح کو اپنے کلام میں مسخر کر لیتے تھے۔ یہ روح سماج کے ان دقیانوسی بندھنوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بے قرار تھی جنھوں نے اسے ذہنی ترقی، رومانی انبساط اور جسمانی لذتوں سے محروم کر دیا تھا، جنھوں نے آزادا ور خاطر خواہ محبت کرنے کے حق کو نوجوانوں سے چھین لیا تھا، ان کی فکر کو مقید کر دیا تھا اور جو انھیں افلاس کے بے رحم تیروں کا نشانہ بنا کر زندگی کی ترنگوں اور امنگوں کو اداسی اور حرماں نصیبی اور اندوہ گینی میں بدل دیتی تھی۔ مجاز بہت جلد اُردو داں تعلیم یافتہ نوجوان لڑکوں ......اور شاید ان سے بھی زیادہ لڑکیوں کے سب سے محبوب شاعر بن گئے۔ کئی سال تک لکھنؤ، الہ آباد، علی گڑھ کی یونیورسٹیوں کے طلبا میں نئے شاعروں میں وہ سب سے زیادہ مقبول اور دل پسند رہے۔

انھیں دنوں کا ذکر ہے (اس وقت تک ''آہنگ'' شائع نہیں ہوئی تھی) کہ ایک بار حیات اللہ انصاری مجھ سے ملے اور انھوں نے مجھے اپنے گھر آنے کے لیے مدعو کیا۔ انھوں نے بتایا کہ تقریب یہ ہے کہ مجاز نے ایک نئی نظم کہی ہے۔ وہ خود تو اسے سن چکے تھے، لیکن وہ اس سے اس قدر متاثر تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ دوستوں کی ایک خاص مجلس میں اسے سنایا جائے۔ میں نے ان کی دعوت بڑی خوشی سے قبول کی۔ اس لیے کہ مجاز کی ہر ایک نظم کو ہم سب اس زمانہ میں ترقی پسند ادب کے تخلیقی مراحل کا ایک اہم واقعہ سمجھتے تھے۔

حیات اللہ انصاری خود لکھنؤ کے ترقی پسند ادیبوں کے گروہ کے ایک ممتاز فرد تھے۔ وہ مجاز، سردار جعفری، جذبی، اور سبط حسن کے ذاتی دوستوں میں سے تھے اور علی گڑھ میں ان کے ساتھ ہی پڑھ چکے تھے۔ ان کی ذات ترقی پسندوں میں کئی لحاظ سے منفرد تھی۔ حیات اللہ انصاری لکھنؤ کے نامور اور محترم علمائے فرنگی محل کے خاندان سے ہیں۔ علمائے فرنگی محل کئی پشتوں سے شمالی ہند کے علما میں اپنی علمی اور روحانی فضیلت کے لیے مشہور ہیں۔ انگریزی راج کے پہلے اودھ کی نوابی کے زمانہ میں وہ اتنے با اثر تھے کہ حکمراں نواب ان کی مرضی اور منشا کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ نان کوآپریشن اور تحریک خلافت کے دنوں میں مولانا عبدالباری فرنگی محل کی شرکت سے اس تحریک

کو بڑی تقویت پہنچی تھی۔ گاندھی جی اس زمانہ میں جب ایک بار لکھنؤ آئے تھے تو فرنگی محل میں مولانا عبدالباری ہی کے مہمان ہوئے تھے۔ یہ چیز ہندو مسلم اتحاد کی ایک جیتی جاگتی نشانی سمجھی گئی تھی۔ ورنہ عام طور سے مسلمان علما کے گھروں میں ہندو لیڈروں کا گزر بھی نہیں ہوتا تھا۔ گو یہ علما اپنا زیادہ تر وقت درس وتدریس، پیری مریدی، ریاضت وعبادت میں بسر کرتے تھے۔ لیکن وہ سیاست سے بے بہرہ نہ تھے۔ البتہ ہم جس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں، اس وقت فرنگی محل کے گھرانے میں کوئی ایسی ہستی جو اپنے علم یا تقدس کے لحاظ سے خاص نمایاں حیثیت رکھتی ہو، باقی نہیں رہ گئی تھی۔ مولانا عبدالباری کے صاحبزادے کم عمر تھے اور ان کا مبلغ علم بھی قلیل تھا۔ بعد میں وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے جہاں علما کی کمی تھی اور صرف ایک بزرگ باپ کے بیٹے ہونے کی حیثیت سے انھیں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں بھی جگہ مل گئی۔ شمالی ہند کے اکثر علمائے اسلام محبّ وطن اور انگریزی سامراج کے مخالفوں میں تھے، وہ مسلم لیگ میں شامل نہیں ہوئے۔ ان کی بڑی اکثریت قوم پرور سیاست کو اپنائے ہوئے تھی۔ اس زمانے میں درمیانہ طبقے کے پڑھے لکھے نوجوانوں میں جو عام بے چینی اور ہیجان تھا، اس سے عربی اور دینی مدرسوں کے طلبا اور خود علما کے گھرانوں کے نوجوان متاثر تھے۔ زمینداریاں اور اوقاف جن سے ان گھرانوں کی معاش تھی اور جن سے ان کی شان برقرار رہتی تھی، مٹ رہے تھے۔ انگریزی پڑھے لکھے لوگوں کو تو نوکریاں ملنے کا کسی قدر موقع تھا بھی، عربی فارسی اور دینیات پڑھے ہوئے لڑکوں کی اکثریت فقر و فاقہ اور بے روزگاری کا اور بھی زیادہ شکار ہو رہی تھی۔ یہ نوجوان دیکھتے تھے کہ مٹھی بھر صاحبِ جائداد علما اور سجادہ نشین تصوف اور تقدس کے دعووں کے باوجود عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ان کے لیے زندگی کی تمام شاہراہیں مسدود ہیں۔ پھر ان کی ہنّق صورتیں، نوجوان چہروں پر جنگلی گھاس کی طرح اگی ہوئی خسی خسی داڑھیاں، ٹخنوں سے اوپر شرعی پائجامے، ان کے عمامے اور پُرانی وضع کی قبائیں، نکاح شادی، مولود مجلس اور عید اور جنازے کی نمازوں کے وقت بھلے ہی احترام کی نظروں سے دیکھے جائیں، عام طور سے لوگ انھیں مضحکہ خیز اور عجائب خانہ میں رکھے جانے کی چیزیں ہی سمجھتے تھے۔ عام لوگ اگر ایک طرف ان لوگوں کا مذاق اڑاتے تھے، جو اپنے قومی خصائل اور تہذیب کو ترک کر کے ضرورت سے زیادہ انگریز یا صاحب بننے کی کوشش کرتے تھے تو دوسری طرف دینیات

کے ان چلتے پھرتے پتلوں کی قدامت پرستی اور دقیانوسیت بھی عوام کے تمسخر اور استہزا کی زد میں تھی۔

ان اسباب کی وجہ سے خود علما کے خاندانوں کے بے مایہ نوجوانوں اور دینی درسگاہوں کے طلبا میں بے چینی اور بے اطمینانی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ اکثر مدرسوں کے طلبا کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جاتا تھا۔ خراب کھانا، سخت عبادت، سونے اور پڑھنے اور چھٹی کے اوقات میں فوجی بیرکوں کی طرح کا ڈسپلن، طلبا کے حقوق کا مکمل فقدان، وظیفوں کے دینے میں طرف داری۔ عام تہذیبی انحطاط کے ساتھ یہ سب خرابیاں ان پُرانی درسگاہوں میں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ اوقاف، چندوں اور جائدادوں کی آمدنیاں، جو درس و تدریس کے لیے تھیں، چند متولیوں اور ان کے کنبوں کی آسائش پر صرف ہوتی تھیں۔ تعلیم کا معیار بھی گرتا جا رہا تھا۔ جدید تعلیم اور سائنس تو خیر وہاں کے نصاب میں داخل ہی نہیں تھی۔ اب قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ، عربی، فارسی، اور ادب کی تعلیم بیشتر رسمی اور بے جان ہو کر رہ گئی تھی۔ تعلیم کی اس زبوں حالی اور رہن سہن کے سقیم حالات اور چند اساتذہ کی بدسلوکی کے خلاف ان درسگاہوں کے طلبا میں بڑی بے چینی تھی۔ چنانچہ لکھنؤ کی کئی درسگاہوں میں لڑکوں کی ہڑتالیں بھی ہوئیں۔ جن کو مقدس منتظمین نے بری طرح کچلا۔ بہت سے طلبا کے نام مدرسوں سے خارج کر دیے گئے اور وہ مدرسوں کی اقامت گاہوں سے نکال دیے گئے۔ ان طلبا کے لیے داڑھی منڈوانا، سگریٹ پینا، سنیما دیکھنا، انگریزی پڑھنا تک ممنوع تھا اور ان کے لیے ان کاموں میں سے کچھ بھی کرنا دین اور ایمان سے بغاوت کا پہلا قدم سمجھا جاتا تھا۔ حیات اللہ انصاری نے علمائے فرنگی محل کے خاندان کا ایک فرد ہونے کے باوجود اور دینیات کے درس کی تکمیل کے باوجود ان تمام بندشوں کو توڑ دیا۔ وہ پہلے تو انگریزی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں جانے پر انھوں نے داڑھی مونچھ دونوں کا صفایا کروایا، اور جب فرنگی محل کے دوسرے لوگ مسلم لیگ میں شامل ہو رہے تھے، انھوں نے کھدر پوشی اختیار کر کے گاندھی ٹوپی اوڑھ لی۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کی سیاست اختیار کر لی اور اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر ترقی پسند ادیبوں کے گروہ میں شامل ہو گئے اور بڑی حد تک اشتراکی خیالات کو بھی اپنا لیا۔

ان دنوں حیات اللہ انصاری علی گڑھ سے نئے نئے واپس آئے تھے اور فرنگی محل میں اپنے

آبائی مکان کے ایک حصہ میں ہی رہتے تھے۔ چنانچہ مجاز کی نئی نظم سننے کے لیے انھوں نے ہمیں وہیں پر مدعو کیا۔ ایک ترقی پسند شاعر کی نظم سننے کے لیے فرنگی محل کے ہی ایک نوجوان کی دعوت پر علمائے کرام کے اس قدیم اور مقدس آستانے پر ہمارا مجمع ہونا یقیناً ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔ اس مجمع میں علیم، سردار جعفری، سبط حسن، اور میرے علاوہ فرنگی محل کے خاندان کے اور بھی کئی نوجوان شامل تھے۔ ان میں رضا انصاری بھی شامل تھے۔ انھوں نے بعد کو ترقی پسند ادب کی تحریک میں کافی حصہ لیا اور اسی سبب سے وہ بھی رجعت پرست حلقوں میں کافی معتوب ہوئے اور انھیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

اس دن مجاز نے ہمیں اپنی نظم ''اندھیری رات کا مسافر'' سنائی۔ اس نظم میں اس نوجوان کی تصویر کشی کی ہے جو ہر قسم کے ارضی وسماوی مصائب کا سامنا کرتا ہوا انقلاب کی منزل کی طرف بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ گو اب اس نظم میں ہمیں بعض معنوی کمیاں نظر آتی ہیں، اس لحاظ سے کہ اس میں انقلاب کی منزل کا تصور کافی مبہم ہے، انقلابی طاقتوں کی صاف تصویر نہیں ہے اور انقلابی جدوجہد کا تصور واقعی کم اور ہیجانی زیادہ ہے، اور غالباً انھیں کمیوں کے سبب سے نظم میں ٹھہراؤ اور سنجیدگی اور گہرا تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ خامیاں اس وقت کی ساری انقلابی تحریک کی ہی خامیاں تھیں۔ اکیلے مجاز کے شعور کی نیم پختگی ان کی ذمہ دار نہ تھی۔ پھر بھی اس نظم میں ایک طوفانی آندھی کی سی کیفیت ہمیں محسوس ہوئی۔ ''تعاقب میں لُٹیرے ہیں۔ چٹانیں راہ میں حائل'' اور اسی قسم کے رواں دواں مصرعے اپنے اندر ایک ایسا آہنگ رکھتے تھے جن کے ساز خود ہمارے سینوں میں چھڑے ہوئے تھے۔

انھیں دنوں حیات اللہ کی ادارت اور ڈاکٹر علیم کی نگرانی میں لکھنؤ سے ہفتہ وار ''ہندستان'' جاری ہوا۔ اس کے لیے سرمایہ خاص طور پر رفیع احمد قدوائی صاحب نے جمع کیا تھا جو صوبہ متحدہ کی کانگریسی وزارت میں وزیر تھے۔ وہ بھی علیم اور آچاریہ نریندر دیو کے ساتھ اس کے ڈائرکٹروں میں تھے۔ اس کی سیاست کانگریسی تھی، لیکن بائیں بازو کا جھکاؤ لیے ہوئے۔ ہم سب ہی اس زمانہ میں کانگریس میں شریک تھے۔ داہنے اور بائیں بازو کے جھگڑے نے ابھی شدت نہیں اختیار کی تھی بلکہ جواہر لعل نہرو کی صدارت میں اس وقت کانگریس میں بائیں بازو والے کافی با اثر ہو گئے تھے۔

صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی میں یہ بات خاص طور پر تھی۔ بہرصورت ’’ہندستان‘‘ کا ادبی حصہ ترقی پسند ادب کے لیے وقف تھا۔ چنانچہ اسی رسالہ میں اس ابتدائی دور کے تمام نوجوان اُردو شاعروں کی نظمیں بالالتزام شائع ہونے لگیں۔ مجاز، سردار جعفری، جذبی، مخدوم محی الدین، وقار انبالوی، مسعود اختر جمال، جاں نثار اختر، علی جواد زیدی، رضی عظیم آبادی، شمیم کرہانی، یہ سب نام ہمیں ہندستان کے شاعروں میں نظر آئیں گے۔ یہ سارا گروہ نئے ترقی پسند شاعروں کا تھا۔ ان کی نظموں میں نئی ادبی تحریک کی پہلی دھڑکنیں تھیں۔ ان کاموں کو دیکھ کر اب ہمیں یہ یقین آنے لگا تھا کہ اب ہم محض پروگرام بنانے، مقصد کا تعین کرنے، پرانے ادب کے رجعت پرست رجحانات کی کڑی اور تلخ تنقید کے دور سے گزر کر زیادہ مشکل ادبی تخلیق کے دور میں داخل ہو رہے تھے۔

سبط حسن کو بھی نئی تحریک کی کشش حیدر آباد دکن سے اب لکھنؤ کھینچ لائی، جہاں ان کے دوست سردار جعفری اور مجاز پہلے سے موجود تھے۔ ویسے ان کے مزاج میں اتنی بے اطمینانی اور لچک ہے کہ وہ ایک شہر، ایک مکان، ایک کام یا ایک عشق سے بمشکل پابند کیے جا سکتے ہیں۔ جس وقت وہ ایک کام کو خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں، اسی دوران میں ان کے ذہن میں کوئی دوسری لمبی چوڑی اسکیم جنم لیتی ہے اور ان کا دل بے اختیار اپنے کام سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔ اب یہ ان کے دوستوں اور ساتھیوں پر ہے کہ انھیں اس کا یقین دلائیں کہ وہ جو کام کر رہے ہیں وہ بہت ضروری ہے اور ان میں اس کے اچھی طرح کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ اگر اس میں ذرا بھی چوک ہوئی تو سبط حسن یکا یک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر غائب ہو جاتے ہیں اور تھوڑے دنوں کا غوطہ لگانے کے بعد جب وہ برآمد ہوتے ہیں تب وہ ثابت کر دیتے ہیں کہ وہ جو نیا کام انھوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے، قدرت نے ان کی تخلیق خاص اسی لیے کی تھی۔ ان کی ذہانت، نکتہ سنجی، اور ادب میں ذوق سلیم کے سب معترف ہیں۔ چونکہ قسمت نے انھیں صحافت کے پیشے کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ اس لیے انھیں اب تک کئی ترقی پسند ادیبوں کی طرح ادب کے میدان کا آزاد نیزہ باز بنے رہنے پر ہی اکتفا کرنا پڑا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس حیثیت سے بھی انھوں نے ہماری تحریک شروع زمانہ سے لے کر اپنی گرفتاری تک (اپریل 1951) تمام ان ادیبوں پر اپنی اصلاح، تنقید، تعریف، نکتہ چینی، اور ادبی سوجھ بوجھ سے اثر ڈالا ہے، جن کے وہ

دوست اور رفیق بن سکتے ہیں۔ ان کی حد درجے کی نفاست پسندی اور مزاج کا تلون اور جن کو وہ کم جانتے ہیں، جن کی لیاقت اور اخلاص کے وہ قائل نہیں ہوتے ان کے ساتھ ایک بلند سطح سے گفتگو کرنے کا انداز، خود ہمارے حلقہ میں بعض لوگوں کو ان سے بدگمان کر دیتا ہے۔ اس لیے اگر انھیں پسند کرنے والے بہت تھے، تو بہت سے لوگ بڑی جلدی ان سے دل برداشتہ بھی ہو جاتے تھے۔ ان کے متعلق لکھتے وقت شیفتہ کا یہ قول یاد آتا ہے......

اگر طبع سخن شناس داری بہ ایں نکتہ می رسی،
چہ خوش فکر اگرچہ کمیاب است آقا خوش فہم کمیاب تر
(گلشنِ بے خار)

ہماری تحریک میں سبط حسن کی اہمیت ان کی خوش فہمی کے سبب سے تھی۔

چنانچہ سبط حسن نے لکھنؤ پہنچ کر یکے بعد دیگرے کئی خوشنما اور عظیم منصوبے بنا کر امید کے دریا میں بہا دیے۔ ترقی پسندوں کی ہی ادارت اور نگرانی میں ہفتہ وار ''ہندستان'' نکل رہا تھا۔ لیکن کانگریسی سیاست کے ساتھ اس کی بندش رفتہ رفتہ ہم سب کو کھٹکنے لگی تھی۔ سبط حسن نے فوراً تجویز پیش کی کہ ایک دوسرا ہفتہ وار اخبار نکلنا چاہیے اور قبل اس کے کہ ہم سب اس کے بارے میں کوئی مستقل رائے قائم کر سکیں، انھوں نے ہفتہ وار ''پرچم'' کے نام سے شائع کر دیا۔ یہ اپنی آب و تاب، اپنے ادبی مضامین، اپنی خالص ترقی پسندی اور اپنی سیاست کے لحاظ سے ''ہندستان'' سے اچھا تھا۔ لیکن اس کی مالی اور تنظیمی بنیاد بے حد کمزور تھی۔ چنانچہ چار پانچ پرچوں کی اشاعت کے بعد ''پرچم'' سرنگوں ہو گیا، اور اس کی اشاعت رُک گئی۔

اس کے بعد انھیں خیال آیا کہ لکھنؤ میں انجمن ترقی اُردو کی ایک جیتی جاگتی شاخ کیوں نہ قائم کی جائے۔ یہ شاخ لکھنؤ میں انجمن کی کتابیں اور رسالے فروخت کرے۔ اس کے بہت سے ممبر ہوں، جن کے جلسے ہوا کریں، اس کا ایک دارالمطالعہ ہو، جو شہر میں ادب کا مرکز ہو۔ ادیبوں کے مل بیٹھنے کے لیے ایک خوشگوار جگہ ہو جہاں سے ادب و تہذیب، شعر و علم کے چشمے پھوٹیں۔ اپنی ان تجاویز کو انھوں نے مولوی عبدالحق صاحب کے سامنے پیش کیا اور انھیں اس پر آمادہ کیا کہ وہ لکھنؤ آئیں اور انجمن کی اس شاخ اور مرکز کا افتتاح کریں۔ شہر کے بہت سے اُردو نواز، اور ادب

پسند لوگوں سے مل کر انھیں اپنا ہم خیال بنایا گیا۔ یہ تجویز ایسی اچھی تھی کہ بھلا کسی کو اس سے کیا اختلاف ہوسکتا تھا۔ کم از کم سبط حسن اور ان کے دوست یہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب لکھنؤ آئے۔ ان کی بڑی شاندار دعوت ہوئی۔ لیکن اندر اندر کچھ لوگ اپنی الگ اسکیم بنا رہے تھے۔ سبط حسن نے جب سب کام کرلیا اور اسکیم شروع ہونے کا وقت آیا تو یہ انکشاف ہوا کہ لکھنؤ میں تو انجمن ترقی اُردو کی ایک شاخ پہلے سے موجود ہے۔ کہیں سے ایک صاحب نکل آئے، جن کا اس وقت تک کسی کو پتہ بھی نہیں تھا، اور ادبی حلقوں میں جو بالکل غیر معروف تھے، جو مدتوں سے لکھنؤ کی انجمن کو اپنی جیب میں لیے بیٹھے تھے۔ ان صاحب کی بے عملی اور نکما پن سب پر ظاہر تھا، سوا مولوی عبدالحق صاحب کے۔ چنانچہ چلتے وقت وہ لکھنؤ کی انجمن کا کام اور اس کی معتمدی دوبارہ انھیں صاحب کو سونپ گئے۔ مولوی صاحب کے جانے کے بعد لکھنؤ میں انجمن پھر پہلے کی طرح غائب ہوگئی اور سبط حسن کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔

لیکن سبط حسن ہار ماننے والے انسانوں میں سے نہیں تھے۔ اب انھوں نے ایک اور بھی بڑا منصوبہ بنایا۔ یہ اُردو زبان کی ہر سطح، ہر مکتبِ خیال اور ہر قسم کے ادیبوں کی ایک عظیم انجمن قائم کرنا تھا، جس کا بنیادی مقصد ادیبوں کے حقوق کی حفاظت کرنا، ضرورت پڑنے پر ان کی مالی امداد کرنا، ان کی تحریروں کی اشاعت میں ان کی مدد کرنا وغیرہ تھا۔ اس اسکیم کے ساتھ بھی مختلف مقامات پر ادبی مرکز اور دارالمطالعہ وغیرہ قائم کرنے کا مقصد شامل تھا۔ اس قسم کی ایک اسکیم مسعود اختر جمال نے بھی تیار کرلی تھی۔ بعد میں یہ دونوں اسکیمیں شاید مدغم کردی گئیں۔ گو اس کا مجھے یقین نہیں۔ جگر صاحب، جوش صاحب، فراق صاحب، مجنوں اور دوسرے بہت سے ادیبوں نے مصنّفین ٹریڈ یونین بنانے کی اس اسکیم کو بہت پسند کیا۔ سب نے حتی المقدور اس کی مالی امداد کے بھی وعدے کیے۔ اس کا دستور العمل بھی بن گیا۔ بھلا کون ایسا مصنف ہوسکتا ہے جو اتنی اچھی تجویز کی مخالفت کرتا؟ ہر مصنف کا ناشروں کے ہاتھوں استحصال ہوتا ہے۔ اس کی آزادیِ رائے اور تحریر پر پے در پے حملے ہوتے ہیں، اسے اپنا پیٹ پالنے کے لیے اپنی صلاحیتوں اور قلم کو جاہل سرمایہ داروں کے ہاتھوں بیچنا پڑتا ہے۔ تو پھر اگر وہ سب ایک ساتھ مل کر دوسرے محنت کشوں سے سبق لے کر متحد ہوں اور اپنی تنظیم کریں تو کیا وہ بھی اپنی معاشی، اپنے قلم اور اپنی خودداری کا تحفظ

نہیں کر سکتے ؟ یہ اسکیم کوئی دو سال تک تجویزوں، مشوروں، بحثوں اور مسودوں کی سطح پر چلتی رہی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور کسی خوش آئند مستقبل میں دوبارہ زندہ کرنے کے لیے بھلا دی گئی۔

ان باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے بہت سے ذمہ دار کام کرنے والوں میں کم اہم اور زیادہ اہم، ممکن اور قابل عمل لیکن نسبتاً چھوٹے، اور خوشنما لیکن دسترس سے باہر اور بڑے کاموں کو چن لینے اور پرکھنے کی اس وقت تک صلاحیت نہیں تھی۔ ہر ہر قدم پر ہم کو اس قسم کی الجھنوں کا سامنا ہوتا تھا۔ ناتجربہ کاری کے علاوہ، غالباً یہ رجحان ہم میں دانشور طبقہ کی اس پتی بورژوا خصلت کے سبب سے بار بار ابھر آتا ہے جس کی نشانی یہ ہے کہ اپنے کو ہر چیز اور تجربے کا منبع اور مرکز سمجھا جائے۔ ساجھے، اشتراکیت اور ڈسپلن کے ساتھ ایک منظور شدہ تنظیم اور منصوبے کے ماتحت دل لگا کر کام کرنے سے گریز کیا جائے۔ جہاں اپنی ذات کی ہر لحہ خود نمائی نہ ہو، ایسی اجتماعیت سے بھاگ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی جائے۔ ہم میں سے اکثر کو ایسا کرتے وقت اس کا احساس نہیں ہوتا کہ ہم دراصل اپنے طبقے کی خود پرستی اور حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت کا شکار ہیں۔ اس لیے کہ ہم اپنی علاحدیت کو قائم کرنے کے لیے بڑا جوش و خروش دکھاتے ہیں اور بڑی محنت کرتے ہیں، اور سوچتے ہیں کہ آخر جب ہم اتنی محنت کر رہے ہیں اور سب کے بھلے کی بات کر رہے ہیں تو ہم توصیف اور تعاون کے مستحق ہیں، نہ کہ اس کے کہ لوگ ہم سے کترائیں اور بالآخر ہماری امداد نہ کر کے ہم کو ناکامیاب بنا دیں۔ لیکن خود پر مرکوز خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کرنا اپنی ہی غلطی یا خامی کو کھوجنے، اسے تسلیم کرنے اور اس کی تصحیح کر کے ٹھیک راستہ پر چلنے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ سہل ہے۔ اس لیے ناکامیوں کے تجربے اکثر درمیانہ طبقے کے دانشوروں میں سمجھداری، شعور اور انکسار پیدا کرنے کے بجائے ان میں پست ہمتی، تلخی اور ابنائے جنس کے ساتھ نفرت کا جذبہ بھر دیتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی انانیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے وہ دوسروں کو ایذا رسانی ان کی حق تلفی اور ان کی آزادی کو کچلنے سے حذر نہیں کرتے اور اس طرح موجودہ سماج میں بہت سے چھوٹے اور بڑے ہٹلر پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کا اگر اور کسی پر بس نہیں چلتا تو اپنے ناکام منصوبوں، اور مسدود تمناؤں سے پیدا ہونے والی مایوسیوں اور گھٹن کا انتقام لینے کے لیے ان کی بیوی اور معصوم بچے، ان کے عزیز اور

دوست تو بہر حال موجود ہی ہوتے ہیں۔

اس بے لگام انانیت کا علاج ہمارے بعض دینی پیشواؤں، صوفیوں اور بھگتوں نے نفس کشی تجویز کیا ہے اور اس کے لیے بڑی سخت جسمانی اور روحانی ریاضتیں تجویز کی ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ نفسیاتی امراض، جو سماج کی طبقاتی تقسیم اور انسانوں کی اکثریت پر اہل دَوَل کی ایک چھوٹی سی اقلیت کے استحصال اور غلبہ سے پیدا ہوتے ہیں، محض اخلاقی پند و نصائح اور روحانی ریاضتوں کے ذریعہ رفع نہیں کیے جا سکتے۔ ان کا مکمل انسداد تو ایک غیر طبقاتی سماج کی تشکیل کے بعد ہی ہو سکے گا، جب انسان نئی معاشرت کے اجتماعی عمل میں کافی طویل مدت تک حصہ لے کر اپنے عادات و خصائل اور سوچنے کے طریقوں کو بھی رفتہ رفتہ بدلیں گے۔

البتہ موجودہ طبقاتی سماج میں درمیانہ طبقہ کے افراد اور خاص طور پر دانشور اپنے ان مذموم خصائل پر قابو پا سکتے ہیں۔ اگر وہ یہ سمجھیں کہ ان کی بہترین انسانی خصلتوں اور ذہنی صلاحیتوں کو اسی صورت میں بروئے کار لایا جا سکتا ہے، جب وہ اپنے کو موجودہ عہد کی سب سے زیادہ جانفزا اور روح پرور اور عظیم اجتماعیت کے ساتھ منسلک کریں، اس اجتماعیت کے ساتھ جس کے فلسفے، نظریے اور طریق کار کی بنیاد جدید محنت کش طبقے کے مشترکہ تخلیقی عمل اور اس کے تجربے پر ہے۔ یہی وہ حبل متین (مضبوط رسی) ہے جو ہمیں انسان دشمنی کے تاریک اور خطرناک غاروں، اور ذہنی و رُوحانی سمیت کے جاں گسل جہنم میں ٹھوکر کھا کر گرنے سے بار بار بچاتی ہے، اور اگر ہم اپنی طبقاتی خود پرستی کے جذبے سے مجبور ہو کر کبھی کبھی گڈھوں میں گر بھی جاتے ہیں تو ہم میں سے ان کو، جن کے ہاتھ سے وہ چھوٹ نہیں جاتی، پستیوں کی طرف سے بلندی کی طرف لانے میں ہماری مدد کرتی ہے۔

ترقی پسندی، انفرادی اور اجتماعی عمل کے تجربے سے اپنی فکر اور نظر میں مسلسل گہرائی پیدا کرنے اور نئی اور اَن دیکھی سچائیوں اور حقیقتوں کے شعور کا دوسرا نام ہے۔ یہی تازہ سچائیاں اور نئی دریافت کی ہوئی حقیقتیں، ہمارے واسطے عمل کی نئی اور صاف راہیں کھول دیتی ہیں، ہمارے عمل کو زندگی کے سب سے اہم تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی ہیں، اور اس طرح پیہم حیات افزا اور انقلابی نظریہ اور علم سے اپنے ذہن کو منور کر کے اور اپنے عزائم اور مقاصد کو ایک بیدار شعور کا حصہ

بنا کر انسانیت کو ارتقا کے اگلے زینے پر چڑھنے اور اس کی آئندہ منزل کی طرف بڑھنے میں مدد دیتی ہیں۔ اس روشن راہ پر عمل کا چھوٹے سے چھوٹا قدم بھی ہمیں ترقی کے راستے پر آگے بڑھاتا ہے۔ لیکن ایسے عمل، جو اس طرح سے وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق اور ان کے متوازن نہیں ہوتے، چاہے وہ بظاہر کتنے ہی بڑے اور دلفریب کیوں نہ نظر آتے ہوں، ہم کو آگے نہیں بڑھا سکتے، بلکہ ہماری قوت کو اور تنظیم کو پراگندہ کر کے ہمیں پیچھے کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

چونکہ ہماری تحریک کے تانے بانے میں اس کے آغاز ہی سے سائنٹیفک اجتماعی تصورات کے سرخ ڈورے بھی موجود تھے، اور چونکہ ہماری تحریک محنت کش عوام، ان کی تنظیموں اور ان کی جدوجہد سے وابستگی اور قریبی تعلق کو اپنے ارتقا کے لیے ضروری سمجھتی تھی، اس لیے پراگندگی اور انتشار، جلد بازی، انتہا پسندی، سستی، مایوسی یا موقع پرستی کے جو رجحانات وقتاً فوقتاً ہمارے درمیان اٹھتے تھے، ان کے تدارک کی بھی ہم میں صلاحیت پیدا ہونے لگی تھی۔ سنجیدہ اور مفید تنقید اور خود تنقید کا مادہ رفتہ رفتہ ہم میں بڑھتا جاتا تھا۔ غلطیوں اور عارضی ناکامیوں سے مایوس ہونے کی بجائے ہم کو ان سے سبق سیکھنے اور اس تجربہ کی بنیاد پر بہتر روش اختیار کرنے کی توفیق ہونے لگی تھی۔

چنانچہ سبط حسن، مجاز، اور سردار جعفری نے اب اُردو کا ایک ایسا ادبی رسالہ جاری کرنے کا منصوبہ بنایا جو ترقی پسندی کے معیار پر پورا اُترے اور جو ایک مرکزی حیثیت سے ترقی پسند ادب کے اُردو حصے کی تخلیق، تنظیم اور راہ نمائی میں مددگار ثابت ہو۔ 1941 کے شروع سے لکھنؤ سے ''نیا ادب'' جاری ہوا۔

''نیا ادب'' باقاعدہ اور آفیشیل طور پر ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کا ترجمان نہیں تھا۔ لیکن غیر رسمی طور پر اور فی الحقیقت یہ بہت جلد ہماری تحریک کا ترجمان بن گیا، اور اُردو کا ہر ترقی پسند مصنف اور تحریک سے دلچسپی رکھنے والا اسے پڑھنا ضروری سمجھنے لگا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُردو کے دوسرے رسالے، جو ترقی پسند رجحانات لیے ہوئے دوسرے ادبی مرکزوں سے شائع ہو رہے تھے (لاہور سے ''ادب لطیف''، پٹنہ سے ''شمیم'')، ان کی ضرورت یا افادیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اُردو کا علاقہ اس قدر وسیع ہے اور اس کے اہم مرکز اتنے متعدد ہیں (مثلاً کلکتہ، پٹنہ، لکھنؤ، دہلی، لاہور، بمبئی، حیدرآباد دکن وغیرہ) کہ اچھے معیاری رسالے ان تمام جگہوں سے نکالے جا

سکتے تھے اور نکلتے تھے۔ پھر بھی ایک ایسے رسالے کی ضرورت تھی جس میں ہر علاقے کے بہترین لکھنے والوں کی چیزیں شائع ہوں، جو مختلف علاقوں اور مرکزوں کی ادبی سرگرمیوں کی خبریں مرکزی طور پر اکٹھا کر کے سب کو پہنچائے اور جو تنقید کا ایسا نظریاتی معیار قائم کرے جس سے سب کو مدد مل سکے۔

''نیا ادب'' ان ہی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر جاری کیا گیا۔اس کے صلاح کار اور معاونوں میں جوش صاحب، فراق، علیم، مجنوں اور میں...... سبھی شامل تھے۔ بعد میں جب جوش صاحب کا ''کلیم'' بند ہو گیا تو ''کلیم'' کا نام بھی ''نیا ادب'' کے ساتھ شامل کر دیا گیا اور جوش صاحب کا نام رسالے کے اوپر مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے شائع ہونے لگا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس رسالے کے اصلی چلانے والے سبط حسن، سردار جعفری، اور مجاز ہی تھے، انھیں تینوں نے شروع میں اپنے پاس سے پانچ پانچ سو روپے فی کس کے حساب سے اس میں لگائے اور پھر اپنے احباب اور جاننے والوں سے، اور رسالے کے مستقل خریدار بنا کر اور ایک دو اشتہار حاصل کر کے شاید اتنی ہی رقم اور جمع کی۔اس زمانہ میں سال چھ مہینہ تک ایک ماہنامہ رسالہ نکال لینے کے لیے یہ رقم کافی تھی۔ بشرطیکہ ایڈیٹر، منیجر، اور لکھنے والے کوئی معاوضہ یا مشاہرہ نہ لیں۔ چند مہینوں کے لیے لکھنؤ کے ایک اُردو نواز رئیس نے رسالے کے دفتر کے لیے لکھنؤ کے سب سے فیشن ایبل بازار حضرت گنج میں ''نیا ادب'' کے لیے دفتر بھی دے دیا۔لیکن ان کی یہ عنایت تھوڑے دنوں کے بعد معاونت میں بدل گئی، اور بالآخر رسالے کا دفتر وہیں پہنچ گیا جس کا کہ وہ اپنے افلاس کے سبب مستحق تھا، یعنی سبط حسن اور سردار جعفری کے رہنے کے چھوٹے سے کمرے میں۔ ان دونوں صاحبوں کی مالی کیفیت کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ ان کی جائے سکونت بھی بدلتی رہتی تھی۔آج لال باغ میں شان سے رہ رہے ہیں تو کل گولہ گنج کے ایک کھنڈر میں، اور وہاں سے نکلے تو بٹلر گنج میں کسی دوست کے مکان میں چند مہینوں کے لیے پناہ گزیں ہیں۔

ان تمام مشکلات کے باوجود سبط حسن اور سردار جعفری ''نیا ادب'' کو نکالنے اور اسے جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔ان دونوں کی محنت اور امنگ کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی بات جو اس رسالے کو کافی دیر تک جاری رکھنے میں مددگار ثابت ہوئی، وہ اس کی غیر معمولی

مقبولیت تھی۔اس کی اشاعت برابر بڑھتی رہی۔اس مقبولیت کا سبب ظاہر ہے، وہ ہماری تحریک کو اس کے ابتدائی دور میں ایک لڑی میں پروتا تھا۔اس میں جو چیزیں شائع ہوتی تھیں......تنقید، ادبی معلومات کے مضامین، افسانے اور نظمیں......وہ ایک ٹھوس طریقے سے تمام ترقی پسند ادیبوں اور تحریک سے ہمدردی اور دلچسپی رکھنے والوں کے سامنے مثالی حیثیت سے یہ کہہ کر پیش کیے جا سکتے تھے کہ ''یہ ہمارا ترقی پسند ادب ہے'' اور یہ ہے ترقی پسند مصنّفین کا نقطۂ نظر! بالآخر ہماری قوم ہمیں ہمارے دعوؤں سے نہیں بلکہ ہمارے تخلیقی کاموں سے ہی جانچے گی۔ اگر ہماری تخلیقوں میں لطافت اور سچائی ہوگی، عہد حاضر کی زندہ روح ہوگی اور لوگ ان کی مدد سے زندگی کے مسائل کو بہتر طریقے سے سمجھ کر آگے بڑھنے کی راہ دیکھ سکیں گے، تو پھر وہ بااثر اور مقبول بھی ہوں گی۔

ظاہر ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ ''نیا ادب'' میں جو چیزیں شائع ہوئیں وہ سب کی سب اعلیٰ درجے کی اور معیاری تھیں، یا یہ کہ ترقی پسند نقطہ نظر کی وضاحت کرنے میں اس نے کبھی بھی غلطیاں نہیں کیں اور اس کی تنقید میں خامیاں نہیں تھیں۔ ہمارے نقطہ نظر میں آج بھی کمزوریاں اور الجھاؤ، اختلاف اور اونچ نیچ وقتاً فوقتاً نظر آتے رہتے ہیں، اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ انسانی کاموں میں تکمیل کا دعویٰ کرنا تو کسی وقت پر اور کسی چیز کے لیے بھی نادانی ہے۔ یہ چیز ہمیں الہامی صحیفوں پر عقیدہ رکھنے والوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔

''نیا ادب'' لکھنؤ سے 1942 کے آخر تک نکلتا رہا۔اس زمانہ کے شماروں پر اگر ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس کی کیفیت کچھ اس باغ کی سی نظر آتی ہے، جو ابھی نیا لگایا گیا ہو۔ زمین پر چند بڑے تناور اور سایہ دار درخت پہلے سے لگے ہیں، چند پھول دار بیلیں جو پہلے سے موجود ہیں، ہوا میں لہرا رہی ہیں، روشوں اور کیاریوں کی حدیں بنا دی گئی ہیں، ہالوں میں نرم اور نازک پودے نکل آئے ہیں، اور ایک دو رنگین پھول یہ پتہ دے رہے ہیں کہ موسم آنے پر سارا تختہ ان سے بھر جائے گا۔ موسمی پھولوں کے پودے اگر ایک طرف ہیں تو گلاب اور چنبیلی کی قلمیں بھی لگی ہیں۔ بہتے ہوئے پانی کی آواز، اور سبزے کی تراوٹ بتا رہی ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا، یہ باغ نکھرتا اور سنورتا جائے گا۔اس کے مالی ہوشیار اور چابکدست ہیں۔

''نیا ادب'' کے ان شماروں میں جوش کی چند معرکۃ الآرا نظمیں ہیں (باغی روحوں کا

کورس، جہاں میں تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب)۔ فراق کی بعض وہ غزلیں ہیں جن کے شعر کی نئی آہنگ نے ہماری ادبی دنیا میں ایک نئی روح پیدا کر دی۔

سیّاروں میں کب پہلے یہ گردش و تابش تھی
ہیں موڑ یہ صدیوں کے، دن ایک مہینے کے
نادیدہ فضاؤں میں تارے چھٹک آئے ہیں
یا چہرۂ فردا پر قطرے ہیں پسینے کے

فراق کا مضمون ''نئے ادب میں غزل کی جگہ''، مجنوں گورکھپوری کا ''ترقی پسند ادب''، فیض احمد فیض کا ''ترقی پسند ادب''، احتشام حسین کا ''قدیم ادب اور ترقی پسند نقاد''، ڈاکٹر عبدالعلیم کا ''ادبی تنقید کے بنیادی اصول'' وغیرہ ایسے مضامین ہیں، جنھوں نے اُردو ادب میں تنقید کے نئے نظریے کی بنیاد رکھی۔ نئے شاعروں میں ہم کو مجاز، مخدوم محی الدین، سید مطلبی، سردار جعفری، علی جواد زیدی، مسعود اختر جمال وغیرہ کی نظمیں ملتی ہیں، جن میں ہماری شاعری کے آغاز کی پُر امید رومانیت، انقلاب پرستی اور حب وطن کے فروزاں شعلے بھڑک رہے ہیں۔ اس کے افسانوں کا حصہ نسبتاً کمزور ہے۔ اس لیے کہ کرشن چندر، بیدی وغیرہ اس وقت تک اکثر پنجاب کے رسالوں میں ہی لکھتے تھے۔ پھر بھی عصمت چغتائی، کرشن چندر، منٹو، اختر رائے پوری، احمد علی، حیات اللہ انصاری، سردار جعفری کے افسانے مختلف نمبروں میں موجود ہیں۔ یہ باتیں میں اپنی یادداشت سے لکھ رہا ہوں۔ سرِ دست ''نیا ادب'' کے تین چار نمبروں کے علاوہ دوسری کاپیاں میرے پاس موجود نہیں ہیں۔ بیرونی ترقی پسند ادب کی نمائندگی میکسم گورکی اور چینی افسانوں کے ترجموں سے کی گئی۔ جدید چینی افسانوں کے بہت اچھے ترجمے پٹنہ کے تمنائی نے کیے تھے، جو بعد کو کتابی شکل میں ''زندہ چین'' کے نام سے شائع ہوئے۔

رسالہ ''نیا ادب'' کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے ان نوجوان ترقی پسندوں نے ترقی پسند ادب کی کتابیں چھاپنے اور انھیں شائع اور فروخت کرنے کے لیے ایک دارالاشاعت بھی قائم کیا۔ اس کا نام ''حلقۂ ادب'' تھا۔ اس کی طرف سے اس زمانہ میں مجاز کے کلام کا مجموعہ ''آہنگ''، حیات اللہ انصاری کے افسانوں کا مجموعہ ''انوکھی مصیبت''، سردار جعفری کے افسانوں کا مجموعہ ''منزل''، اور

سجاد ظہیر کا ناول ''لندن کی ایک رات'' شائع کیے گئے۔ اس ادارے نے ''آزادی کی نظمیں'' کے نام سے ایک مجموعہ بھی شائع کیا، جسے سبط حسن نے مرتب کیا تھا اور جس میں غالب سے لے کر اس وقت تک کی اُردو کی سیاسی اور انقلابی نظموں کا انتخاب تھا۔ جب آزادی کی نظمیں شائع ہوئیں، اس وقت دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو چکی تھی۔ میں لکھنؤ کی جیل میں گرفتار تھا۔ سبط حسن مجھ سے ملنے کے لیے وہاں آئے اور پھلوں اور سگرٹوں کے تحفے کے ساتھ مجھے اس کتاب کی بھی ایک کاپی دی۔ اُس تشدد اور ابتلا کے دور میں ''نیا ادب'' اور ترقی پسند کتابوں کی اشاعت کو جاری رکھنا دراصل بڑی ہمت کا کام تھا۔ آزادی کی نظمیں پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور دل مضبوط ہوا۔ کوئی شخص اسے پڑھنے کے بعد یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُردو ادب کے بہترین خلاقوں نے وطن کی آزادی کی جدوجہد میں اس کے ہر موڑ پر اپنی قوم کے بلند ترین جذبات اور خواہشات کی پُر جوش ترجمانی نہیں کی ہے۔ اس مجموعے میں دوسری عالمگیر جنگ کے موضوعات تک نظمیں تھیں، جوش صاحب کی ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'' اور سردار جعفری کی تازہ ترین نظم، جس کا پُر جوش آغاز اس شعر سے ہوا تھا......

رقص کر اے روحِ آزادی کہ رقصاں ہے حیات
گھومتی ہے وقت کے محور پہ ساری کائنات

اس نظم کے لکھے جانے کے تھوڑے ہی دنوں بعد سردار جعفری بھی گرفتار کر لیے گئے۔ اب سبط حسن اکیلے رہ گئے۔ اس لیے کہ مجاز پہلے بھی دفتری کام نہیں کر سکتے تھے اور وہ لکھنؤ چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔ البتہ اس زمانہ میں ''نیا ادب'' کے چلانے میں رضا انصاری (فرنگی محل) کی مدد بہت کچھ شامل تھی۔ طباعت اور اشاعت اور منیجری کے کاموں میں جو غیر دلچسپ محنت اور باقاعدگی ضروری ہے، اس کی صلاحیت فرنگی محل کے اس نوجوان باریش پیرزادے میں پوری طرح موجود تھی۔ وہ فرنگی محل کے دینی مدرسے میں معلم تھے اور خود ان کی اپنی تعلیم وہی پُرانے طرز پر کی تھی۔ رضا، حیات اللہ انصاری کے رشتے میں شاید بھانجے یا بھتیجے تھے، گو کہ عمر کے لحاظ سے کچھ ہی چھوٹے تھے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک سے انھیں گہرا لگاؤ تھا اور حیات اللہ کی طرح گھر کے بزرگوں کے طعن تشنیع کے باوجود وہ ثابت قدمی کے ساتھ نئی تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے

''نیا ادب'' کے لیے عربی کے ترقی پسند ادب سے کچھ ترجمے بھی کیے اور عرب کی تحریک آزادی پر مضامین لکھے۔ 1942 کے ختم پر جب ''نیا ادب'' لکھنؤ سے نکلنا بند ہو گیا (وہ دوبارہ بمبئی سے جاری کیا گیا جہاں سبط حسن اور سردار جعفری دونوں آ گئے تھے) تو رضا انصاری نے بڑی ہمت کر کے ''منزل'' کے نام سے ایک ترقی پسند ماہنامہ نکالا، جو دراصل ''نیا ادب'' کا ہی دوسرا نام تھا۔

جنگ کے چھڑنے کے چند مہینے بعد شہری آزادیاں سلب کی جانے لگیں، اور جو ترقی پسند ادیب اشتراکی تحریک سے بھی تعلق رکھتے تھے، ان میں سے بیشتر گرفتار ہو گئے۔ اس کے سبب سے انجمن کی تنظیم تعطل کی حالت میں آ گئی۔ انجمن کے باقی ماندہ ممبر اور کارکن جلسے کرنے سے گھبرانے لگے، اس لیے کہ ایسا کرنا اپنے کو گرفتاری کے خطرے میں ڈالنا تھا۔ تنظیمی اعتبار سے 1940 کے بعد سے لے کر 1942 کے ختم تک کا زمانہ ہماری انجمن کی تنظیم کے تعلق اور اس کے جلسوں اور کانفرنسوں کے بند ہو جانے کا زمانہ ہے۔ حکمران اور رجعت پرست غالباً مطمئن اور خوش تھے کہ انھوں نے اس تحریک کو کچل کر ختم کر دیا ہے۔ لیکن ٹھیک اسی زمانے میں فیض کی ''نقشِ فریادی''، کرشن چندر کی ''طلسم خیال''، بیدی کی ''دانہ و دام''، ندیم اور اشک کے افسانوں کے مجموعے لاہور کے ''مکتبہ اُردو'' کی طرف سے شائع ہوئے۔ ٹھیک اسی زمانہ میں ''ادب لطیف'' اور ''نیا ادب'' میں ترقی پسند شاعری، تنقید اور افسانوں کے اچھے نمونے (پہلے کے دو تین سال کے مقابلے میں) پیش کیے گئے اور غالباً سب سے بڑی بات یہ تھی کہ نئے لکھنے والے، جو ابھی یا تو طالب علم تھے یا باقاعدگی سے ادیبوں کی صف میں داخل نہیں ہوئے تھے، ترقی پسند ادب کی تحریک اور ترقی پسند نظریہ سے متاثر ہوئے۔ وہ تمام لوگ جن کے نام ہم پہلی بار 1943 اور 1944 سے ترقی پسند ادیبوں کی حیثیت سے سنتے ہیں، اسی زمانے میں ترقی پسندی کی طرف کھنچ رہے تھے، مثلاً احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، ظہیر کاشمیری، عبداللہ ملک، کیفی اعظمی، عبادت بریلوی، وامق جونپوری، ممتاز حسین، ابراہیم جلیس، سلیمان اریب، شاہد صدیقی، ہنسراج رہبر، پرویز شاہدی وغیرہ۔ یہی بات اس کی ضمانت تھی کہ رجعت پرست عناصر کی توقعات کے برخلاف اس زمانے میں جب کہ وہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے تشدد اور جبر کے ذریعہ ترقی پسند ادب کی تحریک کو ختم کر دیا ہے، پہلے کے لکھنے والوں میں سے اکثر کا شعور زیادہ پختہ اور وسیع ہو رہا تھا۔ ترقی پسند ادب کی تخلیق

جاری تھی، اور ترقی پسند نظریوں کا بیج نئے اور ہونہار دانشوروں کے ذہنوں میں پیوست ہو کر ہمارے ادب کے دامن کو نوساختہ پھولوں سے بھر دینے والا تھا۔

ان ترقی پسند ادیبوں کی استقامت، جو 1940 سے 1942 تک کے زمانے میں اپنی تحریروں سے، رسالوں اور کتابوں کی اشاعت کر کے ہماری تہذیب کے کارواں کو بڑے مشکل حالات میں آگے بڑھاتے رہے، میرے لیے غیر معمولی مسرت کا باعث تھی، اور اس کے سبب سے حبس وقید کی روح فرسا تکلیف کافی کم ہو جاتی تھی۔ مجھے لکھنؤ میں ''نیا ادب''، ''ادب لطیف''، اور ''ادبی دنیا'' باقاعدگی سے ملتے تھے۔ فیض کی نظموں اور مضامین اور بیدی اور کرشن چندر کے افسانوں، احتشام اور اختر انصاری اور کئی اور ترقی پسند ادیبوں کی نگارشات سے فی الحقیقت میں اسی زمانے میں اچھی طرح متعارف ہوا اور میں نے بھی سبط حسن سے وعدہ کیا کہ میں ''نیا ادب'' کے لیے باقاعدگی سے مضامین لکھ کر حتی الامکان ''نیا ادب'' کی مدد کرتا رہوں گا۔ ادبی مضامین کی اشاعت پر زیادہ روک ٹوک بھی نہیں تھی۔ اس لیے میرے لیے ایسا کرنا ممکن تھا۔ چنانچہ میں نے جیل ہی میں ''یادیں'' کے عنوان سے مضمون لکھ کر سبط حسن کو ''نیا ادب'' کی اشاعت کے لیے بھجوا دیا۔ مرزا جعفر علی خاں اثر صاحب نے ترقی پسند ادب کی تحریک پر جو اعتراضات کیے تھے، اس کا جواب بھی لکھا، جو ''سراج مبین'' کے نام سے ''نیا ادب'' میں شائع ہوا۔ اسی زمانے میں میں ہندی بھی سیکھ رہا تھا اور ہندی کا ترقی پسند رسالہ ''ہنس'' باقاعدگی کے ساتھ پڑھتا تھا۔ اس زمانہ میں ''ہنس'' کے ایڈیٹر شیوودان سنگھ چوہان اور پریم چند جی کے بڑے بیٹے شری پت رائے تھے۔ چوہان کی ایڈیٹری سے پریم چند جی کے قائم کیے ہوئے اس رسالے کا کردار پوری طرح سے ترقی پسند ہو گیا اور وہ ہندی میں ترقی پسند ادب کی تحریک کا ترجمان بن گیا۔ ہندی کے ترقی پسند شاعر سمترا نند پنت پر، شیوودان سنگھ چوہان کے مضمون سے اخذ و اقتباس کر کے میں نے ایک مضمون پنت جی کی شاعری کے متعلق بھی لکھا اور ہندی سے کچھ اور ترجمے بھی کیے جو ''نیا ادب'' میں شائع ہوئے۔

سامراجی حکمرانوں کی طرف سے تو ہماری تحریک پر شروع سے ہی حملے ہو رہے تھے (اخبار ''اسٹیٹس مین'' کے مضامین کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے)۔ جنگ کے غیر معمولی حالات

سے فائدہ اُٹھا کر یہ حملہ اور بھی شدت اختیار کر گیا۔ لیکن اب رجعت پرست ادبی حلقوں کی طرف سے بھی ہم پر دو جانب سے حملے شروع ہوئے۔

ترقی پسند ادبی تحریک کے معترضین ایک تو پرانے خیال کے قدیم ادبی لکیروں پر چلنے والے حضرات تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ترقی پسند زبان ''خراب'' کر رہے ہیں، ان کی لکھی ہوئی چیزوں میں حسن نہیں ہوتا، وہ انسانوں کی اصلاح کرنے کے بجائے ان کو خونی انقلاب، نفرت اور تخریب کا سبق دیتے ہیں، وہ بے دینی اور لامذہبیت پھیلاتے ہیں۔ وہ اخلاق اور آداب سے بغاوت اور جنسی بے راہ روی کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کے خیالات اور نظریے بیرونی اور اجنبی ہیں اور وہ ہماری تہذیب کی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کے معترضین میں دو قسم کے لوگ تھے۔ دیانت دار، قابل احترام اور بددیانت اور قابل نفریں! اول الذکر میں جگر مراد آبادی، مرزا جعفر علی خاں اثر، پروفیسر رشید احمد صدیقی، خاص لوگوں میں تھے۔ موخر الذکر میں فرقہ پرستی سے سرشار چند ''بے ادب'' جہلا تھے، جنھیں ادب، تہذیب و تمدن کے صحیح معنی بھی نہیں معلوم تھے، جو اسلام کے نام پر ہم پر حملہ کرتے تھے لیکن خود ننگِ اسلام تھے، جنھیں مسلمانوں کے بہترین اخلاق اور تمدنی روایات کی ہوا بھی نہیں لگی تھی، اور جن کی دکان کی رونق مذہب کی بنا پر اس ملک کے بسنے والے مختلف فرقوں میں بغض و عناد کی آگ بھڑکانے پر قائم تھی۔ اسی قسم کے بہت سے پرانے مکتب خیال کے ہندی ادیب ہندی کے ترقی پسند مصنّفین پر بھی اپنی ہندو فرقہ پرست ذہنیت کی بنیاد پر حملے کرتے تھے۔ ایک کو ہندوؤں سے نفرت تھی تو دوسرے کو مسلمانوں سے...... اور دونوں کو ترقی پسند مصنّفین سے اس سبب سے نفرت تھی کہ ترقی پسند مصنّفین ان میں سے کسی طرح کے بھی فرقہ پرست نہیں تھے۔ بلکہ آزادی اور جمہوریت کے لیے سامراج اور جاگیردار اور قوم فروش سرمایہ دار عناصر کے خلاف ہر فرقہ کے عوام کو متحد کرنے کا پیغام دیتے تھے۔

دُوسرے پہلو سے ہم پر اعتراض کرنے والے جدید اور ''نئے'' خیالات کے لوگ تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ترقی پسند ادب کی تحریک، ادب میں افادیت اور مقصدیت داخل کر کے ادب کو اس کے اصلی منصب سے نیچے گرا رہی ہے۔ ان کے نزدیک ادیب کا یا فنکار کا مقصد ادبی یا فنی تخلیق سے صرف اپنے جمالیاتی حظ کی تسکین ہے۔ کسی بھی خیال، نظریہ یا مقصد کی پابندی سے فنکار کی

تخلیقی قوت فنا ہو جاتی ہے۔ فنکار کی اپنی ایک اندرونی دنیا ہوتی ہے، الفاظ ایک الہامی کیفیت رکھتے ہیں۔کوئی پُراثر قوت (خواہ وہ الوہی ہو یا فطرت کی طرف سے ودیعت کی ہوئی ہو) فنکار کو تخلیق پر مجبور کرتی ہے۔ فنکار کی ذمہ داری اسی قوت کو کام میں لانے کی ہے، وہ اپنے سامعین، قارئین، ناظرین، سماج یا عوام یا نوع انسانی کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔

ترقی پسند ادب کی پہلی قسم کے معترضین زیادہ تر یو۔ پی میں پائے جاتے تھے اور دوسری قسم والے پنجاب میں۔ پنجاب میں ان کا خود ''حلقہ ارباب ذوق'' تھا۔

جہاں تک پہلی قسم کے قدامت پرست معترضین کا سوال ہے، ان میں سے پہلے گروہ کے حضرات کے ساتھ ہماری تحریری اور زبانی بحثیں ہوئیں۔ مرزا جعفر علی خاں اثر صاحب کا مضمون ''نیا ادب کدھر جا رہا ہے؟'' ''نیا ادب'' میں شائع کیا گیا۔ پھر کئی مضامین میں اس کا جواب دیا گیا۔ اثر صاحب کی دلیلیں اگرچہ الجھی ہوئی تھیں اور خونچکاں انقلاب کے متعلق ان کے تصورات وہی تھے جو اوپری طبقے کے رجعت پرستوں کے ہوتے ہیں (یعنی سماج میں محنت کشوں اور روزانہ ہونے والے تشدد اور مظالم کی طرف سے تو آنکھیں بند کر لینا، لیکن جب محنت کش اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے غاصبوں اور ظالموں سے جدوجہد کریں تو الٹے محنت کشوں پر قانون شکنی، فساد اور تشدد کا الزام لگانا)، لیکن وہ اس کو تسلیم کرتے تھے کہ ادب کا کام انسان کے شعور کو متاثر اور بیدار کر کے، خیالات کو اس طرح بدلنا ہے کہ پھر ان کے اثر سے اعمال بھی صحیح اور پاک ہوں۔ اس طرح ان کے ساتھ ہمارا اختلاف ادب کے مقاصد اور ادب کے اسلوب کے متعلق نہ تھا، بلکہ ان خیالوں اور مقاصد کے متعلق تھا جن کو ہم اپنی ادبی تخلیقوں کے ذریعہ سے پیش کرتے تھے۔ اگر اثر صاحب صرف یہ کہتے کہ ان خیالات کو نفاست، حسن اور خوش اُسلوبی کے ساتھ پیش کرو تو ہمارا ان کا اختلاف بہت کم ہو جاتا۔ اس لیے کہ ترقی پسند مصنف خود بھی اپنی خامیوں کو محسوس کرتے ہی تھے۔ ان کو اپنی زبان پر کافی قدرت نہ تھی، ان کا تجربہ گہرا اور وسیع نہ تھا، عوامی زندگی سے وہ کماحقہ واقف نہ تھے۔ لیکن زبان پر قدرت، علم اور تجربہ ایک دن میں تو حاصل نہیں ہوتا۔ سوال یہ تھا کہ کیا وہ سمت صحیح تھی جدھر ترقی پسند بڑھ رہے تھے؟ کیا وہ مقاصد درست تھے جنھیں وہ اختیار کر رہے تھے اور وہ مساعی مناسب تھیں جو وہ کر رہے تھے، یا نہیں؟

میرے خیال میں اس طرح کے بحث ومباحثے سے اچھے نتیجے برآمد ہوئے۔ جہاں تک ترقی پسند مصنّفین کا سوال ہے، انھوں نے ادب کے فنی مسائل پر زیادہ توجہ کرنی شروع کی۔ دوسری طرف جگر صاحب، اثر صاحب، رشید احمد صدیقی اور دوسرے بزرگ بھی ہماری تحریک کے خلوص اور ترقی پسند مصنّفین میں سے کئی کی ادبی صداقت اور ہنرمندگی کے معترف ہو گئے۔ ساتھ ہی کئی باتوں پر اختلاف کے باوجود ان کا رویہ، ترقی پسند مصنّفین کی طرف دوستانہ اور شفقت آمیز اور ہمدردانہ ہو گیا۔

جہاں تک متعصب فرقہ پرست یا جاہل گروہ کا تعلق تھا، ظاہر ہے کہ ان کا بغض وعناد ہمارے ساتھ لازمی اور فطری تھا۔ آخر ہماری تحریک ان کے اور ان کے سرپرست سامراجیوں، جاگیرداروں، رجواڑوں اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کے پھیلائے ہوئے اثرات اور تصورات کے خلاف تو تھی ہی۔ ہمارا مقصد ایسے لوگوں کو قائل کرنا نہ تھا، بلکہ بہت سے اچھے اور ایماندار لوگوں کو ان کے اثر سے نکالنا اور ان کے زہریلے پرچار کا شکار ہو جانے سے بچانا تھا جو لاعلمی اور غلط بیانی یا دقیانوسی عقیدوں اور خیالات کے عادتاً پابند ہونے کی وجہ سے ان رجعتیوں کے بہکانے میں آجاتے تھے۔

یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب ہمارے لکھے ہوئے ادب کی کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ اشاعت ہوتی، جب ترقی پسند مصنّفین اور شاعر عوام کے اجتماع میں جاکر اپنی لکھی ہوئی چیزیں انھیں سناتے اور اس طرح براہ راست ان لوگوں کے ساتھ ربط قائم کرتے جن کے لیے لکھنے کے وہ دعویدار تھے۔ اس طرح ہمارے لیے اگر عام فہم اور مقبول عام کتابیں اور رسالے شائع کرنا ضروری تھا تو دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ محنت کشوں اور درمیانہ طبقہ کے لوگوں کے جلسوں، مشاعروں، کانفرنسوں کو بھی منعقد کریں یا ان میں شریک ہوں۔

یہ کام ہماری کانفرنسوں کے ذریعہ ہونے لگا تھا۔ ہمارے شاعر اُردوداں طلبا اور بڑے بڑے شہروں کے ہندستانی بولنے والے اور ہندستانی جاننے والے مزدوروں کے اجتماعوں اور قومی جلسوں میں جاکر اپنی نظمیں سنانے لگے تھے، عام مشاعروں میں ان کی مقبولیت بڑھتی جاتی تھی

اور رفتہ رفتہ پبلک ان کی قومی اور انقلابی نظموں کو پرانی شاعری کے مقابلے میں زیادہ پسند کرنے لگی تھی۔

اس طرح ترقی پسند ادب عوام تک پہنچنے لگا تھا اور ہماری تحریک کو عوامی پسندیدگی حاصل ہونے لگی تھی۔ ہمارے مخالفین کے وسائل گو ہمارے مقابلہ میں بہت زیادہ تھے اور ہمارے خلاف ان کا پروپیگنڈہ بے شمار اخباروں، رسالوں اور جلسوں میں بدستور جاری تھا، لیکن وہ ہمیں عوام سے علاحدہ کرکے بے بس اور کمزور کر دینے سے قاصر تھے۔ اگر ان کے پیچھے دولت، اقتدار، تعصب اور جہالت کی قوت تھی تو ہمیں ملک کی آزادی پسند اور جمہوری عوامی تحریک اور زندگی کے نئے تقاضوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ جمہوری اور آزادی خواہ تحریکوں کے کارکن اور ان کے زیر اثر عوام ہمارے تھے، اور ہم ان کے۔

اس طرح تہذیبی محاذ پر بھی ایک مستقل جدوجہد شروع ہو گئی تھی۔

ہمارے دوسرے مخالفین (فن برائے فن والوں) کا معاملہ اس پہلے گروہ سے کسی قدر مختلف تھا۔ ان کا ملک کے عام لوگوں میں بہت کم اثر اور رسوخ تھا۔ اس نظریے کے قائل مغربی یورپ کے رجعت پرست ادبی خیالات سے متاثر تھے۔ اس بات سے تو کسی کو انکار نہیں تھا کہ آرٹ اور ادب کا ایک مقصد انسان کو جمالیاتی حظ پہنچانا بھی ہے، اور یہ کہ فنون لطیفہ کا طریقہ سائنس یا علمی تحقیقات کے طریقے سے مختلف ہے۔ سائنس (یا علم) میں تجربہ اور تحقیق کے ذریعہ ہمارے سامنے واقعات اور سچائیوں کا براہ راست انکشاف ہوتا ہے، جن کی بنیاد پر پھر ہم اپنی زندگی کو بہتر اور زیادہ بارآور بناتے ہیں۔ فنون لطیفہ تجربات، مشاہدات، اور علمی حقائق اور معاشرت کے رشتوں اور ان کے عمل اور ردعمل سے انسانوں کے ذہن میں جو جذباتی اور نفسیاتی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، ان کے کسی پہلو کا اظہار کرتے ہیں۔

اس اظہار سے، اگر وہ خوبی سے کیا گیا ہے، ہمیں حظ بھی ہوتا ہے اور ہماری روح اور نفس کا تزکیہ بھی۔ ہم بہت کچھ سیکھتے بھی ہیں۔ سوال اصل میں یہ ہے کہ اس طرح سے ہمارے ذہن میں جو روشنی آتی ہے اور جو روحانی حظ حاصل ہوتا ہے، اس طرح سے ہم جو سیکھتے اور سمجھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں، اس کی نوعیت کیا ہے؟

ترقی پسندوں کا کہنا یہ ہے کہ صرف وہی حظ، وہی جمالیاتی تسکین اور وہی سیکھنا اور سمجھنا انسانوں کے لیے اچھا اور صحت مند ہے جو ان میں پاکیزگی اور طہارت، زندگی کی امنگ اور حوصلہ، جہد حیات میں صلابت اور دانش مندی اور نوع انسانی سے ہمدردی پیدا کرنے میں معین اور مددگار ہو۔ اس طرح سے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی حیات ان کے ظاہر اور باطن دونوں کو زیادہ حسین، زیادہ لطیف اور زیادہ بھرپور بنائے۔ ایسا حظ اور ایسی جمالیاتی تسکین جس سے ہمارے ذہن میں الجھنیں بڑھ جائیں، جو ہمیں اپنے عہد اور اپنے سماج کی سب سے اہم حقیقتوں کے انکشاف اور شعور سے دور لے جائے، جس سے ہماری طبیعتوں میں کثافت پیدا ہو، جو ہماری روح کو مکدر اور بے حس کر کے ہمیں خود پرستی، جہالت، بزدلی یا مایوسی کا شکار بنا دے، جو ہماری انسانیت ہم سے چھین کر ہمیں نوع انسانی سے نفرت کرنا سکھائے اور جو ہمارے دلوں میں سوز و حرارت پیدا کرنے کے بجائے انھیں پتھر کا بنا دے، ہمیں قابل قبول نہیں، ہم اسے مسترد کرتے ہیں، ہم اس کے مخالف ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ فنکار اپنی تخلیقی قوتوں کو کام میں لا کر جب بہترین ادب تخلیق کرتا ہے تو اس سے ہم میں کیف و انبساط پیدا ہوتا ہے اور روحانی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ہم کیف و بدمستی میں فرق کرتے ہیں۔ لذت اندوزی اسی حد تک ٹھیک ہے جب تک اس سے آسودگی اور سرور ہو۔ جب وہ سمیت میں بدل کر ہمارے بدن کو چور کر دے، ہمارے ذہن کو پراگندہ اور ہماری روح کو مردہ، تو پھر وہاں پر ہم حد کھینچ دیتے ہیں۔ فن برائے فن والوں سے ہمارا بنیادی اختلاف یہی تھا کہ وہ اس حد کو کھینچنے کے قائل نہ تھے۔

دنیا میں عام طور پر اور مشرق میں خاص طور پر اور ہمارے ملک میں بھی، فنون لطیفہ اور ادب کے ارتقا کی تاریخ ہمارے اس نظریہ کی پوری طرح تصدیق کرتی ہے۔ فنون لطیفہ (رقص، موسیقی، شاعری، مصوری، سنگ تراشی) کی ابتدا انسانوں کے اجتماعی تخلیقی عمل کے ساتھ ساتھ، زندگی کو برقرار رکھنے اور سامان معیشت کی پیداوار کو بڑھانے اور ان کی فراہمی کو بہتر اور زیادہ جوش اور حوصلہ مندی سے حاصل کرنے کے لیے ہوئی ہے۔ زندگی میں انبساط اور حظ، کیف و سرور انسان کی بنیادی ضرورتوں اور خواہشوں کی آسودگی کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا، اور جب انسان ان ضرورتوں اور خواہشوں کو کسی مجبوری کے سبب سے پورا نہیں کر سکتے، تب اس لاچاری اور بے بسی

کی حالت میں بھی انھیں پورا کرنے کی امید، آسودگی کا خواب اور تمنا ان کے دلوں کو مسرور کرتی ہے۔ لیکن اس مسرت کے ساتھ محرومیوں کے غم کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔

اسی سبب سے ہم دیکھتے ہیں کہ صدیوں سے بالجبر لوٹے جانے والے اور محروم انسانوں کے نغموں اور شعروں میں درد اور دکھ کی المناک صدا ملی ہوئی ہے۔ لیکن ان رنج بھری آہوں کے پیچھے دراصل زندگی کے تقاضے ہوتے ہیں۔ ان ناجائز اور ناروا بندشوں کے خلاف شکوہ ہوتا ہے اور ظلم کی ان زنجیروں کو توڑ دینے کی خواہش ہوتی ہے جن سے نوع انسان کی اکثریت آج بھی بندھی ہوئی ہے۔

ہمارے ملک میں رقص، موسیقی، اور ڈرامے کے فنون نے عہد قدیم میں غیر معمولی ترقی کی تھی، اور ان کے بارے میں پہلی بنیادی علمی کتاب بھرت کی ''ناٹیہ شاستر'' ہے، جو غالباً دوسری یا تیسری صدی قبل مسیح میں مرتب ہوئی۔ ہماری موسیقی اور رقص کی بنیاد اسی شاستر کے لکھے ہوئے اصولوں پر ہے۔ بعد میں رقص اور موسیقی ہمارے سماج کے اجتماعی تجربوں اور مشاہدوں اور ہمارے ماہروں اور عالموں کی تحقیق اور تفتیش کی بنیاد پر ایک زبردست علم کی حیثیت اختیار کر گئے، جہاں پر انسانی آواز کی تمام امکانی صورتوں اور ان کی مختلف ترتیب کو ریاضی کے فارمولوں کی طرح منظّم کر لیا گیا ہے، جس کی مدد سے وہ ایک بچے کو بھی حساب اور جیومیٹری کی طرح سکھائی جا سکتی ہے۔

انسانی جذبات کے اظہار کو اس قدر عملی شکل میں مرتب کر لینا ہماری قوم کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ کیا فن برائے فن یا شدھ کلا (خالص آرٹ) کے ماننے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سب سے زیادہ لطیف اور بادی النظر میں ''خالص'' فن کی بنیاد اور اس کا مقصد جانے بوجھے ہوئے انسانی جذبات کا اظہار نہیں تھا؟ سنگیت اور راگ کا مقصد ہمارے شاستروں نے آوازوں کے تناسب کے ذریعہ سننے والوں کو مسرور کرنا بتایا ہے۔ موسیقی کی تعریف ''دلفریب آواز'' کی گئی ہے اور اس دلفریبی کی بنیاد نو (9) انسانی جذبات پر رکھی گئی ہے......

1۔ شرنگار رس یعنی جذبۂ محبت
2۔ ہاسیہ رس یعنی جذبۂ خندگی یا ہنسی
3۔ کرونا رس یعنی جذبۂ ترحّم

4۔ ویررس یعنی جذبۂ شجاعت

5۔ رُودر رس یعنی جذبۂ غضب

6۔ بھیانک رس یعنی جذبۂ خوف

7۔ بی بھتس رس یعنی جذبۂ نفرت یا تحقیر

8۔ ادبھت رس یعنی جذبۂ حیرانی

9۔ شانت رس یعنی جذبۂ امن وسکون

......گویا ان جذبوں کا خوبصورتی کے ساتھ پیدا کرنا موسیقی اور رقص کے بنیادی مقاصد ہیں۔ کیا اس سے زیادہ صاف طرح سے آرٹ کے مقاصد کا، جو زندگی سے بالکل وابستہ ہوں، اظہار کیا جا سکتا ہے؟

ہماری مصوری کا نقطۂ عروج اجنتا کے غاروں کی دیواروں پر بنی ہوئی تصویریں ہیں۔ وہ سب کی سب گوتم بدھ کی زندگی، ہندستان کے اخلاقی اور سماجی اصولوں کو زندگی اور تاریخ کے واقعات کی تصوری شکل میں پیش کر کے دیکھنے والوں کو ایک خاص مقصد کی طرف مائل کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔

گاندھارا اور گپتا عہد کی بے مثال بت تراشی ایک خاص پیغام، ایک خاص مقصد کے لیے کی گئی تھی......اور یہ مقصد اس عہد کا سب سے بلند، سب سے زیادہ انسانی مقصد تھا اور چونکہ ان مقاصد کا حسن اور ان کی استودگی، ان کی بلندی اور پاکیزگی آج بھی ہماری قوم اور نوع انسانی کے لیے ایک برگزیدہ پیام رکھتے ہیں، اس لیے ان کا تاثر اور دلکشی، اہل بصیرت کے لیے آج بھی باقی ہے۔ گو ہمارے عقائد بدل گئے، ہمارا علم بڑھ گیا ہے، ہمارے سماج کی ترتیب دوسری ہے۔ ہمارے سماجی نصب العین کی منزل اور ہے لیکن ہمارے پرانے آرٹ کے بہترین نمونے ہمارے تہذیبی ضمیر، ہمارے تمدنی مزاج کا حصہ بن کر آج ہمیں زیادہ اونچی سماجی اور انسانی بلندیوں پر جانے کا پیام دیتے ہیں۔

فن برائے فن کو ماننے والے فردوسی کے ''شاہنامے''، مولانا روم کی ''مثنوی'' اور سعدی کی ''گلستاں اور بوستاں''، تلسی کی ''رامائن''، انیس کے ''مرثیوں''، وارث شاہ کی ''ہیر''، حالی کی

''مسدس''، اور اقبال کے کلام کے بیشتر حصوں کو غالباً فن ہی نہیں مانیں گے۔ اس لیے کہ ان ادبی شہ پاروں میں صاف اور کھلے طریقے سے چند اخلاقی اور روحانی اصولوں کو ان عظیم شاعروں نے پیش کیا ہے، اور ان کا کھلا ہوا مقصد اپنے عہد کے انسانوں کو بہتر انسان بنانا ہے۔

تاہم اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ فنونِ لطیفہ اور اخلاقی پند و نصائح، سیاسی تبلیغ یا محض علمی (سائنسی) واقعہ نویسی میں کوئی فرق نہیں۔ ایک کامیاب فنکار حقائق و واقعات، مختلف انسانی رشتوں کے عمل اور ردِعمل کی کیفیتوں، سماجی زندگی سے پیدا ہونے والے بہترین تصورات اور نظریوں (یعنی تعمیات) کا مشاہدہ کر کے اور انھیں سمجھ کے اپنے دل و دماغ میں جذب کرتا ہے۔ یہ سچائیاں اس کے جذبات کا اسی قدر حصہ بن جاتی ہیں جتنا کہ اس کے ذہن کا۔ پھر اپنے جوش، جذبے، تخیل، بصیرت اور فنی مہارت کو کام میں لا کر وہ اپنے فن پارے کی تخلیق کرتا ہے۔ اس طرح ایک نئی، خوشنما اور نشاط انگیز شے وجود میں آتی ہے۔ ایک الہامی نغمہ جس سے دل کو سرور ہوتا ہے، دماغ میں روشنی آتی ہے اور جو ہماری روح میں اہتزاز پیدا کر کے اس میں نئی بلندیوں کی طرف پرواز کرنے کا حوصلہ اور رجحان پیدا کرتا ہے۔ سچائیوں کی زمین میں تجربے، مشاہدے اور بصیرت کی آب پاشی، فنی مہارت کی ٹھنڈی ہواؤں اور گہرے جذبے کی گرم، تیز اور نورانی شعاعوں کے مجموعی عمل سے تخلیق کا دانہ ایک مہکتے ہوئے رنگین اور لطیف پھول کی طرح ہمارے سامنے برآمد ہوتا ہے۔ ان تمام عناصر پر مشتمل لیکن ان سے مختلف تخئیل، تصور اور تجربے کا مُقطر جوہرِ اوّل، کیف آور، حیات افزا اور فلک سیر۔

بہرحال حقائق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے اس خیال کے مخالفین دراصل عظیم فنکاری کے میدان سے باہر نکل چکے ہیں۔ ہمارے وطن اور دنیا کی قدیم فنی اور ادبی روایت ہمارے نظریوں کی تصدیق اور ان کے نظریوں کی تردید کرتی ہے اور خود ان حضرات کی اپنی ادبی تخلیق یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ رجعت پرست طاقتوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر فن اور ادب کے بھی وفادار نہیں رہے جس کا وہ پہلے دعویٰ کرتے تھے۔ وہی لوگ جو ہماری تحریک کے شروع کے زمانے میں ہم پر طعنہ زن تھے کہ ہم ادب کو اشتراکی خیالات پھیلانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں، آج خود پاکستان میں ''اسلامی ادب'' کا نعرہ بلند کر رہے ہیں اور ہندستان میں شدھ کلا کے

پجاری ترقی پسند خیالات سے ہندوتہذیب کو بچانے کے لیے بدترین رجعت پرستی کی طاقتوں کے ساتھ صف بستہ ہوگئے ہیں۔

اس طرح یہ ظاہر ہوگیا کہ ان کی مخالفت ہم سے اس وجہ سے نہیں تھی کہ وہ ''خالص'' فن کے دلدادہ تھے اور ہم ان کے نزدیک فن کو اس کے منصب سے گرا رہے تھے۔ ان کی مخالفت ہماری جمہوریت، محنت کشوں کی طرفداری، ہماری انسان دوستی اور آزادی خواہی سے تھی، ان کی اصلی جگہ رجعت پرست جاگیرداروں، بڑے سرمایہ داروں اور سامراجیوں کی صفوں میں تھی جہاں پر آج وہ پہنچ گئے ہیں۔ ان کے یورپی پیشوا آج کھلے بندوں فاشزم کے طرف دار اور سامراجی قوتوں کے ثنا خواں ہیں۔

اس نہج کا ادبی نظریہ ہمارے وطن اور ارضِ مشرق کی بہترین اور ادبی روایات کے بالکل برخلاف ہے اور چونکہ دنیا کے بلند ترین فنکاروں اور ادیبوں نے ہمیشہ اپنے عہد کے سب سے زیادہ ترقی پسند اور سب سے زیادہ انسانی، اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ حسین نصب العین سے ہی متاثر ہوکر اپنے فن کی تخلیق کی ہے اس لیے اعلیٰ ترین ادبی اور فنی تخلیق کو اس عہد کی سب سے برگزیدہ انسانی جدوجہد اور نظریوں، خیالات اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ علمی حقائق سے علاحدہ کرنا ناممکن ہے۔ ایسا وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں انسانیت اور سچائی دونوں سے کوئی سروکار باقی نہ رہ گیا ہو۔ رجعت پرستوں کی بہت بڑی طاقت اور بہت زیادہ وسائل کے باوجود ان کا زوال اسی سبب سے ہو رہا ہے کہ انھوں نے انسانیت اور سچائی سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ ترقی پسند مصنّفین کمزور اور کم تعداد اور کم مایہ ہونے کے باوجود اگر ترقی کر رہے ہیں تو اسی سبب سے کہ ہم نے انسانیت اور سچائی کا دامن مضبوطی سے پکڑا ہے۔ ہماری یہ گرفت جتنی ہی مضبوط ہوگی، اسی تناسب سے ہماری طاقت، تعداد، مقبولیت اور ہمارے فن کی تاثیر اور خوبصورتی میں اضافہ ہوگا۔

○○○

تیسری کل ہند کانفرنس-1942

جون 1941 میں ہٹلری جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کیا، جس کی وجہ سے بین الاقوامی سیاست میں بنیادی تبدیلیاں آئیں، جس کا ہمارے ملک کی سیاست پر بھی اثر پڑا۔ ہمارا وطن انگریزی سامراج کے اقتدار کے نیچے تھا اور ہماری وطنی آزادی کی جدوجہد اسی کے خلاف تھی۔ اس لیے جب تک لڑائی محض جرمن اور انگریزی سامراج کے درمیان تھی، ہمارے آزادی خواہوں کا عام مطالبہ یہی تھا کہ برطانوی سامراج ہمارے ملک کے وسائل کو دو سامراجوں کی اس لڑائی میں استعمال نہ کرے، ہم برطانوی سامراج کی اس مصیبت سے فائدہ اٹھا کر اپنے ملک کی آزادی کی جدوجہد کو اور تیز کرنا چاہتے تھے۔ داہنے بازو کے قومی راہنما انقلابی جدوجہد نہیں چاہتے تھے۔ وہ سامراج پر دباؤ ڈال کر اس سے سمجھوتے کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ جب سمجھوتہ نہ ہو سکا تو کانگریس نے انفرادی سول نافرمانی شروع کی اور کانگریسی حسبِ دستور خاموشی کے ساتھ جیل خانوں میں چلے گئے۔

لیکن جب سوویت یونین پر حملہ ہوا تو ہر ایسے آزادی خواہ کے سامنے، جو بین الاقوامی حالت کو تھوڑا سا بھی سمجھتا تھا، یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ اگر ہٹلری فاشزم کی اس جنگ میں کامیابی ہوگئی تو اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ فاشسٹ سامراج ساری دنیا پر حاوی ہو جائے،

دنیا کے سارے محکوم ممالک اور بھی زیادہ سختی سے کچلے جائیں، غلام بنائے جائیں اور بین الاقوامی سوشلزم کی عوامی تحریک کافی مدت کے لیے دبا دی جائے۔ اس کے برخلاف اگر سوویت یونین کی فتح ہو تو اس کے سبب سے انقلابی مزدور تحریک اور تمام دنیا کے محکوم ممالک کی آزادی کی تحریکیں مضبوط ہوں گی، اور گو امریکی اور برطانوی اور فرانسیسی سامراج بھی باقی رہیں گے۔ پھر بھی مجموعی حیثیت سے دنیا کی عوامی قوتوں میں بہت اضافہ ہوگا اور خود ہمارے اپنے ملک کی آزادی کی جدوجہد کی کامیابی کے امکانات بڑھ جائیں گے۔

ایسی صورت میں یہ ضروری تھا کہ ہماری وطنی آزادی کی جدوجہد نئے حالات میں نئے طریقہ سے چلائی جائے۔ وہ نیا طریقہ ایسا ہونا چاہیے جس کے ذریعہ سے ہمارے وطن کے عوام کا اتحاد، تنظیم اور قوت بڑھے۔ وہ برطانوی سامراج کو مجبور کرسکیں کہ وہ ہمیں آزاد کرے اور ساتھ ہی ساتھ اس عظیم ملک کی قوت بین الاقوامی فاشزم کے خلاف جنگ کو کامیاب کرنے کے لیے لگائی جا سکے۔ برطانوی حکمراں ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے تسلط کو برقرار رکھتے ہوئے اور آزادی خواہوں اور عوام پر مختلف طریقوں سے مظالم کرتے ہوئے صرف اپنے مذموم سامراجی طریقوں سے اس ملک کے وسائل کو جنگ کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

اس طرح ایک پیچیدہ صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ اکثر آزادی خواہ لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ اگر ہمارے وطن میں برطانوی سامراج کا تسلط پہلے کی طرح قائم رہے تو پھر ہم بیک وقت انگریزوں سے اپنی آزادی کے لیے ایک طرف، اور دوسری طرف اس جنگ کو فاشزم کے خلاف کامیاب کرنے کے لیے کس طرح جدوجہد کر سکتے ہیں۔ کئی مہینوں تک خود اشتراکی جماعت میں اس مسئلہ پر لوگوں کے ذہن صاف نہیں تھے (جس کا سبب یہ تھا کہ اکثر کمیونسٹ راہنما گرفتار تھے، پارٹی ٹھیک سے چلائی نہیں جا سکتی تھی، نہ آپس میں بحث مباحثہ کر کے صاف راہ متعین کی جا سکتی تھی، اور نہ بیرونی حالت کا ٹھیک اندازہ کیا جا سکتا تھا)۔ بہر حال 1941 کے خاتمہ تک صورت حال ہماری نظروں میں صاف ہوگئی۔ جنگ کی نوعیت اشتراکیوں کے نزدیک اب ایک ایسی عوامی جنگ کی ہوگئی تھی، جس میں فاشزم کی شکست کے ساتھ ہمارے اپنے وطن اور سارے ایشیا کے محکوم ممالک کی آزادی اور بین الاقوامی سوشلزم کی فتح منسلک تھی۔

برطانوی حکومت نے بھی اپنی پالیسی میں کسی قدر تبدیلی کی۔ 1941 کے خاتمے کے قریب کانگریس کے راہ نما اور دوسرے کانگریسی جیل سے رہا کرائے گئے اور 1942 کے شروع کے چند مہینوں میں رفتہ رفتہ کر کے کمیونسٹ بھی رہا ہونے لگے۔

مارچ 1942 میں پورے دو سال نظر بند رہنے کے بعد میں بھی لکھنؤ جیل سے رہا کیا گیا۔ میں نے قید کے زمانے میں کوشش کی تھی کہ اپنے مطالعہ اور تعلیم کی افسوسناک کمیوں اور خامیوں کو کسی حد تک دور کروں۔ ہمارے ملک کے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم اور بعد میں انگلستان کی تعلیم (جو مجھے ملی تھی) تہذیبی اعتبار سے بڑے ادھ کچرے انسان اور ذہن کی تربیت کرتی ہے۔ اپنے کلاسیکی ادب (سنسکرت، پالی، برج بھاشا، اودھی، فارسی اور عربی کا قدیم ادب جو شمالی ہند کے ہندستانی بولنے والے علاقے کے ادب کے ماخذ ہیں) سے تقریباً ناواقف، اوپر کے اور درمیانہ طبقے کے شہری ہونے کی وجہ سے اپنے ملک کے زندہ لوک ساہتیہ (عوامی گیت وغیرہ) سے بیشتر بے بہرہ اور غیر مانوس، اور انگریزی ادب اور جدید علوم کی بے حد کم اور سطحی واقفیت رکھتے ہوئے ہم یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے اکثر لوگ مشکل سے مہذب یا تعلیم یافتہ کہے جانے کے لائق ہوتے ہیں۔ علم کی جستجو، تحقیق اور اس کے احترام کی اپنی قدیم روایت اور طریقوں کو ہم تقریباً بھول چکے ہیں اور مغرب کی جدید علمی تفتیش تجزیہ اور واقعاتی صحت کا نیا دستور ہم نے نہیں کے برابر سیکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال کی ذمہ داری سامراجی نظام تعلیم اور ہماری معاشرت کی اس بوسیدہ حالت اور بحرانی کیفیت پر ہے، جو سامراجی غلامی کے سبب سے ہمارے وطن میں گزشتہ دو سو سال کے اندر پیدا ہوئی ہے۔ ان حالات میں صرف وہی لوگ علم اور تہذیب کے سنہرے دائرے میں قدم رکھ سکتے ہیں جو اپنی اور مروجہ علمی کم مائیگی کو محسوس کر کے ان بندشوں کو توڑ دیں جو جاہل حکمرانوں، ان کے تعلیمی نظام اور تہذیب کش سماجی عناصر نے ہماری قوم پر جبر سے عائد کی ہیں اور مشکل اور غیر متمدن حالات کے مسلط ہونے کے باوجود انفرادی، اور جس حد تک ممکن ہو اجتماعی طور پر اپنی تعلیم اور تربیت کر کے صحیح معنوں میں دیانت دار ادیب، فنکار، محقق یا عالم بننے کی کوشش کریں۔ اگر بیرونی محکومی اور تمدنی انتشار کی گزشتہ صدی میں ہمارے وطن میں عظیم یا اچھے ادب وفن کی تخلیق ہوئی ہے، اور علم کا چراغ روشن رہا ہے تو وہ انھیں افراد، گروہوں اور اداروں کے

ہاتھوں، جنھوں نے ایسا کیا ہے۔

قید و بند کے حالات میں تعلیم اور تحریر کے راستے میں چند در چند عملی اور نفسیاتی دشواریاں حائل ہوتی ہیں۔ بہر حال کوشش اور خوش تدبیری سے کسی حد تک ان دشواریوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس زمانے میں اپنی زبان اُردو، ہندی اور فارسی ادب کو خاص توجہ سے پڑھا۔ جدید ادب کی رفتار کا اندازہ ''ادب لطیف، ادبی دنیا، نیا ادب، اور نگار'' اور کبھی کبھی انجمن ترقی اُردو کا رسالہ ''اُردو'' پڑھنے سے ہوتا رہتا تھا۔ میں گرفتار ہی تھا جب مجھے (غالباً 1942 میں) فیض کی ''نقشِ فریادی'' اور راشد کی ''ماورا'' (جو شاید اسی مہینے میں شائع ہوئی تھی)، سردار جعفری نے بھیجی۔ سردار چند مہینے پہلے رہا ہو چکے تھے۔ علیم بھی شاید 1941 کے وسط تک چھوڑ دیے گئے تھے اور لکھنؤ میں اپنی جگہ پر رکھ لیے گئے تھے۔

قید کی المناک فرصت اور روح فرسا تخلیہ اپنی صلاحیتوں، رجحانات اور اپنے ضمیر کے بار بار تجزیے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اب رِہا ہو کر مجھے اپنا زیادہ وقت ادبی کاموں میں ہی صرف کرنا چاہیے اور عملی سیاست میں نسبتاً کم حصہ لینا چاہیے۔ میری محبوب شریک حیات بھی جن کے ساتھ مشکل سے میں چند ہی مہینے زندگی بسر کر سکا تھا، اسی رائے کی تھیں اور وہ خود بھی یہی کرنا چاہتی تھیں۔ ہم نے لکھنے پڑھنے اور کتابوں کی طباعت اور اشاعت کے بہت سے منصوبے گرفتاری کے زمانہ میں ہی تیار کیے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کا ایک ذمہ دار کارکن ہونے کے باوجود سیاسی مشغولیتوں کی وجہ سے میں نہ تو تحریک کی تنظیم اور نہ لکھنے پڑھنے پر ہی خاطر خواہ توجہ کر سکا تھا۔ اس سلسلے میں بھی اب میں اپنی گزشتہ کوتاہیوں کو پورا کرنے کا خواہش مند تھا۔

لیکن ایک ایسی انقلابی تحریک کے کارکن ہونے کی حیثیت سے جس کی بنیاد اجتماعی فکر اور اشتراکِ عمل پر ہے، شخصی فیصلے اور منصوبے فیصلہ کن اور آخری نہیں ہو سکتے۔ پوری صورت حال کا اندازہ، مختلف کاموں کی اضافی اہمیت، ہر طرح کے کارکنوں کی صلاحیت اور انھیں مختلف ضروری کاموں پر لگانے کا بہتر فیصلہ اجتماعی طریقہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ ایسے فیصلوں میں شخصی منصوبوں کے مقابلے میں غلطی کا امکان نسبتاً کم ہی ہوتا ہے۔

ہماری تحریک کے لیے اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ گزشتہ دو سال میں

سیاسی جبر اور دہشت انگیزی کے سبب سے انجمن کی تنظیم جو درہم برہم ہوگئی تھی، اسے نئے حالات میں دوبارہ درست کیا جائے۔ مرکز اور بیشتر صوبائی اور مقامی شاخیں تعطل کی حالت میں تھیں یا ٹوٹ گئی تھیں۔ لکھنے والے موجود تھے اور ترقی پسند ادب کی تخلیق اور اشاعت جاری تھی (رسالوں اور کتابوں کے ذریعہ سے)۔ لیکن ان میں ربط اور تنظیم باقی نہیں رہ گئی تھی۔ جماعتی فکر اور تنقید اور فیصلے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس خودرو کیفیت کو دور کرنا ضروری تھا۔ دوسرا اہم مسئلہ ہمارے سامنے یہ تھا کہ جنگ کی نئی صورت حال کی طرف انجمن ترقی پسند مصنّفین کیا رویہ اختیار کرے۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ جنگ کی وجہ سے ہمارے ملک میں اور دنیا میں جو نازک حالت پیدا ہوگئی تھی اس کے سلسلے میں محبّ وطن، آزادی خواہ اور جمہوریت پسند ادیبوں کی حیثیت سے ہم پر کوئی خاص فرائض عائد ہوتے ہیں یا نہیں۔ اپنے قیام کے شروع ہی سے ہماری انجمن کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے کو ملک کی عام جمہوری سامراج دشمن تحریک کا ایک حصہ سمجھتی تھی۔ وہ ادب اور عوام کے سیاسی اور معاشی مسائل اور ان کی جدوجہد کو دو علاحدہ اور غیر متعلق خانوں میں بانٹنے کی قائل نہ تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ادبی اور فنی تخلیق ایک منفرد قسم کا کام تھا۔ ادبی تخلیق کے لیے ایک خاص طریقۂ کار، ایک مخصوص ذہنی اور نفسیاتی صلاحیت کی ضرورت تھی اور ادب انسان میں انبساط و کیف پیدا کر کے اس کے شعور کو اپنے مخصوص طریقے سے بیدار کرتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک بہترین ادب اور ترقی پسند ادب عوام اور ان کی زندگی سے گہرے اتصال اور ربط سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس طرح ہم میں جو تجربہ، سمجھ اور انسانیت کا جوش اور جذبہ پیدا ہوتا ہے، وہی فنی تخلیق کی مضبوط بنیاد ہے۔ اسی لیے ہم ان ادیبوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے جو عوام کے تمام چھوٹے اور بڑے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل، ان کی زندگی کے اطوار اور الجھنوں، ان کے تخلیقی کاموں، ان کی جدوجہد اور ان کی قربانیوں، ان کے حال اور ان کے مستقبل کے خوابوں کو سمجھنے کی بھی کوشش نہیں کرتے۔ ان کے ساتھ مل کر قدم نہیں بڑھاتے، اپنے کو ان کی اجتماعیت کا ایک جزو اور ان کا رفیق کار نہیں سمجھتے، ان کے ساتھ پیوست نہیں ہوتے۔

اس لیے جب ایک عالمگیر خون آشام جنگ کے بڑھتے ہوئے شعلے انسانی تہذیب اور تمدن کو ہر طرف سے بھسم اور برباد کرتے ہوئے ہمارے وطن تک بھی پہنچ جائیں، اور ہماری قوم کا

حال اور اس کا مستقبل، دونوں ایک شدید خطرے میں ہوں، تو ترقی پسند مصنّفین کے لیے ہی صرف نہیں ...... ہر ایک ادیب، ہر ایک ایماندار فنکار کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ ان تمام حالات کو سمجھے اور ان سے پیدا ہونے والی کیفیتوں کو محسوس کرے اور اپنی قوم کے ساتھ مل کر وطن کی ہر ایک گراں بہا قدر کی حفاظت اور سلامتی اور اس کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے اپنی تمام ذہنی اور روحانی قوتوں کو عمل میں لائے۔ فیض نے اس کیفیت کا اظہار اپنی اس لاجواب نظم میں کیا ہے......

تِیرگی ہے کہ اُمنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
جل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

لیکن ایک صحیح شعور رکھنے والے ادیب کی نظریں اس تیرگی کی چادر کو چاک کر کے اس کے پیچھے بھی دیکھ سکتی ہیں۔ اسی لیے اس نے اسے ''غازۂ رخسار سحر'' سے بھی تعبیر کیا ہے۔

ڈاکٹر علیم (جو اس زمانے میں انجمن کے جنرل سکریٹری تھے)، سردار جعفری، سبط حسن، رشید جہاں، شیوداں سنگھ چوہان، رضا انصاری، میں نے اور چند اور لوگوں نے (جو ترقی پسند مصنّفین سے منسلک تھے) آپس میں مشورہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ جتنی جلدی ممکن ہو ہمیں انجمن کی طرف سے ایک کانفرنس منعقد کرنا چاہیے، جس کے ذریعہ سے انجمن کی اجتماعیت اور تنظیم کو دوبارہ قائم کیا جائے۔ نیز جنگ کی نئی صورت سے پیدا ہونے والے حالات پر غور کر کے انجمن کی پالیسی اور اس کے مطابق لائحہ عمل متعین کیا جائے۔

اپنی رہائی کے بعد گھر پر کوئی دو تین مہینے رہنے کے بعد میں دہلی گیا۔ وہاں میں مجاز سے ملا، جو ان دنوں دہلی کی ہارڈنگ لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ دہلی کے ریڈیو اسٹیشن میں کرشن چندر، منٹو، اشک، راشد بھی کام کر رہے ہیں۔ احمد شاہ بخاری (پطرس) آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر تھے، اور انھوں نے چن چن کر بہت سے نئے اور ہونہار ادیبوں کو ریڈیو کے محکمے میں جگہیں دے دی تھیں۔ اس سے یہ بات تو یقینی ثابت ہوتی تھی کہ پطرس ہمارے ادیبوں کو جس حد تک ان سے ممکن تھا، بھوکے مرنے دینا

نہیں چاہتے تھے۔اس سے ان کے ذوق سلیم کا بھی پتہ چلتا تھا۔پطرس نے گواب لکھنا چھوڑ دیا تھا لیکن اپنی غیر معمولی ذہانت، ادبی فہم اور علمی شغف نیز اپنی شگفتہ مزاجی اور خوش گفتاری کے سبب سے ان کا لاہور میں اپنے شاگردوں اور عام طور پر ادب سے دلچسپی رکھنے والوں، اپنے ہم عصروں اور نوجوانوں پر بہت اثر تھا۔ان کے ادبی نظریوں سے ہم متفق نہ بھی ہوں، لیکن ایک معلم کی حیثیت سے اگر وہ نوجوانوں میں ادب کا شوق پیدا کرتے تھے اور کھوٹے کھرے ادب کے پرکھ کا معیار سمجھا سکتے تھے تو یہ بذات خود ایک قابل تعریف بات تھی۔لیکن تجربے نے ہمیں بتایا کہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت حاصل کر کے ادیبوں کے پیٹ بھر جائیں تو بھر جائیں، لیکن ان کا ادبی ضمیر مضمحل ہو جاتا تھا۔اس وقت ریڈیو بہرصورت سامراجی پروپیگنڈے کی براہ راست اشاعت و نشر کا ایک آلہ تھا، اور اپنی ملازمت کو برقرار رکھنے کے لیے ایک ادیب کو قدم قدم پر ایسے کام کرنے پڑتے تھے اور ایسی چیزوں کی نشر و اشاعت میں مدد دینی پڑتی تھی جو کسی طرح بھی محبّ وطن اور ایماندار انسان کو قابل قبول نہیں ہوسکتیں۔ایک ایماندار آدمی کے لیے مسلسل اپنے ضمیر کی آواز کو دبانا یا چھپانا کوئی سہل کام نہیں۔ایسی صورت میں دو ہی باتیں ہوسکتی ہیں۔یا تو رفتہ رفتہ اس کا ضمیر اور اس کے دل سے بلند ہونے والی حق پرستی کی آواز دب جائے اور وہ خودغرض، موقع پرستوں کی صفوں میں داخل ہوکر اپنے بہترین روحانی جوہر اور تخلیقی صلاحیتوں کو ضائع کر دے...... یا پھر کسی صورت سے ایسے مقام اور موقع سے ہٹ جائے جہاں پر اسے اتنا گراں سودا کرنا پڑتا ہے، اور اپنے ضمیر کی سالمیت اور روح کی تابندگی کو محفوظ اور برقرار رکھے۔

یہ معلوم کر کے کہ کرشن چندر، اشک اور کئی ترقی پسند مصنف آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہیں، مجھے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔اسی لیے جب میں مجاز کے ساتھ کرشن چندر سے ملنے گیا تو میرے دل میں کافی شبہات تھے اور تشویش۔بہرصورت میں کرشن چندر سے ملنے کا مشتاق تھا۔کئی سال پہلے کلکتہ میں ان سے سرسری ملاقات ہوئی تھی۔اس کے بعد گرفتاری کے زمانے میں لاہور کے ادبی رسالوں میں ان کے افسانے پڑھتا رہتا تھا۔ان کے افسانوں کی دلکشی اور حسن کا تقاضہ تھا کہ ان کے مصنف کو اچھی طرح جانا پہچانا جائے۔پنجاب میں ترقی پسند مصنّفین کی تحریک اور مجوزہ ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس کے بارے میں بھی ان سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔

اب مجھے اس ملاقات کی تفصیل یاد نہیں۔ ریڈیو اسٹیشن میں (جو اس وقت پُرانی دہلی میں تھا) کرشن چندر کا اپنا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ ہم بڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ شروع میں ہماری بات چیت کچھ ''چلی'' نہیں گو کہ کرنے کو باتیں بہت تھیں۔ کرشن یوں بھی کم سخن ہیں، اور میں بھی گفتگو کے وقت دوسرے کی بات سننے کو خود بولتے رہنے پر ترجیح دیتا ہوں۔ ''مقطّع'' اور ''ہنسوڑ'' کا تو جوڑ ہو بھی سکتا ہے، لیکن جب دونوں چپ سادھنے والے ہوں تو ذرا مشکل ہو جاتی ہے۔ میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ میں ایسے شخص سے باتیں کر رہا ہوں جو گفتگو میں اور شاید زندگی میں عام طور پر جوڑ توڑ اور داؤ پیچ کا قائل نہیں، اور جس کا خلوص اس کی سادگی بلکہ بھولے پن سے ظاہر ہوتا ہے۔ شاید گفتگو کی اس دشواری سے چھٹکارا پانے کے لیے کرشن چندر نے اپنے دوسرے دوستوں اشک، منٹو اور ریڈیو کے چند اور صاحبوں کو مجھ سے ملنے کے لیے بلوایا۔ اشک اور منٹو سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ لیکن وہ لوگ شاید اپنے کام میں مصروف تھے۔ اس لیے تھوڑی دیر تک رسمی بات چیت کے بعد واپس چلے گئے۔

اس کے بعد کرشن چندر سے میں کئی بار ملا۔ دہلی کے کئی ہندی ادیبوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں جن میں واتسائن بھی تھے۔ انجمن کی تنظیم، جنگ کے متعلق ادیبوں کی پالیسی، اور ادیبوں کی کل ہند کانفرنس کی ضرورت پر ہم لوگ ہم خیال ہو گئے۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ کرشن چندر نے دہلی کے دوسرے ادیبوں کے ساتھ مل کر دہلی میں ہی کانفرنس منعقد کرنے، اس کے سلسلے میں خط و کتابت کرنے، اس کا انتظام کرنے اور اس کے اخراجات کے لیے چندہ فراہم کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں یہ خوشخبری انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر علیم کو دوں گا، اور وہ بھی صوبوں کے لوگوں کی رائے لے کر غالباً دہلی میں کانفرنس کرنے کے خیال کو پسند کریں گے۔ کرشن چندر نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بخاری صاحب سے گفتگو کے بعد انھیں یہ معلوم ہوا ہے کہ ان کا محکمہ اب اس بات پر معترض نہ ہوگا کہ ریڈیو میں کام کرنے والے ادیب ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس میں حصہ لیں۔ بخاری صاحب خود اور حفیظ جالندھری صاحب جو سرکاری گیتوں کی نشر و اشاعت کے مہتمم کی حیثیت سے دہلی آ گئے تھے، ہمارے ساتھ تعاون کرنے کو تیار تھے اور غالباً اس بات کے ٹھوس ثبوت کے طور پر کہ اب جیلوں کی ہوا کھائے ہوئے کمیونسٹ ادیب

بھی حکومت ہند کے ریڈیو اسٹیشن میں داخل ہو سکتے ہیں، مجھے بھی ترقی پسند ادب کی تحریک پر تقریر کرنے کے لیے دہلی ریڈیو اسٹیشن نے مدعو کیا۔

لکھنؤ واپس آکر جب ڈاکٹر علیم کو میں نے ان باتوں کی اطلاع دی تو انھوں نے بھی دوسرے لوگوں سے خط و کتابت کر کے اور کرشن چندر سے تاریخیں طے کر کے دہلی میں (غالباً اپریل یا مئی 1942 میں) ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس کے لیے مختلف صوبوں کے نمائندوں کو مدعو کرلیا۔ ادھر کرشن چندر نے بھی کانفرنس کے کنو ینر کی حیثیت سے دعوت نامے بھیج دیے۔ جب ہم مقررہ تاریخ پر دہلی میں جمع ہوئے تو وہاں پر کچھ عجیب سی صورت حال نظر آئی۔ کرشن چندر نے جن لوگوں کو کانفرنس کے لیے مدعو کیا تھا، وہ یہ سمجھے تھے کہ وہ ایک عام مصنّفین کی کانفرنس کے لیے مدعو کیے جا رہے ہیں، اور لکھنؤ سے جو دعوت نامے گئے تھے وہ ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کے مرکز کی طرف سے۔ ہم اپنی جگہ یہ سمجھ رہے تھے کہ کرشن چندر بھی انجمن کی طرف سے ہی لوگوں کو مدعو کر رہے ہیں۔ چنانچہ دہلی کی کانفرنس میں شرکت کے لیے مولانا صلاح الدین (ادبی دنیا)، میرا جی، قیوم نظر اور کئی ایسے صاحبان موجود تھے جو ہماری تحریک کے مقاصد سے متفق نہ تھے۔ ان حضرات کی موجودگی سے ہمیں تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی۔ لیکن بہت جلد ہماری غلط فہمی دور ہو گئی اور ان کی بھی۔ وہ یہ سمجھ کر آئے تھے کہ یہ مصنّفین کی کانفرنس ہے، ترقی پسند مصنّفین کی نہیں۔ ہم نے (خاص طور پر علیم نے) اور ادھر سے ''غیر ترقی پسند مصنّفین'' نے اب کرشن چندر کی لے دے شروع کی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ آخر یہ کس کی کانفرنس ہے؟ کرشن چندر سے کوئی جواب نہ بن پڑ رہا تھا اور وہ اِدھر اُدھر گھبرائے ہوئے گھوم رہے تھے۔ بالآخر علیم صاحب کے آئین پسند اور باقاعدہ دماغ سے یہ تجویز برآمد ہوئی کہ عام کانفرنس بھی ہو اور ترقی پسند مصنّفین اپنا علاحدہ اجلاس بھی کریں۔ عام کانفرنس میں ترقی پسند مصنّفین بھی شریک ہوں۔ جنگ کے سلسلے میں پالیسی طے کرنے کے لیے بہتر بھی یہی تھا کہ ترقی پسند مصنّفین ہی نہیں، بلکہ دانشوروں کے وسیع تر حلقے کو ایسی پالیسی پر متحد کرنے کی کوشش کی جائے۔ نیز بہت سے مقالے عام کانفرنس میں پڑھے جا سکتے تھے اور ان پر مباحث بھی ہو سکتے تھے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کانفرنس کے اجلاس ہارڈنگ لائبریری (گاندھی گارڈن) کے ہال

میں ہوئے۔ اُردو کے بزرگ ادیبوں میں مولانا صلاح الدین، مولانا عبدالمجید سالک اور حفیظ جالندھری صاحب کی شرکت مجھے خاص طور پر یاد ہے۔ دہلی میں کانفرنس ہونے کی وجہ سے لاہور اور امرتسر سے نوجوان ادیبوں کا خاصہ بڑا گروہ آیا تھا۔ رات کو مشاعرہ بھی ہوا، جس کی صدارت مولانا سالک نے کی۔ حسبِ دستور مشاعرہ میں بھی کئی ہزار کا مجمع تھا اور ہم اسے خاصہ کامیاب سمجھے۔

اس کانفرنس کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ اس میں جنگ کے متعلق ہم سب نے متفق ہوکر ایک ریزولیوشن منظور کیا جس میں ہندستانی ادیبوں اور فنکاروں نے یہ اعلان کیا کہ ان کی ہمدردیاں اتحادی اقوام کے ساتھ ہیں اور وہ فاشزم کے خلاف ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے قلم اور اثر کو جمہوری جنگی کوششوں کی حمایت کے لیے استعمال کرنے اور ملک کو فاشزم کے خطرے سے آگاہ کرنے کے تہیہ کا اعلان کیا۔ ہمارے وطن کی آزادی جنگ میں جمہوری قوتوں کی فتح کے ساتھ وابستہ تھی۔ ہم نے برطانوی سامراج کے اس رویہ کی مذمت کی کہ وہ ان نازک حالات میں ہمارے وطن کو آزادی دینے کو تیار نہیں ہے۔ ہم نے آزادی حاصل کرنے کے لیے قومی اتحاد کی ضرورت پر زور دیا۔

ہم اس بات سے مطمئن اور خوش تھے کہ جنگ کے سوال پر صرف ترقی پسند مصنّفین ہی نہیں بلکہ ادیبوں کے زیادہ وسیع حلقے ہمارے ہم خیال ہوتے جارہے تھے۔ ترقی پسند مصنّفین کی جماعت میں خود مختلف سیاسی اور معاشرتی خیالات رکھنے والے اور مختلف ادبی نظریوں کے پابند چند اشخاص خاص مقاصد کے لیے متحد ہوئے تھے۔ لیکن وقتاً فوقتاً اٹھنے والے قومی مسائل پر (مثلاً جنگ یا امن کے سوال پر، قحط یا بے روزگاری کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے وغیرہ) اگر زیادہ وسیع اتحاد قائم کیا جاسکتا تھا اور عارضی طور پر ہی سہی، ہم ان قومی آلام ومصائب کے خلاف اپنے طریقہ سے جدوجہد کرنے کے لیے متحد ہوسکتے تھے تو یہ ہماری متحدہ محاذ کی پالیسی کے عین مطابق تھا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ دہلی کے ادیبوں کی اس کانفرنس کی روداد اور فیصلوں کو ''اسٹیٹس مین'' اخبار نے بھی خوب پبلسٹی دی۔ جس طرح بیس پچیس سال تک سوویت روس اور کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے بعد اور انھیں دنیا کی تمام برائیوں اور اخلاق کے تمام عیوب کا منبع اور

مخرج قرار دینے کے بعد اب یکا یک سامراجی نقارچیوں کو سوویت روس اور کمیونزم میں بہت سی خوبیاں بھی نظر آنے لگی تھیں، اسی طرح اب ترقی پسند مصنّفین بھی ان کو سنجیدہ اور اچھے معلوم ہونے لگے تھے۔ سامراجیوں کی پالیسی میں جو تبدیلی آئی تھی اس کی وجہ ظاہر تھی۔ ہمیں اس کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی۔

البتہ ''حلقہ ارباب ذوق'' اور اس قسم کے خیالات رکھنے والے دوسری زبانوں اور صوبوں کے بعض ادیبوں (مثلاً ہندی کے ادیب واتسائن، جو ادب برائے ادب کے نظریے اور انارکی کے ہندی میں بڑے زبردست پرچارک تھے) نے جب ہمارے ساتھ مل کر اس کانفرنس میں شرکت کی اور جنگ کے سوال پر ہم سے ہم خیال ہو گئے تو اس میں ناخوشگواری کا بھی ایک پہلو تھا۔ ہم یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ یہ حضرات ایسا غالباً اسی وجہ سے ہی کر رہے ہیں کہ چونکہ اب سرکار بہادر کو جنگ کے نازک حالات کے پیش نظر ملک کی ان جماعتوں اور اداروں کی طرف سے اپنے رویے میں تبدیلی کرنی پڑی ہے جو اپنی آزادی خواہی اور جمہوریت پسندی کی بنا پر اب جنگ میں اتحادیوں کی جیت کے خواہاں تھے۔ پہلے ادب برائے ادب والے ترقی پسندوں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے گریز کرتے تھے اور اس کی وجہ ادبی نظریے میں اختلاف کو ٹھہراتے تھے۔ لیکن جب سرکار کا رویہ بدل گیا اور ہمارے ساتھ ملنے میں سرکاری حلقوں کی ناراضگی اور خطرہ نہیں رہا تو انھیں ہمارے ساتھ تعاون کرنے اور جنگی کوششوں کے لیے اپنے قلم کی قوت کو استعمال کرنے میں کوئی ادبی اعتراض باقی نہیں رہا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا ہم سے ادبی اختلاف دراصل ایک پردہ ہے، جس کے پیچھے موقعہ پرستی کو چھپایا گیا ہے۔ 14 اگست 1947 کے بعد ان میں سے بعض حضرات نے اور بھی قلا بازیاں دکھائیں۔ وہی جو ہم پر یہ الزام رکھتے تھے کہ ہم ادب میں ایک خاص سماجی مقصد (جمہوریت اور آزادی) کی تبلیغ کر کے اسے اس کے بلند منصب سے گرا رہے ہیں، پاکستان میں پاکستانی ادب اور حکومت وقت سے وفاداری کا نعرہ بلند کرنے لگے۔ اس ادبی مقصد کے اعلان سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ ان حضرات کا اپنا مقصد نہ اسلام ہے، نہ ادب، بلکہ بہر صورت اس طرف رہنا ہے جہاں پر وہ محفوظ رہیں۔ بے روزگاری اور معاشی بحران کے اس دور میں یہ خواہش سمجھ میں آ سکتی ہے اور اس کے ساتھ ہر ذی حس اور حقیقت پسند انسان کی ہمدردی

ہوگی۔سودا نے کس تلخی اور کرب کے ساتھ انسان کی ذات کا اظہار کیا ہے……

خونِ جگر بآدم و بوزینہ ہے بکاؤ
صورت معاشِ خلق کی برہم بہت ہے یاں

لیکن غالبًا اپنی جسمانی یا دماغی صلاحیتوں کے ساتھ انسان اپنے ضمیر کو بھی بااقتدار قارونوں کے ہاتھ بیچنے پر مجبور نہیں ہے، اور ایسا کرنے پر بلند آہنگ جمالیاتی اور فلسفیانہ نظریے یا مذہبی تاویلیں اس بددیانتی پر زیادہ دیر تک پردہ نہیں ڈال سکتیں۔

دہلی میں ترقی پسند مصنّفین کی تیسری کل ہند کانفرنس سے یہ فائدہ ہوا کہ ہماری تنظیم میں دوبارہ جان پڑ گئی۔گزشتہ دوسال کے تنظیمی تعطل سے یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ انجمن ٹوٹ گئی اور ترقی پسند مصنّفین کی منظّم تحریک ختم ہوگئی۔ یہ خیال دور ہوا۔مرکز،صوبوں اور مقامی شاخوں کو باقاعدگی سے چلانے کے لیے منصوبے بنائے گئے۔ دوسری مفید بات یہ ہوئی کہ جنگ کی نئی صورت حال کے پیش نظر ترقی پسند مصنّفین کی پالیسی اور فرائض کی وضاحت شروع ہوئی۔تیسرے یہ کہ ادیبوں کے ایک زیادہ وسیع محاذ کو قائم کرنے کی جانب پہلا قدم اٹھایا گیا۔اس کانفرنس میں انجمن کے نئے عہدہ داروں کا انتخاب نہیں ہوا۔

یہ کانفرنس بڑی رواروی میں ہوئی تھی……اور ایک نہیں بلکہ دو کانفرنسیں (ایک ترقی پسند ادیبوں کی اور دوسری عام ادیبوں کی) جو ہوئیں ان سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ہماری تحریک میں نظریاتی اور تنظیمی خامیاں، دونوں بہت زیادہ موجود ہیں۔ یہ ایک مضحکہ خیز بات تھی کہ دہلی کے اجتماع کی نوعیت کے متعلق ڈاکٹر علیم اور میں کچھ اور سوچ رہے تھے، اور کرشن چندر اور دہلی میں ان کے ساتھ کام کرنے والے کچھ اور۔اس کے معنی یہ تھے کہ ہم نے آپس میں بیٹھ کر یا خط و کتابت کے ذریعہ سے ہی خود اپنے گروہ میں ہم خیالی نہیں پیدا کی تھی۔ ہماری تنظیمی ڈھیل اور بے ربطگی کا اس سے بڑا اظہار اور کیا ہو سکتا ہے؟

○○○

چوتھی کل ہند کانفرنس-1943

ہمارے وطن کے تمام شہروں میں بمبئی سب سے زیادہ متنوع اور رنگارنگ شہر ہے۔اس کے اندراس کے اردگرد ہرے بھرے پیڑوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں اور گھاٹیاں ہیں۔ بے قرار زمردیں لہریں اس کے قدموں کو چوم کر بے پایاں بحرعرب میں گم ہو جاتی ہیں۔کبھی وہاں کی تیز اور مرطوب فضا جسم کش تبخیر اور گھٹن پیدا کرتی ہے اور کبھی پانی سے لدی ہوئی ٹھنڈی اور اودی بدلیاں پسینہ سے شرابور بدن اور منکسر اعصاب میں تازگی اور تراوٹ۔وہاں کی برسات میں ایک والہانہ شدت اورابال رندانہ اور بے ساختگی ہوتی ہے۔ وہاں کے جاڑوں میں غیر معمولی نرمی اور پرلطف متانت۔ یوں تو بمبئی کی تقریباً پندرہ لاکھ آبادی میں اکثریت مہاراشٹر کے لوگوں کی ہے۔ اس لیے کہ وہ مہاراشٹر کے علاقے کا ہی شہر ہے۔لیکن وہاں ہندستان کی دوسری قومیں بھی کافی بڑی تعداد میں رہتی ہیں۔ وہاں پر گجراتی ہیں اور مارواڑی، شمالی ہند کے ہندستانی بولنے والے، کون کنی، کرناٹکی، ملایالم، تامل اور تیلگو بولنے والے، بنگالی، پنجابی، سندھی اور پٹھان، اینگلو انڈین اور انگریز، عرب اور ایرانی۔ ہندستان کی سب سے بڑی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے یورپی اقوام کے لوگ بھی خاصی تعداد میں وہاں موجود رہتے ہیں۔بمبئی کی معیشت کی بنیاد کپڑے کی جدید مشینی صنعت اور بین الاقوامی تجارت پر ہے۔وہ ہمارے ملک میں کاروبار کرنے والے انگریز اور دوسرے بیرونی سرمایہ داروں (صنعتی، فنانسی اور تجارتی) اور ہندستانی بڑے اور چھوٹے سرمایہ

داروں کا بہت بڑا مرکز ہے۔ کلکتہ کے ساتھ ساتھ ہندستان کی جدید بورژوا قومی تحریکوں کا آغاز وہیں سے ہوا۔ کانگریس کے حمایتی بڑے اور چھوٹے سرمایہ دار، خلافت اور مسلم لیگ کی تحریک کو لاکھوں روپیہ دینے والے مسلم تاجر سرمایہ دار اسی شہر کے تھے۔ بورژوا سیاست کے تمام اہم موڑوں پر فیصلہ کن قدم یہاں پر یا یہاں کے ملکی سرمایہ داروں کے زیر اثر ہی اٹھائے گئے۔ دوسری طرف ہمارے ملک کی پرولتاری تحریک کا آغاز یہاں سے ہی ہوا۔ صنعتی مزدور طبقے میں طبقاتی شعور سب سے پہلے یہاں سے ہی پیدا ہوا۔ سوتی مل کے لاکھوں مزدوروں کی شدید اور لمبی ہڑتالیں اور ان کی ٹریڈ یونین اور ان کی سیاسی پارٹی کی تنظیم کے سلسلے میں بھی یہاں کے ہی عملی تجربے سارے ملک کے محنت کشوں کے لیے مشعل راہ بنے۔ یہاں کے نوجوان دانشور، بورژوا سیاسی نظریوں کو ترک کرنے اور مارکسی، پرولتاری انقلابی خیالات کو قبول کرنے اور مزدور طبقے میں ان خیالات کو پھیلانے میں پہل کرنے والوں میں تھے۔

یہاں کے حسین اور پر فضا مقامات پر انگریز سامراجی حکمرانوں (1947 کے پہلے) کے شاندار مکانات اور دفاتر ہیں۔ انگریزی اور دوسرے طاقتور بیرونی تجارت اور صنعت اور جہاز رانی کی کمپنیوں اور بینکوں کے عالیشان پتھر اور کانکریٹ کے بنے ہوئے مرکزی دفاتر ہیں۔ ہندستان کے تمام بڑے بڑے راجاؤں اور مہاراجاؤں اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کے محلات ہیں۔ دوسری طرف میانہ طبقہ کے لکھوکھا چھوٹے بڑے مکانات اور بلڈنگیں، دکانیں اور ریسٹورنٹ ہیں، اور محنت کش مظلوم طبقے کی وہ اندھیری نما چھوٹی چھوٹی کھولیاں اور چالیں جہاں پر سورج کی روشنی کا گزر ہے نہ تازہ ہوا کا۔ یہاں سنگ مرمر کی بنی ہوئی عالی شان مسجدیں ہیں، آتش کدے ہیں اور اونچے کلس کے مندر اور یہاں کے محلوں میں لب سڑک لوہے کے جنگلوں میں بند کر کے ہمارے ملک کی ہزاروں عورتوں کے جسم کی اعلانیہ تجارت بھی ہوتی ہے۔ یہاں سامراجی محکومی کا نظام، جدید سرمایہ داری کی قوت اور حرکت، اس کی پھیلائی ہوئی بہمیت اور غلاظت، ریاکاری اور بداخلاقی اور امارت و افلاس کا ہولناک تضاد صاف نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ ہر طرف اور زندگی کے ہر شعبے میں جاری اور ساری ان تضادات اور مخالف کیفیتوں سے یہاں پر محنت کشوں، درمیانہ طبقے کے لوگوں، دانشوروں میں مسلسل شورش اور حرکت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ زندگی کے غیر

انسانی حالات مظلوم انسانوں کے بہترین جذبات کو ابھارتے ہیں۔ ظلم کے خلاف ایک ساتھ مل کر مفاہمت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ ذہن زیادہ تیزی سے چلتے ہیں۔ احساسِ پستی شدت کے ساتھ بلندیوں کی طرف اٹھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ جھوٹ اور ریاکاری کے پردے جوش اور غصے کے ساتھ پھاڑ ڈالے جاتے ہیں۔ حق و باطل کے مابین مسلسل جدوجہد اور تصادم کے سبب مظلوموں میں اتحاد و عمل کا نیا تجربہ ہوتا ہے۔ ان کی سوجھ بوجھ بڑھتی ہے۔ انقلابی عزم بےبسی کی جگہ لینے لگتا ہے۔ نئی جدید سائنسی معاشرت کی اجتماعی تنظیم کا زندہ و دلکش تصور عملی طور سے نگاہوں کے سامنے آ کر دماغ کو روشن اور دلوں کو گرم کرنے لگتا ہے۔ مہیب مایوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اُمنگ اور اُمید کی جھل مل کرنیں نور کا جال بنتی رہتی ہیں۔

یہ ہماری بڑی خوش بختی تھی کہ 1942 کے وسط کے بعض اسباب کی بنا پر بمبئی میں رفتہ رفتہ بہت سے ترقی پسند ادیب اور شاعر جمع ہو گئے۔

اُردو کے نوجوان ترقی پسند ادیبوں میں خواجہ احمد عباس پہلے سے ہی وہاں موجود تھے۔ وہ کئی سال سے بمبئی کرانیکل اخبار میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اور شروع میں ہی انھوں نے بمبئی میں ترقی پسند ادب کی تحریک کو چلانے میں گجراتی اور مرہٹی کے ادیبوں کے ساتھ مل کر حصہ لیا تھا۔ جون 1942 میں جب سردار جعفری اور میں کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی اُردو ہفتہ وار کی ادارت کے واسطے بمبئی میں سکونت کے لیے آئے تو عباس سے مل کر ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بہت بےچینی سے ہمارے بمبئی آنے کا انتظار کر رہے ہوں۔ عباس یوں تو ہماری طرح شمالی ہندستان کے ہی تھے، پانی پت کے رہنے والے تھے، مولانا حالی کے شاید نواسے اور بڑے تقدس مآب قدیم خاندان کے ایک فرد تھے۔ لیکن بمبئی میں کئی سال رہنے اور ایک جدید روزنامہ اخبار میں جرنلسٹ کی حیثیت سے باقاعدگی کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے ان میں جدید صنعتی عہد کے انسان کی بہت سی خوبیاں آ گئی ہیں۔ تیزی سے کام کرنا، لفاظی اور تکلف سے اجتناب، باضابطگی، صاف گوئی ان کی خصلت کا حصہ بن گئی ہے۔ کبھی کبھی جب میں ان کے اخبار کے دفتر میں ان سے ملنے جاتا تھا تو ان کی انگریزوں کی سی رکھائی سے الجھن ہوتی تھی۔ اس وقت میں بمبئی میں نووارد تھا اور اخبار کے کام سے ناواقف، اس لیے مجھے اس کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس غریب کو مقررہ وقت کے اندر اپنا کام

ختم کر دینا ہے اوراس کے پاس دفتر میں فاضل وقت نہیں۔اس لیے گفتگو میں پر تکلف مشرقی تمہید کے بجائے وہ بات کو محض اس کے عملی پہلو سے دیکھ کر چند منٹوں کے اندر ختم کر دینا چاہتا ہے۔ عباس میں محنت کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت تھی۔اخبار میں چھ سات گھنٹے کام کرنے کے بعد وہ فلم کے لیے افسانہ، مکالمے لکھنے، ادبی کام کرنے ،میٹنگوں میں شریک ہونے، بہت سی انجمنوں میں تنظیمی کام کرنے کے لیے، اور پھر بے شمار احباب سے ملنے اوران کی مدد کرنے کے لیے بھی وقت نکال ہی لیتے ہیں۔

عباس کے چھوٹے سے کمرے میں (اس وقت وہ وکٹوریا گارڈن کے پاس رہتے تھے) اور ایرانی ہوٹلوں میں لامتناہی چائے نوشی کے ساتھ ساتھ ہماری بہت سی غیر رسمی میٹنگیں اور گفتگوئیں ہوئیں۔ان میں ہمارے علاوہ ہندی، مرہٹی، گجراتی اور کبھی کبھی کنڑی اور ملایالم کے نوجوان ادیب بھی شریک ہوتے تھے۔ان میں ایک پراسرار اور حسین خاتون اینل ڈیسلوا بھی تھیں۔جنھوں نے پتہ نہیں کیوں، اپنے وطن لنکا کو چھوڑ کر بمبئ میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ انھیں آرٹ، ادب، ڈرامہ،سنیما، زندگی کی دلچسپ اورخوبصورت چیزوں اورآزادی واشتراکیت سے ایک عام دلچسپی تھی۔ان کے دوست بمبئ کے ہر طبقے کے لوگ تھے۔عباس نے انھیں بھی انجمن میں شریک کیا۔

عباس نے ہی اپنے اثر اور دوستوں کو استعمال کر کے انجمن کے جلسوں کے لیے ''بک کلب'' کی جگہ حاصل کی۔ بک کلب بمبئ کے ایک مشہور کتب فروش ''نیو بک کمپنی'' کے پارسی مالک نے قائم کیا تھا۔ یہ فورٹ میں نیو بک کمپنی کی عمارت کے اوپر کے حصے میں تھا۔اس میں دو تین وسیع اورخوش مذاقی سے فرنش کیے ہوئے کمرے تھے جن میں نئ کتابیں میزوں پر پڑی رہتی تھیں اور جن کی دیواروں پر دل آویز تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ہمارے پہلے جلسے میں کوئی پچیس تیس آدمی موجود رہے ہوں گے۔ان میں مرہٹی کے مشہور بزرگ ادیب ماماویرکر تھے۔ گجراتی کے باکولیش اورسوپن رستھ اور بھوگی لال گاندھی، ہندی کے نریندر شرما (شاید) اور رمیش سنہا، اُردو کے سردار جعفری، احمد عباس، کنڑی کے ایک دو ادیب اور بہت سارے نوجوان جو ادیب بننا چاہتے تھے یا ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔اس جلسے کی صدارت ماماویرکر،نے کی۔اس میں بمبئ کی

انجمن ترقی پسند مصنّفین قائم کی گئی۔ آٹھ دس آدمیوں کی ایک ایکزیکیوٹیو کمیٹی چنی گئی۔ انجمن کے ممبر بنائے گئے اور ان سے ممبری کا چندہ وصول کیا گیا۔ سب نے اتفاق رائے سے ایک نوجوان پارسی (گول والا) کو انجمن کا سکریٹری چنا۔ وہ ادیب نہیں تھا لیکن ہماری تحریک سے پُر جوش دلچسپی رکھتا تھا اور خط و کتابت، رجسٹر اور حساب رکھنا، دلچسپ پروگرام بنانا، یعنی تمام وہ خوبیاں، جو ایک انجمن کو چلانے کے لیے ضروری ہیں، اس میں بہت زیادہ تھیں۔ ایسی صلاحیتیں تو ادیبوں میں عام طور سے کم ہوتی ہیں۔ یہ نوجوان خود اس ذمہ داری کو اٹھانا نہیں چاہتا تھا لیکن سب نے مل کر اسے اس کام کو کرنے کے لیے آمادہ کر لیا۔

ان حروف کو لکھتے وقت میرے دل میں ایک ٹیس اٹھتی ہے اور اس نوجوان کا خیال کر کے میرا سر شکر گزاری، احترام اور رنج سے جھک جاتا ہے۔ اب وہ ہم میں باقی نہیں ہے۔ 1945 میں بمبئ کے ایک مزدور محلے میں جہاں وہ یونین کے کام سے گیا تھا، سرمایہ داروں کے غنڈوں نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر اسے قتل کر دیا۔ وہ ایک خوشحال پارسی گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس نے یونیورسٹی میں اپنی تعلیم ختم کر لی تھی۔ دبلا، پتلا، کوئی ساڑھے پانچ فٹ کا قد، سفید قمیص اور پتلون میں ملبوس، زندگی میں تمام آرام و آسائش کو تج کر جو اسے آسانی سے مل سکتے تھے، وہ پہلے سوشلسٹ پارٹی میں داخل ہوا، پھر کمیونسٹ بنا۔ اب وہ اپنا سارا وقت عوامی تحریکوں (طلبا، مزدور، ادیب) کو منظّم کرنے میں صرف کرنے لگا۔ اس نے اپنے طبقے اور خوشحال گھرانے سے لڑائی مول لی، اور وہ عوام کا ہو گیا۔ جب اس سے ملو تو اس کے چہرے پر ایک بشاش سی مسکراہٹ اور سنجیدگی رہتی تھی۔ جس عوامی تنظیم میں بھی وہ کام کرتا تھا وہاں پر وہ بڑی انکساری کے ساتھ سب سے زیادہ مشقت اور دوڑ دھوپ کے ایسے کام اپنے ذمہ لے لیتا تھا، جسے دوسرے غیر دلچسپ سمجھتے تھے۔ خندہ پیشانی کے ساتھ ایک تبسم شرمیلے پن کے ساتھ اپنے خلوص، بے لوث رفاقت اور باضابطگی سے وہ اپنے شریک کار ساتھیوں کو بھی متاثر کرتا تھا اور انھیں بہتر کام کرنے پر آمادہ کر لیتا تھا۔ بمبئ کی انجمن کے پہلے جلسے میں جب ہمارے اس رفیق کا نام سکریٹری کے عہدے کے لیے پیش کیا گیا تو ہم، جو کمیونسٹ تھے، خاموش رہے۔ اس لیے کہ وقتاً فوقتاً کسی گوشے سے تحریک کے متعلق یہ آواز بلند ہوتی رہتی تھی کہ کمیونسٹ چال بازی کر کے انجمن کی اہم جگہوں پر اپنے لوگوں کو رکھ دیتے ہیں اور

اس طرح تنظیم پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی اعتراض کیا جاتا تھا کہ ایک غیر ادیب سیاسی کارکن کو کسی صورت میں ادیبوں کی انجمن کا عہدہ دار نہ ہونا چاہیے۔ انجمن کے اس جلسے میں (اور جیسا کہ اس کے اکثر اجتماع میں ہوتا ہے) اکثریت غیر کمیونسٹوں کی تھی۔ پھر ان سب نے کیوں ایسے شخص کو سکریٹری چنا؟ صرف اس لیے کہ لوگ اس نوجوان پر یہ اعتماد رکھتے تھے کہ وہ بے غرضی کے ساتھ اور تندہی سے انجمن کی تنظیم اور سکریٹری کا کام انجام دے گا۔ ظاہر ہے کہ بہتر یہی ہوتا کہ کوئی ممتاز ادیب اس کام کو اپنے ذمہ لیتا اور اسے باقاعدگی سے کرتا۔ لیکن ترقی پسندوں کی جماعت میں چھوت چھات کے جذبے سے اور مخالفین کے پروپیگنڈے سے ڈر کر ہمیں کبھی بھی ایسی اصول پرستی کا غلام نہ بننا چاہیے، جس کے سبب سے عملی طور پر ہمیں نقصان پہنچے۔ ترقی پسندوں کے مخالف اگر یہ نہیں تو کوئی دوسرا الزام ہم پر لگائیں گے۔ ان کا تو آخر مقصد ہی تحریک میں نفاق پیدا کرنا اور اسے بدنام کرنا ہے۔

اسی طرح کا ایک مسئلہ یہ بھی کبھی ہوتا ہے کہ ہماری انجمن کے ممبروں میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو مصنف نہیں ہیں...... انھیں ممبر بنانا چاہیے یا نہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ ہماری انجمن مصنّفین کی انجمن ہے۔ لیکن اگر چند طالب علم، جرنلسٹ، ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اس کے ممبر بن جاتے ہیں تو ہمیں اس پر پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اتنے برسوں کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ ایسے لوگوں کی موجودگی اور شرکت سے انجمن کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے۔ وہ اگر ہمارے ادیبوں کے افسانے، مضامین یا شعر سننے کے لیے ہی ممبر بن جاتے ہیں اور باقاعدگی سے ہمارے جلسوں میں آتے ہیں، بحث ومباحثہ میں حصہ لیتے ہیں تو اس سے ہماری اجتماعی قوت اور اثر بڑھتا ہے، گھٹتا نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس قسم کے کسی بڑے گروہ نے انجمن کے عہدوں پر قبضہ کر کے انجمن کو کسی غیر ادبی مقصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر ہمیں پابندیاں لگانے اور ممبر بنانے میں سختی کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن جب انجمن کی ادبی نوعیت محفوظ رہتی ہو، اس میں اکثریت ادیبوں کی ہی ہو تو اس قسم کی سخت گیری فضول ہے اور محض ایک خیالی خوف کے ماتحت اپنے ہمدردوں کو خواہ مخواہ ناخوش کرنا، اپنے اثر کو محدود کرنے، اپنی طاقت کو گھٹانے کے مترادف ہے۔ اگر مصنّفین کی انجمن ایک تہذیبی (کلچرل) انجمن بھی ہو تو اس

میں بھی حرج نہیں، فائدہ ہے۔ ہماری تحریک کا ارتقا ہمیں یہ ہی سبق دیتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں دراصل جس بات کی طرف توجہ دینی چاہیے، وہ یہ ہے کہ انجمن کی سرگرمیاں، اس کے اجتماع، کانفرنسیں، اور اس کے رسالے اس قسم کے ہوں جن سے ادبی ماحول پیدا ہو اور جس سے ادب کی تخلیق اور اس کی پیہم ترقی کی مدد ملے۔ مثلاً یہ ممکن ہے کہ ایک افسانہ نگار یا شاعر جو ہماری انجمن کا ممبر ہو، اچھا افسانہ نگار اور شاعر ہونے کے باوجود اچھا نقاد نہ ہو۔ یہ ممکن ہے کہ اس کی تنقید سے دوسرے ادیبوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچے......اور ایک ایسا شخص جو محض ادب میں دلچسپی رکھتا ہے اور خود ادیب نہیں ہے، ادب کی اچھی پرکھ رکھتا ہو اور ہمارے جلسوں میں اس کی تنقید ادیبوں کے لیے مفید ثابت ہو۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ یہ شخص ہماری انجمن کا ممبر ہو یا ہمارے تمام نظریوں سے متفق ہو۔ ہم ان سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں جو ہمارے نظریوں کو قبول نہیں کرتے۔ اس لیے اپنی انجمن اور کانفرنسوں میں ہمیں اپنے حلقے کے باہر کے لوگوں کو بھی وقتاً فوقتاً مدعو کرنا چاہیے اور ان سے اظہار خیال کی درخواست کرنی چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم ان کی باتوں سے متفق ہوں۔ لیکن یہ بالکل ممکن ہے کہ ایسے لوگ ہماری ان خامیوں اور کمزوریوں پر (یا خوبیوں پر) ہماری توجہ کو مبذول کرادیں جن کی طرف خود ہم نے پہلے سے کافی توجہ نہیں کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ 1945 اور 1946 میں بمبئی کی انجمن کے اُردو ادیبوں کے جلسوں میں شریک ہونے کے لیے میراجی بھی کبھی کبھی اختر الایمان اور مہندر ناتھ کے ساتھ آتے تھے، جن کے وہ دوست تھے۔ وہ بیچارے شروع شروع میں ہمارے جلسوں میں چپ بیٹھے رہتے تھے۔ لیکن ہم نے ان سے درخواست کی کہ وہ بھی ان افسانوں، نظموں اور مقالوں پر اپنی رائے دیں جو انجمن میں پڑھے جاتے تھے۔ ہم سب کو اس کی خوشی ہوتی کہ اکثر موقعوں پر ان کی تنقید سنجیدہ، بے لاگ اور نپی تلی ہوتی تھی۔ ان میں اچھے اور برے ادب کی پرکھ کا بہت اچھا شعور تھا۔ اس مجمع میں کئی ایسے ترقی پسند ادیب بھی تھے جن کے مقابلے میں میراجی کا تنقیدی نقطۂ نظر بعض لحاظ سے زیادہ مفید اور وقیع معلوم ہوتا تھا۔

بمبئی کی انجمن کی نوعیت بالکل نرالی تھی۔ اس کے جلسوں میں مرہٹی، گجراتی، ہندی اور اُردو زبان میں لکھی ہوئی نظمیں، افسانے اور مضامین پڑھے جاتے تھے۔ بمبئی میں رہتے رہتے اور

ایک دوسرے کی زبان سنتے سنتے ہم میں سے اکثر دوسری زبان کے افسانوں اور نظموں کے مطالب اور باریکیاں نہیں تو کم از کم مفہوم سمجھنے لگے تھے۔ان جلسوں کے پروگرام میں اگر باالغرض اُردو کا افسانہ پڑھا جاتا تو گجراتی کی ایک نظم، مرہٹی کا ڈرامہ، تو ہندی کی کویتا۔ان میں شریک ہونے کے لیے ہمارے ممبروں کے علاوہ بمبئی کی فلمی دنیا کے آرٹسٹ اور ڈائرکٹر وغیرہ بھی آتے تھے۔دسمبر 1942 میں جب جوش ملیح آبادی اور ساغر نظامی بمبئی آئے تو ان کا کلام سننے اور ان کے استقبال کے لیے ہم نے ایک خاص جلسہ کیا۔اس مجمع میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو اُردو نہیں جانتے تھے یا اس سے بہت کم واقف تھے۔ادیبوں کے علاوہ وہاں پر جو لوگ تھے، پرتھوی راج، سہراب مودی، ڈبلیو۔زیڈ۔احمد وغیرہ، وہ یا تو فلمی دنیا کے لوگ تھے یا جرنلسٹ، اور آرٹسٹ جو جوش صاحب کا کلام ان کے منہ سے سننے اور ان سے ملنے کے مشتاق تھے۔جوش صاحب شروع میں کافی بددل تھے، اس بات سے کہ اس مجمع میں زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو اُردو اور خاص طور پر ان کی اُردو کو نہ سمجھیں گے۔لیکن جب انھوں نے شعر سنانے شروع کیے، رباعیاں اور اس کے بعد نظم، تو مجمع نے اتنی عقیدت اور خلوص سے انھیں سنا کہ اس سے متاثر ہو کر جوش بڑے انہاک سے اور بڑی دیر تک اپنا کلام سناتے رہے۔میرے سپرد یہ محال کام ہوا کہ میں فی البدیہ جوش کے اشعار کا انگریزی میں مفہوم بتاتا جاؤں۔جلسہ کے خاتمہ پر ہمیں محسوس ہوا کہ جوش صاحب نے میدان فتح کر لیا۔ان کی شخصیت، ان کے پڑھنے کا انداز اور ان کے کلام کے وقار اور حسن نے مرہٹی اور گجراتی زبان بولنے والوں اور اُردو سے بہت کم واقفیت رکھنے والوں پر بھی کافی اثر ڈالا۔

جگر مرادآبادی، ہندی کی مشہور شاعرہ سبھدرا کماری چوہان (جن کی نظم ''جھانسی کی رانی'' ہمارے قومی ادب کا شاہکار ہے)، اودے شنکر، انگریزی ناولسٹ ای۔ایم فوسٹر، مولوی عبدالحق، وی۔پی۔مکرجی، وغیرہ کے لیے بھی انجمن نے خاص جلسے کیے۔

ملک کے مختلف حصوں سے اور مختلف زبانیں بولنے والے ان بزرگ ادیبوں اور فنکاروں کے ہماری انجمن میں آنے اور اپنا کلام سنانے یا تقریر کرنے سے نہ صرف یہ کہ ہمارے ادبی اور فنی ذوق کی تربیت ہوئی تھی، بلکہ یہ بات بھی ثابت ہوئی تھی کہ تہذیب کا ایسا نہیں چلتا جس میں تنگ نظری، قومی یا فرقہ وارانہ عصبیت یا جہالت اور نفرت کا کھوٹ ہوتا ہے۔قوم مذہب،

فرقے، ملک یا زبان کی بنا پر عناد اور نفرت، علم، ادب اور تہذیب کے انحطاط اور موت کا باعث ہیں۔ اس لیے کہ ان مبتذل جذبات سے متاثر ہوکر پیدا ہونے والا ادب اور تہذیب بھی محدود اور مبتذل ہوتے ہیں۔ ان میں بنی نوع انسان کے لیے عام طور پر کوئی شریفانہ اور سودمند بات، بیش قیمت یا بلند حقیقت کا انکشاف نہیں ہوتا۔ صرف وہی ادیب اور فنکار اپنی قومی حدود کو پار کر کے دوسرے انسانوں کو متاثر کرتے ہیں، جو اپنی قوم اور اپنے زمانے کے سب سے اچھے اور سب سے اونچے خیالات اور جذبات کا خوبصورتی، مہارت اور سچائی کے ساتھ اظہار کریں۔ حبّ وطن اگر دوسری قوم یا قوموں سے نفرت میں بدل جائے یا اپنی مخصوص تہذیب یا زبان سے فطری لگاؤ دوسری تہذیب یا زبان سے مخالفت اور دشمنی کا رُخ اختیار کرے تو قلوب میں مدنیت کی روح گھٹ جائے گی اور ذہنوں پر بہمیت اور جہالت کی تاریکی چھا جائے گی۔ اس طرح ہم خود اپنے ہاتھوں سے اپنی حق شناسی اور انسانیت کا گلا گھونٹ دیں گے جن کے بغیر علم اور تہذیب کا ارتقا ناممکن ہے۔

بمبئی کی انجمن میں ہمارے وطن کی مختلف زبانوں کے ادیبوں کا میل اور ملک کے مختلف خطّوں کے کلچر کا علمی اتحاد ایک طرف اور دوسری طرف بمبئی کی عوامی جمہوری تحریکوں سے ہم میں سے اکثر کا کسی نہ کسی طرح سے منسلک ہونا ہماری نظر میں وسعت اور ہمارے دلوں میں اعتماد اور رواداری پیدا کرتا تھا۔ ہمارے ملک میں رجعت پرست قوتوں کا مخصوص طریقۂ کار فرقہ واریت، مذہبی، قومی اور ذات پات کی بنیاد پر عوام میں باہمی غلط فہمی اور منافرت پھیلانا ہے۔ ہم انجمن کی تنظیم اور اس کے عمل سے یہ ثابت کرتے تھے کہ ایک دوسرے کے ادب سے واقفیت، ہر ایک تہذیب کو آزادی کے ساتھ بڑھنے اور بار آور ہونے کا موقع دینا، ایک دوسرے پر ضرب لگائے بغیر ممکن بھی ہے اور سب کے لیے مفید بھی، اور یہ کہ عام تہذیبی ترقی کی ایک لازمی شرط ہے۔ غالباً یہ دعویٰ کرنا تو غلط ہوگا کہ اس اچھے اور صحت مند ماحول میں ہم میں سے ہر ایک کے دل و دماغ سے تنگ نظری اور عصبیت بالکل غائب ہوگئی تھی۔ وقتاً فوقتاً اس کے بھی مظاہرے ہوتے تھے۔ ہم جس سماج میں رہتے تھے، اس کے رجعت پسند نظریے کبھی کبھی نادانستہ طور پر اور کبھی بھیس بدل کر ہم میں سے بعض کے ذہنوں میں گھس جاتے تھے۔ تاہم جن بنیادوں پر ہم نے اپنی تنظیم قائم کی تھی،

ترقی اور آزاد خیالی کا جو ماحول ہم نے بنایا تھا، اس میں ان منحوس میلانات کا پنپنا دشوار تھا۔

1942 میں ''نیا ادب'' کے صرف ایک یا دو پرچے لکھنؤ میں شائع ہوئے تھے۔ سردار جعفری کی رہائی کے بعد سبط حسن اسے دوبارہ زندہ کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے کہ سردار کو بمبئی آنا پڑا اور وہ منصوبے وہیں کے وہیں دھرے رہ گئے۔ 1943 میں آخر کو سبط حسن بھی بمبئی آ گئے۔ ہم نے انھیں ''قومی جنگ'' کے اسٹاف میں شریک کرنے کے لیے بلایا تھا۔ احمد عباس کی مدد سے سردار نے فلم کمپنیوں سے اس کے لیے اشتہارات حاصل کر لیے تھے۔ سبط حسن کے آنے پر یہ منصوبے پکے ہو گئے تھے اور اب چھوٹے سائز میں اور سہ ماہی کتاب کی شکل میں ''نیا ادب'' دوبارہ بمبئی سے شائع ہوا۔ لیکن چونکہ سبط حسن، سردار یا میں، ہم میں سے کوئی ایک بھی اپنا پورا وقت اس رسالے کی ادارت کے لیے نہیں دے سکتے تھے، اس لیے اب یہ باقاعدگی سے نہیں نکل سکا۔ پھر بھی اس کے جاری ہونے سے ہماری تحریک کے اُردو حصے میں کسی حد تک مرکزیت آ گئی۔ گو ''نیا ادب'' آفیشیل طور پر انجمن کا رسالہ نہ پہلے تھا اور نہ اب۔ کچھ دنوں بعد عبداللہ ملک بھی لاہور سے آ کر کمیونسٹ پارٹی کے اُردو ہفتہ وار کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے ''نیا اَدب'' کی ادارت میں مدد کی۔

''نیا ادب'' کے اس نئے دور کے پہلے نمبر میں جوش ملیح آبادی اور ساغر نظامی کے دستخط سے جنگ کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر ادیبوں کے فرائض کے متعلق ایک بیان شائع ہوا۔ جوش صاحب جب 1942 کے خاتمہ پر بمبئی تشریف لائے تو وہ کمیونسٹوں سے نالاں اور ناراض تھے اور ہماری سیاسی پالیسی سے اختلاف رکھتے تھے۔ بات یہ تھی کہ اگست 1942 کے بعد سے، جب انگریزی حکومت نے اچانک کانگریس کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا تھا، ملکی سیاست میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ کانگریسی عام طور پر اور ان کے زیر اثر عوام اب پوری کوشش کر کے ملک میں ایسی تحریک چلا رہے تھے، جس کا منشا جنگی کوششوں میں رکاوٹ ڈالنا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ جاپانی فوجیں بنگال کی سرحد تک پہنچ گئی تھیں اور مغرب میں اسٹالن گراڈ کا فیصلہ کن کارزار گرم تھا، کمیونسٹ اور ان کے ہم خیال لوگ کسی ایسی پالیسی کو، جس سے فاشزم کی فوجوں کو براہ راست یا بالواسطہ مدد پہنچے، غلط سمجھتے تھے۔ چنانچہ ہم انگریزی حکومت کے محبان وطن کو گرفتار کرنے اور ملک

کے مطالبہ آزادی کو تسلیم نہ کرنے کی سامراجی سیاست کے مخالف بھی تھے اور جنگ کی کوششوں میں رکاوٹ ڈالنے کی سیاست کو وطن کے مفاد کے خلاف سمجھتے تھے۔ کانگریسی حضرات نے اس زمانے میں بڑے شدومد کے ساتھ ہمارے خلاف یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ ہم انگریز سامراجیوں سے مل گئے ہیں اور ان کے اشارے پر کانگریس کی اگست 1942 کی ''تحریک'' کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ہمارے پیٹھ پیچھے یہ بھی کہا جانے لگا کہ ہم نے انگریزی حکومت سے روپیہ لے لیا ہے۔ جوش صاحب بھی ہمارے خلاف اس پروپیگنڈہ سے متاثر نظر آئے تھے۔ لیکن چونکہ وہ ہم میں سے بعض کو بہت اچھی طرح جانتے تھے اور انھیں غالباً ہمارے خلوص اور نیک نیتی پر شبہ نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے بڑی صفائی سے اپنی ناراضگی کا اظہار ہم سے کیا۔ سردار جعفری اور مجھ سے طویل گفتگوئیں اور بحثیں ہوئیں۔ ہمارے نزدیک اس نازک اور اہم تاریخی موقع پر جب جنگ عظیم میں دنیا کی قسمت، قوموں کی آزادی، جمہوریت اور اشتراکیت کے مستقبل کی فیصلہ کن جنگ ہو رہی تھی، یہ بہت ضروری تھا کہ ترقی پسند ادیب ہم خیال ہوں اور بہت سی باتوں میں نظریاتی اور سیاسی اختلاف کے باوجود متفقہ پالیسی پر ایک ساتھ مل کر عمل کریں۔ جوش اور ساغر کا بیان ان مباحث کا نتیجہ تھا۔ اس بیان سے فاشزم کے جارحانہ حملے سے ہمارے وطن اور تہذیب وتمدن اور جمہوریت کو جو خطرہ لاحق تھا، اس سے ملک کے تمام اہل قلم کو آگاہ کیا گیا اور جوش صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا......

> ''اس خطرناک حقیقت کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ آج ہم دوہری مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ایک طرف تو گرگِ باراں دیدہ چور ہے، جو ہمارے گھر کے اندر چھپا ہوا نہیں بلکہ دندناتا پھرتا ہے، اور دوسری طرف ایک خون آشام ڈاکو ہے جو ہمارا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ چور کو باہر نکال دیں اور ڈاکو کو اندر نہ آنے دیں۔ جس کے واسطے ناقابل تسخیر اتحاد کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اس روش پر کاربند ہو جائیں گے تو بہت جلد ایک ایسی صبح سعادت طلوع ہوگی، جس کی پہلی کرن کی روشنی میں ہم سب انتہائی مسرت آمیز حیرانی کے ساتھ دیکھیں گے کہ چور تو غلے کی کوٹھری میں مرا پڑا ہے اور ڈاکو گلی کی نالی میں غرق ہو چکا

ہے۔

ہمارے نزدیک ان حالات میں تمام ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ تمام ہندستانی قوم کو موجودہ خطرات سے آگاہ کریں۔ انھیں اتحاد کے لیے اٹھائیں......اس بحرانی دور میں ادیبوں کے بڑے فرائض ہیں۔ مایوسی اور پست ہمتی کو دُور کرنا، آنے والے خطرات کی ہولناکی سے عوام کو آگاہ کرنا، حب الوطنی کے جذبات کو بیدار کرنا، عوام میں انقلابی اتحاد کی تعمیر کرنا، اور چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کو فراموش کر کے اپنی تہذیب اور تمدن کی اساس کو محفوظ رکھنے کے لیے سرزمین ہند پر بسنے والے ہر متنفس کو آگاہ و مستعد کرنا......ہم حتی الامکان ان فرائض کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے، اور ہم ہندستان کے تمام اہل قلم کو ایسا ہی کرنے کی دعوت دیتے ہیں......''

اس کے چند مہینوں بعد (مئی 1943 میں) جب مجاز بمبئ آئے تو انھوں نے بھی ایک بیان میں اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا......

''ہم ترقی پسند ادیب اب تک اپنے آرٹ سے تلوار کا کام لیتے رہے ہیں۔ ہم نے ہر قسم کے ظلم اور بے انصافی کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسانیت اور تمدن کے سب سے بڑے دشمن فاشزم کے مقابلے میں ہم اپنی تلوار نیام میں رکھ لیں۔ ہمارے نغموں کو آج دوبارہ وطن کی فضاؤں میں گونجنا چاہیے تاکہ اتحاد، خوداعتمادی، سرفروشی اور حریت کے جذبات سے معمور ہو کر ہم اپنے راستے سے ہر ایک رکاوٹ کو ہٹا دیں، جو اندھے سامراجی ہماری راہ میں حائل کرتے ہیں......''

اس اہم مسئلہ پر نظریاتی یکجہتی کے ساتھ ساتھ اور اس کی وجہ سے ہماری تنظیم بھی مضبوط ہونے لگی۔ جولائی 1943 میں حیدرآباد دکن میں مخدوم محی الدین کی راہ نمائی میں باقاعدہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کی تشکیل ہوئی۔ حیدرآباد میں اب اُردو کے نوجوان ترقی پسندوں کا ایک ہونہار گروہ اُبھر آیا ہے۔ قاضی عبدالغفار صاحب نے انجمن کے افتتاحی جلسے کی صدارت کی۔ پنجاب میں انجمن کی دوبارہ تنظیم نہیں ہو سکی۔ اس لیے کہ انجمن کے پرانے کارکنوں میں (فیض یا کرشن

چندر) اب وہاں کوئی ایسا شخص نہیں رہ گیا تھا جو تنظیم کا مشکل کام اپنے ہاتھ میں لیتا۔ ہمارے نوجوان ساتھیوں میں اس زمانے میں عبداللہ ملک سامنے آئے لیکن وہ بھی بمبئی آ گئے۔ تحریک پھر بھی وہاں اثر انداز ہوتی رہی۔ احمد ندیم قاسمی ابھی تک سرکاری ملازمتوں کے دھندے میں پھنسے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی شاعری اور افسانہ نویسی ترقی پسندی کے آہنگ سے گونج اٹھی اور ان کی نظمیں ہمارے رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ ظہیر کاشمیری کی شاعری بھی اس زمانہ میں ابھری۔ الہ آباد، بنارس، دہلی اور آگرہ میں بھی انجمن کی شاخیں قائم ہوئیں۔ بنگال میں تحریک نئے سرے سے منظّم کی گئی اور بنگالی ترقی پسند ادیبوں اور آرٹسٹوں کی صوبائی کانفرنس بھی ہوئی۔ وہاں کا صوبائی دفتر پھر سے قائم ہوا۔ مشہور بنگالی ادبی ماہنامہ ''پریچے'' اب باقاعدہ انجمن کا ترجمان بن گیا۔ نئے ادیب اور شاعر تحریک میں شامل ہوئے۔

غالباً اسی زمانے میں ہماری تحریک نے آندھرا اور مالابار میں سب سے اہم فتوحات حاصل کیں۔ مالابار میں جدید ملایالی ادب کی سب سے بڑی ہستی ولاٹھول نے پریم چند کی طرح ترقی پسند ادب کی تحریک سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور اس سے منسلک ہو گئے۔ ان کے لڑکے جو نوجوان ادیبوں میں اونچا درجہ رکھتے تھے، انجمن کے سکریٹری ہوئے۔ مختلف شہروں میں انجمن کی تنظیم ہوئی اور صوبائی مرکز اور دفتر بھی قائم ہوا۔ ملایالم کے ترقی پسند ادیبوں نے ایک ماہوار ادبی رسالہ بھی جاری کیا۔ افسانوں اور نظموں اور بیرونی ترقی پسند ادب کے ترجموں کے مجموعے شائع ہوئے۔

اسی طرح آندھرا میں بھی ترقی پسند ادب کی تحریک اس زمانے میں تیزی سے بڑھی اور پھیلی۔ وہاں بھی اس تحریک نے تیلگو زبان کے قومی ادب اور قومی شعور کے احیا کی شکل اختیار کی۔ تیلگو کے بزرگ ترین ادیب اس میں شامل ہوئے۔ مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔ ماہنامہ ادبی رسالہ جاری ہوا۔ صوبائی مرکز اور اس کا دفتر قائم کیا گیا۔

ملک کے ان دونوں علاقوں میں جہاں اس کے پہلے کبھی بھی ہماری تحریک نے منظّم شکل اختیار نہیں کی تھی، اور پھر صرف چند افراد سے انجمن کے مرکز کا تعلق تھا، ترقی پسند ادب کی تحریک کی ایسی زبردست نشو و نما معاشرتی محرکات کے ساتھ دیکھنے ہی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ ہوا یہ کہ اس

زمانے میں یہاں کی قومی آزادی کی تحریک نے ایک وسیع اور عوامی شکل اختیار کی۔ بائیں بازو کے سیاسی کارکن جن میں سے اکثر اشتراکی تھے، صوبے کے کسان، عوام اور نچلے درمیانہ طبقے کے ایک بڑے حصے کو (جن میں دانشور بھی تھے) متحرک اور منظّم کرنے میں کامیاب ہونے لگے۔ کسان عوام کی بیداری، سامراجی نظام اور دیہاتی عوام کا استحصال کرنے والے بڑے زمینداروں اور مہاجنوں کے خلاف کسانوں کی جدوجہد مالاباری اور تیلگو عوام کی قومی آزادی کی جدوجہد کی بنیاد بن گئی۔ ہمارے ملک میں کسان قوم کی عظیم اکثریت ہیں۔ ان کی بیداری کے معنی قومی بیداری کے ہیں۔ قومی آزادی کی جدوجہد جاگیری اور نیم جاگیری نظام اور سامراجی استحصال کے خلاف زرعی انقلاب کو اس صورت میں کامیابی کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں، جب کہ شہر کے انقلابی صنعتی مزدور طبقے کے ساتھ متحد ہوں اور مزدوروں اور تمام کسانوں کے اس مضبوط اتحاد کی بنا پر اور اس کے اردگرد درمیانہ طبقے کے دانشور اور وہ قومی سرمایہ دار بھی، جو بیرونی سامراج کی کارستانیوں کے سبب سے پنپ نہیں سکتے، اپنا متحدہ محاذ بنائیں۔ اس زمانہ میں کیرلا (یا مالابار اور ٹراونکور) اور آندھرا کی کسان ہلچل کا، ان کی امنگوں اور خواہشات، ان کی نئی خوداعتمادی اور قوت، اور ایک نئی اور خوشحال زندگی کی تعمیر کے جذبے کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ ان علاقوں میں ادبی تحریک کے ساتھ ساتھ عوامی تھیئٹر، پُرانے طرز کی کتھاؤں کے لکھنے اور گانے کی تحریک (طرز پرانا تھا لیکن موضوع نیا اور ترقی پسند تھا) ناچ اور ناٹک کی تحریک بھی جاری ہوئی اور بہت جلد کسان عوام میں مقبولیت حاصل کرگئی۔ اس طرح ان علاقوں میں ترقی پسند ادب کی تحریک صحیح معنوں میں عوامی ادب کی تحریک بننے لگی۔ دانشوروں اور درمیانہ طبقے کے محدود حلقوں سے نکل کر ادب عام جنتا کے لیے، ان کی زندگی اور جدوجہد کے متعلق، ان کے جذبات اور خواہشات کا آئینہ دار، ان کی روایات کے مطابق اور ان کی سمجھ میں آنے والی زبان اور طرز میں تخلیق کیا جانے لگا۔ وہ صحیح معنوں میں محنت کش عوام کے ہاتھوں میں سماجی تبدیلی کی جدوجہد کا ایک کارگر ہتھیار بننے لگا۔ معنویت اور طرز وطور دونوں کے لحاظ سے ترقی پسند ادب کی تحریک میں یہ ایک بڑا اقدم تھا۔

اس زمانے میں بمبئی کے مرہٹی مزدوروں میں عوامی ادب کی ایک نئی تحریک شروع ہوئی۔ مرہٹی زبان میں ہندستانی کتھا کی طرح کی طویل نظم جسے ''پواڑا'' کہتے ہیں، قدیم زمانے سے رائج

تھی۔ اسے کئی آدمی ایک ساتھ مل کر تیوہاروں اور اس قسم کے دوسرے موقعوں پر گایا کرتے تھے۔ ان کے موضوع تاریخی یا مذہبی ہوتے تھے۔ اب ایسے پواڑے لکھے گئے جن کے موضوع سیاسی اور سماجی تھے۔ ان میں مزدوروں کی حالت، ان کی سیاست اور جدوجہد، بین الاقوامی مزدور تحریک اور روس کی اشتراکی حکومت کے کارنامے نظم کیے گئے۔ ایک مزدور شاعر انا بھاؤ ساٹھے نے اس زمانے میں کئی پواڑے لکھے۔ یہ مزدوروں کے ہزاروں کے مجمع میں گائے جاتے تھے اور بے حد مقبول تھے۔ اسٹالن گراڈ کی جنگ اور اس میں ہٹلری افواج کی ہزیمت پر جو پواڑا تھا اسے خاص طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔

اسی طرح بمبئی کے اُردو بولنے والے مزدوروں میں ''انقلابی شاعروں'' کی تحریک اس زمانے میں خاص طور پر چمکی۔ بمبئی کے طبقاتی شعور رکھنے والے مسلمان مزدور شعروادب کے بڑے رسیا ہیں۔ ان کی ادبی محفلیں برابر منعقد ہوتی رہتی ہیں، اور وہ سال میں ایک بہت بڑا مشاعرہ کرتے تھے جو کہ انقلابی مشاعرہ کے نام سے مشہور تھا۔ ان میں نوجوان مزدور شاعر اپنی نظمیں اور غزلیں سناتے تھے۔ ان نظموں میں ان کی فنی ناپختگی کے باوجود، ایک تازگی، براہ راست اور کھری بات کرنے کا انداز ہوتا ہے اور جس طرح وہ محنت کش طبقے کی لوٹ اور زبوں حالی کو بیان کرتے ہیں، وہ بڑی موثر ہوتی ہے۔ اب ان مشاعروں میں مخدوم محی الدین، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، سردار جعفری، مجاز وغیرہ بھی شریک ہوکر اپنا کلام سنانے لگے۔ ان میں عام طور پر مقبولیت کا سہرا کیفی اعظمی کے سر رہتا تھا۔ اس قسم کے عوامی اجتماعوں میں سنانے کے لیے کیفی اعظمی اور سردار جعفری نے طویل مثنویاں بھی لکھیں جن کا موضوع قومی اور بین الاقوامی سیاست حاضرہ تھا۔ یہ مثنویاں بڑی سہل اور رواں زبان میں تھیں۔ کیفی کی مثنوی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں ختم ہوتی تھی۔ لیکن لوگ اسے بڑی دلچسپی سے سنتے تھے۔ جوش صاحب اور ساغر نظامی بھی، جب وہ 1943 میں پونا آکر مقیم ہوگئے تھے، ان مشاعروں میں حصہ لیتے تھے۔

اس طرح سے ہماری تحریک میں شامل درمیانہ طبقے کے ادیبوں (خاص طور پر شاعروں) کا ربط محنت کش عوام سے بڑھ رہا تھا اور دوسری طرف خود محنت کش مزدوروں اور کسانوں میں سے نئے شاعر پیدا ہورہے تھے۔ ہماری تحریک کا یہ ارتقا ملک کے عام جمہوری ارتقا کا ایک حصہ تھا۔ اس

کا ہمارے ادب کے موضوع اور مطلب، اس کے اطوار اور اسالیب اور اس کی زبان پر ایک نمایاں اور اچھا اثر پڑا۔ موضوعات کے تنوع کے ساتھ زبان میں سادگی اور عمومیت کا رجحان بڑھا، اور ادب میں براہ راست صاف اور سیدھا اور سہل طرز بیان ابھرنے لگا۔ ادب کے پُرانے طور طریقوں پر لکھنے والوں کی تحریروں میں بھی نئی اور زیادہ گہری ترقی پسند معنویت پیدا ہونے لگی۔

اب ہمارے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اس نئے دور میں ملک کے مختلف حصوں میں بڑھتی اور پھیلتی ہوئی ترقی پسند ادب کی تحریک میں زیادہ اجتماعیت اور نظم پیدا کرنے کے لیے، اور تحریک کے نئے عوامی پہلوؤں کی خوبیوں اور خامیوں سے عملی نتیجہ نکال کر سبق سیکھنے کے لیے انجمن کی کل ہند کانفرنس کی جائے۔ جنگ کی وجہ سے ملک میں جو حالات پیدا ہو رہے تھے، ان کے سلسلے میں بھی ترقی پسند ادیبوں میں نظری یک جہتی اور ان کے فرائض کو متعین کرنے کا سوال تھا۔ جاپانی فاشزم کی فوجیں ہماری سرحدوں تک پہنچ گئی تھیں۔ کلکتہ پر بمباری ہو رہی تھی۔ انگریزی سامراجیوں نے کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کر کے اور ملک کے مطالبۂ آزادی کو ٹھکرا کر ہماری قوم میں عام طور سے بد دِلی اور مایوسی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ جنگ کی وجہ سے غذائی بحران پیدا ہو گیا۔ ضروریاتِ زندگی کی چیزوں کی گرانی اور کمیابی سے چور بازاری اور نفع خوری عام ہو گئی تھی۔ عوام کی تکالیف از حد بڑھ گئی تھیں۔ بنگال میں سامراجی نوکر شاہی اور نفع خور سرمایہ داروں نے مل کر غذائی قلت کو ایک ہولناک قحط میں بدل دیا تھا۔ لاکھوں انسان بھوک سے مر رہے تھے، وہاں کا زرعی نظام درہم برہم ہو رہا تھا، بھری بستیاں اُجڑ رہی تھیں۔

یہ تھے ملک کے وہ نازک اور بحرانی حالات جن میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی چوتھی کل ہند کانفرنس بمبئی میں منعقد ہوئی۔ اپنی نمائندہ حیثیت کے لحاظ سے یہ کانفرنس پہلے کی تینوں کانفرنسوں سے بہتر تھی۔ حسب دستور اس کی صدارتی مجلس ملک کی ان بڑی بڑی زبانوں کے مقتدر ادیبوں پر مشتمل تھی، جن کے نمائندے اس کانفرنس میں موجود تھے۔ ان میں جوش ملیح آبادی (اُردو)، پنڈت راہل سانسکر تائن (ہندی)، ستین مجمدار (بنگالی)، ایس۔ اے۔ ڈانگے (مرہٹی)، سچپا ئیا (تیلگو)، اور ان کے علاوہ گجراتی اور کنڑی کے دو ادیب ان جنوبی زبانوں کی نمائندگی کرتے تھے، ان کے نام مجھے اس وقت یاد نہیں۔

اس کانفرنس میں ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے اُردو، ہندی، بنگالی، پنجابی، مرہٹی، گجراتی، کنڑی، ملیالم، اور تیلگو زبانوں کے ادیب شامل تھے۔ وسطی اور جنوبی ہند کی زبانوں کے ادیبوں کی اتنی بڑی نمائندگی اس سے پہلے ہماری کانفرنس میں اور کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا سبب ایک تو یہ تھا کہ اس زمانے میں ہماری تحریک جنوبی ہند کے علاقوں میں پھیل گئی تھی، اور دوسرے یہ کہ کانفرنس بمبئ میں ہو رہی تھی۔ اُردو کی بھی اچھی نمائندگی تھی۔ گو کہ کانفرنس میں شرکت کے لیے شمالی ہند سے چل کر چند ہی نمائندے آئے تھے۔ ڈاکٹر علیم جو انجمن کے جنرل سکریٹری تھے اور اس کانفرنس کے خاص منتظمین میں تھے، مجاز اور رضا انصاری۔ لیکن حیدر آباد سے مخدوم کی راہنمائی میں کئی اُردو کے نوجوان ادیب آئے تھے۔ پھر خود بمبئ اور پونا میں شمالی ہند کے اردو کے ادیبوں کا گروہ موجود تھا، جس نے کانفرنس میں شرکت کی۔ ان میں خواجہ احمد عباس، ساغر نظامی، کرشن چندر، سردار جعفری، سبط حسن وغیرہ تھے۔

مرہٹی کے ترقی پسند ادیبوں نے جب ڈانگے صاحب کا نام صدارتی مجلس کے لیے پیش کیا تو اس پر ہم میں سے بعض چونک پڑے تھے۔ اس لیے کہ ملک میں ڈانگے صاحب ایک بزرگ اشتراکی راہنما اور مزدور تحریک کے بانیوں کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ لیکن ہم کو بتایا گیا کہ وہ مرہٹی زبان کے ادیب، عالم اور ایک مورخ کی حیثیت سے بھی کافی شہرت رکھتے ہیں (اس وقت تک ان کی کتاب ''قدیم ہند کی تاریخ'' شائع نہیں ہوئی تھی) اور اس حیثیت سے مہاراشٹر کے تمام ادبی حلقوں میں ان کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ بہرحال ڈانگے کا خطبہ صدارت غالبًا اس کانفرنس کی سب سے اچھی چیز تھی۔ ڈانگے نے کانفرنس میں خطبہ انگریزی میں پڑھا۔ اس لیے مرہٹی نہ جاننے والے بھی اسے سمجھ سکے۔ اس میں انھوں نے مرہٹی زبان اور ادب کے ارتقا کو مرہٹی عوام کی تاریخ کے مختلف اَدوار میں سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کی روشنی میں پیش کیا۔ انھوں نے دکھایا کہ ٹھیک اس زمانے میں مرہٹی ادب کے کلاسیکل شاہکار لکھے گئے، جب مہاراشٹر کے مظلوم کسان اپنے اوپر ظلم کرنے والے مغل حاکموں کے خلاف لڑنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ لیکن جب وہ خود مہاراشٹر کے راجاؤں اور دیش مکھوں اور اس سے منسلک رجعت پرست برہمنیت کا شکار ہو گئے، ایسے زمانے میں ادب کی ترقی رک گئی اور اس میں تصنع اور کھوٹا پن پیدا ہو گیا۔ بعد میں

ڈانگے کا یہ خطبہ کتابی شکل میں انگریزی اور مرہٹی میں شائع بھی ہوا۔

جوش صاحب کی صدارت ان کے بلند ادبی رتبے اور وقار کے سبب سے ہماری انجمن اور اس کی کانفرنس کے لیے باعث فخر تھی۔ لیکن وہ کسی بڑے جلسے یا کانفرنس میں صدر کے عہدے کے لیے سخت ناموزوں آدمی ہیں۔ ان پر ایسے مواقع پر بالکل طفلانہ گھبراہٹ اور بے چینی طاری ہو جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جتنی دیر تک وہ صدارت کی کرسی پر بیٹھے ہیں، ان کی آزادی کو سلب کر کے بے رحم دوستوں نے انھیں مقید کر دیا ہے۔ وہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو، خاص طور پر ان کو جنھیں وہ جانتے ہیں اور پسند کرتے ہیں، ایک ملتجی معصومیت سے دیکھتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جلد سے جلد کرسیٔ صدارت سے اُٹھ کر اپنے ان دوستوں کے ساتھ باہر نکل جانے کے خواہش مند ہیں اور گویا کہہ رہے ہیں کہ...... ''تم نے مجھے یہاں پر بیٹھا کر اپنی حماقت کا پورا ثبوت دیا ہے۔ باہر چلو، کہیں پر ساتھ مل کر بیٹھیں گے، عقل کی باتیں کریں، شعروشاعری کے تذکرے ہوں، پیار محبت کے چرچے ہوں۔ اس تقریر، قرارداد اور آداب اور ضابطے کی فضا میں تو میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔'' جب بھی ہم انھیں ایسے عہدوں کے لیے منتخب کرتے تھے تو وہ اس کے خلاف سخت احتجاج کرتے تھے۔ ان کی آزاد فطرت ہر پابندی سے گریزاں رہتی ہے۔ پھر بھی ہر موقع پر جب ہم ان سے اس قسم کے کسی کام کے لیے اصرار کرتے تھے تو ترقی پسند گروہ کے ساتھ ذہنی رفاقت اور قلبی محبت کے جذبے سے مجبور ہو کر بالآخر راضی ہو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس موقع کے لیے بھی انھوں نے ایک مختصر سا خطبہ لکھا اور پڑھا، جس میں شاعری اور ادب کی زبان کے مسئلہ کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ جوش صاحب شعر کی محفل میں اہل نظر اور تماشائی، دونوں کو مطمئن کر دیتے ہیں[1] اور بے تکلف نجی صحبتوں میں اگر کوئی ناتراشیدہ یا کم فہم ان کی طبیعت کو منغض نہ کر دے تو ان کی باتیں بیک وقت شہد و شراب کی چاشنی اور کیفیت لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ لیکن میں نے ان کو بارہا بڑے جلسوں اور مشاعروں میں شریک ہوتے ہوئے دیکھا، تقریر کرتے ہوئے کبھی نہیں سنا۔

اس کانفرنس میں جو قراردادیں منظور ہوئیں، ان میں سب سے زیادہ اہم وہ اعلان (مینی فیسٹو) تھا جس میں جنگ سے پیدا ہونے والے قومی اور بین الاقوامی حالات کے پیش نظر ملک

کے ادیبوں کے فرائض کا عام طور پر، اور ترقی پسند مصنّفین کا خاص طور پر تعین کیا گیا تھا۔ اس اعلان کے تیار کرنے میں ہم نے خاص طور پر اس کا خیال رکھا تھا کہ وہ انجمن میں شریک مختلف سیاسی مسلک رکھنے والے محبّ وطن ادیبوں کے خیالات اور احساسات کی ترجمانی کرے، نہ کہ کسی ایک مکتب خیال کی۔ ہمارے نزدیک آزادی، جمہوریت، انسان دوستی اور ترقی پسندی پر عقیدہ رکھنے والے (اور یہی عقیدہ ہماری انجمن میں مختلف مسلک پر چلنے والوں، ادیبوں کے اتحاد کی بنیاد تھا) تمام ادیبوں کے لیے جنگ سے پیدا ہونے والے حالات اور اس سلسلے میں ادیبوں کے فرائض کی انجام دہی کے لیے متحدہ محاذ بنانا ممکن اور ضروری تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اگر انجمن میں بحث مباحثہ کے بعد ہم اتحاد کی بنیاد وضع کر سکتے ہیں تو پھر ان دانشوروں اور ادیبوں کے ساتھ بھی انجمن کے باہر ایک وسیع تر اتحاد قائم کیا جا سکتا ہے جو انجمن کے رکن نہ تھے، اور کم از کم ایسے موقع پر جب ہمارے وطن کی آزادی اور ساری دنیا میں جمہوریت کے مستقبل کا ایک نازک اور فیصلہ کن مرحلہ آ گیا تھا۔ ملک کے تمام حساس اور ایماندار ادیب اگر تمام باتوں پر متفق ہو کر ایک ساتھ کام نہیں کر سکتے، پھر بھی وہ وطن کو فاشسٹ محکومی میں چلے جانے سے روکنے، قومی آزادی اور قومی اتحاد کے لیے کوشش کرنے، بنگال کے قحط زدہ عوام کو بھوکا مرنے سے بچانے اور ملک میں عام معاشی بدحالی اور ان سے پیدا ہونے والی شدید تکالیف کو دور کرنے کے لیے اپنے قلم کی قوت اور اپنے اثر کو استعمال کر سکتے ہیں۔

ان مسائل پر ترقی پسند مصنّفین میں یکجہتی پیدا کرنے کے لیے، اپنے اتحاد کو برقرار رکھنے اور ملک میں وسیع تر اتحاد قائم کرنے کے لیے ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ کانفرنس کی اس امر کے متعلق قرارداد کا مسودہ ہمارا ایک ایسا رکن تیار کرے جو غیر کمیونسٹ ہو، لیکن جس کی حب الوطنی اور ترقی پسندی پر عام طور سے بھروسہ کیا جاتا ہو۔ کمیونسٹوں کے متعلق (میرے نزدیک بے جا طور پر) بعض حلقوں میں یہ خیال عام تھا کہ وہ اپنی سیاست کو ہر اس تنظیم میں حاوی کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں کہ وہ کام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کمیونسٹ کہیں بھی ہوں، وہ اپنے مسلک کو نہیں چھوڑ سکتے، اور اگر وہ جمہوری طریقے پر اپنے خیالات اور اپنی پالیسی کا پرچار کرتے ہیں تو دوسرے خیالات کے لوگوں کی طرح سے ان کا بھی یہ جمہوری حق ہے۔ لیکن متحدہ محاذ کا تصور بھی ملک میں

کمیونسٹوں نے ہی پیش کیا ہے اور اس پر بھی وہ سختی سے کاربند رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہرصورت ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس موقع پر کسی بھی غلط فہمی کی گنجائش ہو اور انجمن کے مخالفوں کو ہماری تحریک کے خلاف اس بنا پر پروپیگنڈا کرنے کا موقع ملے۔ چنانچہ خواجہ احمد عباس نے، جو اس زمانے میں کمیونسٹ سیاسی پالیسی کے بہت سے پہلوؤں پر سختی سے نکتہ چینی کرتے تھے اور کسی سیاسی جماعت کے رکن نہیں تھے، کانفرنس کی اس قرارداد کا مسودہ تیار کیا۔ ڈیلی گیٹوں میں بحث و مباحثہ اور چند ترمیموں کے بعد متفقہ رائے سے یہ اعلان نامہ پہلے ڈیلی گیٹوں کی علاحدہ میٹنگ میں، اور اس کے بعد کانفرنس کے کھلے اجلاس میں منظور کیا گیا۔ اس اعلان نامہ میں کئی باتیں ایسی تھیں جن کو ہم میں سے بعض لوگ وضاحت طلب یا ناکافی سمجھتے تھے۔ لیکن اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے کسی محبّ وطن ادیب کو بھی اختلاف ہو۔ وہ اعلان جنگ میں پیدا ہونے والے حالات میں مختلف عقیدے اور رجحانات رکھنے والے ادیبوں کے مشترک اصولوں اور خیالات کا اظہار کرتا تھا اور سب کے لیے ایک ساتھ مل کر ادبی محاذ پر آگے بڑھنے کا راستہ دکھاتا تھا۔

اس کانفرنس میں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ انجمن کا مرکز لکھنؤ سے بمبئی منتقل کر دیا جائے۔ بمبئی میں اس وقت انجمن کی شاخ سب سے زیادہ فعال تھی۔ پھر وہاں کی انجمن میں ہمارے ملک کی کئی زبانوں کے ادیب اکٹھے تھے۔ اس کے علاوہ جنوبی ہند کے علاقوں سے، جہاں ہماری تحریک نے اس زمانے میں خاص طور پر ترقی کی تھی، بمبئی کا مرکز زیادہ آسانی کے ساتھ تعلق قائم کر سکتا تھا۔

انجمن کے نئے عہدیداروں اور اس کی مجلس عاملہ کا بھی اس کانفرنس میں انتخاب ہوا۔ کلکتہ کانفرنس کے بعد سے نیا انتخاب نہیں ہوا تھا۔ چونکہ مرکز کو اب بمبئی میں منتقل کرنا تھا، اس لیے یہ ضروری تھا کہ جنرل سکریٹری ایسا شخص ہو جو بمبئی میں رہتا ہو۔ اس لیے ڈاکٹر عبدالعلیم کی جگہ پر سجاد ظہیر کو دوبارہ انجمن کا جنرل سکریٹری چنا گیا۔ میری اپنی رائے یہ تھی کہ خواجہ احمد عباس کو سکریٹری چنا جائے۔ لیکن وہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں ہوئے۔ میں ایمانداری سے یہ محسوس کرتا تھا کہ میری سیاسی مصروفیتوں کے پیش نظر میرا انتخاب صحیح نہیں ہے۔ اس انتخاب سے دراصل ہماری اجتماعی، تنظیمی اور مالی کمزوری ظاہر ہوتی تھی۔ ابھی تک نہ تو ہم اپنا علاحدہ مرکزی دفتر قائم کر سکے

تھے، نہ اس دفتر کو چلانے کے لیے قلیل سرمایہ ہی فراہم کر سکے تھے، اور نہ ایک بھی کل وقتی مرکزی کارکن رکھ سکے تھے۔ دوسرے ذمہ دار کارکنوں کو بھی اس کا احساس تھا۔ لیکن ہم نے مجبوریوں کے آگے سر جھکا کر جیسے تیسے کام چلانے کا فیصلہ کیا۔ میرے اصرار پر خواجہ احمد عباس انجمن کے جوائنٹ سکریٹری چنے گئے۔ انجمن کی نئی مجلس عاملہ (ایگزیکٹو کمیٹی) بھی چنی گئی۔

یہ کانفرنس بمبئی کے مارواڑی ودیالیہ (ہائی اسکول) کے ہال میں ہوئی تھی جو سینڈ ہرسٹ روڈ پر چوپاٹی کے قریب واقع ہے۔ سوسَوا سو ڈیلی گیٹوں کے علاوہ کانفرنس کے کچھ جلسوں میں بمبئی کے دانشور اور مزدور بھی کافی تعداد میں شریک ہوئے تھے اور کل ملا کر حاضری ڈھائی تین سو کے قریب ہوئی تھی۔ آخر میں ہم نے ایک سنیما ہال میں ایک بڑا مشاعرہ کیا، جس میں تقریباً دو ہزار کی حاضری تھی۔ ہم نے اس کی شرکت پر ٹکٹ لگایا تھا۔ اس لیے حاضری اتنی تھی، ورنہ بمبئی میں ایسے مشاعروں میں جس میں جوش، ساغر، مجاز، سردار جعفری، کیفی اور مجروح وغیرہ شریک ہوں، آٹھ دس ہزار کا مجمع کر لینا مشکل نہیں ہے۔ اس مشاعرہ سے ہمیں کافی آمدنی ہوئی اور کانفرنس کے اخراجات پورے کرنے میں، اس سے سب سے زیادہ مدد ملی۔

○○○

تحریک کی تیز رفتار ترقی

1943 سے لے کر اگلے چار سال ہماری تحریک کی تیز رفتاری، وسعت اور متنوع ترقی کے سال تھے۔

1939 میں جب عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ ملک کی عوامی تحریکوں پر حملہ، تو سامراجی تباہ کاری اور جبر وتشدد کی اس فضا کو ہمارے دو شاعروں......مخدوم اور فیض نے اپنی بڑی حسین اور پر اثر نظموں میں پیش کیا تھا۔ مخدوم نے کہا تھا......

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اجالے میں مگن
یہی ملبوس عروسی ہے، یہی ان کا کفن

لیکن اس نے رجعت پرست قوموں کی رات اور اس کی ہمہ گیر سیاہی اور نحوست اور جھوٹی آرائش کو عارضی بتایا تھا......اور آخر میں یہ بشارت دی تھی کہ......

رات کے ماتھے پر آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

......اور فیض نے وطن کی آزادی کے مجاہدوں سے کہا تھا کہ جبر وتشدد کے دور کو صرف شجاعانہ مقاومت سے ہی ختم کیا جاسکتا ہے......

بول کے لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے

1943 میں جب دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے فیصلہ کن جنگ میں اسٹالن گراڈ کے محاذ پر رجعت پرستی اور جمہور دشمنی کی سب سے بڑی عسکری قوت پاش پاش ہوگئی اور نوع انسانی کی آزادی کی راہیں محفوظ ہو گئیں، تب اس حوصلہ خیز کیفیت کی عکاسی مخدوم کے مشہور ترانے ''یہ جنگ ہے، جنگِ آزادی، آزادی کے پرچم کے تلے'' کے دل افروز سُروں سے ہوئی۔ اس ترانہ میں، جو ایک سحر کا ترانہ حرکت ہے، اس کے سادہ اور خوبصورت الفاظ ہیں۔ جو ترنگ اور جولانی ہے وہ اس کی موزوں شعریت اور گانے کے طرز، دونوں کو ملا کر پیدا ہوئی تھی۔ مخدوم شاعر ہونے کے علاوہ ایک خوش لحن موسیقار بھی ہیں۔ یہ ترانہ اور اس کا طرز دونوں ہی ان کی تخلیق تھی۔ اس کا آخری بند......

لو سرخ سویرا آتا ہے
آزادی کا، آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے
آزادی کا، آزادی کا
گلنار ترانہ گاتا ہے
آزادی کا، آزادی کا

متحرک اور منظّم آزادی خواہ عوام کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ، ان کے دلوں کی پر جوش دھڑکن، اور ان کے ''گلنار'' مستقبل کی رنگینی ہر اس مجمع اور گروہ میں پیدا کر دیتا تھا جہاں وہ اس زمانہ میں گایا جاتا تھا۔

فیض نے اپنی نظم ''سیاسی لیڈر کے نام'' میں ملک کے ان لیڈروں کی سیاست پر نکتہ چینی کی، جو اس عظیم کارزار کی صحیح نوعیت کو نہیں سمجھتے تھے، جس کے نتیجے کے طور پر ہماری قوم اس موقع پر

ایک مجبور تماشائی کی حیثیت اختیار کر گئی تھی، اپنے ہاتھوں کو کام میں لاکر دنیا کے جمہوری عوام نے رات کے سنگین سیہ سینے میں اتنے گھاؤ لگائے تھے کہ اب جس سمت نظر جاتی ہے......

جا بجا نور نے اک جال سا بن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

لیکن ہمارے قومی راہ نما ایک تذبذب کی حالت میں تھے۔ وہ اپنی قوم کو متحرک نہیں کر رہے تھے۔ فیض نے ان سے کہا......

تجھ کو منظور نہیں غلبۂ عظمت لیکن — تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گاہ میں دھڑکتا ہوا دن — رات کی آہنی میّت کے تلے دب جائے

ترقی پسند جماعتیں اس جمود کو توڑنا چاہتی تھیں، جو برطانوی سامراج کی آزادی کش سیاست اور بڑی قومی جماعتوں کے راہ نماؤں کی ناعاقبت اندیشی کے سبب سے ہمارے وطن پر طاری ہو گیا تھا۔ وہ ان لاکھوں کروڑوں ہاتھوں کو باعمل بنانا چاہتی تھیں، تاکہ جنگ سے پیدا ہونے والے مصائب کے بوجھ کو ہلکا کیا جا سکے، دنیا کی نبرد آزما جمہوریت کی طاقت میں اضافہ ہو اور خود ہمارا ملک آزادی کی راہ پر آگے بڑھے۔

جنگ کے حالات سے پیدا ہونے والے بنگال کے قحط کی تباہ کاری کا ملک کے ترقی پسندوں نے خاموشی اور بے بسی سے تماشا نہیں دیکھا۔ قحط زدہ لوگوں کی امداد کے لیے عوام کی ایک بڑی تحریک جاری ہوئی۔ اس میں ترقی پسند مصنّفین نے حصہ لیا۔ مخدوم اور سردار جعفری وغیرہ نے بنگال پر پُر جوش نظمیں لکھیں، جگر مرادآبادی نے بھی ایک نظم لکھی، جونپور کے ایک نوجوان شاعر وامق نے ایک دردناک اور پُر اثر گیت لکھا (بھوکا ہے بنگال)، بمبئی کے مرکزی پیپلز تھیئٹر کے بنگالی موسیقاروں نے اس کے گانے کی طرز نکالی اور چند مہینوں کے اندر یہ ترانہ ملک کے کونے کونے میں پھیل گیا۔ وامق کے اس ترانے سے لاکھوں آدمیوں کا جذبۂ حب وطن اور اتحاد بیدار ہوا...... اور اس میں کوئی شک نہیں کہ پیپلز تھیئٹر کے پروگرام میں اس زمانہ میں وہ ایک ایسا زبردست وسیلہ تھا جس کے ذریعہ سے لاکھوں روپیہ اور غلہ بنگال کے لیے جمع کیا گیا اور ہمارے ہزاروں ہم وطنوں کی جان بچی۔ ترقی پسند ادب کی تاریخ میں وامق جونپوری کا یہ ترانہ صحیح معنوں

میں سونے کے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ وہ وقت کی آواز تھی۔ وہ ہمارے انسان دوستی کے جذبات کو براہ راست ابھارتا تھا۔ اس کی زبان، اور چھب عمومی تھی۔ دیہات اور شہر میں ہر طبقے کے لوگ اسے سمجھ سکتے تھے، اس کی غمگینی اور دردنا کی لوک دھن کے ساتھ مل کر دلوں میں طہارت اور عمل کا جذبہ بیدار کرتی تھی۔ اسی سبب سے یہ ترانہ نہ صرف ہندستانی بولنے والے علاقوں میں مقبول ہوا، بلکہ ملک کے ان علاقوں میں بھی، جہاں کی زبان ہندستانی نہیں تھی۔

اس زمانہ میں انڈین پیپلز تھیئٹر (ہندستانی عوامی ناٹک) کی تحریک بھی شروع ہوئی۔ اس کا بھی مرکز بمبئ میں تھا، جہاں پر اداکاروں، موسیقاروں اور رقاصوں کے کل ہند مرکزی گروپ کی تشکیل کی گئی۔ بمبئ کے علاوہ مالابار، آندھرا، بنگال، یو۔ پی اور پنجاب میں بھی پیپلز تھیئٹر کے حلقے قائم ہوئے۔ ملک کے مختلف حصوں میں پیپلز تھیئٹر کا کامیاب قیام، ہمارے وطن کے تہذیبی ارتقا میں ایک بالکل نیا اور بے مثال قدم تھا۔ اس کے کارکن (اداکار، موسیقار، اور رقاص) اکثر وہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں، جو سیاسی کارکن تھے اور جن میں سے بیشتر ملک کی انقلابی جمہوری تحریکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ذات اور عوامی تھیئٹر کی تحریک میں آرٹ، سیاست اور تہذیب کی تفریق نہیں ہوتی تھی۔ ان کی ساری زندگیاں وطنی آزادی اور عوام کی جمہوری فتح کی کاوش کے لیے وقف تھیں۔ اس لیے ان کا فن، شعوری و غیر شعوری طور پر اسی عظیم قومی کاوش اور جدوجہد کا ایک پہلو اور حصہ تھا۔ عوامی تھیئٹر کے ناٹک تمثیل، گانے اور ناچ ہیں۔ ہمارے ملک کے قدیم فنونِ لطیفہ اور لوک گیتوں اور ناچوں اور ناٹکوں کے طرز، اور شیلی میں جدید انقلابی تصورات، اور ہندستانی عوام کی موجودہ زندگی کے سیاسی اور سماجی مسئلوں، اور ان کے دکھ سکھ، ان کی بہترین خواہشوں اور تمناؤں کو ملانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان میں بہت ساری خامیاں تھیں۔ کلا کی کسی بھی نئی شیلی کا نکلنا، فنی ابداع اور اختراع، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ خاص طور پر ناٹک، گائکی، اور نرتیہ کی نئی طرزوں کا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک کے قدیم اور ترقی یافتہ سنگیت اور نرتیہ ودیا کو حاصل کریں اور اس کے ماہر بنیں۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک کے مختلف علاقوں کی زندہ اور مروجہ لوک کلاؤں کو سیکھیں اور برتیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے ملک سے باہر کی ان کلاؤں کا بھی علم حاصل کرنا ہوگا اور سب سے زیادہ ضروری یہ ہے

کہ ہم اپنے عوام کی موجودہ زندگی، ان کے مسائل، اور زندگی کو بہتر بنانے اور سنوارنے کے لیے ان کی جدوجہد سے گہری واقفیت اور ہمدردی رکھتے ہوں، ان کے سوچنے اور سمجھنے کے ڈھنگ سے واقف ہوں اور پھر اپنی ان تمام فنی صلاحیتوں کو کام میں لاکر عوام کی مادی، ذہنی اور روحانی کیفیت کی ایسی لطیف اور پُر تاثیر نقش گری کریں کہ وہ دلوں کو محظوظ کرنے اور موجودہ زندگی اور اس کے مسائل کا صحیح اور بہتر شعور پیدا کرکے لوگوں کو جہد حیات کے لیے آمادہ اور مستعد کریں۔

عوامی تھیئٹر کے یہی مقاصد تھے۔ لیکن ان کو حاصل کرنا کوئی سہل کام نہیں تھا، اور نہ یہ تھوڑی مدت میں ہی حاصل کیے جا سکتے تھے۔ محنت، ریاضت اور علم سے کلاکار کی بہت سی کمیاں پوری کی جاسکتی ہیں اور خامیاں دور ہوسکتی ہیں۔ لیکن سمجھداری اور نظر کی گہرائی، کلا میں گمبھیرتا کے ساتھ سرستا، علمی تبحر اور شدتِ جوش کی بنیاد پر ٹھہراؤ اور اعتماد اور جذبات و خیالات کی راستی اور استقامت کے ساتھ طرز ادا میں لوچ، نرمی، رس، اور سریلا پن، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے گزشتہ اور حالیہ ثمر بار تجربوں سے ہی پیدا ہو سکتے ہیں اور ایسے تجربوں کے درک اور ان سے مستفید ہونے کی صلاحیت کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ہوتی ہے۔

ہم کو اپنے علم اور تجربے دونوں کی کمی کا احساس تھا۔ اس لیے انھیں حاصل کرنے کی کوشش اپنے مقدور بھر برابر جاری رکھی، اور محنت کشوں اور مفلس دانشوروں کے پاس مادی وسائل کی بھی کمی تھی۔ ہمیں مشق اور ریاضت کے لیے وقت بھی کم ملا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود جب تھوڑے ہی عرصہ میں عوامی تھیئٹر کے ناٹک، تمثیل، گانے اور ناچ عوام میں تیزی سے مقبول ہونے لگے اور سینکڑوں اور ہزاروں کے مجمع میں وہ اپنی کلا کی نمائش کرنے کے بعد خراج تحسین حاصل کرنے لگے تو یہ ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات تھی۔

بلراج ساہنی اور ان کی بیوی دمینتی، شنبھو اور ترپتی مترا کی اداکاری، بنائے رائے اور پریم دھون کے ترانے، اتر پردیش میں صاحب سنگھ مہرا اور پنجاب میں شیلا بھاٹیہ کی کویتا اور ان کے گانے، بمبئی اور مہاراشٹر میں انا بھاؤ ساٹھے کے پواڑے، آندھرا اور تلنگانا میں کئی نئی بُرّا کتھائیں، نئی عوامی فنکاری کے ایسے دل پذیر اور دلکش نمونے تھے، جنھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ترقی پسند تہذیبی تحریک ہمارے وطن کے فنون لطیفہ کی ہر صنف میں ایک نئی جان ڈال سکتی ہے اور موجودہ

حالات میں کلا کے نرمان کا راستہ ان کے ارتقا کا صحیح راستہ بھی ہے۔

عوامی تھیئٹر اور ترقی پسند مصنّفین کی تحریکوں میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کے بہت سے کارکن عوامی تھیئٹر میں بھی کام کرتے تھے اور اس کے منظّم کرنے میں انھوں نے بہت اہم حصہ لیا۔ خواجہ احمد عباس، ترقی پسند مصنّفین کی کل ہند انجمن کے جوائنٹ سکریٹری تھے اور وہ اس کے پرانے کارکنوں میں تھے۔ بمبئی اور کل ہند پیپلز تھیئٹر کے بھی وہ اہم رکن تھے۔ تنظیمی کاموں کے علاوہ ان کا ڈرامہ ''یہ امرت ہے'' بمبئی سے پیپلز تھیئٹر کے لیے لکھا گیا۔ یہ بمبئی میں کھیلا بھی گیا اور اس کے ڈائرکٹر بھی عباس تھے۔ سردار جعفری نے پیپلز تھیئٹر کے لیے ہی اپنا ڈرامہ ''یہ کس کا خون ہے'' لکھا اور وہ بھی پیپلز تھیئٹر نے بمبئی میں اسٹیج کیا۔ مخدوم اور وامق کے ترانے بھی، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، پیپلز تھیئٹر کے پروگرام کے خاص گانے تھے۔ پریم دھون اور شیلا بھاٹیہ گیت لکھنے اور گانے دونوں میں ماہر تھے۔

لیکن غالبًا آندھرا میں پیپلز تھیئٹر اور ترقی پسند مصنّفین کا سمبندھ سب سے زیادہ گہرا تھا۔ وہاں اس زمانے میں ایک ڈرامہ پیپلز تھیئٹر نے پیش کیا جو آندھرا اور تلنگانا میں سینکڑوں مرتبہ شہروں اور دیہاتوں میں دکھایا گیا۔ اس کا مصنف ڈاکٹر کرشنا راؤ، اس ڈرامے میں اداکاری بھی کرتا تھا۔ ڈرامے کا موضوع آندھرا کے غریب کسانوں کی زمین کے لیے جدوجہد تھی۔ کرشنا راؤ کی اداکاری اتنی اچھی تھی اور یہ ڈرامہ اس قدر مؤثر تھا کہ جہاں کہیں بھی وہ کھیلا جاتا، کسانوں میں اس کی وجہ سے اتحاد، تنظیم اور ظلم کے خلاف جدوجہد کا زبردست جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔ نیز اس ڈرامہ کو دیکھنے اور اس کے ساتھ کی کتھاؤں کے سننے کے بعد لوگ اتنے متاثر ہوتے تھے کہ وہ آندھرا کی کسان تحریک کے لیے دل کھول کر چندہ دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ایک ڈرامہ کے ذریعے سے آندھرا کے پیپلز تھیئٹر نے کسان تحریک کے لیے تقریباً ایک لاکھ روپیہ چندہ جمع کیا۔ آندھرا اور تلنگانا میں کسانوں کو بیدار اور منظّم کرنے میں پیپلز تھیئٹر کے اس ترقی پسند ڈرامے اور بُرّا کتھاؤں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

ترقی پسند اداکاروں، موسیقاروں، رقاصوں اور مصنّفین نے مل کر اب ایک بہت بڑا قدم اٹھایا......یعنی فلم سازی کا۔ بمبئی میں ترقی پسند مصنّفین کی انجمن اور عوامی تھیئٹر میں کام کرنے

والوں میں اکثر اب بمبئی کی فلم انڈسٹری سے منسلک ہو گئے تھے اور یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ یہ سب اس بات سے بددل اور مغموم رہتے تھے کہ انھیں اپنی ہنر مندی کو فلم انڈسٹری کے بیشتر جاہل اور غیر مہذب منافع پرستوں کے ہاتھ بیچنا پڑتا ہے جو گھٹیا قسم کی فلمیں تیار کر کے لاکھوں کماتے ہیں، ایسی فلمیں جو انسان کے پست ترین جذبات کو ابھارتی ہیں، جن سے قوم کی فلاح نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی گراوٹ ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں بمبئی میں ''سوویت یونین کے دوستوں کی انجمن'' بھی قائم ہو گئی تھی۔ اس انجمن نے باقاعدگی سے بمبئی میں سوویت فلموں کی نمائش شروع کی۔ سوویت فلموں کو دیکھنے کے بعد بمبئی کے فلمی کلاکاروں میں عام طور سے اور چند ڈائرکٹروں اور پروڈیوسروں کو اچھی فلم سازی کے معنی معلوم ہوئے۔ سنیما دراصل موجودہ عہد کا سب سے اہم آرٹ ہے۔ مصوری، ڈرامے، موسیقی، اور رقص کے اس متحرک امتزاج سے ایک ایسا وسیلہ انسان کے ہاتھ میں آیا ہے، جس کا صحیح اور فنکارانہ استعمال نہ صرف لاکھوں کروڑوں عوام کی تفریح اور دلچسپی کا عظیم ترین سامان مہیا کرتا ہے، بلکہ سماجی اصلاح، بہبود اور تبدیلی، ذہنی تعلیم اور روحانی تزکیہ کا بھی غیر معمولی طور سے مؤثر ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اس فن کا ابتذال، سرمایہ داری ملکیت کے ہاتھوں جتنا مہلک اور سیاہ کار ہے، اس کا ارتقا ترقی پسند عوامی قوت کے ہاتھوں اتنا ہی روح پرور اور نورافشاں ہو سکتا ہے۔

ہندستانی عوامی تھیئٹر نے ''دھرتی کے لال'' فلم بنا کر ہمارے ملک کی فلمسازی میں ایک انقلابی قدم اٹھایا۔ اس فلم کے ہیرو ہمارے ملک کے کسان تھے، جن کی المناک لیکن نمو کی قوت سے بھری ہوئی زندگی، لاکھوں مصائب اور مظالم کا شکار ہونے کے باوجود اپنی رَو میں مادی اور اخلاقی اقدار کے چمکتے ہوئے طلائی ذرے بکھیرتی ہوئی ہماری معاشرت اور تہذیب کی زمین کو زرخیز اور بارآور بناتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ ''دھرتی کے لال'' کی کہانی اور مکالمہ خواجہ احمد عباس نے لکھے تھے اور اس فلم کے ڈائرکٹر بھی وہی تھے۔ لیکن کہانی، مکالمے اور ڈائرکشن وغیرہ کے تمام کام دراصل اجتماعی طریقے سے ہوتے تھے، اور سب کی صلاح اور مشورے سے اس میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ بلراج ساہنی فلم کے ایک اہم اداکار بھی تھے اور ڈائرکشن میں بھی حصہ لیتے تھے۔ شنبھو مترا بھی اسی طرح تھے۔ اس فلم میں ترپتی مترا کی اداکاری، جنھوں نے ایک

کسان خاندان کی نوجوان بہو کا رول ادا کیا، اتنی نازک، دلکش، اور حقیقت پر مبنی تھی کہ فلم دکھائے جانے کے بعد ہی ملک کے بہترین اداکاروں میں انھوں نے بلند درجہ حاصل کرلیا۔ بلراج ساہنی، شنبھو مترا، اور حمید بٹ نے بھی بجا طور پر شہرت اور نام وری حاصل کی۔ گانے بیشتر سردار جعفری کے لکھے ہوئے تھے اور فلم کے بہترین گائک بنائے رائے ثابت ہوئے۔ اس فلم کے سارے اداکاروں میں سے ایک بھی اس وقت تک ''پیشہ ور'' اداکار نہیں تھا اور کسی نے بھی اس سے پہلے فلمی اداکاری نہیں کی تھی۔ سرمایہ، سامان، ٹکنیکل وسائل اور تجربہ کی کمی مستزاد تھی۔ یہ نہیں ہے کہ اس فلم میں خامیاں نہیں تھیں، بہت تھیں۔ پھر بھی ہندستان کے باہر اور اندر کے فلمی ماہرین کی عام رائے یہی تھی کہ اس وقت تک ہمارے یہاں اتنی اچھی اور پرتاثیر فلم، جس میں اس ملک کے محنت کش عوام کو مرکزی حیثیت سے پیش کیا گیا ہو، نہیں بنائی گئی تھی۔

ترقی پسند مصنّفین کی انجمن وقتاً فوقتاً قومی یا بین الاقوامی شہرت اور افتخار رکھنے والے ادیبوں پر توجہ مرکوز کرنے کے لیے اور ان کے ادب اور تصورات کے ترقی پسند اور فنی پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے لیے خاص جلسے ان ادیبوں کے نام پر بھی کرتی تھی۔

1936 میں سب سے پہلے ہم نے ''یومِ میکسم گورکی'' منعقد کیا تھا۔ اس دن ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں انجمن کی طرف سے گورکی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا اور اس کی نگارش کی خصوصیات پر تقریریں ہوئیں۔ بنارس میں منشی پریم چند (گو کہ وہ علیل تھے) اس جلسے میں شریک ہوئے۔ الہ آباد، کلکتہ، پٹنہ، لاہور، بمبئی وغیرہ میں بھی ''یوم گورکی'' منایا گیا۔

بمبئی میں ترقی پسندوں نے سبط حسن کی کوشش اور کاوش سے ''یوم غالب'' بڑی شان سے منایا۔ اس کی صدارت کے لیے قاضی عبدالغفار صاحب حیدرآباد (دکن) سے خاص طور پر بمبئی آئے۔ بمبئی کے اداکاروں اور شعرا کی شرکت سے اس موقع پر ''دہلی کا آخری یادگار مشاعرہ'' بھی اسٹیج کیا گیا، جو بہت مقبول ہوا۔ اس موقع پر ایک نمائش بھی ہوئی جس میں غالب کی کتابیں، ان کے خطوط اور تصاویر وغیرہ کی نمائش ہوئی۔

ترقی پسند مصنّفین نے بمبئی میں ایک کل ہند اُردو کانفرنس کے انعقاد میں بھی حصہ لیا۔ ترقی پسندوں کی طرف سے سبط حسن اور کیفی اعظمی نے اس کے انتظامات میں سب سے زیادہ کام کیا۔

مولوی عبدالحق صاحب نے اس کانفرنس کی صدارت کی۔ ہم نے انجمن ترقی اُردو کی عمارت کے لیے چندہ بھی جمع کیا اور تقریباً پندرہ ہزار کی رقم مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ اس موقع پر جو مشاعرہ ہوا، اس میں مولانا حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی جیسے اساتذہ شریک ہوئے۔

ترقی پسند شاعروں کے لکھے ہوئے ترانے، نظمیں اور کتھائیں، عوامی مشاعروں اور جلسوں، کسانوں کی سبھاؤں اور کانفرنسوں کے ذریعہ سے اب براہ راست ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں تک پہنچ رہے تھے۔ ان کے ناٹک اور چھوٹی چھوٹی تمثیلیں اور نقلیں، عوامی تھیئٹر کے گروپوں کے ذریعے سے عوام میں مقبولیت حاصل کر رہے تھے۔ ''نیا ادب'' اور اسی صنف کے ہندی، گجراتی، بنگالی، تیلگو، اور ملیالم کے ادبی رسالے ہمارے مختلف مرکزوں سے شائع ہوکر دانشور طبقے میں ترقی پسند ادب اور اس کے نظریوں کو پھیلا رہے تھے۔ ملک کی مختلف زبانوں میں کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اور روزنامہ اخباروں کی اشاعت مل ملا کر ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ ان میں بھی ترقی پسند ادیبوں کی سیاسی نظمیں شائع ہوکر ملک کے ہر حصے میں محنت کش عوام اور دانشوروں کے وسیع حلقوں تک رسائی حاصل کر رہی تھیں۔

ہماری تحریک کے پھیلاؤ، عوام سے ہماری بڑھتی ہوئی قربت اور ان سے براہ راست تعلق کے پیش نظر اب یہ اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا تھا کہ نئے حالات میں ترقی پسند ادب کے تمام تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے فن اور تکنیک کے مسائل پر مسلسل غور و فکر کیا جائے۔ تنقید بہتر ہو، زبان و بیان پر عبور حاصل کرنے کی سعی کی جائے۔ ہمارے مبلغ علم میں اضافہ ہوتا رہے، اور پیہم مشق اور تجربہ کے ذریعہ اپنی خامیاں اور کمزوریاں دور کر کے ادبی تخلیق کی تمام اصناف کی سطح کو بلند اور معیار کو اونچا کرنے کی کوشش برابر جاری رہے۔

اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ 1944 کے ختم سے بمبئی میں ادیبوں کا کافی جمگھٹا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر فلم سازی کی صنعت یا صحافت سے وابستہ تھے۔ حضرت جوش ملیح آبادی، ہمارے پیرِ مغاں پونہ میں تھے۔ کرشن چندر، ساغر نظامی، اور اختر الایمان بھی پہلے وہیں تھے، پھر بمبئی میں آ گئے۔ ساحر لدھیانوی اور حمید اختر کو بھی فلم کی کشش

پنجاب سے بمبئی کھینچ لائی۔ بھوپال سے قدوس صہبائی آئے اور ہفتہ وار ''نظام'' کے مدیر بن گئے۔ کرشن چندر کے ساتھ ساتھ اب ان کے بھائی مہندر ناتھ بھی ادبی محفلوں میں نظر آنے لگے۔ سردار جعفری جب ''نیا زمانہ'' کے ادارتی بورڈ سے علاحدہ ہوکر ایک اشاعتی ادارے (کتب پبلشرز) میں کام کرنے لگے تو ظ۔ انصاری اور محمد مہدی شمالی ہند سے آکر ''نیا زمانہ'' کی ادارت کرنے لگے۔ کیفی اعظمی بھی ''نیا زمانہ'' کے ادارے سے علاحدہ ہوکر ''نیا ادب'' کے مدیر بن گئے۔ مجاز، جذبی، جاں نثار اختر کافی مدت تک بمبئی آکر رہے۔ اپندر ناتھ اشک بھی بمبئی میں تھے اور اب وہ با قاعدگی سے انجمن کے ممبر بنے اور اس کی کارروائیوں میں حصہ لینے لگے۔ عصمت چغتائی، جو ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی ہماری تحریک سے کٹی کٹی رہتی تھیں، اب انجمن سے بھی دلچسپی لینے لگیں۔ گوان کے میاں شاہد لطیف، جو اپنی طالب علمی کے زمانہ میں علی گڑھ کی انجمن میں تھے اور افسانے لکھتے تھے، اب فلموں کی دلچسپیوں میں ایسے ڈوبے کہ انھوں نے لکھنا ترک کر دیا۔ 1945 میں جب جنگ ختم ہوئی تو ملک راج آنند نے اپنا پرانا وعدہ پورا کیا اور وطن واپس لوٹے اور بمبئی میں آکر مقیم ہوئے۔ ممتاز حسین جو لکھنؤ کے ایک کالج میں پڑھاتے تھے، بمبئی میں قسمت آزمائی کے لیے آگئے اور کچھ دن کی فاقہ کشی کے بعد وہاں کی نیم سرکاری اُردو ریسرچ سوسائٹی میں کام کرنے لگے۔ انور نیوی میں افسر تھے، وہ حمید اختر کے ہم وطن اور دوست تھے اور اس زمانہ میں سرکاری ملازموں کے لیے انجمن کے جلسوں میں شرکت کے معنی نوکری سے ہاتھ دھونے کے نہیں تھے۔ وہ بھی کبھی کبھی ہمارے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ سعادت حسن منٹو، میرا جی، ممتاز مفتی، مدھوسودھن گو انجمن کے رکن نہیں تھے لیکن کبھی کبھی اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ منٹو اور مدھوسودھن نے اپنے افسانے بھی سنائے۔ حیدرآباد (دکن) سے مخدوم محی الدین سال میں دو تین بار بمبئی ضرور آتے تھے اور انجمن کی کارروائیوں میں حصہ ضرور لیتے تھے۔ بمبئی کے ریڈیو اسٹیشن سے رفعت سروش خاموش اور مسکراتے ہوئے، با قاعدگی سے انجمن کے جلسوں میں آتے تھے اور اپنا کلام سناتے تھے۔ وشوامتر عادل گو ''میرا جیت'' میں ڈوبے ہوئے تھے، لیکن اب انھوں نے ترقی پسند نظریوں کو بڑی حد تک قبول کر لیا تھا اور اپنی شاعری میں انوکھے طریقوں سے اس کا اظہار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ نیاز حیدر، حیدرآباد (دکن) سے آکر بمبئی میں تقریباً مستقل طور سے

بس گئیے اور فلمی دنیا کے طواف کرنے لگے۔ ان پر ہمیشہ ایک دلکش قسم کی گھبراہٹ اور معصومیت طاری رہتی تھی۔

ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور اپنی بڑی بہن کے ساتھ بمبئی میں آ کر رہنے لگیں۔ وہ کبھی کبھار ہمارے جلسوں میں آتی تھیں۔ جب ہم ان سے شکایت کرتے کہ زیادہ باقاعدگی سے کیوں نہیں آتیں تو اس کی شکایت کرتی تھیں کہ جلسے کے شرکا میں بعض نوجوانوں کا رویہ غیر مہذب ہوتا ہے۔ میں انھیں دیکھتا تھا تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے چڑیا کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں جن کے ابھی پر نہیں نکلے ہیں، لیکن ان کے ذہین چہروں سے ظاہر تھا کہ جب ان کے ادبی پَر نکلیں گے تو وہ بہت اونچی اڑان اڑیں گے۔

حیدرآباد سے آنے والوں میں ابراہیم جلیس بھی تھے۔ وہ بمبئی آنے سے پہلے اپنا پہلا ناول شائع کر چکے تھے۔ اپنے قد کی درازی میں وہ ساحر اور حمید اختر کے برابر تھے، اور اب ان کے غول میں ہی شامل ہو کر اس جوڑی کو تکڑی بنا دیا۔ ان کی طنز نگاری اس وقت تک ابھر چکی تھی۔ لیکن ان کی لکھی ہوئی چیزیں سننے کے بعد دل میں بے ساختہ یہ خیال ہوتا تھا کہ یہ شخص اور گہری نظر رکھتا ہوتا اور اسکول اور کالج کے لڑکوں کی طرح ہلکے مذاق اور فقرہ بازی سے کبھی کبھی اپنی منفرد ہنرمندی کو آلودہ نہ کرتا۔ عادل رشید شروع شروع میں کرشن چندر اور مہندر کے دوست کی طرح آئے۔ ترقی پسندی کے بارے میں انھوں نے معلوم نہیں کیا کیا سنا تھا۔ اس لیے کچھ گھبرائے ہوئے رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ پوری طرح تحریک کے ساتھ ہو گئے۔ مجروح سلطانپوری، جگر صاحب کے ساتھ لگے ہوئے پہلے بمبئی آئے۔ وہاں کے مشاعروں میں نام پیدا کیا۔ پھر نوجوان ترقی پسندوں سردار جعفری، کیفی اور کرشن چندر وغیرہ کے ساتھ ایسے گھلے ملے کہ تحریک کے مجاہدوں میں شمار کیے جانے لگے۔ ان کے ساتھ گویا غزل، ترقی پسند ادب کی تحریک میں دوبارہ بڑی دلکش ادا کے ساتھ داخل ہوئی۔ سردار جعفری، خواجہ احمد عباس اور سبط حسن تو اب ہماری تنظیم میں پرانے چاول کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔

بمبئی کی انجمن کے عام جلسوں میں مختلف زبانیں بولنے اور لکھنے والے ادیب شامل ہوتے تھے۔ ان میں کسی ایک زبان میں لکھی ہوئی چیز پر تفصیلی بحث اور تنقید اس وجہ سے نہیں ہو سکتی

تھی کہ زیادہ تر حاضرین اس میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔اس لیے جب اُردو کے ادیبوں کا کافی بڑا اگروہ بمبئ میں جمع ہوگیا،تو ہم نے بہتر سمجھا کہ عام جلسوں کے علاوہ انجمن کی مختلف زبانوں کے الگ الگ جلسے بھی ہوں۔ چنانچہ اُردو، ہندی اور گجراتی کے ادیب اب اپنے علاحدہ جلسے بھی کرنے لگے۔ ہرزبان کے ان علاحدہ جلسوں کے سلسلے میں اُردو کے شعبے کے جلسے سب سے زیادہ باقاعدگی سے اور سب سے اچھے ہوتے تھے...... دلچسپی اور افادیت، دونوں لحاظ سے۔ بمبئ کی انجمن کے اُردوشعبے کے ادیبوں نے اپنا کام چلانے کے لیے اب چار پانچ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنالی،جس کے کنو ینر حمید اختر ہوئے۔شروع شروع میں تو ہم حمید اختر کو محض ساحر لدھیانوی کے ایک دوست کی حیثیت سے جانتے تھے، گواُن کی طبیعتوں اور مزاج میں بڑا فرق تھا۔لیکن ان کا یارانہ ضرب المثل بن گیا تھا۔ ایسا بہت کم اتفاق ہوتا تھا کہ حمید اختر یا ساحر سے کوئی علاحدہ مل لے۔ لمبے اور دبلے یہ دونوں دو متوازی خطوط کی طرح ہمیشہ ایک ساتھ دکھائی دیتے تھے۔کسی کے یہاں ہوں، کسی چائے خانہ میں ہوں، کسی جلسے میں ہوں، یا ان کی اپنی جائے رہائش پر۔ان کی ادبیت کے متعلق ہمیں صرف یہ علم تھا کہ وہ ایک انگریزی ناول کے مترجم ہیں جو لاہور میں شائع ہوا تھا۔لیکن اب حمید اختر نے غیر معمولی تنظیمی صلاحیت اور ادبی شعور کا اظہار کیا۔انجمن کے جلسوں کے لیے ہر ہفتہ ایک دلچسپ پروگرام بنانا (جس کے لیے وہ مختلف ادیبوں کو لکھنے کے لیے آمادہ کرتے رہتے تھے، جو کافی مشکل کام تھا)، سب کو جلسے کی اطلاع کرنا، جلسے کی شرکت کے لیے مختلف لوگوں سے تقاضے کرتے رہنا اور ضرورت پڑنے پر زیادہ کاہل اور غیر ذمہ دار قسم کے ادیبوں اور شاعروں کو ان کے گھروں سے جا کر اپنے ساتھ لے آنا، یہ سب تو ان کے لیے معمولی کام تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کسی قسم کے بھی کام سے ہچکچاتے نہیں تھے، اور اگر وہ محسوس کرتے تھے کہ دوسروں کے سپرد جو کام کیے گئے ہیں، ان میں ڈھیلا پن ہے،تو پھر وہ ان کا بھی اس طرح ہاتھ بٹاتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کام دوسرا ہی کررہا ہے لیکن حقیقت میں وہ حمید اختر کرتے تھے۔

یہ جلسے زیادہ تر میرے فلیٹ کے ایک بڑے سے کمرے میں ہوتے تھے جس میں تیس چالیس آدمی گھس پل کر فرش پر بیٹھ سکتے تھے۔خوش قسمتی سے میں بمبئ میں رہنے کے لیے ایسے

وقت پر پہنچا تھا، جب وہاں جاپانی حملہ کے خطرے کی وجہ سے بہت سے خوشحال قسم کے لوگ خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے تھے اور بہت سے اچھے مکان اور فلیٹ کافی کم کرائے پر مل جاتے تھے۔ مجھے تین کمروں کا ایک فلیٹ اسی طرح مل گیا تھا۔ ہمارے پاس صوفے، بڑی کرسیاں یا پلنگ بھی نہیں تھے۔فرنیچر کی کمی کی وجہ سے ہمارے رہنے کے بڑے کمرے میں کافی گنجائش تھی۔ چنانچہ حمید اختر جلسے کے دن آدھے گھنٹے پہلے ہی پہنچ کر، رضیہ سے ہمارے بستروں کے گدّے اور چادریں لے کر کمرے میں چاروں طرف بچھا دیتے تھے اور معزز حاضرین کا استقبال کرنے کے لیے رضیہ اور وہ، اس طرح تیار ہو جاتے تھے۔اس درمیان میں میری دو چھوٹی بچیاں یہ محسوس کرتیں کہ چچا حمید اختر دراصل ان کی آزادی کے ساتھ دوڑنے اور کھیلنے کے لیے کمرے میں گنجائش نکال رہے ہیں......
اور اپنے ساتھ دو تین اور بچوں کو بلا کر وہ سجا سجایا سامان اتھل پتھل کرنے لگتیں۔حمید اختر کو اس بے پناہ فوج سے بھی اپنی محنت کے پھل کو بچانا ہوتا تھا اور اس کے لیے وہ طرح طرح کی ترکیبیں کرتے رہتے تھے۔ اِدھر رضیہ کو یہ شکایت رہتی تھی کہ ترقی پسند مصنّفین سگریٹ پیتے ہیں تو راکھ اور سگریٹ کے ٹوٹے ان خالی ٹینوں میں نہیں پھینکتے جو کافی تعداد میں فرش پر چاروں طرف رکھ دیے جاتے تھے۔ بلکہ فرش اور چادروں کو اتنا گندہ کرتے رہتے ہیں کہ جلسے کے بعد جھاڑو دیتے دیتے وہ تھک جاتی ہیں۔آخر میں سمجھوتہ اس پر ہوا کہ جلسے کے بعد صفائی کرنے اور کمرے کو اپنی اصلی صورت پر لانے میں بھی حمید اختر اور میں رضیہ کا ہاتھ بٹایا کریں گے۔

جلسے ہر ہفتے تیسرے پہر ہوتے تھے اور ان میں دس پندرہ آدمیوں سے لے کر تیس چالیس تک کی حاضری ہوتی تھی۔ ویسے ایک دو بار یہ بھی ہوا کہ کل حاضری پانچ اشخاص پر مشتمل ہوتی جس میں حمید اختر کے علاوہ ہم دو میزبان اور مضمون نگار اور ایک اس کے ساتھ آنے والا کوئی دوست ہی ہوتا تھا۔لیکن ایسی اداسیاں کم ہوتی تھیں۔کبھی کبھی چالیس پچاس تک حاضری ہو جاتی تھی، یہ وہ موقعے تھے جب کرشن چندر یا جوش صاحب کی قسم کے ادیب کچھ پڑھنے کو ہوتے تھے یا کوئی خاص طور پر دلچسپ پروگرام بنتا تھا۔

ان جلسوں میں جو چیزیں پڑھی گئیں، ان میں سے بیشتر ''نیا ادب'' اور دوسرے ادبی رسالوں یا مصنّفین کے مجموعوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ جوش صاحب کی چند بہترین غنائیہ اور حرف

آخر کی بعض نظمیں ان میں سنی گئیں۔ وہ دوسرے تیسرے مہینے ہی ہمارے جلسوں میں شریک ہو سکتے تھے۔ لیکن جب وہ جلسے میں موجود بھی ہوتے تھے، تو جو کوئی بھی کچھ پڑھتا تھا یا بولتا بھی تھا، اسے یہی خدشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں زبان، محاورے یا تلفظ کی کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی۔ زیر وزبر کی ذرا سی بھی غلطی یا لفظ کے غلط استعمال سے فوراً ان کے ماتھے پر بل پڑ جاتا تھا اور اگر وہ فوراً نہ بھی ٹوکتے تو ایسی صورت بنا لیتے تھے جیسے انھیں کوئی جسمانی چوٹ لگ گئی ہے۔ ایک بار وہ میرے یہاں آئے تو دوران گفتگو میں نے ان سے پوچھا...... ''آپ پونا سے کب تشریف لائے؟'' بجائے اس کے کہ وہ میرے سوال کا جواب دیں، وہ رضیہ کی طرف یکبارگی مڑ کر پوچھنے لگے...... ''یہاں کہیں زہر ملے گا؟ مجھے تھوڑا سا منگا دو۔ ہم تو اب زہر کھا لیں گے۔'' رضیہ اور میں حیران ہو کر ان کا منہ تکنے لگے کہ آخر ہم سے ایسی کون سی گستاخی ہوئی جس پر یہ اتنے ناراض ہو گئے۔ رضیہ نے پوچھا...... ''کیا بات ہوئی جوش صاحب؟'' میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ...... ''یہ حضرت اُردو کے ادیب ہیں اور تم اُردو کی عالم فاضل ہو، جب تمھارے گھر میں بھی میں یہ سنوں کہ آپ پونا سے کب آئے، تو یہ بتاؤ کہ اب میں زہر نہ کھالوں تو اور کیا کروں؟'' ''گھوڑا کی دم'' بھی بولا کرو۔'' ہم جوش صاحب سے کبھی کبھی معذرت کرتے کہ آپ زبان کے معاملے میں بہت سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ وہ ہمیں جواب دیتے...... ''تم لوگ جب انگریزی بولتے ہو تو گرامر کا بہت خیال رکھتے ہو مثلاً کبھی یہ نہیں کہتے کہ آج فائیو (Five) یا سِکس جنوری ہے۔ ہمیشہ ففتھ یا سکستھ جنوری کہتے ہو۔ پھر جب اُردو بولتے ہو تو اس کے قواعد کا کیوں لحاظ نہیں کرتے؟ پانچ یا چھ جنوری کیوں کہتے ہو؟ پانچویں یا چھٹی جنوری کیوں نہیں کہتے، جو صحیح ہے؟ اپنی زبان نے کیا قصور کیا ہے کہ اسے غلط بولا جائے؟'' ہم جب لاجواب ہو کر کہتے کہ زبان میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور اتنی سختی کرنے

نوٹ:— 'پونا' اور 'پونے' کی یہ بحث یہاں پر ہی ختم نہیں ہوئی۔ اتفاق سے اس واقعہ کے چند روز بعد مولانا ابوالکلام آزاد بمبئی تشریف لائے۔ مَیں جوش صاحب کے ہمراہ ان کی قدم بوسی کے لیے گیا۔ دوران گفتگو مولانا نے بھی پونا کا استعمال اسی طرح کیا جس پر جوش صاحب نے مجھے ٹوکا تھا۔ اب میں جوش صاحب کی طرف فاتحانہ انداز میں دیکھ کر مسکرانے لگا۔ مولانا نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے۔ میں نے ان کو سارا واقعہ سنایا۔ مولانا ہنسے اور انھوں نے فتویٰ دیا کہ 'پونا' یا 'پونے' دونوں طرح سے اس کا استعمال صحیح ہے۔ جوش صاحب بھی مولانا کا بہت احترام کرتے ہیں۔ وہ اس وقت تو کچھ نہیں بولے لیکن باہر نکل کر مجھ سے کہا کہ مولانا غلطی پر ہیں۔

سے اس کی ترقی رک جائے گی۔ اس پر وہ کہتے کہ غلطیوں کو عام کرنے کے معنی ترقی کے نہیں۔ نئے لفظ ضرور گڑھے جائیں، نئے محاورے استعمال کیے جائیں، نئے خیالات کے اظہار کے لیے نئی ترکیبیں بنائی جائیں، لیکن زبان کے قواعد وضوابط اور اس کے مزاج کو ملحوظِ خاطر رکھ کر، ورنہ زبان بنے گی نہیں بلکہ بگڑ جائے گی۔

زبان کی صحت پر جوش صاحب کا اصرار ترقی پسند مصنّفین کے لیے بہت مفید اور ضروری تھا۔ مطالب کو ادا کرنے کے لیے الفاظ اور محاورات کا ٹھیک انتخاب شعر میں (اور ادب میں عام طور سے) مضمون اور خیال اور ان کی مخصوص فضا اور مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے لفظوں کے صرف مطالب و معنی کا ہی نہیں، بلکہ ان کی روایتوں اور علاقوں کا خیال رکھنا، کلام کی تاثیر اور تکمیل کی ایک لازمی شرط ہے۔ اس قسم کی صلاحیت کا پیدا ہونا ادیب کی فطری ذہانت پر ایک حد تک مبنی ہے، سو دوسری طرف اس کے ذوق سلیم کی تربیت، اساتذہ اور مستند زبان دانوں کے کلام کے مسلسل مطالعہ اور علم، نیز اپنی زبان بولنے والوں کے مختلف طبقوں اور گروہوں کے روزمرہ کے سننے اور اس کی واقفیت سے ہی ہوسکتی ہے، اور ان طریقوں سے حاصل کیا ہوا ادبی ادراک، لکھنے کی مشق اور مہارت کے ذریعے سے ہی پختہ ہوسکتا ہے۔

سامراجی نظام نے ہماری قوم کی عظیم اکثریت کو تعلیم سے محروم کر دیا تھا اور جن لوگوں کو تعلیم ملی بھی تھی، وہ ناقص تھی۔ اس لیے نئے لکھنے والوں میں خامیاں تھیں۔ ان کے لیے نہ صرف رجعتی سامراجی اور جاگیری تصورات اور ان کے اثرات کا تدارک اور ان کی بیخ کنی ضروری تھی، بلکہ نئے عوامی آزادی خواہ اور ترقی پسند خیالات کی ترویج کے لیے اور ادب کو انقلاب اور جمہوری تبدیلی کا ایک مؤثر آلہ بنانے کے لیے اپنی صحیح تعلیم بھی ضروری تھی۔ زبان دانی اس تعلیم کا ایک بہت اہم جزو تھا۔ ہماری انجمن اچھے ترقی پسند ادب کی تخلیق میں اسی صورت سے مفید اور مددگار ثابت ہوسکتی تھی جب اس کی کارروائیاں (اس کے جلسے، کانفرنسیں اور ادبی رسالے) تنقید اور ترغیب کے ذریعہ سے ادیبوں کو اپنے تعلیم کے معیار کو اونچا کرنے اور زبان پر عبور حاصل کرنے اور اس طرح طرز بیان میں تنوع، خوبی، اثر اور دلکشی پیدا کرنے کے لیے آمادہ کرتی رہیں۔

تاہم جوش صاحب کی تنقید صحیح ہوتے ہوئے بھی، اور ان کی مسلم انقلاب دوستی کے باوجود

ہم میں سے بعض کو نامکمل معلوم ہوتی تھی اور ان میں قدامت پرستی کا رنگ نظر آتا تھا۔ جس طرح ان کے کلام میں کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ ترقی پسند خیالات کے ہیولے، نوابی ٹھاٹھ سے ملبوس ہیں اور ان کی فکر جمہور کی طرفدار ہوتے ہوئے بھی محنت کشوں کی سانس کی گرمی اور ان کے خون کی حرارت نہیں رکھتی۔ ان کا دل عوام کے لیے دھڑکتا ہے، لیکن عوام کا نہیں ہے۔ اسی طرح سے ان کی تنقید کسی استاد کی طرح زبان کی فروگزاشتوں سے تو ہمیں مطلع کر دیتی ہے۔ لیکن ترقی پسند ادیبوں کے سامنے نئے عہد، نئے ماحول سے مطابقت رکھتے ہوئے اور نئے کاموں کو انجام دینے کے لیے جدید ادبی تخلیق کے جو پیچیدہ مسائل ہیں، ان پر روشنی نہیں ڈالتی۔

ہمارے ان جلسوں میں ظ۔ انصاری تنقید اور نکتہ چینی کے میدان کے سب سے بڑے شہسوار تھے۔ کسی مضمون یا نظم کو سن کر اور وہ بھی ادیبوں کے مجمع میں اور خود مضمون نگار یا شاعر کی زبانی، اور اس کی موجودگی میں تنقید، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تنقید خاص طور پر جب وہ تنقیص بھی ہو، بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ ایسے بہت کم ادیب ہیں جو اسے برا نہیں مانتے، اگر وہ دوست بھی ہیں پھر بھی نقاد کو اپنا مخالف سمجھنے لگتے ہیں اور اپنے کلام پر تنقید کو سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے الٹے نقاد کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اس کی نیت پر یا اس کی سمجھداری پر جوابی حملے شروع کر دیتے ہیں۔ ادیب سمجھتے ہیں کہ ان پر تنقید کرنے والے ان کو گرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے ''خونِ جگر'' پر کیچڑ اچھال کر اس کی تحقیر کی جا رہی ہے، اور یہ سب ناقد کی گروہ بندی، تعصب یا کم فہمی یا کم علمی کے سبب سے ہے۔ بعض نقاد تو خیر ایسے ہوتے بھی ہیں۔ لیکن ایماندار نقادوں کے لیے بھی شبہ اور شک کی اس فضا میں منہ کھولنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ تنقید کرنے والے کی تنقید غلط ہو۔ ادبی پسندیدگی کے معیار اگر مکمل طور سے سائنٹیفک ہوتے تو زیادہ مشکل نہ ہوتی۔ لیکن افلاطون اور ارسطو سے لے کر آج تک گو اچھے اور بُرے ادب کی پرکھ کے اصول مرتب ہوتے رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ تنقید کے اصول اور نظریوں کا اختلاف تو ایک طرف رہا، ایک نظریے اور اصول کو ماننے والے بھی جب عملی طور سے کسی ادیب یا شاعر کی تخلیق کو پرکھتے ہیں تو کبھی کبھی ان میں آپس میں اختلاف نمایاں ہوتا ہے۔ ان اختلافات کا سبب علم کی کمی بیشی، مذاق سخن، اور تربیت کے ماحول یا مزاجوں اور ذہنیتوں کا فرق ہو سکتا ہے۔ مزاج اور ذہنیت کے اس

فرق کے اسباب ڈھونڈھنے کے لیے ہمیں کسی مافوق الطبیعی پُراسرار اور نامعلوم قوت کے سامنے عقیدت کی نگاہیں جھکا دینے کی ضرورت نہیں۔ انسانوں کے مزاج، معاشرے میں طبقات کی معاشی تنظیم، ان کے باہمی رشتوں اور اس سے پیدا ہونے والی مادی اور تہذیبی کیفیتوں کے خمیر سے بنتے ہیں۔ مزاجوں کے اختلاف اور ان میں ہم آہنگی، دونوں کی بنیاد یہی کیفیتیں ہیں۔ ایک فرد کا مزاج اس کے طبقے کے حالات، اس کے موجودہ معاشرتی ماحول، اس کی اپنی روایتوں، دوسرے طبقوں اور دوسرے عہدوں کی روایتوں سے جو اس پر اثر ڈالتی رہتی ہیں (تعلیم، تعصّبات، مروجہ رسوم و رواج اور عادات وغیرہ کے ذریعے سے) مل کر بنتا ہے۔ مزاجوں میں تبدیلی اس وجہ سے آتی ہے چونکہ یہ کیفیتیں (تہذیبی، معاشرتی، روایتی، عمل اور ردِعمل) متحرک اور متبادل ہوتی ہیں۔ ترقی اور زوال، زوال اور ترقی کا ارتقائی عمل معاشرہ اور اس کے تہذیبی مظاہر میں ہر وقت جاری رہتا ہے۔ ترقی پسند شعور اور ادراک کے معنی یہ ہیں کہ سماج اور تہذیب کی اس حرکت اور متضاد قوتوں اور رجحانات میں ان قوتوں، ان رجحانات، ان احساسات، خیالات کا پتہ چلایا جائے جو کسی معاشرے میں زندگی بسر کرنے والے انسانوں کی اکثریت کی مادی اور تہذیبی بھلائی کے نظریے اور خیالات ہیں، اور پھر ایسے نظریوں اور خیالات کو اپنی فکر و عمل کا محور بنا کر معاشرے کے ارتقائی عمل کو اور تیز کیا جائے۔

سیاسی امور کے مقابلے میں کلچر کے معاملات میں، (ادب جس کا حصہ ہے) اس قسم کے صحیح ادراک اور شعور کا پیدا ہونا زیادہ مشکل ہے۔ گو سیاست میں بھی استحصال کرنے والے طبقے اور گروہ عوام کو گمراہ کرنے کے لیے اپنے اصلی مقاصد پر پردے ڈالتے ہیں، لیکن مظلوم اور لوٹے جانے والے محنت کش اپنی زندگی کے روزمرہ کے تجربوں سے جلدی اپنی حقیقت کا پتہ چلا لیتے ہیں۔ لیکن تہذیب اور کلچر کی رجعت پرست روایتیں کبھی فلسفیانہ، کبھی مذہبی، کبھی قومی، خصائل اور عادات کا دل لبھانے والا لباس پہن کر سماج کی مظلوم اکثریت کے اندر گھسا دی جاتی ہیں۔ حالانکہ ان کی تہہ میں صرف مٹھی بھر استحصال کرنے والوں کے تصورات ہوتے ہیں، لیکن انھیں فنون لطیفہ کا دلکش رنگ دے کر اور ان کی اُلوہی یا قومی یا تاریخی اہمیت جتا کر ان سے مظلوم اکثریت کے قلوب و اذہان کو ماؤف کر کے ان پر اقتدار جمانے کا کام لیا جاتا ہے۔

ترقی پسند ادراک اندرونی اور بیرونی، نظریاتی اور علمی، روحانی اور مادی دونوں میدانوں میں رجعت اور ارتقا کی قوتوں اور ان کے مختلف مظاہر کے پیہم مجاہدے اور مجادلے میں حصہ لینے اور اس کے تجربوں سے صحیح نتیجے اخذ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے کسی خاص وقت یا فرد میں اس کی حد معین نہیں کی جاسکتی۔ یہ ادراک ایک ارتقا پذیر شے ہے، جس میں کمی اور بیشی، یعنی جس کا زوال اور جس کی ترقی ایک درد کی اس صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ معاشرے کے مجموعی رشتوں اور ان کی آویزشوں سے پیدا ہونے والی ارتقائی حرکت کو محسوس کر کے اپنے ان احساسات کو کس حد تک شعور یا ادراک میں تبدیل کرتا ہے۔ اس کوشش میں کامیابی ایسے فرد کو معاشرے کی اجتماعی ترقی کا ایک باشعور اور صاحب ادراک عامل بنا دیتی ہے۔

بہر حال نقد و نظر کا فرق، مزاجوں کا اختلاف، لحاظ اور تکلف، دل شکنی اور ناراضی کا خیال کبھی کبھی ہمارے جلسوں میں بھی لوگوں کو ادیبوں اور شاعروں کی ان نگارشات پر، جو ان جلسوں میں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں، تنقید کرنے سے روک دیتا تھا۔ جب مقالہ یا نظم ختم ہو جاتی تو اس کے بعد خاموشی چھا جاتی۔ خاص طور پر کسی بڑے یا مشہور شاعر نے اپنا کلام سنایا ہوتا، یا کوئی ایسا ادیب ہوتا جس کے بارے میں عام خیال یہ ہوتا کہ وہ تنقید سے ناراض ہوگا۔ ایسے نازک موقعوں پر سب کی نظریں ظ۔ انصاری کی طرف اُٹھ جاتیں۔ ہم یہ محسوس کرتے کہ تنقید و بحث ان جلسوں کا سب سے اہم مقصد ہے اور اس میں تکلف یا جھجک دراصل ایک غلط، نقصان دہ اخلاق کی پابندی کرتا ہے۔ ظ۔ انصاری کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے منحنی جثّے اور شائستہ کلامی کے سبب سے اخلاق کا مجسمہ معلوم ہوتے تھے۔ وہ ہمارے درمیان ان معدودے چند مولوی افراد میں سے تھے، جنھوں نے عربی فارسی کی تعلیم پرانے قسم کے مدرسوں میں حاصل کر کے، پھر انگریزی پڑھی تھی اور رفتہ رفتہ ترقی پسند نظریوں اور تحریکوں سے متاثر ہو کر جدید قسم کے انقلابی صحافی اور ادیب بنے تھے۔ ان کی عادات کبھی کبھی مجموعہ اضداد معلوم ہوتی تھیں اور ان کے تصورات میں اس زمانہ میں جدید رجحانات کا میل ایسا لگتا تھا جیسے لکھنؤ کی پرانی اور پھول دار چھپی ہوئی فرد پر فرانسیسی ساٹن کا پیوند لگا دیا جائے۔ ان وجوہ سے ان کی ذات اور ان کی بات، دونوں میں ایک عجوبہ پن، ایک قسم کی دلچسپی ہوتی تھی۔ زبان میں کسی قسم کی خامی یا جھول اور مطلب میں ابہام یا ضرورت سے زیادہ باریکی ان

کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ ان کی مولویانہ تربیت نے کسی قدر خشک قسم کی اور سخت بے لوچ منطق سے ان کے ذہن کو مسلح کر دیا تھا۔ بحث ومناظرہ کا آغاز کرنے کے لیے وہ موزوں معلوم ہوتے تھے۔

چنانچہ وہ جوش ملیح آبادی ہوں، یا کرشن چندر، سردار جعفری یا کیفی اعظمی، مجاز یا مجروح یا کوئی اور، ظ۔انصاری کوئی نہ کوئی اعتراض ان پر آہستہ سے کرہی دیتے تھے۔اس طرح لوگوں کی جھجک دور ہو جاتی تھی اور جب بحث شروع ہو جاتی تھی تو پھر رفتہ رفتہ اس کے دوران میں مفید باتیں بھی نکلتی تھیں۔ عام طور سے سردار جعفری کا نقطہ نظر ظ۔انصاری سے مختلف ہوتا تھا۔اس طرح یہ لازمی سا ہو جاتا تھا کہ ظ۔انصاری کے بعد سردار ان سے اپنے اختلاف کا اظہار کریں۔ اس کے بعد بحث پھیل جاتی۔بعض لوگ بحث میں اس اصرار کے باوجود کہ وہ بھی اپنی رائے کا اظہار کریں، بہت کم یا بالکل نہیں حصہ لیتے تھے......مثلاً کرشن چندر...... وہ جب افسانہ سنا چکتے اور پھر اس پر بحث شروع ہوتی تو عام طور سے معترضین کے اعتراض اور نکتہ چینیوں کو اس طرح قبول کرتے جیسے کہ وہ ان کے احسان مند ہیں۔ غالباً ان کے فن کی ترقی اور عروج کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ اپنے افسانوں پر مناسب تنقید سے بالکل ناراض نہیں ہوتے تھے بلکہ انکسار اور کشادہ پیشانی سے اسے قبول کر لیتے تھے۔بعض ادیبوں اور شاعروں میں وہ جو ایک گھٹیا قسم کا غرور اور رعونت ہوتی ہے جو کہ دراصل جاگیری دور کی ایک غیر جمہوری اور احمقانہ روایت ہے، اور جس کا انسداد کرنا ترقی پسند تحریک کے لیے ضروری ہے، کرشن چندر میں بالکل نہیں ہے۔

مجروح سلطانپوری ترقی پسند ادیبوں کے درمیان جگر صاحب کی شاعری کی روایات کے ساتھ آئے تھے۔ان کی غزلوں میں ترنم اور سادگی کے ساتھ ایک دلکش عمومیت تھی جو اُن کے خوش گلو ہونے کے سبب سے، جب وہ خود اپنا کلام سناتے تھے تو اور بھی بڑھ جاتی تھی۔لیکن ہمارے یہاں ان پر اعتراض کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ جوش صاحب تو غزل کو بہ حیثیت ایک صنف سخن کے ہی مردود قرار دیتے تھے، اور بھی لوگ اسے شاعرانہ خوردہ فروشی سمجھتے تھے۔ مجروح اس بات کو مانتے تھے کہ روایتی غزل کے پٹے ہوئے موضوعات اور طرز بیان کو، جو فرسودہ روایات اور خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں، بدلنے کی ضرورت ہے۔لیکن وہ بہ حیثیت ایک صنف سخن کے

غزل کے بہت گرم جوش طرف داروں میں تھے۔انھوں نے نہ صرف یہ کہ غزل کے مخالفوں سے کبھی ہار نہیں مانی، بلکہ ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ جدید ترقی پسند نظریوں کو سمجھنے اور پڑھنے کے ساتھ ساتھ عملی طور سے اپنی غزلوں میں اس کا اظہار کرنے کی بھی کوشش کرتے رہتے تھے اور اپنی حدوں کے اندر انھیں اس کوشش میں کامیابی بھی ہوتی تھی، گوابھی ان کی اس نئے دور اور نئی طرح کی شاعری میں ابتدا اور آغاز کے انداز اور اطوار تھے۔اس زمانہ میں مجروح کو بمبئی میں گویا دو محاذوں پر جنگ کرنی پڑتی تھی۔ایک طرف وہ اپنے پہلے کے روایتی غزل گویوں اور شاعروں سے ترقی پسندی کے اصولوں کو صحیح منوانے کے لیے لڑتے، دوسری طرف ترقی پسند ادیبوں کی اکثریت سے غزل کو مقبول کروانے اور اس کی اہمیت کو تسلیم کروانے کے لیے۔ان میں ادبی معرکہ آرائی کے لیے غیر معمولی توانائی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کارزار میں حصہ لینا ہی ان کے ذہنی نمو کی شرط ہے۔

ترقی پسند مصنّفین کے ان جلسوں کی تفصیلی روداد اور ان کی فضا کو حمید اختر ہر ہفتے بڑی خوبی کے ساتھ قلمبند کرتے تھے۔ ہر جلسے کے شروع میں وہ بہ حیثیت سکریٹری کے انجمن کے گزشتہ ہفتے کی روداد پڑھتے تھے۔ عام طور سے سکریٹری کی رپورٹ ایک خشک اور رسمی سی چیز ہوتی ہے، لیکن حمید اختر نے ان رپورٹوں میں بھی ادبی رنگ پیدا کر دیا تھا اور اس طرح غالباً وہ ایک نئی ادبی صنف کے موجد سمجھے جاسکتے ہیں۔ان کی یہ ہفتہ وار سرگزشت دراصل ایک دلچسپ رپورتاژ ہوتی تھی۔ جس میں جلسے میں پڑھے گئے مضامین اور مقالوں کا خلاصہ، ان پر اور نظموں اور افسانوں پر بحث میں حصہ لینے والوں کی کہی ہوئی باتیں مختصراً لکھی جاتی تھیں۔اس کے علاوہ بحث کرنے والوں اور حاضرین کے طور طریقوں اور جلسہ کی عام کیفیت کا بھی پرلطف اشاروں میں بیان ہوتا۔اس کی وجہ سے ساری سرگزشت میں جان سی پڑ جاتی تھی۔قدوس صہبائی نے ان رپورٹوں کو باقاعدگی سے ہفتہ وار ''نظام'' میں شائع کرنا شروع کیا۔جس کی وجہ سے ان جلسوں کا احوال ملک میں اُردو کے تمام ادبی مرکزوں میں پہنچ جاتا تھا۔''نظام'' جو اس سے پہلے ایک معمولی قسم کا تجارتی ہفتہ وار تھا، اب سارے ملک میں اُردو کا سب سے اچھا ادبی ہفتہ وار مانا جانے لگا۔ ہمارے جلسوں میں پڑھے جانے والے مقالے اور نظمیں بھی اس میں باقاعدگی سے چھپنے لگیں۔ ہمارے جلسے اور ان کی بحثیں

اور روداد یں ہماری پوری تحریک کے لیے ایک مثالی حیثیت اختیار کرنے لگیں۔ جب ملک کے مختلف حصوں میں اُردو کے ترقی پسند مصنّفین نے انجمن کی نئی شاخیں قائم کیں تو وہ بمبئی کی انجمن کی طرح جلسے کرنے اور ان کی مفصّل روداد لکھنے اور انھیں چھپوانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس طرح ادبی تخلیق اور تنقید کے لیے ایک مربوط اور سازگار فضا پیدا ہوئی۔

اس وقت میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس زمانے میں اُردو کے ترقی پسند ادیبوں نے جس ادب کی تخلیق کی اور جس کی اشاعت ہوئی، اس کا جائزہ لوں۔ یادداشت سے کام لے کر ایسا کام کرنا ٹھیک نہیں ہے اور نہ یہ ممکن ہے۔ اہم اور قابل توجہ نام یاد نہ ہونے کی وجہ سے چھوٹ سکتے ہیں اور اس طرح میں جانبداری کا نادانستہ ملزم ہوسکتا ہوں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان تخلیقات پر مفصل تنقید اس کتاب کا موضوع بھی نہیں ہے۔

تاہم میرے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ ہماری اس تحریک کے اس دَور میں اچھے اور قابل توجہ ادب کی تخلیق ہوئی، میں ان نگارشات کی طرف اشارہ کروں جن کے نقش ابھی تک میرے دل ودماغ پر موجود ہیں۔

کرشن چندر کی افسانہ نگاری اس دور میں ایک نئی بلند سطح پر پہنچی۔ ابھی تک وہ ہمارے کئی اچھے اور ہونہار افسانہ نگاروں میں ایک تھے۔ ''اَن داتا'' لکھنے کے بعد وہ ایک ممتاز افسانہ نگار بن گئے۔ اس کے انگریزی ترجمے کی اشاعت اور اس کی غیر معمولی مقبولیت کے بعد وہ بین الاقوامی ادبی دنیا میں ہندستان کے نئے افسانہ نگاروں کے بہترین نمائندے تسلیم کیے گئے۔ ''ان داتا'' کے بعد مسلسل انھوں نے کئی شاہکار افسانے لکھے، جو اُن کے نئے مجموعے میں شائع ہوئے۔

خواجہ احمد عباس کی ''ایک لڑکی'' برسوں ہوئے شائع ہوئی تھی۔ اب اس زمانے میں انھوں نے کئی اچھے افسانے لکھے (زعفران کے پھول، اجنتا) جن سے ان کے فن کی ترقی کا پتہ چلتا تھا۔ عصمت چغتائی کا پہلا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' اسی زمانہ میں شائع ہوا۔

احمد ندیم قاسمی کافی عرصے سے لکھتے تھے اور انھوں نے ادبی دنیا میں اپنی شاعری اور افسانہ نگاری سے اونچا مرتبہ حاصل کرلیا تھا۔ اس زمانہ سے ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی شروع ہوئی۔ 1945 میں ان کی ایک نظم ''رجعت پرستی کا نعرہ'' نیا ادب میں شائع ہوئی، جس میں

انھوں نے اپنے منفرد انداز میں کھو کھلی اور زندگی کی حقیقتوں سے گریزاں رومانیت پرستی کی اتنی پر اثر طریقے سے قلعی کھولی، جتنی کہ شاید نثر میں بھی کسی دوسرے ترقی پسند ادیب نے نہیں کی تھی۔ ان کے طنز میں بھی ایک نرمی، ایک لطافت تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ جب وہ اپنے مخالف رجعت پرستوں پر شدت سے اور بے رو و رعایت حملہ کر رہے ہیں، اس وقت بھی ایک گہری انسان دوستی، جو مخالفوں کو بھی اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے، ان کے لہجے، الفاظ اور خیالات سے چھوٹ کر نظم کی ساری فضا کو منور کر رہی ہے۔ ندیم کی نگارشات کی یہ خصوصیت وقت گزرنے پر اور بھی واضح اور نمایاں ہوتی رہی۔ ان کے کلام میں شروع ہی سے اپنے وطن کی سوندھی زمین، اس کی رنگین فضا اور اس میں رہنے والے مظلوم لیکن توانا محنت کشوں سے اُنس اور یگانگت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ان کے قطعات کا مجموعہ ''دھڑکنیں'' (جو 1942 میں شائع ہوا، بعد میں ''رِم جھم'' کے نام سے اس مجموعے کو شائع کیا گیا) اس کا ثبوت تھا کہ آئندہ دنوں میں نظریاتی صفائی اور تجربہ کی وسعت کے ساتھ ندیم کی فطرت اور انسان سے ان کی محبت عوام کی آزادی اور مساوات کی انقلابی جدوجہد کی کھلی طرفداری میں بدل جائے گی۔ مذکورہ بالا نظم کا پہلا بند ندیم کی شاعری کے انداز، ان کے شریفانہ لہجے اور ان کی فکر کی بنیادی حقیقت پسندی کی بہت اچھی مثال ہے......

اندھیارے میں رہنے والو، اندھیارے کے راز نہ کھولو
کانچ سے سپنے ٹوٹ نہ جائیں، آہستہ آہستہ بولو
زہر نہ بن جائے یہ جینا، اس امرت میں نیندیں گھولو
اور خوابوں کے موتی رولو!............

ان کی اخلاقی استقامت اور اپنی ادبی تخلیق کو معنوی اور فنی طور سے بلند سے بلند تر درجے پر لے جانے کی ان کی مسلسل کاوش نے چند سالوں کے اندر نہ صرف ندیم کو ترقی پسند شعرا اور افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں پہنچا دیا بلکہ ان کی ذات پوری تحریک کے لیے ایک مثالی حیثیت اختیار کر گئی۔

اس زمانے میں سردار جعفری، مخدوم محی الدین، جذبی، کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی کے کلام کے پہلے مجموعے (علی الترتیب پرواز، سرخ سویرا، فروزاں، جھنکار اور تلخیاں) شائع

ہوئے۔ سید مطلبی فرید آبادی کی بھی نظموں کا مجموعہ لاہور سے شائع ہوا۔

قومی دارالاشاعت، بمبئی نے جوش ملیح آبادی کا نیا مجموعہ کلام ''رامش ورنگ'' شائع کیا جس میں بیشتر ان کی وہ نظمیں تھیں جو ان کے پونا اور بمبئی کے قیام کے دوران میں کہی گئی تھیں اور جن میں سے کئی ''نیا ادب'' میں چھپی تھیں یا ہمارے جلسوں میں بار بار پڑھی گئی تھیں۔

فراق گورکھپوری کے نظم ونثر کے پہلے مجموعے بھی اسی زمانے میں شائع ہوئے۔ فراق ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں سے ہیں۔ وہ غزل کے آنچل کو پرچم ہی نہیں بنائے رہے بلکہ انھوں نے اس پر اپنی سنہری روپہلی تخیل کے ایسے نئے نئے نقش اور بیل بوٹے کاڑھ دیے جن میں دور چمکتے ہوئے ستاروں کی جھلملاہٹ، پھول کی پنکھڑی کی نزاکت اور کنوارگی چاندنی کی ٹھنڈک تھی۔ 1942 کے ''نیا ادب'' کے لیے انھوں نے اپنے تازہ کلام سے خود ہی اشعار کا انتخاب کر کے بھیجا۔ آج اس کے بہت سے شعر اُردو شاعری کا ذوق رکھنے والوں کی زبان پر ہیں......

یہ زندگی کے کڑے کوس، یاد آتا ہے
تری نگاہِ کرم کا گھنا گھنا سایہ

سانس ہے گرم و تیز سینے میں
ہوئی جاتی ہے دیر جینے میں

......اور یہ شعر جو صرف ترقی پسند فراق ہی کہہ سکتے تھے......

دلوں کو اب نہیں فردوسِ گم شدہ کی تلاش
وہ نشترِ غمِ فردا چلا دیے میں نے!

آج دو جگ مل رہے ہیں، کاٹتی ہیں پے بہ پے
پاس کی پرچھائیوں کو دور کی پرچھائیاں

تنقید کی بھی اس زمانے میں ترقی ہوئی۔ احتشام حسین اور مجنوں گورکھپوری نے پہلے کے

مقابلے میں زیادہ اور بہتر لکھا ''ادب اور زندگی''، احتشام کے تنقیدی مقالات کا پہلا مجموعہ ''تنقیدی جائزے'' بھی شائع ہوا۔ اختر انصاری کو ہم ایک ترقی پسند شاعر اور افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اب ترقی پسند تنقید پر ان کی کتاب ''افادی ادب'' شائع ہوئی۔ حیدرآباد دکن میں پروفیسر عزیز احمد نے بھی ترقی پسند تنقید کے نقطہ نظر کو بڑی حد تک اپنایا اور ان کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' شائع ہوئی جو اُردو کے جدید ترقی پسند ادب پر پہلی کتاب ہے۔ ممتاز حسین کے مضامین ''نیا ادب'' میں شائع ہونے لگے۔ ان مضامین میں ترقی پسند ادب کے علمی (سائنٹیفک) نظریوں کو پہلے لکھنے والوں کے مقابلے میں زیادہ ٹھوس اور مفصّل طریقے سے بیان کیا گیا تھا۔ ان میں ہمارے قدیم اور جدید ادب اور ان میں پیش کیے جانے والے فنی اور فلسفیانہ نظریوں کے سماجی اور تاریخی ماخذ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ممتاز حسین نے جدید یورپ کے مختلف ادبی نظریوں کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھا اور ان لوگوں کو جواب دیا، جو اُن میں سے بعض نظریوں سے متاثر ہو کر ترقی پسند ادب کی تحریک پر یورپ کے جدید رجعت پرستوں کا سہارا لے کر حملے کر رہے تھے۔ ممتاز حسین نے ادبی تخلیق کے فلسفیانہ مسائل پر بھی لکھا۔ البتہ ان کی تحریر کسی قدر الجھی ہوئی ضرور تھی اور اپنے مطالب کو واضح اور آسان طریقے سے ادا کرنے کا فن انھیں ابھی سیکھنا باقی تھا۔ اس خامی کے باوجود ان کی تحریروں سے مطالعے کی وسعت اور فکر کی گہرائی کا پتہ چلتا تھا۔ ادب کے جدید ترقی پسند نظریے کے مختلف پہلوؤں پر عبور حاصل کرنے کی کوشش اور ان کی روشنی میں اپنی تہذیب اور ثقافت کے مختلف مظاہر کو پرکھنے کی مسلسل کاوش نے ممتاز حسین کو ہمارے نقادوں میں جلد ہی ایک اونچے مقام پر پہنچا دیا۔

اس زمانے میں بیرونی ملکوں کے ترقی پسند ادب، اور علمی اور سیاسی کتابوں کے ترجمے بھی ترقی پسند مصنّفین نے کیے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے، جو انجمن ترقی اُردو (ہند) سے وابستہ تھے، انجمن کے لیے پہلے کالی داس کے ناٹک ''شکنتلا'' کا بہت اچھا ترجمہ کیا۔ وہ اُردو کے ان معدودے چند ادیبوں میں ہیں جو سنسکرت اور ہندی سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ اس کے بعد میکسم گورکی کی ''آپ بیتی'' کا ترجمہ انھوں نے کیا جو انجمن ترقی اُردو (ہند) نے دو جلدوں میں شائع کیا۔ عظیم آباد (پٹنہ) میں 1946 سے ہی ترقی پسند ادب کی تحریک کا آغاز ہو گیا تھا۔ وہاں

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں سہیل عظیم آبادی سب سے نمایاں تھے۔ ہندی کے ترقی پسند ادب کی تحریک نوجوان مصنّفین کو متاثر کر رہی تھی۔ ترقی پسند رسالے وہاں سے وقتاً فوقتاً شائع ہوکر بند ہوجاتے۔لیکن بدقسمتی سے وہاں انجمن کی تنظیم باقاعدگی سے نہیں ہوسکی تھی۔

1943 کے بعد سے انجمن کی تنظیم وہاں ہوئی۔ پٹنہ کے ایک ترقی پسند ادیب تمنائی نے ''زندہ چین'' کے نام سے جدید چینی افسانوں کا ترجمہ کیا جو لاہور سے شائع ہوا۔اس انتخاب نے چین کے عظیم مصنف لوہسون اور دوسرے ترقی پسند چینی ادیبوں کے افسانوں سے اُردو پڑھنے والوں کو غالباً پہلی مرتبہ روشناس کیا۔

سید مطلبی فرید آبادی جنگ کی پوری مدت نظر بند رہے تھے۔(تقریباً پانچ سال) جیل میں انھوں نے شولوخوف کے مشہور اور ضخیم ناول ''اینڈ کوائٹ فلوز دی ڈان'' کا ترجمہ کیا۔ 1946 میں لاہور کے ایک نئے ترقی پسند ادارے ''سنگم'' نے اس کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ ''بہتا دریا'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا۔اسی ادارے نے سید صاحب کی نظموں کا مجموعہ بھی شائع کیا جن میں سے بیشتر جیل میں ہی لکھی گئی تھیں۔

مخمور جالندھری نے بھی اسی زمانے میں اس ناول کا ترجمہ کرلیا تھا، جو''اور ڈان بہتا رہا'' کے نام سے شائع ہوا۔مخمور نے گورکی کے ناول ''ماں'' کا بھی ترجمہ کیا۔اس طرح اُردو ادب دنیا کے اس عظیم پرولتاری ناول سے روشناس ہوا۔

ترجمے کا کاروبار میرے اپنے گھر میں بھی بڑے زور شور سے جاری تھا۔ رضیہ نے قومی دارالاشاعت کے لیے انسان کے ارتقا پر سائنس کی ایک روسی کتاب کا بڑا اسلیس اور شگفتہ ترجمہ کیا۔ یہ لاہور سے ''انسان کا عروج'' کے نام سے شائع ہوا۔اس کے بعد انھوں نے ایک طویل روسی ناول ''چنگیز خان'' کا ترجمہ کیا،اور پھر ڈاکٹر ملک راج آنند کے ناول ''قلی'' کا۔

اسی زمانے میں قومی دارالاشاعت (بمبئی و لاہور) نے مارکس، لینن اور اسٹالن کی سیاسی، فلسفیانہ اور تاریخی کتابوں کے مستند ترجمے شائع کیے۔ ان کتابوں کے مترجم ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کے اراکین تھے (ڈاکٹر عبدالعلیم، کلیم اللہ، سبط حسن، علی اشرف، سلامت اللہ وغیرہ)۔

یہاں پر جن آدمیوں کا ذکر کیا گیا ہے اسے کسی طرح بھی مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ سارے ملک میں انجمن کے جلسوں اور ترقی پسند حلقوں میں نظم و نثر سنانے والوں کی تعداد اور ادبی ماہناموں اور ہفتہ واروں میں شائع ہونے والی چیزوں کی مقدار اس سے کہیں زیادہ تھی۔

ظاہر ہے کہ ان چیزوں میں اچھی، کم اچھی، معمولی اور ناکامیاب......سبھی چیزیں تھیں۔ فن و ادب کی ہر بڑی اور جاندار تحریک، تہذیب کی ہر بڑی لہر کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کمزوریوں، خامیوں اور ناکامیابیوں کے تجربے اتنے ہی ناگزیر ہیں جتنا کہ حقیقت، سچائی اور تاریخ کے تقاضوں پر مبنی تحریکوں کی ترقی، نمو اور کامیابی! اپنی تہذیب کو سنوارنے اور بنانے، رجعتی اثرات و نظریات کا قلع قمع کرنے اور فن کی اس دولت کے فیض کو عام کرنے میں، جسے اہل دَوَل اور ان کے حاشیہ نشینوں نے اپنی اجارہ داری بنا کر رکھا تھا، ترقی پسند مصنّفین نے اس مختصر مدت میں جو کام کیا وہ لائق تحسین ہے۔

اگر وہ اس کی مقدار اور ماہئیت سے مطمئن نہ ہوں بلکہ اسے اپنی جد و جہد کی ابتدا سمجھیں اور اگر ناکامیوں سے سبق سیکھنے اور اپنی اصلاح کرنے کی توفیق انھیں برابر ہوتی رہے، تو پھر ان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنے مخالف رجعت پرستوں سے کہیں...... ''تمھارے پاس اس کے مقابل کی اگر کوئی چیز ہو تو پیش کرو۔''

○○○

مناظرے و مکالمے

عالمگیر جنگ کے خاتمے (جون 1945) نے ہمارے ملک کے لیے نئے مسائل پیدا کیے۔ ہٹلر، مسولینی اور ٹوجو کو شکست ہوگئی تھی۔ لیکن جو سامراجی باقی رہ گئے تھے، وہ دنیا اور خاص طور پر ایشیا کے محکوم ملکوں کی آزادی کا حق تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ ہندستان، چین، برما، ملایا، انڈونیشیا، ہندچین، فلپائن وغیرہ جنگ کی مصیبتیں جھیلے ہوئے ملکوں میں آزادی اور جمہوریت کی زبردست سامراج دشمن لہر اٹھی۔ جنگ نے محکوم ملکوں کی معیشت کو، جو پہلے بھی سامراجی استحصال پر قائم تھی، اور بھی خستہ کردیا تھا۔ سامراجی حکمرانوں نے جنگ کے زمانے میں بھی جنگ کا بوجھ محکوم ملکوں پر ڈالا تھا۔ اب وہ اپنی بوسیدہ معیشت کو سدھارنے کے لیے محکوم ملکوں کو طرح طرح سے لوٹنے کے نئے منصوبے بنانے لگے۔ لیکن جنگ عظیم میں فاشسٹوں کی شکست، اور سوویت یونین کی فتح نے دنیا میں مجموعی حیثیت سے سامراجی قوتوں کو کمزور کردیا تھا۔ مشرقی یورپ کے بہت سے ممالک سامراجی دست بُرد اور مقامی جاگیرداروں کے چنگل سے نکل گئے تھے۔ چین میں سامراجیوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے اور عوامی آزادی کی فوج نے چین کے بہت سے حصوں میں اپنے مضبوط مستقر بنالیے تھے۔ دوسرے ایشیائی ملکوں میں بھی بیدار عوام سامراجی اقتدار کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ رہے تھے۔ دنیا بدلی ہوئی تھی۔ ایشیا کی دو سو سال کی محکومی کا

خاتمہ قریب آ گیا تھا اور اس محکومی کے ساتھ ساتھ ایشیائی محنت کش عوام، کسان، مزدور، درمیانہ طبقے صدیوں پرانے جاگیری اور نوابی کے زرعی نظام اور اجارے دارانہ اور بیرونی سامراج سے گٹھ جوڑ کرنے والی سرمایہ داری کو بھی ختم کر دینے کے لیے آمادہ اور متحد ہو رہے تھے، جنھوں نے ہماری زرعی اور صنعتی ترقی کو روک کر ہمارے وطن کو افلاس، بھوک، غربت اور جہالت کے گڈھے میں دھکیل دیا تھا۔

ایشیائی ملکوں کی قدیم معیشت کی بنیادیں تو بیرونی سامراج کے معاشی اور سیاسی غلبے نے ہی ہلا دی تھیں۔ اس کی جگہ پر سامراجیوں نے ہمارے ملک میں معیشت کے اس نظام کو جنم دیا تھا جسے ''نوآبادیاتی نظام'' کہتے ہیں، جو جدید سرمایہ دارانہ نظام سے بہت مختلف ہے۔ اس نظام کے تحت محکوم ملکوں میں جدید مشینی صنعتوں کی ترقی بہت کم ہوئی تھی۔ ملکی صنعت کار سرمایہ دار، سامراجی سرمایہ داروں کے مقابلے میں بہت کمزور تھے اور ان کے ملک میں بڑی صنعتیں قائم کرنے کے راستے میں رکاوٹیں ڈالی جاتی تھیں۔ سامراجی، مالیاتی سرمایہ (فنانسی بینکی سرمایہ) ملک کی تمام معیشت پر حاوی تھا اور اپنے اس غلبے کو سرمایہ داروں کی غیر معمولی طور پر کثیر منافع خوری کے لیے استعمال کرتا تھا۔ بیرونی سرمایہ داروں کے لیے کم مال تیار کرنا اور ان کے ہاتھوں اسے سستے داموں بیچنا، اور بیرونی صنعتوں کا بنا ہوا مال غیر معمولی گراں قیمت پر خریدنا، محکوم ملکوں کی معیشت کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ ان تمام کارروائیوں کا سب سے زیادہ تباہ کن اثر ہماری زرعی معیشت پر پڑا تھا۔ دیہات میں سامراجیوں نے جاگیری یا نیم جاگیری نظام کو قائم رکھا تھا یا جہاں وہ موجود نہیں تھا، وہاں پر بڑی زمینداریاں قائم کی تھیں۔ کاشتکار زمین کا مالک نہیں تھا۔ اس کی پیداوار کا بیشتر حصہ اوپر کے مالکانِ آراضی کے پاس چلا جاتا تھا۔ حکومت کے ٹیکسوں اور محصولوں، اور سرکاری عہدیداروں کی رشوت خوری کا بوجھ بھی اسی پر پڑتا۔ پھر زرعی پیداوار کی قیمتوں کو کم کر کے اور سود خوری کے ذریعہ بھی وہ لوٹا جاتا تھا۔ الغرض نوآبادیاتی محکومی کے نظام کی یہ چومکھی لوٹ (زرعی نظام کی تباہی، دستکاری کی تباہی، جدید مشینوں کی صنعتوں کی بہت کم ترقی، غیر معمولی سامراجی نفع خوری) ایشیا کے قدیم جاگیری اور خودکفیل دیہی نظام کی طبقاتی وست برد سے بالکل مختلف تھی۔

اس نوآبادیاتی معیشت اور سامراجی سیاسی غلبے سے ہمارے وطن میں جو معاشرتی اور تہذیبی اثرات نمایاں ہوئے، اس کا ہم پہلے باب میں تذکرہ کر چکے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے سے جو دور شروع ہوا اس کی ایک سب سے بڑی خصوصیت سامراجی محکومی کے نظام کی شکست و ریخت ہے۔ پھر بھی یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ اور اس کی جگہ پر ایشیائی اقوام کی آزادی اور ایک جمہوری ترقی پسند نظام کا قیام، سیدھے یا آسان طریقے سے اور بغیر سخت جدوجہد کے وقوع پذیر ہوگا۔ محکوم ملکوں میں آزادی اور جمہوریت کی اس جدوجہد کی جلد یا بدیر کامیابی کا انحصار مختلف اسباب پر ہے۔ مثلاً اس ملک کے تاریخی حالات، مختلف طبقوں کی حیثیت اور ان کی اضافی قوت، آزادی اور جمہوریت کا نصب العین رکھنے والے قومی متحدہ محاذ کی قوت اور اس کی راہ نما جماعت کی تنظیم، نظریاتی صفائی، دور بینی اور انقلابی عزم۔ دوسری طرف جو اسباب اس جدوجہد پر مسلسل اثر انداز ہوتے ہیں، اور اسے آگے بڑھاتے یا پیچھے گھسیٹتے ہیں، وہ سامراجی، ان کے طرف دار مقامی رجعت پرست طبقوں اور گروہوں کی ایک خاص وقت میں قوت اور اثر، بین الاقوامی طور پر مختلف سامراجی طاقتوں کی باہمی آویزش اور تضادات، اور جمہوریت، آزادی اور سوشلزم کی عالمگیر قوت اور اس کے مقابل سامراجی قوت۔

لیکن ان ناگزیر پیچیدگیوں، راستے کی اونچ نیچ اور مختلف مراحل کی دشواریوں کے باوجود یہ عہد مجموعی حیثیت سے عوام کی فتوحات کا عہد تھا، اور اب کہیں دور سے، کہیں نزدیک سے قومی آزادی کی منزل نظر آنے لگی تھی۔ آزادی کے لیے لڑنے والے عوام اگر جبر و تشدد سے دبا بھی دیے جاتے تھے یا غلط رہنمائی کا شکار ہو کر دھوکہ کھا جاتے تھے، تو تھوڑی ہی مدت کے بعد وہ بہتر تنظیم اور بہتر انقلابی شعور کے ساتھ پھر آگے بڑھنے کے لیے نکل آتے تھے۔ انتشار، پسپائی اور مایوسیوں کی مدت تھوڑی ہوتی تھی۔ اُمید اور عزم کے چراغ دلوں میں بجھتے نہیں تھے۔ تنظیم اور شعور کی سطح کو اونچا کرنے کی خواہش قلوب میں جاگزیں رہتی۔ کامیابی اور فتح کا یقین کبھی دھندلا نہیں ہوتا تھا۔

اس عظیم دور کی بلندیوں، اس کی راہ کے موڑوں اور اس کی پستیوں سے گزرنے والے افراد، گروہوں اور طبقوں پر ایک ٹوٹتی ہوئی معاشرت کے اثرات، ترقی اور زوال کے مابین جہد وجدال کے درمیان سے نئی زندگی کی نمو، جمہوری تصورات، رجعتی اور غیر سائنسی عقائد اور

خیال پرستی سے ٹکر اور ایک زیادہ روشن، پاک اور انسانیت افروز اخلاقی اور تہذیبی معیار کا فروغ، ان حالتوں اور کیفیتوں کو دیکھنا، سمجھنا اور شدت سے محسوس کرنا اور پھر اس نہج سے اس کا اظہار و بیان کرنا کہ اس دَور کی ساری تڑپ، حرکت اور عظمت ان کی نگارشوں سے جھلک پڑے، ترقی پسند مصنّفین کی کوششوں کا مقصد و مدُعا اس نئے زمانے میں یہی تھا۔

1942 کے وسط سے 1945 کے زمانہ تک ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کی شاخیں یا چھوٹے چھوٹے حلقے بہت سے مقامات پر قائم ہو گئے تھے اور 1940 سے 1942 تک جو تنظیمی کمزوری پیدا ہو گئی تھی، اسے دور کر کے ہم پہلے کے مقابلے میں بھی زیادہ مضبوط ہو گئے تھے۔ یہ کچھ عجیب بات تھی کہ اُردو کے تین بڑے مراکز لاہور، دہلی اور لکھنؤ میں ہماری انجمن مختلف وجوہ کی بنا پر بنتی رہی اور ٹوٹتی یا بے عمل ہوتی رہی (حالانکہ ان مقامات پر ترقی پسند ادیبوں کی انفرادی سرگرمیاں مسلسل جاری رہیں)۔ اب لکھنؤ اور دہلی میں انجمن کی دوبارہ تنظیم ہوئی۔ ممتاز حسین بمبئی سے پہلے لکھنؤ میں تھے۔ وہاں پر انھوں نے چند اور ادیبوں کے ساتھ مل کر انجمن کی دوبارہ تنظیم کی۔ انجمن کے جلسے ڈاکٹر رشید جہاں کے گھر پر عام طور سے ہوتے تھے۔ ایک بار جب میں لکھنؤ گیا تو رشید جہاں نے مجھ سے کہا...... ''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ میرے یہاں میٹنگ ہو، لیکن تم ذرا ممتاز حسین کو سمجھا دو کہ اگر انھوں نے یا دوسرے ترقی پسندوں نے میرے فرش کو میلا کیا اور چادروں اور دریوں پر سگریٹ کی راکھ گرائی، اور جاتے وقت کمرے کی صفائی نہیں کی تو میں ہرگز اپنے یہاں جلسہ کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔'' میں نے انھیں بتایا کہ رضیہ کو بھی مجھ سے اور حمید اختر سے بعینہٖ یہی شکایت ہے۔ رشیدہ نے تنک کر کہا...... ''بات یہ ہے کہ تم لوگ دکھانے کے لیے تو ترقی پسند بن گئے ہو، لیکن جب اس پر عمل کرنے کا سوال آتا ہے تو وہ سجاد ظہیر ہوں یا ممتاز حسین، عورتوں سے اس کی توقع کرتے ہو کہ گھر کا سارا گندہ اور غیر دلچسپ کام وہی کریں، تمھارے لیے گھروں کو صاف ستھرا رکھیں اور تمھیں چائے بنا بنا کر پلایا کریں اور تم مزے سے مالک بن کر بیٹھو اور ادب کی تخلیق کرو! یہی ہے نہ تمھارا تصور عورتوں کے بارے میں...... جن کو تم برابری کا درجہ دینے کا دعویٰ کرتے ہو؟'' یہ الزام بہت سنگین تھا۔ رجعت پرست تو خیر ہم کو جو کہتے تھے، کہتے ہی تھے۔ اب ہمارے اپنے گھروں کی عورتوں کو ہمارے خلوص پر شبہ ہونے لگا۔ ممتاز اور

میں نے اس مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا۔ ممتاز نے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ جلسے کے بعد کمرے کی صفائی کرنا نہیں بھولیں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ رائے اور نظریے بدل لینا یا قلم چلانا پرانی عادتوں کو ترک کرنے کے مقابلے میں بہت زیادہ سہل ہے۔ خاص طور پر جب ان مذموم رواجوں یا عادتوں سے ہم کو فائدہ یا آرام پہنچتا ہو، یا کسی قسم کی لذت حاصل ہوتی ہو۔

دہلی میں قاضی محمد احمد کی جگہ شمشیر سنگھ نرولا (اُردو افسانوں کے مجموعے ''جالے'' کے مصنف) انجمن کے سکریٹری ہو گئے تھے۔ وہاں پر ان دنوں فیض، تاثیر، شیودان سنگھ چوہان، دیوندر ستیارتھی، طفیل احمد خاں، اور ان کے علاوہ ہندی اور اُردو کے نوجوان ادیبوں کا بڑا گروہ جمع ہو گیا۔ نرولا بڑے محنتی اور مخلص آدمی ہیں، اور گو دہلی میں باقاعدگی سے جلسے اب بھی نہیں ہو سکے لیکن 1946 میں ایک بار جب مجھے دہلی میں دس گیارہ دن رہنے کا موقع ملا، تو انجمن کے دو بڑے بڑے جلسے منعقد ہوئے جن میں چالیس پچاس آدمی شریک ہوئے ہوں گے۔ ڈاکٹر تاثیر کی دلچسپی تحریک سے وقتاً فوقتاً گھٹتی بڑھتی تھی۔ میں جب دہلی میں تھا تو عبداللہ ملک بھی لاہور سے وہاں آئے تھے۔ ہم دونوں تاثیر مرحوم سے ملنے کے لیے ان کے گھر پر گئے۔ ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ اب وہ سرکاری نوکری سے علاحدہ ہو کر لاہور میں رہیں گے۔ وہاں ترقی پسند تحریک میں پورے وقت کام کریں گے۔ کچھ اور دوستوں کے ساتھ مل کر ایک بڑے پبلشنگ ہاؤس (سنگم) کو چلائیں گے وغیرہ۔ ہم تاثیر مرحوم کی ان باتوں سے بہت خوش ہوئے۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ مرحوم ڈیڑھ دو سال بعد اپنی ان تمام باتوں کو بالکل بھلا کر فرقہ وارانہ موقع پرستی کی راہ کو بڑے شد و مد کے ساتھ اختیار کرنے والے ہیں۔

دہلی والے، لکھنؤ اور لاہور والوں کی طرح شعر و ادب کے ساتھ تفریح اور نوک جھونک پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار ان دنوں جب میں دہلی گیا، تو میرے دوست مقیم الدین فاروقی اور قاضی احمد صاحب نے مجھے بتایا کہ انھوں نے ترقی پسند مصنّفین کی طرف سے ان کے مخالفین کو کھلا چیلنج دے دیا ہے کہ ہمارے ساتھ ایک پبلک مناظرہ کر لیں۔ دوسری طرف سے یہ چیلنج قبول کر لیا گیا ہے۔ انھوں نے مجھے دعوت دی کہ ترقی پسندوں کی طرف سے میں بھی اس مناظرہ میں حصہ لوں۔ ادبی مسائل کو حل کرنے اور اختلاف کو دور کرنے کا یہ طریقہ اتنا ہی نامناسب اور بیکار ہے

جتنا کہ مختلف مذاہب کے پیروؤں کے مابین مناظرہ کر کے روحانیت کے مسائل کی عقدہ کشائی کی کوشش۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجی مہاشوں اور مسلمان مبلغوں نے آپس میں پبلک مناظرے کر کے کس قدر نفرت خیزی کی تھی اور مختلف مذاہب کے عوام کو ایک دوسرے کے خلاف مشتعل کیا تھا۔ لیکن میری دلیلیں کارگر نہیں ہوئیں۔ فاروقی اور قاضی کہنے لگے کہ اب اگر ہم نے مناظرہ کرنے سے انکار کیا تو ساری دہلی میں ہماری فضیحت ہوگی، اور کہا جائے گا کہ ہم ڈر کر دبک گئے۔ اصل میں ان حضرات کا ایک مقصد اور بھی تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ اس قسم کے مباحثے میں بہت بڑا مجمع ہوگا، اور وہ اس پر ٹکٹ لگا کر انجمن کے لیے فنڈ بھی جمع کرنا چاہتے تھے۔ الغرض مناظرے کی ٹھن گئی۔

اس جلسے کے لیے بڑے اہتمام کیے گئے۔ دہلی کے میونسپل کارپوریشن کے بڑے ہال میں جلسہ ہونا قرار پایا۔ سر رضا علی (مرحوم) اس کی صدارت کے لیے بلائے گئے۔ ترقی پسند مصنّفین کی تحریک پر ''حملہ'' کرنے کے لیے دہلی کے دو نامور اصحاب تھے۔ خواجہ محمد شفیع ناول اور افسانہ نگار اور شاعر، دہلی کے ایک پرانے خاندان کے فرد اور وہاں کی قدیم تہذیب و آداب اور شرفائے دہلی کی میٹھی زبان کے ماہر اور ان کی نوکیلی اداؤں پر فریفتہ اور انھیں کو انسان کے عروج کی آخری منزل سمجھنے والے۔ دوسرے قاضی سعید احمد تھے۔ یہ صاحب بالکل دوسری قسم کے تھے۔ عربی فارسی اور علوم دینیہ کے استاد، خش خشی داڑھی، ثقہ، سنجیدہ...... اس کے ساتھ ساتھ وہ ایم۔ اے بھی تھے۔ ایک جدید وضع کی ترکی ٹوپی اور شیروانی پہننے والے انگریزی داں مولوی، قاضی صاحب ندوۃ المصنّفین (دہلی) کے ایک رکن تھے اور اس ادارے کے ماہانہ علمی اور دینی رسالے ''برہان'' کے ایڈیٹر تھے۔ (دار المصنّفین اعظم گڑھ کے رسالے ''معارف'' کے بعد اس زمانے میں اُردو میں اسلامیات کا یہ سب سے اچھا اور سنجیدہ رسالہ تھا۔ اس کی وضع قطع بھی معارف کی طرح تھی)۔ ترقی پسندوں کی طرف سے اس حملے کا بچاؤ کرنے کے لیے فیض احمد فیض اور میں چنے گئے تھے۔ جاڑوں کے دن تھے، اور جلسہ رات کو کوئی سات یا آٹھ بجے شروع ہوا۔ حاضرین کی تعداد کوئی ایک ہزار رہی ہوگی۔ فیض لاہور کے تھے اور میں لکھنؤ کا...... اور گو ہم دہلی میں اجنبی نہ تھے، پھر بھی اپنے مخالفوں کے مقابلے میں اس لحاظ سے کمزور تھے کہ دہلی نگری کے روڑے نہ تھے،

اور ہم نے دو دہلی والوں کے خلاف ان کے ہی شہر میں محاذ قائم کیا تھا۔

جلسہ کی کارروائی صدر سر رضا علی کی تقریر سے شروع ہوئی۔ اسے سن کر میں نے یہ محسوس کیا کہ مرحوم جدید اُردو ادب کے مطالعے میں حالی، اکبر اور اقبال سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ انھوں نے صدر کی حیثیت سے غیر جانبدار رہنے کے بجائے مزاحیہ انداز میں ترقی پسند ادب پر چوٹیں کیں۔ اس کے بعد خواجہ محمد شفیع صاحب نے تقریر کی۔ خواجہ صاحب کی تقریر نہیں تھی، ترقی پسندوں پر چوٹوں کا ایک سلسلہ تھا۔ انھوں نے آزاد شاعری کا مذاق اڑایا۔ ترقی پسندوں کی زبان کی غلطیاں بتائیں۔ ان کے تصورات کو مخربِ اخلاق اور پست اور غیر شاعرانہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ فحاشی کا الزام بھی ہم پر لگایا گیا۔ ہم ان اعتراضات کے سننے کے عادی ہو چکے تھے۔ گو دہلی کی ٹھیٹھ زبان اور اتنے پیارے لہجے میں ہم نے اس کے پہلے گالیاں نہیں سنی تھیں۔ خواجہ صاحب کی تقریر کا مجمع پر کافی اثر ہوا، اور میرا جی، راشد اور مخمور جالندھری کی چند نظموں کے ٹکڑے جب پڑھے گئے تو اس پر کافی قہقہے لگے۔

خواجہ صاحب کے بعد فیض بولے۔ وہ حضرت...... معلوم ہوتا تھا اپنے فوجی دفتر سے اُٹھ کر سیدھے جلسے میں آ گئے ہیں۔ انھیں کپڑے بدلنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا اور لفٹیننٹ کرنل کی وردی زیبِ تن تھی۔ ان کا یہ لباس ہی دہلی والوں کو ''غیر ادبی'' معلوم ہوا ہوگا۔ مجھے کسی قدر گھبراہٹ ہونے لگی۔ فیض سے میں نے کہا...... ''کپڑے تو بدل لیے ہوتے!'' انھوں نے آہستہ سے جواب دیا...... ''سب ٹھیک ہے۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔'' فیض تقریر شروع کرتے ہی مسئلہ کی تہہ پر چلے گئے اور خواجہ صاحب کے اعتراضات کا براہ راست جواب دینے کی انھوں نے زحمت نہیں کی۔ انھوں نے عالمانہ انداز میں بڑی متانت سے یہ ثابت کیا کہ ترقی پسند ادب میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ سماج میں تبدیلی اور ارتقا کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی تبدیلی اور ترقی ہوتی ہے۔ اسے روکنے کی کوشش کرنا فضول ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک ناگزیر ہے البتہ اس کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ فیض کی تقریر میں جوش، زور، طنزیا حملے کا انداز بالکل نہیں تھا۔ اس میں روانی، متانت اور درس دینے کی سی کیفیت تھی۔ مجمع نے توجہ اور خاموشی سے تقریر سنی۔ نہ قہقہے لگے اور نہ تالیاں بجیں۔

خواجہ شفیع صاحب کی تقریر تو میری توقع کے مطابق تھی۔ دلچسپ لیکن مغز سے خالی۔ قاضی سعید صاحب سے مجھے توقع تھی کہ ان کی تقریر ان کے رتبہ کے مطابق ٹھوس اور عالمانہ ہوگی، اور اس سے کچھ سیکھ سکیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے انھوں نے دینی اور مذہبی نقطہ نظر سے ترقی پسند تحریک پر اعتراضات کیے۔ الحاد، لادینی، بداخلاقی پھیلانا، ان کے نزدیک ترقی پسندوں کے یہی مقاصد تھے۔ پھر ایسے لوگ زبان وادب کو کیوں نہ خراب کریں گے؟ انھوں نے بھی میراجی، راشد اور مخمور جالندھری اور منٹو کے اقتباسات پیش کر کے اپنے دلائل کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یہ باتیں ایسی تھیں جن کے ہم بارہا جواب دے چکے تھے۔ پھر بھی ہمارے خلاف لوگوں کو مشتعل کرنے کے لیے ہمارے مخالف بار بار ان ہی حربوں کا استعمال کرتے تھے۔

قاضی صاحب کے بعد میری تقریر تھی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ میرے لیے ان اعتراضوں کا معقول جواب دینا ہی کافی نہیں ہے۔ آخر ہم اس بات کے دعوے دار ہیں کہ ہماری تحریک عوام کی تحریک ہے۔ یہ مجمع دہلی کے عوام کا ہے۔ ان میں طلبا، دکانوں کے کرمچاری، غریب دانشور، سیاسی شعور رکھنے والے محنت کش، سیاسی کارکن بھی ہیں۔ اگر ہم اس مجمع کی اکثریت کو ترقی پسند ادب کی تحریک کا پرجوش طرف دار نہیں بنا سکے تو پھر کون ہمارا ساتھ دے گا؟ ہماری کامیابی دراصل یہ ہوگی کہ اگر ہم اس مجمع کی اکثریت کو یہ محسوس کرا دیں کہ ترقی پسند ادب کی تحریک ان کی اپنی تحریک ہے، اس کا مقصد ان کے دکھ درد، ان کی بہترین آرزوؤں اور خواہشوں کا اظہار کرنا ہے اور ان لوگوں، طاقتوں اور اداروں سے لڑنا اور ان کی مخالفت کرنا ہے جو عوام کے دشمن ہیں، ان کو غلام بناتے ہیں، ان کو لوٹتے ہیں، ان کی پستی اور جہالت، امراض اور فلاکت کا شکار ہونے پر مجبور کرتے ہیں۔

میں نے کہا کہ ایک عالم دین کے لیے ترقی پسند تحریک کا ذکر کرتے وقت میراجی وغیرہ کو ترقی پسندوں کا نمائندہ بنا کر پیش کرنا کہاں کی دیانت داری ہے؟ یہ لوگ ہماری تحریک کے کھلے مخالفوں میں ہیں۔ پھر اعتراض کرنے والے ان کے ساتھ بھی انصاف نہیں کرتے۔ ان کا ایک مصرعہ، ایک شعر، ایک سب سے خراب نظم یا افسانہ لے کر ان کی ساری نگارشات کو معتوب کر دیتے ہیں۔ کیا میر، سودا، سعدی، اور حافظ وغیرہ کے ادب کا جائزہ لیتے وقت ہم ایسا کرتے ہیں؟ کیا ہم

میر کو فحش گو کہتے ہیں چونکہ انھوں نے ''پاس ہے رنڈی و لے ہے ضعفِ باہ'' قسم کے بھی شعر لکھے ہیں؟ ترقی پسندوں نے سنجیدہ ادیب ہونے کی حیثیت سے فحاشی کو کبھی نہیں سراہا، اور اگر ترقی پسند ادب کی مثال پیش کرنا ہے تو ہمیں پریم چند، جوش، فراق، کرشن چندر، فیض، مجاز، ندیم، جذبی، سردار جعفری وغیرہ کے یہاں سے ان کی بہترین چیزیں لے کر پیش کرنا چاہیے۔ رہ گیا بے دینی اور الحاد کا الزام......تو وہ تو متشرع ملاؤں کی طرف سے گزشتہ زمانوں میں بھی ہم سے زیادہ بڑے لوگوں پر بھی لگایا جا چکا ہے......اور اس کے جواب میں شیخ، مُلّا، صوفی، واعظ، محتسب کی فارسی اور اُردو کے جلیل القدر شاعروں اور ادیبوں نے جو خبر لی ہے، اور مذہب کے پردہ میں ریا کاروں اور رجعت پرستوں پر جو کاری ضربیں لگائی ہیں، ہم ان کے مقابلے ابھی بہت کم کر سکے ہیں۔ خواجہ حافظ سے بڑھ کر کون کہہ سکتا ہے......

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر مے کنند
چوں بہ خلوت مے روند آں کارِ دیگر مے کنند

یا

حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش ولے
دامِ تزویر مکن چون دیگراں قرآن را !!

رجعت پرستوں کو ہم سے اصل غصہ اس پر نہیں ہے کہ ہم لادِین ہیں، قماشی کرتے ہیں یا بداخلاق ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ہماری ایمانداری، ہمارا اخلاق اور ہماری حقیقت پسندی اپنی قوم کی بہترین روایات کے مطابق ہے، جس کے ہم خادم ہیں اور پروردہ ہیں۔ خود رجعت پرست خلوت میں ''کارِ دیگر'' کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اصل غصہ انھیں اس پر ہے کہ ہم عوام کے دشمنوں کے دشمن ہیں اور ان کے چہروں سے جھوٹے اخلاق اور جھوٹی روحانیت کی نقاب کو اتار دیتے ہیں، ایک بہتر زندگی کی تخلیق میں محنت کش عوام کی مدد کرتے ہیں۔ چونکہ اس بات کی مخالفت عوام کے سامنے نہیں کی جا سکتی، اس لیے ہم پر جھوٹے اور بے بنیاد الزام لگائے جاتے ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ میری تقریر کے بعض حصوں کی سخت کلامی اور صاف گوئی سے ہمارے محترم صدر سر رضا علی صاحب کس قدر بے چین ہو رہے ہیں۔ اس کے برخلاف مجمع میں

بیٹھے ہوئے ہمارے دوستوں کی آنکھیں چمکنے لگیں ہیں۔ جب میں نے تقریر ختم کی تو صدر سے درخواست کی کہ زیرِ بحث تجویز پر حاضرین کے ووٹ لے لیے جائیں۔لوگوں نے تالی بجا کر اس کی تائید کی۔لیکن صدر نے اب جلدی سے چند کلمے کہہ کر اور تاخیر کا عذر پیش کر کے جلسہ برخاست کر دیا۔

جلسے کے بعد خواجہ شفیع صاحب اور قاضی سعید سے میرا باقاعدہ تعارف ہوا۔ میں ان حضرات کے نام سے تو پہلے سے واقف تھا،لیکن ان سے ملنے کا اس سے پہلے موقع نہیں ملا تھا۔ دونوں صاحبوں نے معذرت کی کہ بہت سی باتیں انھوں نے محض مناظرے کی خاطر کہی تھیں اور میں ان کا خیال نہ کروں۔ معلوم نہیں انھوں نے میری دلجوئی رسمی طور پر کی یا دراصل وہ ایسا محسوس کرتے تھے۔خواجہ صاحب نے اس کے بعد مجھے باصرار اپنے دولت خانے پر بھی مدعو کیا اور ایسے مزے مزے کی چیزیں کھلائیں جو صرف دہلی والے ہی کھلا سکتے ہیں۔ان کا اندازِ گفتگو البتہ ان کے کھانوں سے بھی مزے دار تھا۔ جب میں رُخصت ہونے لگا تو اپنی تصانیف کا ایک پورا سیٹ انھوں نے مجھے تحفہ دیا۔ میں ان کی ضیافت اور عنایت کے بوجھ سے جیسے دب گیا اور واپسی پر سوچتا رہا......

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

قاضی سعید صاحب سے بعد میں میری ملاقات ندوۃ المصنّفین میں ہوئی۔ یہ علمی ادارہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور ان کے چند رفیقوں نے دہلی میں قائم کیا تھا۔قرول باغ میں اس کا کتب خانہ اور دفتر تھا۔علوم اسلامی پر تصنیف و تالیف اس کا مقصد تھا اور دسمبر 1947 کے ہنگاموں سے پہلے اس کا دفتر بھی خاکستر ہو گیا۔اس نے بہت سی اچھی کتابیں اُردو میں شائع کی تھیں۔اس کے اراکین دیوبندی مکتبِ خیال کے حضرات تھے۔جنھوں نے اسلام کی دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ حب الوطنی اور سامراج دشمنی کو اپنا شعار بنایا تھا۔مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو میں 1936 سے جانتا تھا جب کہ وہ اور میں، دونوں ایک ساتھ سیاسی کام کرتے تھے۔مولانا بہت سلجھے ہوئے دماغ کے مستودہ صفات اور عالم فاصل انسان ہیں۔ (1962 کو مولانا حفظ الرحمٰن کا انتقال ہوا۔)اس کے باوجود کہ میں جس سیاست پر کاربند تھا،اس سے ان کو بہت سی باتوں میں اختلاف

تھا، ان کی شفقت و عنایت مجھ پر ہمیشہ رہتی تھی۔ میں انھیں سامراج دشمنی، وطنی آزادی کی مشترکہ جدوجہد میں اپنا بزرگ اور قابل احترام رفیق تصور کرتا تھا۔ میں جب بھی دہلی جاتا تو ان کی زیارت اپنا فرض سمجھتا تھا۔ بہرحال جب میں ندوۃ المصنّفین میں قاضی سعید صاحب سے مولانا حفظ الرحمٰن کے ساتھ ملا، تو انھیں چند دنوں پہلے کے ترقی پسندوں کے مخالف مقرر سے بالکل مختلف پایا۔ انھیں ہماری تحریک سے کوئی اصولی اختلاف نہ تھا۔

میں نے ان سے کہا کہ اگر ان کا یہ خیال ہے کہ ہماری تحریک کا ایک مقصد مذہب کی مخالفت کرنا بھی ہے تو یہ صحیح نہیں ہے کہ تحریک میں مختلف مذاہب اور فلسفۂ خیال کے لوگ (جن میں مارکسی خیالات والے بھی ہیں)، جو چند مشترک مقاصد کے لیے متحد ہوتے ہیں، جن کا ذکر ہمارے اعلان نامے میں ہے...... نہ صرف یہ کہ مذہب کی مخالفت کرنا، ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کے مقاصد میں نہیں ہے۔ ترقی پسند مصنّفین مذہبی عقائد اور دینی راہ نماؤں کا احترام کرتے ہیں، اور ہر شخص کی آزادیٔ رائے اور ضمیر اور اپنے مسلک و مذہب پر قائم رہنے اور اسے برتنے کے حق کو مانتے ہی نہیں بلکہ ان حقوق پر کسی جانب سے بھی حملہ ہو تو اسے ایک بنیادی انسانی حق پر حملہ تصور کر کے اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ایسے ناروا حملے کی سختی سے مخالفت کریں۔ ترقی پسند مصنّفین لوگوں کے دینی عقائد پر حملے نہیں کرتے۔ البتہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں ہی سے ایک کٹّر اور تنگ خیال گروہ اپنے علاوہ تمام دوسرے عقائد کے ساتھ رواداری کا اصول برتنے کو تیار نہیں ہوتا، دوسروں کی آزادیِ ضمیر کو سلب کرنے کی برابر کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس کٹّر گروہ کو سماج کی رجعت پرست طاقتوں کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارا اصول عقائد کے معاملہ میں رواداری، ہر انسان کی آزادیٔ ضمیر اور مختلف مذاہب اور مسلکوں کے پیروؤں کے مابین صلح و آشتی قائم کرنا ہے۔ البتہ مذہب کی آڑ لے کر خلق خدا کا استحصال اور عقل و سائنس کی مخالفت ترقی پسندی کے اصولوں کے خلاف ہے، اور ہم یقیناً ان رجحانات کے مخالف ہیں۔

اس کے بعد ہم برہان میں اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کی تہذیب کے مختلف مسائل پر اچھے مضامین لکھوانے اور شائع کرنے کی ضرورت پر گفتگو کرتے رہے۔

اُردو کے ان مستند ادیبوں نے جنھوں نے ہماری تحریک کے آغاز سے ہی ترقی پسند

خیالات کو سراہا تھا اور انجمن میں شامل ہو کر اس کی مدد کی تھی، مثلاً جوش ملیح آبادی، قاضی عبدالغفار، مجنوں گورکھپوری، اور لطیف احمد صاحب۔ آگرہ اُردو ادب کا ایک قدیم مرکز تھا اور مولانا سیماب اکبر آبادی، مخمور اکبر آبادی وغیرہ شاعروں کا کافی بڑا گروہ لکھنؤ اور دہلی کی طرح وہاں پر شعر و ادب کی محفل گرم کیے رہتا تھا...... ایک ایسی محفل جس میں پرانے شاندار کھلنڈروں کی سی کیفیت تھی۔ لطیف احمد نے اس ادبی فضا میں پرورش پانے کے باوجود اس سے علاحدہ روش اختیار کی اور اُردو کے رومانوی مکتب خیال (جسے ادب لطیف کا نام دیا گیا) کے ایک ممتاز فرد بنے۔ رومانویت ترقی پسندی کی ضد نہیں، بلکہ ترقی پسندی کے ساتھ مل کر اس کی تاثیر، جاذبیت اور صحت مندی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ لطیف احمد اکبر آباد میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے ایک ستون بن گئے۔ 1932 کے بعد ہندی کے مشہور ترقی پسند ادیب ڈاکٹر رام بلاس شرما بھی آگرہ کے ایک کالج میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہو گئے تھے۔ اب وہاں اُردو اور ہندی کے ادیبوں نے انجمن کی ایک مضبوط اور باعمل شاخ قائم کی۔ وہاں پیپلز تھیئٹر کا بھی ایک بہت اچھا حلقہ تھا۔ میں 1946 میں جب آگرہ گیا تو انجمن اور پیپلز تھیئٹر والوں نے مل کر کئی کلچرل پروگرام کیے، جن میں عوامی گانے، ناٹک، نقلیں، نظم خوانی وغیرہ شامل تھے۔ ان پروگراموں کو سیکڑوں آدمی گھنٹوں تک دیکھتے اور محظوظ ہوتے۔

1944 میں (غالباً) عبداللہ ملک بمبئی میں تقریباً ایک سال رہنے کے بعد لاہور واپس چلے گئے تھے۔ پنجاب کے بہت سے چوٹی کے ادیب دوسرے صوبوں میں ترقی پسند ادب کی مشعل روشن کیے ہوئے تھے۔ اس لیے وہاں پر ہماری تنظیم کی حالت 1942 کے بعد بھی سقیم تھی۔ صوفی تبسم صاحب نے (غالباً سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے) کافی عرصے سے انجمن سے کنارہ کشی کر لی تھی۔ وہاں پر ایک ایسے محنتی آدمی کی ضرورت تھی جو کم از کم انجمن کے باقاعدہ جلسے کرے، ان کے لیے اچھے پروگرام بنائے اور اس طرح لاہور میں تحریک کو ایک منظّم شکل دے۔ لاہور اُردو کے ترقی پسند ادب کا سب سے بڑا اشاعتی مرکز بھی تھا۔ وہاں کی تنظیم کے مضبوط ہونے سے وہاں کے ادبی رسالوں اور اشاعتی اداروں پر بھی اچھا اثر پڑتا، جس کا فائدہ پوری تحریک کو ہوتا۔

عبداللہ ملک لاہور میں انجمن کے آرگنائزر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد حالات کسی قدر سدھرے اور گو باقاعدگی اب بھی پیدا نہیں ہوئی، لیکن وقتاً فوقتاً انجمن کی طرف سے جلسے ہونے لگے۔

انھیں دنوں جب میں لاہور میں تھا، وائی۔ایم۔سی۔اے کے ایک چھوٹے سے کمرے (بورڈ روم) میں انجمن کا ایک جلسہ مجھے یاد ہے۔ایک بڑی میز کے اردگرد پچاس ساٹھ آدمیوں کا مجمع تھا۔جگہ کم تھی،لوگ زیادہ تھے اور سگریٹ کے دھوئیں سے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔پروگرام بھی کافی لمبا چوڑا تھا۔ایک افسانہ پڑھا گیا جس کے مصنف کا نام مجھے اب یاد نہیں۔پھر عبدالمجید بھٹی کی نظم تھی۔اس کے بعد لوئی آراگوں پر میں نے مقالہ پڑھا اور اخیر میں حلقہ اربابِ ذوق کے شاعر یوسف ظفر نے اپنی ایک نظم سنائی۔

بھٹی صاحب نے اس جلسہ میں اپنی نظم ''برہن'' سنائی جس میں محض ایک لفظ ''چھن'' کی تکرار اور کئی سطروں میں (کسی میں ایک، کسی میں دو اور کسی میں اس سے زیادہ) اسے ہی دہرا کر معنے آفرینی کی کوشش کی گئی ہے۔''کم فہم'' اور ''کند ذہن'' حاضرین کی اکثریت (جن میں اس وقت میں بھی شامل تھا) اس نظم کو سن کر خاموش رہی۔لیکن لاہور کے نچلے نہ بیٹھنے والے نوجوان بھلا چپ رہنے والے کہاں تھے، اور وہ چاروں طرف سے بھیڑوں کی طرح بھٹی صاحب سے چمٹ گئے اور طعنوں اور سوالات کی بھرمار کر دی۔آخر کو بھٹی صاحب نظم کے معنی سمجھانے پر مجبور ہوئے۔ پہلی ''چھن''انھوں نے شاید سمجھایا، گھر کی کنڈی کی آواز ہے۔پھر برہن کے دروازے تک جانے کی۔بعد کے چھن چھن، اس کے آہستہ آہستہ مایوس ہو کر واپس آنے کی۔اس لیے کہ پہلی آواز اس کے بالم کے دروازہ کھٹکھٹانے کی نہ تھی۔معنی فی بطن الشاعر اور شعر میں دور کی کوڑی لانے کی استادوں نے شعر کا سقم بنایا تھا۔بھٹی صاحب کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے کوڑی کو اتنا دور پھینکا کہ وہ گم سی ہو گئی۔بھٹی صاحب کے مطلب سمجھانے کے بعد بھی معترضین کو اطمینان نہیں ہوا اور اب مجھ سے سوال کیا گیا کہ کیا میں اس نظم کو ترقی پسند سمجھتا ہوں؟ میں نے جواب دیا کہ......''پہلے آپ یہ فیصلہ کیجیے کہ کیا یہ نظم ہے بھی یا نہیں؟ اس کے ترقی پسند ہونے یا نہ ہونے کا سوال تو اس کے بعد پیدا ہوگا۔''

پنجاب کے باہر کے لوگ، خاص طور پر اتر پردیش کے اُردو داں عام طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ پنجاب میں اُردو کا ہی دَور دورہ ہے اور وہاں پر ادبی تخلیق صرف اُردو میں ہی ہو رہی ہے۔اس کے بیشتر اُردو کے ادیب اور خاص طور پر مسلمان ادیب اس تصور کو پھیلانے کی کوشش کرتے رہتے

ہیں،فرقہ واریت اوراُردوادب کے سیاسی نزاع سے پنجاب میں مختلف خیالات ہوگئے ہیں اور یہ خیال پیدا کر دیا ہے کہ اُردو کی حمایت کے معنی مسلمانوں کے مذہب کی تہذیب کی حمایت کے ہیں۔اس کے برخلاف سِکھ فرقہ پرستوں نے پنجابی زبان کی حمایت کچھ اس طرح سے کی کہ اُردو کی مخالفت، اس حمایت کا ایک لازمی جز تھی۔فرقہ پرستوں کی اس کشمکش سے جہاں اور بہت سے نقصان ہوئے وہاں اُردواور پنجابی ادب کو بھی بہت نقصان پہنچا لیکن اس مناقشہ کے باوجود پنجاب میں پنجابی زبان ایک زندہ قوم کی زندہ زبان کی حیثیت سے موجود ہے اوراس کے پاس پرانے اور عوامی ادب کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔وارث شاہ کی ہیر کی ادبی اوراخلاقی عظمت کے سامنے پنجاب کے مسلمان، سکھ اور ہندوسب تعظیم سے اپنا سر جھکاتے ہیں اوراب بھی پنجابی ادب کی تخلیق جاری ہے۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب پنجاب میں فی الحقیقت عوام کا اقتدار ہوگا تو پنجابی زبان کا اور بھی فروغ ہوگا۔لیکن پنجاب میں اُردو کی تخلیق کی جڑیں بھی بہت گہری ہیں اور یہ بھی غلط ہے کہ اُردو پنجاب کے لیے ایک غیر یا بیرونی زبان ہے۔ اُردواور پنجابی کی بنیادی نحوی ساخت اوراس کے قواعد میں باہمی مناسبت اورقریبی تعلق ہے،ان کے الفاظ کا ذخیرہ بہت حد تک مشترک ہے اور پنجاب میں اُردو کی روایت صدیوں سے وہاں کی تہذیبی زندگی کا ایک جز بن چکی ہے۔اس لیے پنجاب میں پنجابی کے فروغ کے معنی اُردو کے خاتمے کے ہرگز نہیں ہیں بلکہ جب وہاں تعلیم آبادی کے دس فیصد حصے میں محدود ہونے کے بجائے سو فیصدی ہوگی، چاہے وہ پنجابی میں ہی کیوں نہ ہو، تو ماضی اورموجودہ زمانے کے مقابلے میں پنجاب میں اُردو لکھنے اور پڑھنے والے آج کے مقابلہ میں لاکھوں کی تعداد میں زیادہ ہوں گے۔

اس زمانہ میں، مَیں پنجابی بہت کم سمجھتا تھا۔لیکن انجمن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے مجھے اپنی زبان کے علاوہ تمام دوسری زبانوں کے ترقی پسند ادیبوں سے ملنا اور ان کی نگارشات اورادبی سرگرمیوں کی واقفیت ضروری تھی۔ چنانچہ ایک بار لاہور میں پنجابی لکھنے والے ادیبوں نے مجھے اپنے ایک جلسہ میں مدعو کیا۔ساتھ ساتھ چائے کی دعوت بھی دی۔اسٹفلسن ریسٹوران میں کوئی پندرہ بیس جمع رہے ہوں گے۔وہاں کرتار سنگھ دگل سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی۔انھوں نے جلسہ میں اپنا ایک مختصر افسانہ پنجابی میں پڑھ کر سنایا۔پروفیسر موہن سنگھ سے بھی

میں وہاں پر ملا۔ پنجابی کی کئی نظمیں پڑھی گئیں۔ میری خاطر اس کے ترجمے بھی کر دیے جاتے تھے۔ پنجابی زبان کے ادب اور اس کی ترقی کے مسائل پر آپس میں گفتگو ہوئی۔ امتیاز علی صاحب تاج سے بھی میں پہلی بار اس جلسہ میں ملا۔ بعد میں مجھے پنجابی کے مشہور شاعر استاد دامن کی نظمیں سننے کا بھی موقع ملا۔ پنجاب کے دیہات اور قصبات میں پنجابی شاعری بڑی آن بان سے زندہ ہے اور وہاں کی کسان تحریک سے پنجابی کے بہت سے شاعر وابستہ ہیں۔

لاہور میں تقسیمِ پنجاب سے پہلے کے دو ادبی جلسوں کی اور بھی مجھے یاد آ رہی ہے۔ غالباً 1946 یا 1947 کے شروع کا زمانہ تھا اور اب پنجاب میں ہماری تحریک تنظیم و وسعت، ادبی تخلیق اور ترقی پسند رسالوں اور کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لحاظ سے دن بہ دن ترقی پذیر تھی۔ اب وہاں پیپلز تھیئٹر کی تحریک بھی چل پڑی تھی اور اس کا بہت اچھا گروپ تیار ہو گیا تھا۔

پہلے جلسے کی روداد مجھے یاد نہیں سوا اس کے کہ میں نے اس میں ترقی پسند ادب کے مسائل پر ایک تقریر کی تھی۔ اس تقریر میں کیا کہا تھا، یہ بھی یاد نہیں۔ لیکن اس جلسہ کا ماحول اور اس کی فضا ذہن پر نقش ہے۔ ایک لاہوری، بنگالی آرٹسٹ (سانیال) کے اسٹوڈیو میں یہ جلسہ ہوا تھا۔ یہ اسٹوڈیو مال روڈ کے ایک بالائی کمرے میں تھا۔ ایک وسیع کمرہ جس میں دیواروں پر چھوٹی بڑی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ بعض مکمل اور بعض نامکمل، اِدھر اُدھر پتھر اور سفید مٹی کے مجسمے رکھے تھے، کسی کا سر غائب اور خالی دھڑ، اور کسی کا صرف بڑا سا سر، بیٹھنے کے لیے عجیب وغریب اسٹول اور کرسیاں تھیں۔ شام ہو چکی تھی اور اسٹوڈیو میں جگہ جگہ پر چھپے ہوئے لیمپوں سے ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ اس حسین دھندلکے میں چالیس پچاس ادیب اور ادب کا ذوق رکھنے والے بیٹھے تھے۔ زیادہ تر فرش پر اور چندان کرسیوں پر جو وہاں موجود تھیں۔ بعض ان میں سنجیدہ تھے اور بعض ایسے جو صرف فنون لطیفہ کے شوقین ہی کہے جا سکتے ہیں۔ پنجاب کی عوامی زندگی سے یہ فضا کسی طرح میل نہیں کھاتی تھی۔ گو اس میں اپنا ایک حسن تھا۔ مجھے امرتسر کے جلیان والا باغ والی ترقی پسندوں کے شروع دور کی وہ کانفرنس یاد آ گئی جو پنجابی کسانوں کے ہجوم میں چبوترے پر ہوئی تھی۔ یہ ہماری تحریک کے دو رُخ تھے۔ موجودہ سماج میں درمیانی طبقے کے دانشوروں اور فنکاروں کی ایک اپنی الگ دنیا تھی۔ اس میں بھی علم، فن اور ادب کی پرورش ہوتی ہے۔ لیکن اس میں جان اس وقت پڑتی

ہے اگر وہ باہری دنیا سے منسلک رہے۔ رجعت پرست محنت کش عوام اور دانشوروں اور فنکاروں کے اس تعلق کو توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ترقی پسند سمجھتے ہیں کہ ان کا باہمی ربط فن و ادب کے تنومند ارتقا کے لیے ضروری ہے۔

دوسری میٹنگ مال روڈ ہی کے ایک دوسرے حصے میں کافی ہاؤس کے قریب ایک دکان کے زیریں حصے (بیس مینٹ) کے ایک بڑے سارے نئے بنے ہوئے کمرے میں ہوئی تھی۔ دُکان کا یہ حصہ ترقی پسندوں کے کسی ہمدرد نے اپنے کاروباری دفتر کے لیے لیا تھا۔ ان کی ایک دو میزیں اور ٹائپ رائٹر اس دُکان کے ایک کونے میں لگے تھے۔ باقی حصہ خالی تھا جس پر ترقی پسند ادیبوں نے میٹنگ کے لیے قبضہ کیا۔ یہ میٹنگ صبح کے وقت قریب دس بجے ہوئی تھی اور حاضرین کی تعداد کوئی پندرہ بیس تھی۔ اس میں انجمن کے انتظامی امور کے متعلق باہمی مشورہ ہوا تھا۔ عبدالسلام خورشید، بلونت گارگی اور ہنس راج رہبر سے پہلی بار میں یہاں ہی ملا تھا۔ خورشید صاحب زیادہ تر وقت پنجاب کے لوک ناچوں اور لوک گیتوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ بلونت گارگی پنجابی میں ڈرامے لکھنے شروع کر چکے تھے۔ غالبًا لاہور ریڈیو سے ان کی لکھی ہوئی چیزیں نشر ہوتی تھیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اب پنجابی زبان میں ناول لکھنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ وہ بار بار ملک راج آنند کا حوالہ دیتے تھے جن سے وہ کافی متاثر تھے۔ ان میں ایک عجیب بے چینی کی سی کیفیت تھی اور وہ بہت حساس اور نرم دل قسم کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ جیسے آرٹ اور فن میں کسی نازک اور موہوم حسن کی تتلی کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہوں، لیکن بار بار وہ ان کی گرفت سے نکل جاتی ہو، اور وہ ایک بچے کی طرح گھڑی میں خوش اور گھڑی میں اداس ہو جاتے ہوں۔ ان سے مل کر دل بے اختیار چاہا کہ کاش میں ان کی لکھی ہوئی کوئی چیز پڑھ سکتا۔ میں نے اُس وقت تک اُردو میں ان کا کوئی ڈرامہ یا افسانہ نہیں پڑھا تھا۔

رہبر سے پہلی بار ملنے کے بعد بالکل دوسری قسم کا تاثر ہوتا تھا۔ گارگی اچھا سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ان کے پتلون کی کریز، لاہور کی مال روڈ پر گل گشت کرنے والے خوش پوشاک، خوشحال نوجوان کی طرح سیدھی اور ''اپ ٹو ڈیٹ'' تھی۔ رہبر معلوم ہوتا تھا کہ رات بھر کسی دفتر میں گھِس گھِس کرنے کے بعد صبح کو ایک چائے کی پیالی ہی پی کر جیسے آ گئے ہوں۔ ان کی اندر دھنسی

ہوئی آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ ان کے دبلے چہرے پر ان کے پتلے پتلے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور وہ مغموم اور فکر مندی کی حد تک سنجیدہ معلوم ہوتے تھے۔ اس وقت تک میں نے ان کی لکھی ہوئی کوئی بھی چیز نہیں پڑھی تھی۔ ان سے معلوم ہوا کہ وہ اُردو اور ہندی دونوں میں لکھتے ہیں اور یہ کہ لاہور میں چند ہندی لکھنے والے ترقی پسند ادیب بھی ہیں۔ یوں تو ہماری تحریک میں ہر طرح کے لوگ ہیں، بہت مخلص اور کم خلوص والے، محنتی اور کاہل، اپنے فن پر کاوش کرنے والے اور وہ جو تفریحاً ترقی پسند بن گئے ہیں، اور تھوڑی مدت تک ترقی پسندی کی گویا سیر کر کے اپنی خودی کی تعمیر میں لگ جاتے ہیں، اور پھر باقی عمر اس کا رونا روتے رہتے ہیں کہ ترقی پسند ادیبوں نے یا ان کے کسی خاص گروہ نے ان کی قدر نہیں کی اور ان کے جوہر کو نہیں پہچانا۔ رہبر سے ملنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تحریک کی قوت اصل میں کس قسم کی شخصیتوں کی اخلاقی اور روحانی صلاحیت پر قائم ہے۔ یہ وہی ہیں جو ہر طرح کی مالی اور سیاسی مشکلیں جھیل کر بھی اپنے بلند انسانی اصولوں کو نہیں چھوڑتے، جو تحریک اور تنظیم کی خاطر ہر قسم کے کام کرنا (جلسوں میں فرش بچھانے اور اشتہار چھپوانے اور انھیں بانٹنے اور دیواروں پر چپکانے سے لے کر ٹکٹ بیچنے، چندہ جمع کرنے کے جان لیوا کاموں تک) اپنی شان سے گرا ہوا نہیں سمجھتے۔ اور جو برابر تحصیل علم، تجربہ اور مشق و مہارت کے ذریعے اپنے فن کی سطح کو بلند کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ رہبر سے پہلی ہی بار ملنے پر میں نے محسوس کیا کہ میں شاید ایسے ہی ایک رفیق سے مل رہا ہوں۔ لیکن ایسا بارہا ہوا ہے کہ ایک شخص سے پہلی بار مل کر اس کے بارے میں جو رائے قائم کرتا ہوں وہ غلط ثابت ہوئی ہے اور بعد کو مجھے اپنی رائے بدلنی پڑتی ہے۔ مجھے اس کی خوشی ہے کہ رہبر کے افسانوں کی ماہیئت میں گزشتہ چند سالوں میں تدریجی ترقی ہوئی ہے اور ان کے مقالوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کلچر کے مختلف مسائل پر کافی محنت اور سوچ بچار کے بعد قلم اٹھاتے ہیں۔

اسی زمانہ میں فکر تونسوی سے بھی لاہور میں میری ملاقات ہوئی۔ وہ ان دنوں ''ادب لطیف'' کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے ادب لطیف کے سالنامے میں اشاعت کے لیے لوئی آراگون پر میرا مقالہ مجھ سے لے لیا۔ یہ تو خیر معمولی بات تھی لیکن حیرت انگیز کام انھوں نے یہ کیا کہ وہ دوسرے ہی دن پچیس یا تیس روپیہ اس کا معاوضہ مجھے لا کر دے گئے۔ ایسے خوشگوار موقعے جب

تحریر سے ٹھوس مادی فائدہ ہو، میری یا ترقی پسند مصنّفین کی زندگی میں بہت کم آتے ہیں۔اس لیے فکر کے لیے میرے دل سے دُعا نکلی۔فکر کی چند نظمیں میں نے مختلف رسالوں میں پڑھی تھیں۔وہ مجھے پسند نہیں آئی تھیں۔ ہمارے کئی ترقی پسندوں پر بھی خاص طور پر پنجاب میں ان دنوں ''نراجیت'' (جو بذاتِ خود انگلستان کے جدید رجعت پرست ادیبوں کا چربہ تھی) اور حلقہ ارباب ذوق کی ادبی مجہولیت اور غرابت بری طرح سوار تھی، شاید یہ بات تھی کہ میں اس قسم کی شاعری سے مانوس نہیں تھا، اور اسے ناپسند کرنے میں خود میری تربیت اور فہم کا قصور تھا۔ یہ دور اب ختم ہو گیا ہے۔فکر اور اس سے بھی زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ مخمور جالندھری اس دور سے نکل گئے ہیں اور اب ان کی نظم ونثر حقیقت نگاری اور تاثر کے لحاظ سے ایک اچھا مقام رکھتی ہے۔فکر نے ابراہیم جلیس کی طرح طنز نگاری میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔

ترقی پسند ادیبوں کے حلقے امرتسر اور راولپنڈی میں بھی قائم ہو گئے تھے۔ بدقسمتی سے تحریک کے ابتدائی دور کے بعد مجھے امرتسر جانے کا موقع نہیں ملا۔البتہ لاہور میں ظہیر کاشمیری سے ملاقات ہوئی۔ظہیر ان لوگوں میں ہیں جن کا نام زبان پر آتے ہی ان کی صورت اور شکل نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔کیوں کہ ان کے سرخ وسفید لمبوترے چہرے پر طوطا پری ناک، فرنچ کٹ سرخ داڑھی اور سر پر سرخ گھونگریالے بالوں کے لمبے پٹے ہند یا پاکستان میں کسی دوسرے کے پاس نہیں ہیں۔ظہیر نے ایک بار مجھے اکیلے چائے پینے کے لیے میکلوڈ روڈ کے ایک ریسٹوران میں مدعو کیا اور مسلسل دو ڈھائی گھنٹے تک ادب وشعر اور مارکسی فلسفے پر گفتگو نہیں، بلکہ تقریر کرتے رہے۔ میں ان کی تقریر سے زیادہ ان کے شعر سننے کا خواہشمند تھا۔اس لیے کہ ان کی شاعری میں ایک تیکھا پن، ایک خوشگوار سختی اور تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت ہوتی ہے، اور ترقی پسند فکر ان کے یہاں (جب وہ اچھے شعر لکھتے ہیں) نئے انداز میں نمودار ہوتی ہے۔لیکن افسوس کہ انھوں نے مجھے ریسٹوران میں اس سعادت سے محروم رکھا اور اپنی ساری توجہ میری تہذیبِ دماغ پر ہی مبذول رکھی۔ جب ہم کافی دیر کو چراغ جلے ریسٹوران سے باہر نکلے تو چند قدم چلنے کے بعد وہ یکا یک فٹ پاتھ پر رک گئے اور کہنے لگے کہ جانے سے پہلے کچھ شعر سنتے جایئے۔ یہ سڑک اور فٹ پاتھ لاہور کے ایسے حصے میں ہیں جہاں ہر وقت بھیڑ رہتی ہے، اور شام کو تو سنیماؤں کی قربت کی وجہ سے

وہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ ظہیر کاشمیری کو اس کی کوئی پروا نہیں معلوم ہوتی تھی۔ قبل اس کے کہ وہ شعر سننے کے لیے میری رضامندی کا انتظار کریں، انھوں نے نظم شروع کر دی اور دس پندرہ منٹ تک سناتے رہے۔ ظہیر کاشمیری بہ حیثیت شاعر، نقاد، یا انقلابی کے اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور ایک ترقی پسند ہونے کے باوجود اور اس کے باوجود کہ وہ عوامی جدوجہد کے سلسلے میں کئی بار جیل کی سختیاں بھگت چکے ہیں، وہ صرف رجعت پرستوں کے خلاف محاذ قائم کیے ہوئے ہیں۔ بلکہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے بیشتر اراکین بھی ان کے تیرونشتر کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ ظہیر کاشمیری بے مثال ہیں۔

راولپنڈی میں ترقی پسندی کا حلقہ وہاں کے مختلف سرکاری دفاتر میں ملازم نوجوان کلرکوں، کالج کے چند لکچراروں اور طلبا پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں میں سے اکثر سے میں ملا اور ان کے شعر و افسانے اور مقالے سنے۔ ان کی خصوصیت ان کی عالمانہ سنجیدگی تھی۔ چونکہ کالجوں کے چند ذہین پروفیسر اس حلقہ کے کرتا دھرتا تھے جو جدید انگریزی تنقید سے بخوبی واقف تھے اور جنھیں پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ اس لیے ان کے مباحث میں تنقید اور ادب کے فلسفیانہ مسائل کی بہتات رہتی تھی۔ یہ ایک خوبی تھی۔ لیکن مجھے یہ محسوس ہوا جیسے یہ لوگ عام زندگی سے کسی قدر کٹے ہوئے ہیں۔ البتہ کلرکوں کے گروہ میں سے مجھے ایک نوجوان شاعر ملا (غالبًا اس کا تخلص پرویز تھا)، جس میں عوامی رنگ کی انقلابی تڑپ تھی اور اس کی شاعری کا آغاز یہی تھا اور اس کے کلام میں ناپختگی تھی۔ بعد کو اس سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اُردو کی ادبی دنیا میں راولپنڈی کی سب سے مشہور ہستی پنڈت تلوک چند محروم کی تھی۔ پنڈی کی انجمن یا گارڈن کالج کی اُردو سوسائٹی کی جانب سے ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں ترقی پسند ادب کی تحریک پر مجھے تقریر کرنی تھی۔ مجھے بے حد مسرت ہوئی جب میں نے جلسہ میں پہنچنے کے بعد دیکھا کہ حضرت محروم اس کے صدر ہیں۔ وہ غالبًا گارڈن کالج میں اُردو، فارسی کے پروفیسر تھے اور ان کی عمر ساٹھ کے قریب رہی ہوگی۔ ایسے زبان دان اور قدیم مکتبِ خیال کے قابل احترام استاد کے سامنے زبان کھولتے ہوئے مجھے کافی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ میں بڑی احتیاط سے بولا۔ میری تقریر کے خاتمہ پر پنڈت جی نے فرمایا کہ میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے بارے میں دوسرے خیالات رکھتا تھا۔ لیکن اگر اس کے

مقاصد وہی ہیں جو اس جلسے میں بیان کیے گئے تو اس سے بھلا کس کو اختلاف ہوسکتا ہے؟ میں نے ان کے اس جملہ کو تحریک کے اور اپنے لیے باعث برکت سمجھا۔

1946 کے جاڑوں میں، میں دو تین دنوں کے لیے پشاور گیا۔ گو میری خواہش تھی کہ سرحد کے پشتو اور اُردو کے ادیبوں سے ملوں، لیکن بدقسمتی سے یہ پوری نہیں ہوئی۔ کاکا صنوبر حسین پشتو کے ترقی پسند ادیب اس وقت تک قبائلی علاقہ سے صوبہ سرحد کو واپس نہیں آئے تھے۔ فارغ بخاری اور ان کے ادیب رفقا کے نام سے ہم اس وقت تک واقف نہیں ہوئے تھے۔ البتہ پشاور کے ریڈیو اسٹیشن میں کام کرنے والے نوجوانوں میں سے چند صاحبان مجھ سے ملے۔ یہ حضرات پنجابی تھے اور ترقی پسند ادب کا ایک حلقہ ریڈیو اسٹیشن میں بنائے ہوئے تھے۔ چند سال بعد جب میں نے ان کے بارے میں مشترک دوستوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اب وہ ترقی پسندی سے ''تائب'' ہو چکے ہیں۔

اگست 1947 کی تقسیم نے پنجاب کی وہ اگلی محفلیں برہم کر دیں۔ سامراجی شیطنت اور فرقہ پرستی کے بھوت نے پنجاب اور دہلی کی سرزمین کو لہولہان کر کے تہذیب و ادب کے چراغ بجھا دیے۔ لیکن موت زیادہ دیر تک زندگی پر غالب نہیں رہ سکتی۔ ابھی جلے ہوئے مکانوں اور جھونپڑیوں کی آگ پوری طرح بجھی بھی نہیں تھی اور ملبہ اچھی طرح صاف بھی نہیں ہوا تھا کہ منتشر دماغ اور پریشان روحیں جمعیت خاطر کے سامان دوبارہ فراہم کرنے لگیں۔ پرانے اور نئے ادیبوں نے مل کر ترقی پسند تحریک کی نئی بنیادیں سرحدوں کے دونوں طرف مرتب کرنا شروع کر دیں۔ تہذیب کے ٹمٹماتے ہوئے دیے دوبارہ جلائے گئے۔

○○○

حیدر آباد اور احمد آباد کی کانفرنسیں

ملک کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اُردو میں ترقی پسند ادب کی منظّم تحریک نے زیادہ وسعت اختیار کی تھی۔ وہ صرف ایک یا دو صوبوں میں محدود نہ تھی۔ جہاں بھی اُردو زبان کے ادبی مرکز تھے، خواہ وہ صوبہ متحدہ (اتر پردیش)، دہلی، پنجاب، یا بہار ہو، کلکتہ یا بمبئی ہو، احمد آباد یا سورت، بھوپال، وسطی ہند یا حیدر آباد ہو، ان میں اور ان علاقوں کے چھوٹے شہروں میں بھی ترقی پسند ادیب پیدا ہو گئے تھے اور اگر انجمن کی کسی جگہ باقاعدہ تنظیم نہیں بھی تھی، پھر بھی ان کے نوجوان اور نئے لکھنے والے ہر جگہ ترقی پسند رجحانات کو اپنا رہے تھے۔ یہ لوگ انجمن کے بمبئی مرکز سے خط و کتابت کے ذریعہ صلاح و مشورہ کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ نیا ادب بھی ان تمام مرکزوں اور افراد تک پہنچتا تھا، جس کی مدد سے کسی حد تک تنظیمی اور نظریاتی وحدت پیدا ہوتی تھی۔ بمبئی کی انجمن کے اُردو شعبے کے جلسوں کی ہفتہ وار روداد (حمید اختر کی لکھی ہوئی) جو ہفتہ وار ''نظام'' میں شائع ہوتی تھی، دوسرے مقامات پر ترقی پسند ادیبوں کے حلقوں کے لیے ایک مثالی حیثیت اختیار کر گئی، اور کئی مقامات سے اور بھی ہماری کارروائیوں کی اس کی تفصیلی رپورٹ میں شائع ہونے لگیں۔

حیدر آباد (دکن) میں 1945 میں اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کا اچھا اور مضبوط گروہ پیدا ہو

گیا تھا اور انجمن کی شاخ وہاں پر پھل پھول رہی تھی۔ گو مخدوم محی الدین رفتہ رفتہ شاعری کے میدان سے دور ہوتے جارہے تھے، لیکن ادبی تحریک سے وہ پھر بھی منسلک تھے۔ یہ زمانہ حیدرآباد میں تلنگانے کی کسان تحریک، اور مزدور تحریک کی تنظیم اور پھیلاؤ کا تھا۔ درمیانے طبقے کے دانشوروں کا ایک گروہ بھی اس سے متاثر تھا۔ جاگیری نظام کے زوال کی بدترین خباثتیں حیدرآباد میں موجود تھیں۔ گو حیدرآباد ریاست کے عوام کی اکثریت، تیلگو، مراٹھی اور کنڑی زبان بولنے والوں کی تھی، اور دو کروڑ کی آبادی میں صرف بیس لاکھ کی آبادی اُردو بولتی تھی، لیکن یہاں کے تعلیمی اور سرکاری نظام میں حیدرآباد کی دوسری قومی زبانوں کو کوئی جگہ نہیں دی گئی تھی۔ اُردو کو سب زبانوں پر ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی، جو یہاں کے حکمران اور جاگیردار طبقہ کی بھی زبان تھی۔ گوان حکمرانوں کو اُردو ادب یا تہذیب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، اور وہ اپنی جہالت اور عیاشی میں مگن تھے، اور سمجھتے تھے کہ زیر سایہ برطانیہ ظلّ اللہ تاج دارِ دکن کی مطلق العنانی ابدالآباد تک قائم رہے گی۔ لیکن حیدرآباد اور ہندستان کے مسلم عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے وہ اُردو زبان کی حمایت کا ڈھونگ رچاتے تھے اور ہندستانی مسلمانوں کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ حیدرآباد میں نظام شاہی اور جاگیرداری کا وجود، ہندستان میں اسلام، مسلمانوں کی تہذیب اور اُردو زبان کو برقرار رکھنے کے مترادف ہے۔ ہندو فرقہ واریت (جسے بڑے مارواڑی سرمایہ دار راجہ مہاراجاؤں اور جاگیری عناصر کی حمایت حاصل تھی) کی اقلیت کشی اور دوسری زبوں کاریوں کے سبب سے فرقہ وار رجعت پرستوں کو مسلم عوام میں کسی حد تک پنپنے کا موقع مل جاتا تھا۔ برطانوی سامراج فرقہ واریت کے دونوں سرچشموں کی رکھوالی کرتا تھا۔

ان حالات میں حیدرآباد میں اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کی پوزیشن کافی دشوار تھی۔ جمہوریت ترقی پسندی کا ایک بنیادی عنصر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر قوم کی آزادی اور خود مختاری کے حق کو تسلیم کیا جائے اور کسی قوم یا گروہ کو دوسرے پر سیاسی یا تہذیبی اعتبار سے غلبہ کا حق نہ ہو۔ حیدرآباد میں چونکہ اس زمانہ میں اُردو کو دوسری زبانوں پر ایک ناجائز غلبہ حاصل تھا، اس لیے اُردو کے ترقی پسندوں کا خاص طور پر یہ فرض تھا کہ جہاں وہ اُردو بولنے والوں میں اپنی زبانِ اُردو کی ترقی و ترویج کریں اور اس میں ترقی پسند ادب پیدا کرنے کی کوشش کریں، وہاں ریاست

حیدرآباد کی ان اقوام کی زبانوں کو ان کا مناسب مقام دلوانے کے لیے آواز بلند کریں اور کوشش کریں جن کو ان کے جائز ثقافتی اور تعلیمی حقوق سے محروم کردیا گیا تھا۔ حیدرآباد میں اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کا خاص طور پر یہ فرض تھا کہ خود کو اُردو کے رجعت پرست (اور فی الحقیقت جھوٹے) ''حمایتیوں'' سے ممیّز کریں۔

دوسرا سوال حیدرآباد میں اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کے سامنے یہ تھا کہ حیدرآباد کے مخصوص حالات میں ترقی پسندی کے مفہوم کیا ہیں؟ ترقی پسند ادیب عوام کے دُکھ دَرد، ان کی آزادی، اور جمہوریت کی خواہش کے ترجمان ہیں۔ سارے ملک سے سامراجی اقتدار کے اُٹھ جانے کے لیے تو وہ آواز بلند کرتے ہی ہیں۔ کیا حیدرآباد میں ان کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ ریاستی حکمران کی مطلق العنانی (طلسمے ست بالائے گنج مقیم) کو توڑنے کی بھی کوشش کریں؟ سوال محض یہ نہیں تھا کہ ایک فاتر العقل افیونی کو ریاست کے خزانوں، جائداد اور تمام سرخ وسفید کا مطلق العنان سربراہ بنانا دانش مندی نہیں۔ سوال یہ تھا کی حیدرآباد کے جمہور کو جاگیری نظام سے چھٹکارا دلا کر وہاں جمہوریت کی مضبوط بنیاد رکھی جائے۔

حیدرآباد میں اُردو کے ترقی پسند ادیب زیادہ تر درمیانہ طبقے کے مسلمانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس درمیانہ طبقے کی حالت بھی رفتہ رفتہ سقیم ہوتی جا رہی تھی، ان کا پڑھا لکھا حصہ بیشتر سرکاری نوکریاں کر کے اپنی بسر اوقات کرتا تھا۔ اب اس میں بھی بڑی بے روزگاری تھی۔ پھر اس طبقے کے کافی بڑے حصے میں حکمران طبقے کا فرد ہونے کا زعم تھا۔ رسی جل گئی لیکن اس میں سے بل نہیں گیا تھا۔ نظام دکن سے وفاداری جیسے ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس میں ان کی کافی بڑی تعداد مجلس تنظیم المسلمین کی تحریک سے وابستہ ہوتی جارہی تھی۔ یہ تحریک دوسری فرقہ وارانہ تحریکوں کی طرح قدیم، تہذیبی اور مذہبی روایات اور جمہوریت کا زبان سے ادعا کرتی تھی جس کے ذریعہ سے مسلم عوام کے ایک حصہ کو وہ اپنی جانب کھینچتی تھی۔ لیکن فی الحقیقت اس کا مقصد غیر جمہوری جاگیری نظام اور سامراجی اقتدار کو بدلی ہوئی شکل میں برقرار رکھنا تھا۔

موجودہ زمانے (1953) کے بدلے ہوئے حالات میں حیدرآباد کے ترقی پسند ادیبوں

کی نظروں میں اوپر لکھی ہوئی باتیں بالکل صاف ہوں گی۔ لیکن 1945 میں ایسا نہیں تھا۔ مخدوم اور ان کے بالکل قریب کے لوگ جو کسی نہ کسی طرح سے عوامی تحریکوں سے وابستہ تھے اور حیدرآباد میں اُردو کے صحیح مقام، نظام اور جاگیرداری کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے، لیکن ترقی پسند ادیبوں کی انجمن سے ملحق اور اس کے اردگرد بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو ترقی پسند بھی تھے اور نظام کے خلاف بات کرنا بھی ان پر گراں گزرتا تھا۔ ایسے بھی تھے جو اُردو ادب کی ترویج وترقی اور اس میں ترقی پسند ادب کی تخلیق تو پسند کرتے تھے، لیکن حیدرآباد میں ہی بسنے والی دوسری زبان بولنے والی قوموں کو ان کی زبان کی ترویج وترقی اور اس میں تعلیم کا حق دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ یا اگر تیار بھی تھے تو اس بات کا صاف طور سے اظہار کرنے کی ان کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

بہرصورت ان خامیوں کے باوجود حیدرآباد کی انجمن اس زمانے میں ہماری اچھی اور مضبوط شاخوں میں سے تھی۔ مخدوم کے علاوہ اس میں ابراہیم جلیس، سلیمان اریب، شاہد صدیقی، نظر حیدرآبادی، کلیم اللہ، سری نواس لاہوتی، نیاز حیدر، پروفیسر عزیز احمد، عالم خوندمیری وغیرہ شامل تھے اور وہاں لکھی جانے والی نظموں اور تنقیدی مضامین کا معیار کافی بلند تھا۔ افسانہ کی صنف کے اچھے نمائندے ابراہیم جلیس تھے، جو کچھ دنوں کے لیے بمبئی بھی آ گئے تھے۔ نیاز حیدر اور نظر کبھی کبھی بمبئی آ کر رہتے تھے اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔

حیدرآباد کی انجمن نے مرکز کے سامنے تجویز پیش کی کہ اُردو کے ترقی پسند مصنّفین کی ایک ''کل ہند کانفرنس'' کی جائے اور اگر مرکز اسے منظور کرے اور حیدرآباد کی انجمن کے ساتھ تعاون کرے تو وہ اس کانفرنس کو حیدرآباد میں منعقد کر سکتے ہیں۔ ہم نے اس تجویز پر بمبئی میں آپس میں مشورہ کیا اور دوسری شاخوں کی بھی اس کے متعلق رائے لی۔ ابھی تک ہم نے کسی ایک زبان کی ''کل ہند'' کانفرنس نہیں کی تھی۔ اس وقت تک ہماری کل ہند کانفرنسیں ملک کی تمام ان مختلف زبانوں کے ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنسیں ہوتی تھیں جہاں ہماری شاخیں یا ترقی پسند ادیب موجود تھے۔ ہمارے آئین میں صوبائی یا ایک لسانی علاقے کی کانفرنس کے لیے تو دفعہ موجود تھی لیکن اس قسم کی کانفرنس کے لیے نہیں۔ اس کے باوجود عام رائے یہی ہوئی کہ اس قسم کی عام کانفرنس ضرور ہونی چاہیے اور اس سے ہم کو فائدہ ہوگا۔ اردو کے ادیب یا انجمن کی اُردو شاخیں ملک کے مختلف

حصوں میں موجود تھیں۔ اگر ان کے نمائندے وقتاً فوقتاً اکٹھا ہو سکیں تو اُردو ادب کی مختلف اصناف اور اُردو میں ترقی پسند ادب کی تحریک کی مجموعی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ایک دوسرے کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اور نظریاتی اور تنظیمی اعتبار سے ہم میں زیادہ مضبوطی آسکتی ہے۔ مختلف زبانوں کی صوبائی کانفرنسیں ہوتی ہیں لیکن حیدرآباد اور بمبئی، پٹنہ اور لکھنؤ، لاہور، اور دہلی، احمد آباد اور بنگلور وغیرہ کے اُردو ادیب ایک ساتھ کیسے مل سکتے ہیں؟ انھیں صرف کل ہند ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس میں ہی ملنے کا موقع مل سکتا ہے۔ لیکن وہاں پر بہت سی زبانوں کے درمیان، اُردو صرف ایک زبان ہوتی ہے۔ اس لیے اُردو ادب کے مسائل پر ملک کے ہر حصہ کے اُردو ادیبوں کے مابین تفصیلی بحثیں نہیں ہو سکتیں۔ بمبئی کی انجمن میں بھی کئی زبانوں کے ادبا تھے اور وہاں عملی تجربے سے ہم نے یہ سیکھا تھا کہ سب زبانوں کے ادیبوں کے مشترک جلسوں کے علاوہ علاحدہ علاحدہ زبانوں کے جلسے بھی ضروری ہیں۔ پھر ہمیں اس کا بھی خیال تھا کہ حیدرآباد جیسی جگہ میں جہاں شہری آزادیاں برائے نام ہیں اور جمہوریت پسندوں کے اظہارِ خیال پر پابندیاں ہیں، باہر سے آنے والے ترقی پسندوں کا اجتماع وہاں پر ہماری تحریک کو مضبوط کرے گا۔ ہمارے حیدرآباد کے رفیق محسوس کریں گے کہ وہ ہندستان کی سب سے بڑی جاگیردار قوت کے مقابلے میں تنہا نہیں بلکہ سارے ملک کے اُردو کے ادیب ان کے ساتھ ہیں۔

کرشن چندر نے اُردو کے ترقی پسند مصنّفین کی اس کل ہند کانفرنس کے متعلق جو حیدرآباد میں اکتوبر 1945 میں منعقد ہوئی، اپنے تاثرات ''پودے'' کے نام سے لکھے ہیں۔ اس سے بہتر یا ویسا بھی لکھنا میرے لیے ممکن نہیں۔ ''پودے'' ادب اور جرنلزم کی اس ملی جلی صنف میں، جس کا نام ''رپورتاژ'' ہے، ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں کانفرنس کی روداد نہیں ہے بلکہ اس کی فضا، اور ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔ حیدرآباد جیسے شہر میں جہاں اس زمانے میں ترقی پسندی کے نام سے ہی لوگوں کے کان کھڑے ہو جاتے تھے، وہاں کے نوجوان ادیبوں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے کس طرح اتنی شاندار، اتنی منظّم اور اتنی مفید اور ٹھوس کانفرنس کر لی، اس کا خیال کر کے آج بھی مجھے تعجب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ترقی پسندوں کے پاس خود اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ کانفرنس کے کثیر اخراجات، جلسوں کے لیے متعدد ہالوں کا انتظام اور سارے ملک سے آئے ہوئے

پچاسوں ادیب ڈیلی گیٹس کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا (اور ان میں اکثر نازک مزاج شعرا تھے) بندوبست کر سکتے تھے۔ ہمارے حیدرآبادی رفیقوں نے یہ سب بڑی خوشی سے کیا اور میرے خیال میں اس کے پہلے یا 1948 تک، جب تک مجھے علم ہے، ترقی پسند مصنّفین کی کوئی کانفرنس ہر اعتبار سے اتنی اچھی طرح اور اتنی کامیابی سے نہیں ہوئی۔

وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوئے اس لیے کہ انھوں نے بڑی دانشمندی اور باقاعدگی کے ساتھ حیدرآباد کے تمام ان افراد، گروہوں اور طبقوں کا تعاون حاصل کیا، یا انھیں اپنا ہمدرد بنایا جو اُردو زبان اور اُردو ادب و شعر اور اس کی ترقی سے ذرا بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ حیدرآباد کے لوگ عام طور سے بڑے مہمان نواز اور خلیق مشہور ہیں۔ باہر سے آنے والوں کی وہاں بے حد خاطر کی جاتی ہے۔ خاص طور پر اگر باہر سے آنے والا مہمان اُردو کا ادیب یا شاعر ہے تو پھر تو وہاں کے رئیسوں اور جاگیرداروں اور ''جنگوں'' تک کا بھی ایک حلقہ ان کی آؤ بھگت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ غالبًا ان کی بے کیف اور تھکی اور اکتائی ہوئی زندگی میں وہسکی کی طرح یہ بھی تفریح کا ایک سامان ہے۔ محترمہ سروجنی نائیڈو اور قاضی عبدالغفار ہماری تحریک کے پرانے سرپرست اور مددگار تھے۔ انھوں نے کانفرنس کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ مخدوم اور حیدرآباد کی جمہوری تحریکوں میں کام کرنے والے مصنّفین کی وساطت سے جمہوری طلبا، دانشوروں اور محنت کشوں کے باشعور حلقوں کی مدد حاصل کی گئی، جس کے بغیر تنظیم کے سب سے مشکل اور تکلیف دہ اور غیر دلچسپ کام اچھی طرح انجام ہی نہیں پا سکتے۔

یہ کانفرنس کوئی پانچ دن تک ہوئی۔ اس کا افتتاح مسز نائیڈو نے کیا۔ افتتاحی جلسہ ایک سنیما ہال میں ہوا تھا اور اس میں کوئی دو ڈھائی ہزار کا مجمع رہا ہوگا۔ اس کانفرنس کی صدارتی مجلس مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر تاراچند، کرشن چندر، فراق گورکھپوری اور احتشام حسین پر مشتمل تھی۔ پہلے دن کے افتتاحی جلسہ کی صدارت کرشن چندر نے کی۔ افتتاحی جلسہ تو دراصل نمائش اور طمطراق کے لیے ہوتا ہے، جس میں تحریک کے عام مقاصد بیان کر کے حاضرین کو اس کے ساتھ ہمدردی اور حمایت کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے۔ کانفرنس کا زیادہ مفید کام ان چھوٹے چھوٹے اجلاسوں میں ہوا جو بعد کو منعقد ہوئے اور جن میں سو دو سو کی حاضری ہوتی تھی۔ ان اجلاسوں میں ادب کے

مختلف شعبوں پر بحث ہوتی تھی۔ جدید اُردو شاعری، اُردو افسانہ و ناول، اُردو جرنلزم (صحافت)، اُردو اور ہندی کا مسئلہ، اُردو تنقید۔ فراق نے شاعری کے اجلاس کی صدارت کی۔ کرشن چندر نے افسانہ اور ناول، قاضی عبدالغفار نے (جو استقبالیہ کمیٹی کے بھی صدر تھے) جرنلزم، ڈاکٹر تارا چندر نے اُردو ہندی کا مسئلہ اور احتشام حسین نے اُردو تنقید کے اجلاس کی صدارت کی۔ مولانا حسرت موہانی نے ایک بڑے عام جلسے کی صدارت کی۔

اس بار شاید پہلی مرتبہ ہم اس کانفرنس کے لیے ایسی تیاری کرنے میں کامیاب ہوئے تھے جو ایک ادبی اور علمی کانفرنس کو دوسری کانفرنسوں سے ممیّز کرتی ہے۔ ہم نے یہ کوشش کی تھی کہ ادب کی ان مختلف اصناف پر جنھیں کانفرنس میں زیر بحث لایا جائے، کم از کم ایک اچھا، مستند اور مفصل مقالہ کسی ایسے شخص سے تیار کروایا جائے جو اس موضوع پر لکھنے کی خاص اور نمایاں اہلیت رکھتا ہو۔ اس مقالے میں نہ صرف اس صنفِ ادب کا ترقی پسند نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے، بلکہ آئندہ کی ترقی کی راہوں پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ یہ کام انجمن کے مرکز کا تھا کہ وہ اُردو کے سنجیدہ ترقی پسند ادیبوں میں سے چند کو اس قسم کے مقالے تیار کرنے کے لیے آمادہ کرے، اور اس کا بندوبست کرے کہ یہ حضرات کانفرنس کے لیے محنت کریں اور اس میں شرکت کریں۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہمارے بہت سے ادیب قلم برداشتہ لکھنے کے عادی ہیں۔ افسانے اور شعر میں تو یہ طریقہ چل بھی سکتا ہے، اچھے تنقیدی مقالے اس طرح نہیں لکھے جا سکتے اور اگر اچھے مقالے محنت، تفتیش اور تحقیق کر کے تیار نہ کیے جائیں تو پھر ادبی کانفرنس کا مقصد بڑی حد تک فوت ہو جاتا ہے۔ اس میں تحریک کا عام پروپیگنڈہ، شعر خوانی اور تفریح تو ہو سکتی ہے، لیکن ادبی تخلیق کے عملی مسائل پر غور و فکر نہیں ہو سکتا، اور ادیبوں کو اپنے تخلیقی کام کے سلسلے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں انھیں حل نہیں کیا جا سکتا۔

کانفرنس کے انعقاد کے دو تین ماہ پہلے سے ہم نے تمام شاخوں اور بہت سے ادیبوں کو فرداً فرداً مقالے لکھنے کے لیے لکھا اور ان سے برابر تقاضے کرتے رہے۔ گو اس سلسلہ میں ہمیں نمایاں کامیابیاں بھی ہوئیں۔ پھر بھی جب کانفرنس شروع ہوئی تو ہمارے پاس اتنے بہت سے مقالے آ گئے تھے کہ اب ان سب کو کانفرنس میں پڑھنا اور پروگرام میں جگہ دینا دشوار ہو گیا۔ بمبئی سے سبطِ حسن، سردار جعفری، اور میں نے کانفرنس کے لیے کافی محنت کر کے مقالے تیار کیے۔ سبط

حسن نے اُردو جرنلزم کے ارتقا پر کافی تفتیش کر کے بہت اچھا مقالہ لکھا، جو تاریخی بھی تھا اور جس میں دکھایا گیا تھا کہ ترقی پسند جرنلزم کس طرح وطنی آزادی کی تحریک کے ساتھ ساتھ سامراجی استبداد کا مقابلہ کرتی ہوئی بڑھی ہے۔

سردار جعفری اقبال کی شاعری، فلسفہ اور زندگی پر مہینوں سے مطالعہ اور غور کر رہے تھے۔ اقبال کی فکر اور شاعری پر اچھی ترقی پسند تنقید کی سخت ضرورت تھی۔ ہم میں آپس میں بھی ان کی شاعری کے بارے میں اختلاف تھا۔ اس لیے انھوں نے اقبال پر ایک مقالہ لکھا۔

میں نے اُردو، ہندی، ہندستانی کے مسئلہ پر ایک مقالہ لکھا۔

احتشام حسین نے اُردو کی ترقی پسند تنقید پر مقالہ لکھا۔ وہ کانفرنس کے اس شعبہ کا صدارتی خطبہ بھی تھا۔

پنجاب سے کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے ساحر لدھیانوی آئے تھے۔ انھوں نے اُردو کی جدید انقلابی شاعری پر ایک چھوٹا سا لیکن اچھا اور دلچسپ مقالہ لکھا تھا۔

کرشن چندر نے اُردو افسانہ پر لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ بمبئی میں تھے اور آخر وقت تک کہتے رہے کہ لکھیں گے۔ لیکن جب بمبئی کے اسٹیشن پر حیدرآباد کے لیے روانہ ہوتے وقت میں نے ان سے اس کے متعلق آخری بار دریافت کیا تو انھوں نے یہ مژدہ سنایا کہ نہ انھوں نے مقالہ لکھا ہے اور نہ صدارتی خطبہ! میں نے جب ان کی اس حرکت پر ناراضگی اور بے اطمینانی کا اظہار کیا، اور ادیبوں کی عام غیر ذمہ داری کی عادتوں پر گفتگو شروع کی تو انھوں نے شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے یقین دلایا کہ وہ خطبہ حیدرآباد میں پہنچ کر ضرور لکھ لیں گے۔ میں نے کہا...... ''وہاں تمھیں ایک دن تو ملے گا، کیا خاک لکھو گے؟'' انھوں نے مسکرا کر گردن جھکا لی۔ کرشن چندر کے ساتھ ان کی ایک خوبصورت اور نازک اندام فلم ایکٹریس دوست صاحبہ بھی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے حیدرآباد جانے کے لیے بمبئی کے اسٹیشن پر مجھے نظر آئیں۔ ان سے پلیٹ فارم پر جب میرا تعارف ہوا تو میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ان کے جانے سے کانفرنس کی ''رونق'' تو ضرور بڑھے گی لیکن کرشن چندر کا خطبہ کبھی نہیں لکھا جائے گا۔ زبانی تقریر کرتے ہوئے میں نے کرشن کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ سنا تھا۔ کرشن شاید میرے خیالات کو بھانپ گئے اور سارے راستے مجھ

سے کتراتے رہے۔ حیدرآباد پہنچ کر حضرت کو حرارت آگئی اور انھیں دیکھنے کے لیے ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔ دوسرے دن تیسرے پہر کانفرنس کا اجلاس تھا۔ صبح کو جب میں ان کی مزاج پرسی کے لیے گیا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب میں نے دیکھا کہ وہ کمرے کے ایک کونے میں کرسی میز لگائے ہوئے کچھ لکھنے میں مشغول ہیں۔ اب انھوں نے مجھ سے آنکھیں چار کیں اور اپنا مسودہ میری طرف بڑھا کر بولے...... ''یہ لیجئے، پڑھ لیجئے اور دیکھئے ٹھیک ہے نا؟'' انھوں نے راتوں رات اپنا خطبہ تیار کر لیا تھا، جو مختصر تھا، لیکن جس میں کرشن چندر کی تحریر کی تمام خوبیاں اور لطافتیں تھیں۔ میں نے خوشی سے انھیں گلے لگا لیا اور پوچھا...... ''تمھیں تو بخار تھا...... اسے کب لکھا؟''

کرشن نے جواب دیا...... ''رات کو ہی لکھنے بیٹھ گیا تھا۔ پتہ نہیں بخار کب اتر گیا۔''

اور بھی کئی مقالے کانفرنس کے لیے لکھے گئے تھے۔ لیکن اب مجھے ان کے عنوان یاد نہیں۔

ابھی تک جو ہماری کانفرنسیں ہوئی تھیں، ان میں اچھے اور پہلے سے محنت کر کے لکھے ہوئے مقالوں کی کمی ہماری سب سے بڑی خامی ہوتی تھی۔ اس کانفرنس میں ایک نئی دشواری ہمارے سامنے آئی۔ یہاں مقالوں کی کمی نہیں، بہتات تھی۔ لمبے لمبے علمی مقالے جب کانفرنس میں پڑھے جاتے تھے تو ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ حاضرین کی کافی بڑی تعداد بور ہو رہی ہے، اور پھر جب پینتالیس منٹ یا ایک گھنٹے تک مقالہ سننے کے بعد لوگوں کو چھٹی ملتی تھی تو کسی میں اتنی سکت نہیں رہ جاتی تھی کہ مقالہ میں لکھے ہوئے مسائل پر بحث بھی کرے...... اور اگر مسائل پر بحث نہ ہو، مختلف لوگ اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کریں تو پھر ان مسائل کا متفقہ حل کیسے نکل سکتا ہے؟ اس دشواری کا حل غالبًا یہ ہے کہ بڑے مقالے کانفرنسوں میں پڑھے نہ جائیں۔ بلکہ انھیں چھاپ کر ایک دو دن پہلے کانفرنس کے ان ڈیلی گیٹوں میں تقسیم کر دیا جائے جو اس صنف ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ مضمون نگار کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے مقالے کے خاص خاص نکات پر تشریحی تقریر کرے اور پھر اس کے بعد عام بحث شروع کی جائے۔ اس طرح کام کرنے سے مختلف مقالے لوگوں کی نظر کے سامنے بھی آ جائیں گے اور وہ انھیں اطمینان سے پڑھ سکیں گے اور سب کو اظہار خیال کے لیے کافی وقت بھی ملے گا۔ لیکن اس وقت ہماری تنظیمی حالت ایسی نہ تھی اور ہمارے پاس اتنے وسائل نہ تھے کہ ہم اس طریقے پر عمل کر سکیں۔

دوسری کانفرنسوں کی طرح اس کانفرنس میں بھی بہت سے رزولیوشن پاس ہوئے۔ یہ زمانہ مسلم لیگ کی تحریک کے بڑے زور کا زمانہ تھا۔ بات کافی دلچسپ ہے کہ اس آٹھ دس سال کی مدت میں (1936 سے لے کر 1947) اس کے باوجود کہ فرقہ پرست اُردو زبان اور مسلم کلچر کے تحفظ اور اس کی ترقی کا بہت ڈھول پیٹا کرتے تھے، اور اُردو بولنے والے عوام کے سامنے اپنے کو اُردو کے بہت بڑے حمایتیوں کی طرح پیش کرتے تھے، فرقہ پرست، تصورات وخیالات اور اس کے پیدا کیے ہوئے جذبات سے متاثر ہوکر ایک بھی قابل ذکر نظم نہیں لکھی گئی، یا اور کسی قسم کا وقیع ادب نہیں پیدا ہوا۔ رجعت پرستی بانجھ ہوتی ہے۔ اس کی کوکھ سے فن وادب کی تخلیق نہیں بلکہ تحقیر و بربادی ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض کٹّر اور فی الجملہ جاہل قسم کے فرقہ پرست حلقے اور افراد ترقی پسند ادب کی تحریک پر حملے کرکے اور اس پر بے بنیاد اور لغو الزامات لگا کر اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ اسلامی کلچر اور اُردو زبان کی خدمت کررہے ہیں۔ الزامات وہی پرانے تھے...... ''ترقی پسند الحاد، بے دینی اور بداخلاقی کی تلقین کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادب میں فحاشی کرتے ہیں۔ ترقی پسند زبان کو خراب کرتے ہیں۔'' جب ہماری یہ کانفرنس حیدرآباد میں ہوئی اس وقت خاص طور پر ان الزامات سے بھرے ہوئے مضامین بعض اُردو اخباروں میں شائع ہوئے۔ حیدرآباد کے چند نظام پرست اور مجلس اتحاد المسلمین سے تعلق رکھنے والے اخبارات ان ہرزہ گویوں میں پیش پیش تھے۔ ان باتوں کے پیش نظر ہم میں سے بعض نے یہ مناسب سمجھا کہ کانفرنس ایک رزولیوشن کے ذریعہ یہ بات صاف کردے کہ فحاشی، ترقی پسند اصولوں کے خلاف ہے اور ترقی پسند ادب میں فحاشی کو رجعت پرستی کی ہی ایک شق سمجھتے ہیں۔ اس قسم کی تجویز کی ضرورت ہم کو یوں بھی محسوس ہوئی چونکہ اُردو کے بعض...... مثلاً سعادت حسن منٹو، جن میں ترقی پسندی کے عناصر بھی تھے اور جنھوں نے بعض اچھی ترقی پسند کہانیاں لکھی تھیں، کبھی کبھی فحاشی پر بھی مائل ہوجاتے تھے۔ نیز یورپی ادب میں نراجی رجعت پرستی اب فحاشی، بداخلاقی اور ہر قسم کے معاشرتی نظم وضبط سے بغاوت کی شکل میں نمایاں ہورہی تھی اور بعض کم فہم دانشور سرمایہ داری کے زوال کی اس بے ہودہ جدت کو ترقی پسندی سمجھ کر اس کی نقل کرتے تھے۔

فحاشی کے مسئلہ پر تجویز کا مسودہ ڈاکٹر عبدالعلیم نے تیار کیا جو ہم میں صحت الفاظ، اختصار

اور اپنے مطلب کے صاف اور واضح اظہار کے لیے بے نظیر تھے۔ انھوں نے ہی اس تجویز کو کانفرنس کے سامنے پیش بھی کیا۔ کسی نے اس کی تائید بھی کردی۔ غالبًا احتشام حسین کانفرنس کے اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے، اس میں یہ تجویز پیش ہوئی۔ جب تحریک اور تائید ہوچکی تو صدر نے رسماً دریافت کیا کہ کوئی اس کا مخالف تو نہیں ہے۔ کسی کا بھی خیال نہیں تھا کہ اس بدیہی سی تجویز پر کسی قسم کا اختلاف ہوگا یا اس پر زیادہ بحث کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارا یہ خیال غلط نکلا۔ مولانا حسرت موہانی ڈائس سے نیچے، حاضرین کی پہلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ یکا یک کھڑے ہوگئے اور صدر سے اس تجویز میں ایک ترمیم پیش کرنے کی اجازت چاہی۔ ہم سب سخت حیران ہوکر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ جلسہ میں ابھی تک ایک اکتاہٹ کی سی کیفیت تھی جو رسمی قسم کی تجویزوں اور تقریروں سے ہمیشہ پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا کے اس طرح کھڑے ہو جانے سے ہر شخص چوکنّا ہوگیا اور سب دلچسپی کے ساتھ یہ سننے کے لیے مشتاق ہوگئے کہ مولانا فحاشی پر کیا کہتے ہیں۔

علیم نے جو قرارداد پیش کی تھی، اس میں کچھ اس طرح کے الفاظ تھے...... ''یہ کانفرنس ایک بار پھر اس بات کو صاف کر دینا چاہتی ہے کہ ترقی پسند ادیب ادب میں فحش نگاری کے خلاف ہیں، اور اسے بُرا سمجھتے ہیں...... الخ۔'' مولانا حسرت موہانی نے یہ تجویز پیش کی کہ اس جملہ کے آگے یہ جملہ بڑھا دیا جائے...... ''لیکن وہ لطیف ہوسناکی کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔'' مولانا کی اس ترمیم پر سارے حاضرین ہنس پڑے۔ لیکن مولانا پر استہزا کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ پوری متانت اور سنجیدگی سے اپنی ترمیم کو منظور کروانے کے لیے تقریر کرنے لگے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ فحاشی کی تعریف بہت مشکل ہے۔ ہر شخص اس کے اپنے ہی مطلب نکالتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بعض کٹّر ملاّ اُردو اور فارسی کے تمام اس شاعری کے ذخیرے کو (جسے خود مولانا نے فاسقانہ یا انسانی عشق و محبت کے متعلق شاعری قرار دیا تھا) ہی ناجائز سمجھتے ہیں۔ کوئی شاعر یا ادیب ملاؤں کی اس بات کو نہیں مان سکتا اور ہمیں احمق یا بددیانت لوگوں کے حملے سے گھبرا کر کوئی ایسی تجویز نہیں منظور کرنا چاہیے، جس میں عاشقانہ شعر و ادب کو مطعون قرار دینے کا احتمال ہو۔ مولانا نے بڑے بھولے پن سے کہا...... ''مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میری اپنی شاعری کے بیشتر حصے میں ہوسناکی

ہوتی ہے۔لیکن یہ ہوسنا کی تو لطیف ہوتی ہے۔کسی کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بہرحال کٹھ ملاؤں کو اعتراض ہو تو ہو، جو شاعری کو ہی فعل عبث سمجھتے ہیں، ادیبوں کو نہیں ہونا چاہیے۔''

علیم، قاضی عبدالغفار صاحب سے، مجھ سے اور چند اور دوستوں سے مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔مولانا کی ترمیم اگر منظور کر لی جائے اور اسے قرارداد میں جوڑ دیا جائے تو ملک کے سارے ادبی حلقوں میں تضحیک و مذاق کا سب سے بڑا موضوع ہوگا۔ترقی پسند ادیب فحاشی کے تو خلاف ہیں لیکن لطیف ہوسنا کی میں کوئی مضائقہ نہیں! اس سے بڑھ کر مضحکہ خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ میں نے علیم سے کہا کہ مولانا حسرت موہانی سے گفتگو کریں اور ان سے کہیں کہ اپنی ترمیم واپس لے لیں۔ چونکہ مولانا جو واضح کرنا چاہتے تھے وہ سب کی سمجھ میں آ گیا۔لیکن قرارداد میں ''لطیف ہوسنا کی'' والا ٹکڑا شامل کرنے سے ہم مسئلہ کو الجھا دیں گے۔اب قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر عبدالعلیم، اور میں مولانا کو سمجھا رہے تھے۔لیکن وہ اپنی پوزیشن سے ٹس سے مس ہونے کو ذرا بھی تیار نہیں تھے۔آخر کار عاجز آ کر عبدالغفار صاحب کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ فی الحال اصلی قرارداد واپس لے لی جائے اور بعد میں مولانا کے مشورے سے اس موضوع پر انجمن ایک مبسوط بیان شائع کر دے۔مولانا قرارداد کی واپسی کو آئینی طور پر روک نہیں سکتے تھے۔اس لیے بالآخر چپ ہو گئے۔اجلاس کی نشست قہقہوں میں ختم ہوئی۔ ہر شخص کی زبان پر مولانا کا لطیف ہوسنا کی والا فقرہ تھا! سبط حسن کو نشست کے بعد میں نے بڑبڑاتے ہوئے سنا۔''اس شخص کا تاریخی رول ہی ہمیشہ اس قسم کی بے ڈھب بات کر کے سب کو مشکل میں ڈال دیتا ہے۔ جب تک کانگریس میں رہے، یہی کیا۔مسلم لیگ میں مسٹر جناح کو عاجز کر رکھا ہے اور آج ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس میں وہی رول ادا کر رہے ہیں۔'' بہرحال مولانا کی اس ترمیم سے یہ فائدہ تو ہوا کہ فحاشی کے مسئلہ پر ہم زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور ہوئے، اور بعد کو انجمن نے کوئی بیان شائع نہیں کیا۔

انھیں دنوں حیدر آباد میں ہمارے مخالفین نے ایک جلسہ کیا جس کا مقصد ترقی پسند ادب کی تحریک پر لعن طعن کرنا تھا۔ جلسہ کرنے والوں نے اپنی بدقسمتی سے مولانا حسرت موہانی کو بھی (مولانا اور مسلم لیگی سمجھ کر) جلسے میں بلایا۔مولانا نے وہاں پر ترقی پسند ادب کی تحریک اور کمیونزم کی حمایت میں اتنی زبردست تقریر کی کہ جلسہ کا رنگ ہی بدل دیا اور وہاں پر کوئی تجویز ہماری مخالفت

میں منظور نہ ہوسکی۔ حیدرآباد میں ہی مولانا سے میں نے ''نیا ادب'' کے لیے خاص طور پر کچھ لکھنے کی درخواست کی۔ اس کے کچھ دنوں بعد آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی میٹنگ بمبئ میں تھی۔ اس میں شرکت کے لیے مولانا بھی بمبئ تشریف لائے۔ قبل اس کے کہ میں ان کی قدم بوسی کے لیے ان کی قیام گاہ پر جاؤں، ایک دن صبح کو وہ خود ہی میرے یہاں پہنچ گئے۔ سیاست اور ادب پر بڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ چلتے وقت جیب سے ایک پرچہ نکالا اور کہنے لگے...... ''یہ دیکھو! تم لوگوں کے لیے ایک نظم لکھ کر لایا ہوں۔'' اور بڑی بے تکلفی سے اسے پڑھ کر سنانے لگے۔ اس نظم کا مطلع تھا......

معیشت میں بہر سو رنگ فطرت ہے جہاں میں ہوں
اخوت ہے جہاں میں ہوں سویّت ہے جہاں میں ہوں

اس شعر کو پڑھنے کے بعد سویت کے معنی سمجھاتے رہے کہ یہ عربی لفظ ہے جس کے معنی برابری (مساوات) کے ہیں، اور کہنے لگے کہ غالباً اگر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ روسی زبان میں لفظ ''سوویت'' بھی دراصل عربی لفظ کی روسی شکل ہے۔ روسی میں عربی کے بہت سے الفاظ ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ مولانا کی عمر اس وقت ساٹھ سے اوپر ہی ہوگی۔ لیکن جب گفتگو کرتے تھے تو ایک ہنس مکھ بچے کی طرح ان کا چہرہ مع اپنی گنجان داڑھی کے جیسے کھل جاتا تھا اور اشتراکیت اور اشتراکی انقلاب کے برحق ہونے پر ان کی گفتگو میں اس طرح اظہار ہوتا تھا، جیسے کوئی نوجوان اپنے دل کی گہرائیوں سے اپنی محبت کی سچائی کا بیان کر رہا ہے۔ تازگی، بشاشت اور خلوص ان کے ایک ایک لفظ، ان کی آنکھوں کی چمک اور ان کے بشرہ کے ہر ایک نقش سے جھلکا پڑتا تھا۔ وہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے آغاز سے ہی اس کے ایک مضبوط اور مستقل طرفدار تھے۔ اُردو کے ترقی پسند ادیبوں سے وہ بڑی شفقت اور محبت کرتے تھے۔ میں ہر لحاظ سے ان سے بہت چھوٹا تھا، لیکن جب بھی مجھ سے ملتے تھے تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے ایک برابر کے رفیق کی طرح برتاؤ کر رہے ہیں۔ ان سے ملنے پر یہ احساس ہوتا تھا کہ جیسے کسی بڑے مسرور اور زندگی سے محظوظ ہونے والے انسان سے مل رہے ہیں، اور انھوں نے بالکل سچ کہا ہے......

عیشِ گدازِ دل بھی غمِ عاشقی میں تھا
اک راحتِ لطیف بھی ضمنِ محن میں تھی

حیدرآباد کی کانفرنس میں، دور ہونے کی وجہ سے شمالی ہندستان سے چل کر نسبتاً کم لوگ پہنچ سکے تھے۔ پھر بھی فراق، ساحر لدھیانوی، احتشام حسین، ممتاز حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر تاراچند منجملہ اور کئی ادیبوں کے وہاں سے آئے تھے۔ بمبئی سے سب سے بڑا قافلہ گیا تھا۔ ہم سب بھی شمالی ہند کے ہی تھے، لیکن اس زمانہ میں بمبئی میں قیام پذیر تھے۔ جوش صاحب ان دنوں پونے میں تھے۔ وہ ''قبلہ رندان جہاں'' تھے۔ وہ حیدرآباد میں اپنی جوانی کی کافی مدت گزار چکے ہیں اور اس شہر اور اس کے باسیوں سے انھیں بڑا لگاؤ ہے۔ ہم سب بہت خواہشمند تھے کہ وہ بھی کانفرنس میں شریک ہوں۔ لیکن ایک عرصہ سے جوش ملیح آبادی کا داخلہ حیدرآباد میں بند تھا۔ ہم نے کوشش کی کہ کم سے کم کانفرنس میں شرکت کے لیے یہ ناروا ممانعت اٹھا دی جائے۔ لیکن ہمیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس پر ہمیں حیدرآباد کی حکومت پر سخت غصہ آیا جو اُردو کی حمایتی ہونے کی دعویدار ہوتے ہوئے بھی اُردو کے اتنے بڑے شاعر کا چند دنوں کے لیے بھی ریاست میں داخل ہونا گوارا نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ کانفرنس میں حکومت حیدرآباد کی مذمت کی تجویز ہم نے پیش کی۔ کسی ترقی پسند کو اس سے کیا اختلاف ہوسکتا تھا؟ لیکن ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب خود حیدرآباد کے چند ترقی پسند ادیبوں اور ان کے بہی خواہوں نے ہم سے کہا کہ اگر حکومت حیدرآباد کی مذمت کی یہ قرارداد منظور کر لی گئی تو پھر غالباً ان کے لیے حیدرآباد میں کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ حکومت ویسے ہی ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کو مشتبہ نظروں سے دیکھتی ہے۔ اگر اس کی کھلی مذمت کی گئی تو ممکن ہے وہ انجمن کو غیر قانونی قرار دے دے۔ اپنے حیدرآبادی دوستوں کے کہنے پر بڑے رنج کے ساتھ ہم نے یہ تجویز واپس لے لی۔ قاضی عبدالغفار اور عثمانیہ یونیورسٹی کے کئی استادوں اور دوسرے بارسوخ لوگوں نے ہمیں یہ یقین دلایا کہ وہ اپنے طور پر جوش صاحب کے حیدرآباد میں داخلہ کی ممانعت کے حکم کو منسوخ کروانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن بعد کو بھی یہ حکم منسوخ نہیں ہوا۔

اس ایک واقعہ سے ہم کو اندازہ ہوا کہ حیدرآباد کے حکمران انسانی آزادی کا کس حد تک

احترام کرتے تھے اور اُردو سے ان کی ''محبت'' کتنی گہری تھی۔

شعروادب سے گہرا لگاؤ اور شاعری کا شوق ہماری قوم، علی الخصوص اُردو بولنے، پڑھنے یا لکھنے والے عوام کی ایک نمایاں اور قابل ذکر خصوصیت ہے۔ تمام ان بڑے اور چھوٹے شہروں، قصبوں تک میں جہاں اُردو کی رسائی ہے، ادبی انجمنیں شاعر اور ادیب موجود ہوتے ہیں۔ بڑے شہروں، مثلاً کلکتہ، بمبئی، دہلی، عظیم آباد، حیدرآباد، لکھنؤ، الہ آباد، لاہور وغیرہ میں تو تقریباً ہر محلے میں ادبی حلقے اور انجمنیں موجود ہیں، جن کا کام عام طور سے وقتاً فوقتاً مشاعرے منعقد کرنا، اپنے گروہ کے شاعروں کی تعریف اور طرفداری کرنا، اور دوسرے گروہوں کے ساتھ نوک جھونک جاری رکھنا ہوتا ہے۔ اس قسم کی انجمنیں، جن کے نام بھی بڑے بھڑکیلے ہوتے ہیں (مثلاً بہارِ ادب، گلزارِ سخن وغیرہ) بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں۔ ان کی ادبی سطح عموماً کچھ زیادہ اونچی بھی نہیں ہوتی۔ لیکن ان کی تمام خامیوں کے باوجود ان کے ذریعہ سے شعروادب کی پہنچ ایک جاندار طریقہ سے (یعنی کتابوں اور رسالوں کے علاوہ) عام لوگوں تک ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ ترقی پسند تحریک سے اس قسم کی بہت سی انجمنیں اور حلقے متاثر ہونے لگے۔ یہ تاثر مختلف طریقوں سے ان حلقوں تک پہنچتا تھا۔ ملک کے ان شہروں میں، جہاں بڑی بڑی ملیں اور کارخانے تھے، یو۔ پی اور بہار کے بہت سے اُردو بولنے والے مزدور بھی کام کرتے تھے۔ ان میں کافی تعداد اُردو پڑھے لکھے ورکروں کی بھی تھی۔ یہ لوگ مزدور تحریک میں کھنچے چلے آرہے تھے۔ ترقی پسند ادب ان کے بیدار شعور کا اظہار کرتا تھا۔ وہ اپنے محلّوں کے مشاعروں اور ادبی محفلوں میں ترقی پسند شعرا اور ادیبوں کو مدعو کرتے تھے۔ وہ خود بھی ترقی پسند شاعری کرنے اور افسانے لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے علاوہ محلے کے ریڈنگ روموں اور ایک کمرے میں مشتمل چھوٹے چھوٹے کتب خانوں میں ترقی پسند سیاسی اخباروں کے ساتھ ساتھ، ترقی پسند ادیبوں کی کتابیں اور ترقی پسند رسالے بھی خریدے اور رکھے جاتے تھے۔ بمبئی، کلکتہ، کانپور، احمد آباد، میں اس طرح کے کتب خانوں میں کئی بار مجھے جانے کا اتفاق ہوا۔ ان بیدار اور باشعور محنت کشوں نے ہماری ادبی تحریک کو پھیلانے اور مقبول بنانے اور اس کی پشت پناہی کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ جب ہماری ادبی کانفرنسیں ہوتی تھیں، تو یہی لوگ اس کے سب سے مشکل کام اپنے ہاتھ میں لے کر انھیں بڑی خوبی اور ڈسپلن کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ بعض مرتبہ جب رجعت

پرست حلقوں کی طرف سے ہمارے جلسوں، مشاعروں اور کانفرنسوں میں زر خرید غنڈوں کے ذریعہ گڑبڑ اور ہنگامہ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی تو ہمارے یہی رفیق ہمت اور دلیری کے ساتھ انھیں فرو کرتے تھے۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ مزدور تحریک کے بڑے بڑھاؤ اور پھیلاؤ کا زمانہ تھا۔ محنت کشوں کی اس علم بیداری اور ہلچل سے ہماری تحریک جو عام جمہوری تحریک کا ہی ایک جزو تھی، متاثر ہوئی اور وہ بھی نئے طریقوں سے بڑھی اور پھیلی۔

دوسرا بڑا گروہ دانشوروں کا تھا جو اس زمانہ میں خاص طور پر ترقی پسند ادب کی تحریک سے متاثر ہوا۔ طلبا، یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں کے نوجوان، معلم، سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر میں کام کرنے والے نچلے درمیانی طبقے والے اس زمانہ میں اپنے سیاسی و معاشی حقوق کے لیے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں منظّم ہو رہے تھے، ملک بھر میں زبردست مظاہرے اور ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ لوگ اپنے مطالبات کو منوانے کے لیے دوسرے محنت کشوں کے ساتھ جدوجہد کر رہے تھے، لاٹھیاں اور گولیاں کھا رہے تھے۔ جیلوں کو جا رہے تھے۔ ترقی پسند ادب میں ان کے جذبات کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس گروہ پر تاثر کا انداز ہم کو اس بات سے ہوتا تھا کہ ترقی پسند ادیب اور شاعر کالجوں اور اسکولوں کے ادبی جلسوں اور ان کی ادبی انجمنوں میں پہلے کے مقابلے میں اس زمانے میں بہت زیادہ بلائے جاتے تھے۔ کالجوں کے مشاعروں میں ترقی پسند شاعری عام طور سے سب سے زیادہ پسند کی جاتی تھی۔ ان کے علاوہ درمیانی طبقے کے لوگوں کی ادبی انجمنوں میں بھی ترقی پسند اپنی تخلیق پیش کرنے کے لیے بلائے جاتے تھے۔ نئے ترقی پسند لکھنے والے ان ہی دانشوروں کے گروہ سے پیدا ہو رہے تھے۔

دیہات کے عوام تک اُردو کے ترقی پسند ادب کی رسائی نسبتاً کم تھی۔ وہاں کے عوام تک وہ ناٹک، نظمیں، کویتائیں پہنچ رہی تھیں جن میں سے اکثر (ہندستانی بولنے والے علاقوں میں) دیہاتی بولیوں میں لکھی جاتی تھیں۔ پھر غیر ہندستانی بولنے والے علاقوں میں (مثلاً تیلگو، مرہٹی، ملایالم، پنجابی، بنگالی، علاقوں میں) وہاں کے ایسے ادیب لکھتے تھے جو دیہات کے ہی رہنے والے تھے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شہروں میں جس ترقی پسند ادب کی تخلیق ہوئی تھی وہ دیہات میں پہنچتا ہی نہیں تھا۔ ایسا نہیں ہے۔ دیہات کا پڑھا لکھا طبقہ اپنی کتابیں اور رسالے اور اخبار شہروں

سے ہی حاصل کرتا ہے۔ دیہات کی منظّم جمہوری تحریکیں شہروں سے بھی وابستہ ہوتی ہیں۔ شہروں اور قصبوں سے ہی تربیت اور تعلیم حاصل کر کے ملوں، کارخانوں، دکانوں، دفتروں اور فوج سے روزی کما کر ہزاروں، لاکھوں انسان شہروں سے دیہات کو جاتے ہیں اور وہاں رہتے ہیں۔ وہ شہر کی تہذیب اور وہاں کا ادب (کئی برائیوں کے ساتھ ساتھ) دیہات لے جاتے ہیں۔ اس زمانے میں، جب کہ ملک میں سیاسی بیداری دیہات میں پھیل رہی تھی، دیہات میں رہنے والے پڑھے لکھے، سیاسی کارکن، طلبا، ٹیچر، روشن خیال زمیندار گھرانوں کے نوجوان ترقی پسند کتابیں، پمفلٹ اور رسالے کافی بڑی تعداد میں خریدتے اور پڑھتے تھے۔ مجھے اس کا اندازہ مختلف طریقوں سے ہوتا تھا۔ پنجاب یا یو۔ پی۔ کے دیہات میں دورہ کرتے وقت کسان کارکنوں کے ہاتھ میں یا ان کے گھروں پر ''نیا زمانہ'' کے ساتھ مجھے کیفی اعظمی کی ''جھنکار''، مخدوم کی ''سرخ سویرا''، سوویت یونین پر اُردو شاعروں کی نظموں کا مجموعہ ''سرخ ستارہ''، کرشن چندر کی ''اَن داتا'' وغیرہ بھی نظر آجاتی تھیں۔ قومی دارالاشاعت کی کتابوں کی دکانوں پر (جو بمبئی، لاہور، لکھنؤ، الہ آباد، وغیرہ میں کھولی گئی تھیں) جب دیہات سے آئے ہوئے کسان کارکن جاتے تھے تو وہ سیاسی کتابوں کے ساتھ ادبی کتابوں کے بھی پلندے خرید کر دیہات کو لے جاتے تھے اور ہفتہ وار ''نیا زمانہ'' کے سلسلہ میں دیہات سے ہمارے پاس خطوط آتے رہتے تھے۔ ان میں بھی اکثر دوسری کتابوں کے ساتھ ادبی کتابوں اور پمفلٹوں کے آرڈر ہوتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ بمبئی میں انجمن کے ایک جلسہ میں ایک بار دو نوجوان آئے۔ وہ ہمارے ممبر نہیں تھے اور میں ان کو پہلے سے نہیں جانتا تھا۔ جلسہ کے بعد خود ہی انھوں نے اپنا تعارف کروایا۔ ان میں سے ایک اسماعیل کالج، اندھیری کا بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اپنے کالج میں سردار جعفری اور میری تقریریں سن چکے ہیں اور انھیں ترقی پسند ادب سے دلچسپی ہے۔ ان کے ساتھ ان کے ایک شاعر دوست تھے۔ وہ دونوں مالیگاؤں کے رہنے والے تھے (بمبئی سے پچھّم کی طرف کوئی دو سو میل کے فاصلہ پر مہاراشٹر میں ایک شہر ہے)۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ وہاں ترقی پسند نوجوان ادیبوں اور طلبا کا ایک گروہ ہے، اور وہ لوگ مالیگاؤں میں ایک اُردو کی ادبی کانفرنس اور مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم ان کے ساتھ تعاون کریں۔ مجھے اس میں شک تھا کہ مہاراشٹر

کے بیچو بیچ میں ایک چھوٹے سے شہر میں اُردو کی کانفرنس کامیاب ہوسکتی ہے۔ گو اس کے پہلے کبھی کبھی ادیب اور نشاط مالیگانوی کے اشعار بعض رسالوں میں نظر آتے تھے۔ ان دونوں نوجوانوں میں دوسرے صاحب خود نشاط تھے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ مالیگاؤں کی بیشتر آبادی کھڈیوں پر کپڑا بنانے والے انصار دستکاروں پر مشتمل ہے اور ان کے آباواجداد سب بنارس اور مئو وغیرہ سے آکر مالیگاؤں میں بس گئے ہیں۔ مالیگاؤں مہاراشٹر میں ہوتے ہوئے اُردو بولنے والوں کا شہر ہے۔ ان مسلمان دستکاروں کا تہذیبی معیار صدیوں سے کافی اونچا رہا ہے، اور گو ان دنوں دستی صنعت ایک بحرانی کیفیت میں گرفتار ہے، پھر بھی مہاراشٹر کے دیہات میں پہنی جانے والی ہاتھ کی بنی ہوئی ساڑیاں زیادہ تر مالیگاؤں کی ہی بنی ہوتی ہیں۔ اس آبادی میں متمول مسلمان تاجر بھی ہیں۔ اُردو شعر وشاعری کا وہاں پر چرچا ہے، ادیب مالیگانوی وہاں کے مستند شاعروں میں سے ہیں۔ وہ بھی چاہتے ہیں کہ ترقی پسند ادیبوں کے تعاون سے مالیگاؤں میں کانفرنس منعقد کی جائے۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ادبی اجتماعوں کے شعائر میں کتنی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ رسمی مشاعروں میں بڑی خوشامد درآمد کرکے ممتاز شاعروں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ بغیر سیکنڈ کلاس کے آنے جانے کا کرایہ اور اچھا خاصہ سفر خرچ لیے ہوئے شعرا کرام مشاعروں میں جانے کا نام نہیں لیتے تھے۔ پھر اگر ان کی ضیافت یا خاطر داری میں مشاعرہ کے منتظمین سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جاتے تھے اور یہ روائتیں کوئی ایسی بری بھی نہ تھیں۔ اس لیے کہ شاعروں کو مشاعروں کے علاوہ اور پوچھتا بھی کون تھا؟ اگر وہ مشاعرہ والے ٹکٹ لگا کر نفع خوری کریں اور غریب اور مفلس شاعروں کو اس آمدنی میں سے کچھ حصہ مل جائے تو یہ ان کا جائز حق ہے۔ لیکن ہمیں مدعو کرنے والوں کے پاس نہ تو اتنی آؤ بھگت کرنے کے لیے روپیہ تھا، اور نہ ہم ان سے اس کی توقع کرتے تھے۔ ہم میں سے اس سلسلہ میں مشکل ان چند لوگوں کو پیش آتی تھی جو پرانے طرزوں کے عادی تھے۔ لیکن کچھ ہمارے ساتھ کے لحاظ سے، کچھ ''ترقی پسندی'' کے ماحول سے مجبور ہوکر انھیں بھی طرح طرح کی زحمتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ مالیگاؤں کو بمبئی سے جو شاعروں اور ادیبوں کا قافلہ گیا (مجاز، ساحر، سردار جعفری، کیفی اعظمی، سجاد ظہیر وغیرہ) ان میں ساغر نظامی بھی تھے۔ تیسرے درجہ کا سفر تو ساغر صاحب مسکرا کر برداشت کر گئے، ریل میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی، دن دن

کا سفر تھا اور بہت سے دوستوں کا ساتھ تھا۔ لیکن مالیگاؤں میں ہم لوگ ایک ایسے کمرے میں ٹھہرائے گئے جو نیا بنا ہوا، اور وسیع تو تھا لیکن جس کے بالکل چوکھٹ پر سے ایک کافی بدبودار نالہ گزرتا تھا۔ سونے کے لیے پلنگ بھی نہیں تھے۔ ہم میں سے اکثر بمبئی میں رہ کر زمین پر سونے کے عادی ہو گئے تھے۔ لیکن ساغر بے چارے کو دراصل بڑی ہی تکلیف ہوئی۔ پھر بھی وہ ان ''مصائب'' پر تھوڑا بہت احتجاج کر کے برداشت کر لے گئے۔ ہمارے مالیگاؤں کے دوستوں کا خلوص اور محبت، ہم سب کو حتی الامکان آرام پہنچانے کی کوشش، اور سب سے بڑھ کر ان کی ترقی پسند ادب اور ترقی پسند خیالات کو مالیگاؤں میں مقبول بنانے اور پھیلانے کی خواہش ایسی تھی، جس کا احساس کر کے چھوٹی چھوٹی جسمانی تکلیفوں کی طرف خیال بھی کرنا ابتذال اور چھچھورا پن معلوم ہوتا تھا۔

موسم برسات کا تھا اور مالیگاؤں کی ٹاؤن ایریا کونسل بھی ہمارے ملک کی تمام دوسری میونسپلٹیوں کی طرح سڑکوں کی مرمت، برساتی پانی کی نکاسی اور صفائی کو معاشرتی زندگی کے غیر ضروری صیغے سمجھتی تھی۔ اس لیے ہر چہار طرف گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ تھا۔ ہماری کانفرنس مالیگاؤں کے ایک نئے سنیما ہال میں منعقد ہوئی، جس کا نیا ہونا اس سے ثابت تھا کہ وہ لکڑی اور ٹین کا ایک ایسا ڈھانچہ تھا جو چھت کی طرف سے اور کناروں پر کھلا زیادہ اور بند کم تھا۔ بہر حال اس میں چند تخت اور میزوں کو رکھ کر ایک ڈائس بنا دیا گیا تھا اور لاؤڈ اسپیکر بھی نصب تھا۔ یہ ہمارے لیے کافی تھا۔ مجمع کی اکثریت مالیگاؤں کے کپڑا بنانے والے دستکاروں اور ان کے بچوں پر مشتمل تھی۔ ظاہر ہے کہ ادبی مقالوں کے پڑھنے کی وہاں پر کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں اپنے دل میں سوچتا رہا کہ اس چھوٹے سے شہر میں پانچ سو، ہزار آدمی آخر کس خیال سے اور کیا توقع لے کر ہمیں سننے کے لیے جمع ہوئے ہیں؟ ان کی ایک خواہش تو ظاہر ہے تفریح اور دلچسپی کی ہوگی، مشاعروں کی روایت ہمارے ہاں بہت پرانی ہے۔ لیکن وہ ترقی پسندی کے بارے میں بھی جاننا چاہتے ہوں گے، اور ان کے دلوں میں یہ امید بھی ہوگی کہ ان لوگوں کے شعر اور ادب میں شاید ایسی باتیں بھی ہوں گی جن میں انھیں اپنے دکھوں، اپنی بے نام آرزوؤں اور زندگی کو بہتر بنانے کی تمناؤں کی تصویر نظر آئے۔ معلوم نہیں جب میں نے اور ہمارے دوسرے مقرروں نے تقریریں کیں، تو ہم اپنی تحریک کے مقاصد انھیں بتا کر اپنے کو ان کا

اوران جیسے دوسرے محنت کشوں کا ترجمان اور خادم ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے یانہیں؟ البتہ دو باتوں کا مجھے یقین ہے۔ ایک تو یہ کہ خود ہم نے ان لوگوں کے قریب آ کر، جن کی زندگی اور جن کے بلند جمہوری مقاصد کی ترجمانی کے ہم دعویدار تھے، اپنے خیالات اور نظمیں ان کے سامنے پیش کر کے ذہنی اور روحانی قوت حاصل کی۔ ہمارے حوصلے بڑھے اور اپنی ادبی مساعی کی اچھائیاں اور ان کی کمزوریوں کا ہمیں پہلے کے مقابلے میں زیادہ بہتر احساس ہوا۔ دوسرے یہ کہ ہمارے شاعروں (کیفی اعظمی، سردار جعفری، ساحر وغیرہ) کی وہی نظمیں عوام میں سب سے زیادہ پسند کی جاتی ہیں جو سیاسی، جمہوری یا انقلابی خیالات کا اظہار صاف، براہ راست اور پر اثر طریقہ سے کرتی ہیں۔ غنائیہ غزلیں اب بھی جاذبیت رکھتی تھیں، عشق ومحبت کی واردات کا بیان دلوں کو برماتا تھا۔ لیکن مشاعروں میں تڑپ اور حرارت ان اچھی نظموں سے زیادہ پیدا ہوتی تھی، جن میں شاعر ظلم کرنے والوں پر ضرب لگاتے تھے، ریاکاریوں کی پول کھولتے تھے، جمہور کی اصلی حالت کا موثر بیان کرتے تھے۔ اتحاد، عمل اور جدوجہد کا پیام اور ایک ایسے آنے والے زمانے کی بشارت دیتے تھے جس میں آزادی، خوشحالی اور انصاف کا دور دورہ ہوگا۔

اس خیال کی تصدیق صرف مالیگاؤں کے ہی ایک مشاعرے سے نہیں بلکہ اور بہت سے مشاعروں اور ادبی محفلوں میں ہمارے تجربہ سے ہوتی تھی۔ بمبئی میں پنجابی مسلمانوں کی ایک انجمن ہر سال بڑے دھوم دھام سے ''ہفتۂ اقبال'' مناتی تھی، جہاں مبارک علی فتح علی خاں قوال کی قوالی بھی ہوتی تھی۔ اقبال کا سہارا لے کر رجعت پسند قسم کی تقریریں بھی (سوا ان موقعوں کے جب دو ایک قابل اور روشن خیال لوگوں، مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین کو اقبال کی شاعری پر تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا) اور ایک بڑا آل انڈیا قسم کا مشاعرہ۔ ان تمام تقریبوں کے منتظمین جن میں سے بیشتر بڑے سرکاری ملازمین تھے، ترقی پسند ادب کی تحریک سے سخت متنفر تھے۔ لیکن اب بمبئی میں مشاعرہ کرنے کے لیے ان کے لیے یہ ناممکن ہو گیا تھا کہ چند ترقی پسند شاعروں کو اپنے مشاعروں میں شرکت کے لیے مدعو نہ کریں۔ جوش ملیح آبادی کی حیثیت تو خیر اتنی اونچی تھی کہ اُردو کے کسی بھی مشاعرہ میں جس میں سارے ملک سے شاعر بلائے جائیں، ان کو نہ مدعو کرنا (یا جگر مرادآبادی کو نہ بلانا) گویا اس کو بن دلہا کی بارات بنا دینا تھا۔ پھر بھی ہم کو یہ افواہیں سنائی دیتی تھیں

کہ ماہرالقادری صاحب اس کی پوری کوشش کررہے ہیں کہ جوش کو اس بنا پر، کہ وہ ماہر صاحب کے خیال کے مطابق ملحد اور بے دین ہیں، مسلمان اپنے کسی اجتماع میں مدعو نہ کریں۔ لیکن مسلمان ہوں یا کسی بھی قوم کے عوام...... وہ بے دینوں کے مقابلہ میں بے ایمانوں سے زیادہ نفرت کرتے ہیں...... اور مشاعروں سے علیٰ الخصوص وہ اس کی توقع کرتے ہیں کہ جھوٹ، ظلم، حماقت اور ریاکاری پر بے دریغ حملے کریں۔ فارسی اور اُردو کے شاعروں نے صدیوں سے ظالم امرا، راشی محتسب، جاہل ملّا اور ریاکار زاہد اور شیخ کی قلعی کھولی ہے اور زندہ دل اور حق پرست عوام سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔

بہرحال ان خالص ''اسلامی'' مشاعروں میں جوش صاحب کا مدعو کیا جانا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ وہ ایک طرح سے ناگزیر تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ ان میں نوجوان ترقی پسند شعرا سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح، ساحر وغیرہ بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ تین سال تک میں نے ان مشاعروں میں شرکت کی۔ چار پانچ ہزار آدمیوں کے بڑے مجمع میں ہمارے یہ شاعر اور ان کی سیاسی نظمیں اتنی مقبول ہوتی تھیں کہ اساتذہ کے علاوہ (جوش، جگر، حفیظ جالندھری) اور کسی کو شاید ہی اتنا پسند کیا جاتا ہو۔ مجمع کی طرف سے بار بار مطالبہ ہوتا کہ انھیں ایک سے زیادہ نظمیں پڑھنے کا موقع دیا جائے۔ لیکن منتظمینِ مشاعرہ کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ انھیں کم از کم وقت ملے۔ پھر وہ ان سے یہ بھی درخواست کرتے کہ زیادہ ''سخت'' نظمیں نہ پڑھیں۔ لیکن حاضرین مشاعرہ ان تمام شرائط کے پابند نہ تھے اور وہ اصرار کرتے رہتے اور منتظمین اور شاعر دونوں سے اپنی مرضی منوا کر دم لیتے۔

اِس صورت حال سے ہمیں خوشی اور اطمینان اور ماہرالقادری صاحب اور ان کے ہم خیال رجعت پرستوں اور ترقی پسند تحریک کے مخالفوں کو سخت تکلیف اور کوفت ہوتی تھی۔ عام طور سے مشاعرہ کے بعد ترقی پسندوں کی مخالفت میں چند اخباروں اور رسالوں میں اس مخالف حلقہ کی طرف سے ضروری مضامین شائع کیے جاتے تھے، جن میں وہی پرانے الزام بار بار دہرائے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ راجہ صاحب محمود آباد، جو اس زمانہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے اور ساتھ ہی ساتھ جماعت اسلامی قسم کی ایک تنظیم قائم کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، بمبئی تشریف لائے۔ ان دنوں موصوف کا جوشِ ایمانی پورے شباب پر تھا اور سننے میں آیا تھا کہ محمود آباد

میں اپنے عالیان قصر سے باہر انھوں نے ایک حجرہ بنوایا ہے، جہاں بیٹھ کر عبادت و قرآن خوانی کرتے رہتے ہیں اور اس سے جو وقت بچتا ہے اس میں (عبادت کے ساتھ مرد مومن کے لیے فقر بھی ضروری ہے) بکریاں چَراتے ہیں۔ بمبئ میں ماہرالقادری صاحب پہلے سے ہی موجود تھے۔ ان دونوں صاحبوں نے بمبئ کی دلچسپ ہستی حکیم مرزا حیدر بیگ (جن کی سیاست حالات کے ساتھ ساتھ بدلتی تھی اور جو طبابت اور دواسازی کے ساتھ شاعری کا بھی شوق رکھتے تھے) کے ساتھ مل کر باقاعدہ ایک جلسہ منعقد کیا جس کا مقصد مسلمانوں کو ترقی پسند تحریک کے خلاف ورغلانا تھا۔ ہم کو اس جلسہ کی اطلاع اس وقت ہوئی جب اس کی تفصیلی روداد ہم نے بمبئ کے ایک مسلم لیگی اخبار میں پڑھی۔ اس جلسہ میں (ہمیں بعد میں پتہ چلا) حاضری تو شاید پچاس آدمیوں سے زیادہ کی نہ تھی، لیکن اس کی روداد اس اخبار کے تین، چار کالموں میں پھیلی ہوئی تھی۔ زبان کو خراب کرنے کے الزام سے لے کر فحاشی اور کفر تک کا الزام اس میں ہم پر لگایا گیا اور آخر میں ہمیں کافر قرار دے کر مسلمانوں سے ہمیں بائیکاٹ کرنے اور قتل تک کر دینے کے لیے کہا گیا۔ مجھے ان حضرات کے اس غیظ و غضب اور اس طرح جامہ سے باہر ہو جانے پر کافی تعجب ہوا، اور خاص طور پر اس وجہ سے کہ ان تینوں صاحبوں سے میرے ذاتی تعلقات گو رسمی تھے لیکن پھر بھی کافی خوش گوار تھے۔ دوسرے ترقی پسندوں سے بھی یہ حضرات اچھی طرح ملتے جلتے تھے۔ لیکن تعصب اچھے اچھوں کو اندھا اور بداخلاق بنا کر ان سے غیرانسانی حرکتیں کروا دیتا ہے۔ جب اہل اقتدار اور ان کے ہوا خواہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ نظریات اور خیالات، جن کی مدد سے وہ عوام کو دھوکہ دے کر اپنا مطیع اور طرفدار بناتے ہیں اور اپنے استحصالی اعمال پر پردہ ڈالتے ہیں، نئے انقلابی تصورات کی زد میں آ کر اپنا اثر کھو رہے ہیں اور ان کا جادو ٹوٹ رہا ہے۔ پھر ان کے پاس سوا افترا، دروغ اور تشدد کی دھمکیوں کے نئی ترقی پسند قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اور کون سا وسیلہ رہ جاتا ہے؟ رجعت اور ترقی کی اس ٹکر میں وضع داری، پرانے تعلقات، دوستی یا قرابت کیسے سلامت رہ سکتی ہے؟

اس ناشائستہ اشتعال انگیزی کا جواب دینا ہمارے لیے ضروی تھا۔ اس لیے بھی کہ خود ہمارے کئی نوجوان رفیق غصے سے لال پیلے ہو رہے تھے۔ آپس میں مشورے کے بعد ہم نے طے کیا کہ ہم ایک نئے قسم کا ادبی اجتماع کریں۔ اس میں ترقی پسند شعرا اپنا کلام سنائیں۔ کرشن چندر

اور احمد عباس اپنے افسانے پڑھیں اور ایک مختصر مقالہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے اس اجتماع میں پیش کیا جائے۔ انجمن کو اور ''نیا ادب'' کو روپیہ کی بھی ضرورت تھی۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ ہم اس اجتماع میں داخلے کا ٹکٹ لگائیں، اور پھر اگر فضا سازگار ہو تو حاضرین سے بھی چندہ جمع کریں۔ اگر ہمیں اس میں کامیابی ہوگی تو یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ بمبئی کے اُردو نواز حلقوں پر ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے اور ہماری تحریک میں وہ نہ صرف دلچسپی لیتے ہیں بلکہ اس کی مالی امداد کر کے اس کی بقا اور ترقی کے بھی خواہاں ہیں۔

بمبئی کے ایک مرکزی مقام ''انجمن اسلام ہائی اسکول'' کے خوبصورت ہال میں یہ ادبی اجتماع ہوا۔ داخلہ ٹکٹ صرف آٹھ آنے کا تھا۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ ٹکٹ ایک روپیہ کا رکھیں۔ لیکن ہمارے ادب کے شوقین مزدور رفیقوں نے تخفیف پر اصرار کیا۔ اس لیے اسے کم کرنا پڑا۔ اس اجتماع میں کوئی دو ڈھائی سو کی حاضری رہی ہوگی۔ ساغر، مجروح، ساحر، مجاز، سردار جعفری، کیفی، رفعت سروش، نیاز حیدر (جو نام مجھے یاد ہیں) کو سننے کے لیے اتنے آدمیوں کا جمع ہو جانا کوئی خاص بڑی کامیابی تو نہ تھی، لیکن ہمیں دراصل فکر اس کی تھی کہ ابھی تک بڑے جلسوں میں افسانہ سنانے کا تجربہ نہیں کیا گیا تھا۔ لوگ اسے پسند کریں گے یا نہیں؟ مجھے اب یاد نہیں کہ وہ کون سا افسانہ تھا جو کرشن چندر نے پڑھا، لیکن اس کے پڑھے جانے پر جو اثر اس جلسہ اور مجھ پر ہوا تھا وہ میں ابھی تک محسوس کر سکتا ہوں۔ لاؤڈ اسپیکر کے باوجود کرشن کی آواز کافی آہستہ تھی اور اس میں اُتار چڑھاؤ بھی بہت ہی خفیف سا تھا۔ وہ کوئی بیس پچیس منٹ تک نظریں کاغذ پر گڑائے اپنی کہانی پڑھتے رہے۔ مجمع پر مکمل سکوت طاری رہا۔ ایسا سکوت جس میں لوگوں کے سانس لینے تک کی آواز سنائی دیتی تھی۔ لیکن جب وہ کہانی ختم کر کے بالکل پیچھے کی صف میں جا کر بیٹھ گئے تو یکا یک لوگ جیسے چونک گئے اور پھر بڑی دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ اس تجربہ کی کامیابی پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے معنی یہ تھے کہ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ہم داستان گوئی کی روایت کو ایک نئے عوامی، اجتماعی طریقے سے زندہ کرنے کا پہلا قدم اٹھا رہے تھے۔ ابھی تک صرف ہمارے شاعر ہی اپنی تخلیق بڑے مجمعوں میں براہ راست لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ اب ہم افسانوں کو بھی بڑے

جلسوں میں پڑھ کر عوام سے ایک نیا قریبی تعلق قائم کر سکتے تھے۔

جلسے کے خاتمے کے کچھ پہلے میں نے حاضرین سے چندے کی اپیل کی۔ ٹکٹوں کے فروخت سے ہمیں شاید سوڈیڑھ سو روپے ہی ملے تھے جو ہماری توقعات سے کم تھے۔ لوگوں نے ایک ایک، دو دو روپیہ، اٹھنّیاں، چونیاں دینا شروع کیں اور اس طرح سو روپے کے قریب اور جمع ہو گئے۔ میرا جی بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ ہم سب جانتے تھے کہ ان کی مالی حالت کافی خراب تھی۔ لیکن انھوں نے اپنی جیب سے دس روپیہ کا نوٹ نکال کر چندہ کی جھولی میں ڈال دیا اور خود لوگوں سے زیادہ چندہ دینے کی اپیل کی۔ ہم سب میرا جی کی اس سخاوت سے بہت متاثر ہوئے۔ اس لیے کہ وہ ہمیشہ اس کا بھی اعلان کرتے رہتے تھے کہ وہ اصولی طور پر ہم سے اختلاف کرتے ہیں۔ متمول لوگوں میں اس اجتماع میں شریک ہونے والوں میں صرف ادا کارہ نرگس اور جدن بائی تھیں۔ جو بہت ہی سادہ کپڑے پہنے ہوئے ایک کنارے بیٹھی تھیں۔ چلتے وقت انھوں نے کافی بڑی رقم معذرت کے ساتھ ہماری جھولی میں ڈال دی، جو شاید باقی سب لوگوں کی دی ہوئی کل رقم کے برابر تھی۔ میں نے اپنے دل میں ماہر القادری، راجہ صاحب محمود آباد اور حکیم مرزا حیدر بیگ کا شکریہ ادا کیا۔ اگر انھوں نے ہم پر اپنی خاص نظر عنایت نہ کی ہوتی تو ہم نہ اتنا کامیاب اور دلچسپ جلسہ کرتے اور نہ انجمن کے لیے اتنی بہت سی رقم جمع کرتے۔ (سعادت حسن منٹو نے حکیم صاحب کا نام مرزا ''ہینڈ بیگ'' رکھ دیا تھا۔ یہ نام ان سے بری طرح چپک گیا اور عام طور پر لوگ انھیں اسی نام سے یاد کرنے لگے۔)

ملک کی عام جمہوری تحریک کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ہمارے ترقی پسند ادب کی تحریک عوام میں مقبول ہوئی، اسی تناسب سے رجعت پرست عناصر (جن میں فرقہ پرست سب سے نمایاں تھے) کا غصہ بھی ہمارے خلاف بڑھتا جاتا تھا۔ وطن کے عوام سے ہمارا پیغام، اتحاد، باہمی آشتی، ترحم، تہذیب، سامراج اور جمہوریت کے دشمنوں کے خلاف جدوجہد کا اور ان کا باہمی منافرت اور سامراج سے سمجھوتے اور دوستی کا پیغام تھا۔ جوش صاحب نے اس زمانہ میں ایک طویل سیاسی نظم لکھی جو مادر وطن اہل وطن، اور ملک کی بڑی سیاسی جماعتوں سے خطاب کرتی ہے۔ لکھنؤ میں ترقی پسندوں نے ایک خاص جلسہ عام کیا جس میں جوش صاحب نے یہ نظم بڑے شد و مد

کے ساتھ پڑھی۔ عام لوگوں میں یہ نظم بہت مقبول ہوئی لیکن ان لوگوں کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے جو ہندو مسلم عوام کے جمہوری اتحاد کے مخالف تھے۔

احمد آباد گو گجرات کا دارالحکومت ہے۔ لیکن وہاں پر اُردو بولنے والوں کی کافی بڑی تعداد ہے اور اُردو زبان کی روایتیں وہاں پر صدیوں پرانی ہیں۔ گجرات پنجاب کی طرح ہندستانی بولنے والے علاقے سے متصل صوبہ ہے۔ اس لیے گجراتی عام طور سے ہندستانی سمجھ لیتے ہیں۔ نیز احمد آباد کے سوتی ملوں کے مزدوروں میں کافی بڑی تعداد شمالی ہند کے اُردو بولنے والے مزدوروں کی ہے۔ ان کا طبقاتی اور سیاسی شعور بھی کافی بلند ہے اور احمد آباد کی مزدور تحریک میں وہ ہمیشہ آگے بڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ان میں اچھے اچھے شاعر بھی ہیں۔ تبسم اور وحید بنارسی کی سیاسی اور انقلابی نظمیں ہمارے ہفتہ وار ''نیا زمانہ'' میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی تھیں۔ احمد آباد میں گجراتی کے ترقی پسند مصنّفین کی انجمن پروفیسر ہیرالال گودی والا اور بھوگی لال گاندھی نے 1936 میں ہی قائم کی تھی، جس میں گجراتی کے کئی ممتاز شاعر اور ادیب شامل ہوئے۔ یہ انجمن بنتی اور ٹوٹتی رہی۔ 1946 میں وہاں اُردو کی انجمن کی بھی ایک شاخ بنی جس میں کئی کالج کے طلبا، مل کے مزدور اور دوسرے لوگ شامل ہوئے اور انھوں نے احمد آباد میں ترقی پسند مصنّفین کی جانب سے ایک اُردو کانفرنس، انجمن کے مرکز سے مشورہ کر کے منعقد کی۔ احمد آباد کے رفیقوں کا ہم سے مطالبہ تھا کہ ہم بمبئی سے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی بڑی سے بڑی تعداد احمد آباد بھیجیں اور کانفرنس کا پروگرام بنائیں۔ ہمارا ان سے یہ مطالبہ تھا کہ کانفرنس کے اخراجات اور احمد آباد کی انجمن کے ضروری مصارف کے بعد کانفرنس اور مشاعرے سے جو رقم جمع ہو وہ مرکز کو دی جائے تا کہ ہم ''نیا ادب'' کو باقاعدگی سے نکال سکیں اور اسے بہتر بنا سکیں۔ احمد آباد والوں نے ہماری شرطیں بخوشی قبول کیں۔ بمبئی سے جوش صاحب، مجاز، ممتاز حسین، کرشن چندر، حمید اختر، کیفی، مجروح، ساحر، سردار جعفری، نیاز حیدر، اور میں کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے۔ ممکن ہے اور بھی چند آدمی رہے ہوں لیکن اب مجھے ان کے نام یاد نہیں۔

کانفرنس کے لیے احمد آباد کا سب سے اچھا اور خوبصورت بنا ہوا ہال منتظمین نے میونسپلٹی سے کرایہ پر لیا تھا۔ یہ بھی بغیر مخالفت کے نہیں ہو سکا۔ احمد آباد کی میونسپلٹی میں کانگریس والوں کی

اکثریت تھی۔ انھیں ہمیں ہال دینے پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن بعض مسلم لیگی عناصر نے اس کی مخالفت کی۔ انھوں نے کانگریس کا دشمن ہونے کے باوجود ان کے ساتھ سازباز شروع کی اور کہا کہ ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس کے عام مسلمان خلاف ہیں۔ کانفرنس سے نقضِ امن کا خطرہ ہے۔ اس لیے ہال ہمیں نہ دیا جائے۔ ان کی اس دھمکی سے کام نہیں چلا۔ بعض دوسرے زیادہ سمجھدار مسلمانوں نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا، اور بالآخر کانفرنس کے لیے ہال مل گیا۔ اب شہر میں یہ افواہیں اڑائی جانے لگیں کہ مسلم لیگی کانفرنس کو توڑ دیں گے۔ اس میں مار پیٹ ہوگی، لوگوں کو اس میں شریک نہ ہونا چاہیے وغیرہ۔

گو اس کانفرنس میں بھی داخلہ ٹکٹ سے تھا۔ لیکن ہم جب ہال میں داخل ہوئے تو وہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس میں آٹھ سو، ہزار کے قریب آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ کوئی کرسی خالی نہ تھی۔ بہت سے لوگ کھڑے ہوئے بھی تھے۔ اس ہال میں جس کا ڈائس بالکل تھیئٹر کے اسٹیج کی طرح بنا ہوا تھا، اور ہمارے احمد آباد کے منتظمین نے غضب یہ کیا ہوا تھا کہ ڈائس کے کنارے پر رفلکٹروں والی زمینی روشنی (فٹ لائٹ) لگا دی تھی، جس کی وجہ سے ہم لوگوں پر جو باہر سے آئے تھے اور اسٹیج پر دو لائنوں میں بٹھائے گئے تھے، تھیئٹر کے ایکٹروں کی طرح تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ ہزاروں آنکھوں کی زد میں مسلسل کئی گھنٹے تک رہنا ویسے بھی تکلیف دہ ہے۔ میرے خیال میں ہم میں شاید ہی کوئی ایسا رہا ہو جسے لیڈر قسم کے لوگوں کی طرح اپنی نمائش کا شوق رہا ہو۔ پھر یہ مجمع ہمارے لیے اجنبی تھا۔ زیادہ سے زیادہ ہم میں سے چند کے ناموں سے بعض لوگ واقف رہے ہوں۔ جوش، کرشن چندر، مجاز کی صورتیں ہی دیکھنے بہت سے لوگ آئے ہوں گے۔ میں اپنے دل میں سوچتا رہا کہ ہماری قوم اپنے ادیبوں اور شاعروں سے کتنی محبت کرتی ہے کہ ٹکٹ لے کر اتنے بہت سے آدمی وہاں پر جمع ہو گئے ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ اس مجمع میں ہمارے بہت سے مخالف بھی ہوں گے۔ ہمارے احمد آباد کے دوستوں نے (وارث علوی، تبسم، قادری وغیرہ جو کانفرنس کے منتظمین میں سے تھے) ہمیں بتایا تھا کہ بعض حلقوں کی جانب سے کانفرنس میں گڑبڑ کر کے اسے توڑ دینے کی دھمکی برابر جاری ہے، اور حالانکہ وہ مجھے یہی یقین دلاتے رہے کہ مخالف کچھ بھی نہیں کر سکیں گے، لیکن ان کی گھبراہٹ چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ کیا ہم اپنے دوستوں اور

خیر اندیشوں کی توقعات پوری کر سکیں گے؟ کیا وہ ہمارے شعر و ادب، ہماری گفتار، اور ہمارے کردار کے اس مظاہرے سے مطمئن ہوں گے؟ ہمارے مخالف کانفرنس میں کیا رویہ اختیار کریں گے؟

پہلے دن کانفرنس کوئی ڈھائی تین گھنٹے رہی۔ اس دن کے صدر غالباً کرشن چندر تھے۔ ان کا خطبہ، سیکریٹری کی رپورٹ اور پھر اس کے بعد چند شاعروں کی نظمیں، اور بس...... دوسرے دن میں صدر تھا۔ اس دن کے پرگرام میں ممتاز حسین اور حمید اختر کے مقالے اور سردار جعفری کی تقریر اقبال کی شاعری پر تھی۔ آخر میں چند شاعروں کو نظمیں سنانی تھیں۔ جب پہلے دن کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تو لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ دوسرے دن گڑبڑ ضرور ہوگی۔ اس کی وجہ سے ہمارے ذہنوں میں کافی تناؤ تھا۔ میں جب صدارتی تقریر کر چکا تو جعفری کی تقریر شروع ہوئی۔ جعفری بہت اچھے مقرر ہیں۔ ان کی تقریر میں روانی اور جوش ہوتا ہے اور ان کی دلیلیں منطقی ہوتی ہیں۔ جب وہ کوئی پندرہ منٹ تک بول چکے اور معلوم ہو رہا تھا کہ مجمع ان کی تقریر سے متاثر ہو رہا ہے، تو مجمع کے درمیان سے ایک صاحب ایک دم کھڑے ہو گئے اور بڑے ہیجانی انداز میں چلّا چلّا کر کہنے لگے کہ...... ”جعفری صاحب اقبال کو غلط رنگ میں کمیونسٹ بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ ان کی تقریر سے اقبال کی اسلامی روح بے چین ہوگی۔ ہم اس تقریر کو سننا نہیں چاہتے۔“

یہ حضرت مقامی مسلم لیگ کے بہت سرگرم لیڈروں میں سے تھے۔ پستہ قد، بہت دبلے پتلے، سیاہ فام، سونے کی کمانی کی عینک لگائے ہوئے اور سر پر اپنے سر سے بھی بڑی سیاہ بالوں کی ٹوپی اوڑھے ہوئے۔ تین چار صاحبوں نے ان کی حمایت میں ”نعرۂ تکبیر اللہ اکبر“ بلند کیا۔ دوسری طرف مجمع میں بہت سے لوگوں نے غصہ میں آ کر چلّانا شروع کیا...... ”بیٹھ جاؤ! بیٹھ جاؤ!“ جعفری کی تقریر رک گئی۔ میں فوراً کھڑا ہو گیا اور سب سے خاموش ہو جانے کی درخواست کی۔ پھر میں نے ان صاحب سے کہا کہ ”جعفری صاحب ہمارے پروگرام کے مطابق تقریر کر رہے ہیں۔ اس کا پہلے سے اعلان کیا گیا تھا۔ یہاں پر اکثر لوگ ان کی تقریر بھی سننے کے لیے آئے ہیں۔ البتہ بعض لوگوں کو ان کے نقطۂ نظر پر اعتراض ہو سکتا ہے، جیسا کہ آپ کو ہے۔ جعفری کی تقریر کے بعد میں آپ کو موقع دینے کے لیے تیار ہوں کہ آپ بھی یہاں آ کر اپنا نقطۂ نظر پیش کریں۔ لیکن ان کی

تقریر کے درمیان غل مچانا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر آپ اس کے لیے تیار نہیں ہیں تو آپ لوگ جلسہ سے باہر جا سکتے ہیں۔'' مجمع پر خاموشی طاری ہوگئی۔ وہ صاحب کچھ بڑبڑا کر خاموش ہو گئے، جعفری نے تقریر دوبارہ جاری کی۔ اقبال، ان کی شاعری اور ان کا فلسفہ، جعفری کا مرغوب موضوع ہے۔ کبھی کبھی تو ہم بھی جعفری کی اقبالیات سے عاجز آ جاتے تھے۔ اب اس اعتراض کے بعد تو انھوں نے اور بھی جوش میں آ کر تقریر کی۔ اقبال کا بہت سا کلام انھیں ازبر ہے۔ اپنے دلائل کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے اقبال کے اتنے فارسی اور اُردو کے برمحل اشعار پڑھے کہ ایک سماں سا چھا گیا۔ ان کے بعد میں نے معترض صاحب سے کہا کہ وہ ڈائس پر آ کر تقریر کریں۔ وہ کسی قدر گھبرائے ہوئے تھے۔ انھوں نے کوئی دس پندرہ منٹ بے ربط اور ہیجانی انداز میں تقریر کی جس میں کمیونسٹوں پر بے سروپا الزامات اور دھمکیاں زیادہ اور اقبال کی شاعری کے متعلق موصوف کا نقطۂ نظر کم تھا۔ لیکن ان کی اس تقریر کے بعد، غالباً جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ مجمع کو منتشر کرنے اور ہم پر ناراض ہو کر حملہ کروانے میں ناکام ہو گئے تو ان کا بھی جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور کانفرنس کی کارروائی پروگرام کے مطابق جاری رہی۔ اس کے بعد پھر کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔

تیسرے دن کے آخری اجلاس میں مشاعرہ تھا۔ اس دن مجمع سب سے زیادہ تھا۔ باہر سے آنے والے مہمانوں کے علاوہ بہت سے مقامی شاعروں نے بھی اپنی نظمیں اور غزلیں مشاعرے میں سنائیں۔ آخر میں تقاضہ کر کے جوش صاحب، کیفی، جعفری، ساحر، مجروح، اور نیاز حیدر کو لوگوں نے بار بار پڑھوایا۔ بڑی رات گئے مشاعرہ برخاست ہوا، اور کانفرنس خیر و خوبی کے ساتھ ختم ہوئی۔

احمد آباد سے جوش صاحب اور کرشن چندر بمبئی واپس چلے گئے۔ باقی لوگ سورت گئے جہاں کے ترقی پسندوں نے ہمیں ایک دو دن کے لیے مدعو کیا تھا۔ سورت کے نام سے ہمارے ذہن میں ولی دکنی کا خیال آتا ہے۔ انگریز کے پہلے مرکز کا، جہاں سے وہ ہمارے وطن میں داخل ہوئے، مغلیہ عہد کی سب سے بڑی بندرگاہ کا، لیکن جدید سورت میں سوائے دریائے نربدا کے کنارے کچھ دیواروں اور کھنڈروں کے اس قدیم سورت کی کوئی نشانیاں نہیں معلوم ہوتیں۔ سورت میں اُردو کا چلن (گو وہاں کے عام لوگوں کی زبان گجراتی ہے) غالباً اس زمانے کی سب

سے بڑی نشانی ہے۔ وہاں ہم بہت سے ایسے شاعروں سے ملے (جن میں سے اکثر مسلمان تھے) جو گجراتی اور اُردو، دونوں میں غزل کہتے ہیں۔ سورت میں ہمارا بڑا پرتپاک خیر مقدم ہوا، جس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہاں کے مقامی مسلم لیگ کے لیڈر بھی اس میں پیش پیش تھے۔ سورت میں ہمارے اجتماع کی صدارت مشہور گجراتی ادیب اور جرنلسٹ فخر ماتری صاحب نے کی۔ وہاں دو دن کا پروگرام تھا، اسی طرح کا جیسا کہ احمد آباد میں، لیکن اس سے چھوٹے پیمانے پر۔ پہلے دن تقریریں ہوئیں، مقالے پڑھے گئے اور دوسرے دن مشاعرہ ہوا۔

میں نے محسوس کیا کہ احمد آباد میں، اور سورت میں اس سے بھی زیادہ، جس کا مجمع اس میں سننے کے لیے جمع ہوا تھا، اس میں مقالہ پڑھنا ذرا زیادتی ہی تھی اور پھر ممتاز حسین کا مقالہ، اس کا ثقیل طریقے سے پرمغز ہونا ہی غالباً ان جگہوں پر اس کی سب سے بڑی غیر موزونیت تھی۔ مجمع خاموشی اور لحاظ کے ساتھ اسے سنتا رہا۔ لیکن وہاں پر اسے سمجھنے والے کم ہی معلوم ہوتے تھے۔ ادبی موضوعات پر بہت ہلکی پھلکی تقریریں تو لوگ برداشت کر لیتے تھے، لیکن ادب کے پیچیدہ مسائل پر مقالہ سننا غالباً وہ نہیں چاہتے تھے۔ ممتاز کی آواز بھی، ان کی تحریر کی طرح صاف نہیں ہے۔ یہ اور بھی مشکل تھی۔ سورت میں مشاعرہ کیفی اعظمی کے ہاتھ رہا۔ آخر میں لوگ باصرار انھیں کو گھنٹے، دو گھنٹے تک سنتے رہے۔ انھوں نے اپنی سیاسی نظمیں بڑے زوردار اور مخلص انداز میں تحت اللفظ میں سنائیں جس کے وہ اس وقت ماہر ہو گئے تھے، اور جو ان کے کلام کے انیسی رنگ کے لیے موزوں بھی ہے۔ ہر نظم ختم کرنے کے بعد مجمع کی جانب سے اصرار ہوتا تھا کہ وہ اور سنائیں تو کیفی میری طرف دیکھتے تھے کہ کیا رائے ہے؟ ایسے موقعوں پر میری قطعی رائے یہ ہوتی تھی کہ ترقی پسند شاعروں کو روایتی شاعروں کی طرح مشاعروں میں نخرے بالکل نہ کرنا چاہیے اور خندہ پیشانی سے حاضرین کے مطالبات پورے کرنے چاہئیں۔ جب میں اچھے اچھے سنجیدہ شاعروں کو مشاعروں میں شریک ہونے والے عوام کی ہمت اور ان کی بے عقلی یا کم عقلی کا رونا روتے ہوئے سنتا تھا، تو مجھے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ اس طرح وہ دراصل خود اپنی بڑائی اور غرور کا اظہار کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مشاعروں میں کبھی کبھی تحسین ناشناسی ہوتی ہے اور بے ادبی کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی حرکتیں کرنے والے عام طور سے تھوڑے سے لوگ ہوتے ہیں۔ عام طور سے ہمارے

مشاعروں میں جن شاعروں کا مذاق اڑایا جاتا ہے یا جن کو لوگ ایک موقع پر سننے سے ہی انکار کر دیتے ہیں ان کی شاعری یا تو ہوتی ہی ہے گھٹیا قسم کی، یا وہ ایسی چیزیں پڑھتے ہیں جو مشاعرہ میں پڑھنے کے لیے کسی نہ کسی سبب سے ناموزوں ہوتی ہیں، یا ان کے پڑھنے کا انداز مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ میں نے کسی مشاعرے میں مشہور یا مستند شاعروں کا مذاق اڑاتے ہوئے نہیں سنا۔ مولانا حسرت موہانی کی آواز بہت ہی خراب تھی اور وہ مشاعروں میں شعر بھی پھٹی ہوئی آواز میں بری طرح پڑھتے تھے۔ لیکن لوگ انھیں ہمیشہ بڑے غور اور احترام سے سنتے تھے۔ بہرحال ترقی پسندوں کو عوام کی رائے اور منشا کا احترام ہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ عوام کی طرف ان کا رویہ انسیت اور رفاقت کا ہونا چاہیے۔ اگر کبھی کسی مشاعرہ میں ان کا کلام پسند نہیں کیا جاتا تو انھیں حاضرین سے ناراض ہوکر روٹھنا نہیں چاہیے، اور یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ لوگ جاہل یا بیوقوف ہیں، اور وہ خود اتنے بڑے علامہ دہر ہیں کہ ان کا کلام بلاغت عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ بالغرض اگر ایسا ہے بھی تو یہ ان کی اپنی حماقت تھی کہ انھوں نے مشاعرے میں ایسا کلام پڑھا۔ بہرحال اگر شاعر ترقی پسند ہے تو اسے ایسے ناخوشگوار موقعوں پر سنجیدگی سے یہ سوچنا چاہیے کہ اس کے کلام، اس کے پڑھنے کے انداز، یا موقع اور محل کی کون سی خرابی یا ناموزوئی تھی، جس کے سبب سے وہ مقبول نہ ہوسکا؟ ہمارے عوام اپنے ادیبوں اور خاص طور پر اپنے دل پسند شاعروں سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ ان کے اخلاق و کردار کی خامیوں اور کمزوریوں کی طرف سے بھی وہ چشم پوشی کرتے ہیں۔ تو پھر اگر ہمارے شاعر اپنے عوام سے التفات برتیں، ان کی عزت کریں، اور ان کی محبت کے بدلے میں اپنی طرف سے بھی ان کو لطف و مدارات، اخلاص و عقیدت کی پیشکش کریں تو یہ جمہوری اخلاق کے عین مطابق ہوگا۔

○○○

تحریک اور اُردو ہندی اور دُوسری زبانیں

جاڑوں کے موسم میں مشاعرے کرنے کا دستور ہمارے یہاں عام ہے۔ لیکن اب جہاں بھی ان مشاعروں کی تنظیم میں ترقی پسندوں کا ہاتھ ہوتا تھا، وہ اس کی کوشش کرتے تھے کہ مشاعرے کے علاوہ ادبی کانفرنس بھی ہو، نیز مشاعرے نئے طرز کے ہوں، یعنی ان میں صرف طرحی غزلیں نہ پڑھی جائیں بلکہ شعرا اپنا ہر قسم کا کلام سنائیں۔ غزل کی جگہ نظم خوانی کی محفلوں کی بنیاد تو محمد حسین آزاد، اور حالی وغیرہ ہی ڈال چکے تھے۔ یہ بھی دستور عام ہو چکا تھا کہ سیاسی اور تعلیمی کانفرنسوں اور تقریبوں میں نظمیں پڑھی جانے لگی تھیں۔ لیکن نظم کو مشاعرہ کا اہم جز بنانے اور اسے مقبولیت عام دینے میں ترقی پسندوں کا کافی حصہ ہے۔

اسی زمانے میں گورکھپور سے ہمارے پاس مجنوں کا خط آیا کہ وہاں سینٹ اینڈریوز کالج کے لڑکے ہر سال مشاعرہ کرتے ہیں، لیکن اب وہاں بھی ادبی کانفرنس ہوگی۔ مجنوں نے لکھا کہ وہ اس موقع پر خاص کوشش کریں گے کہ پرانے مکتب خیال کے سنجیدہ ادبا اور شعرا کے ساتھ ساتھ ذمہ دار اور اچھے ترقی پسند بھی جمع ہوں تاکہ دونوں گروہ والوں کو ایک دوسرے سے بے تکلفی کے ساتھ ملنے اور ادبی مسائل اور باہمی اختلافات پر بالمشافہ گفتگو کرنے کا بھی موقع ملے۔ گورکھپور میں ہماری انجمن کی کوئی شاخ نہ تھی۔ لیکن مجنوں کی ذات ہی ایک انجمن تھی۔ میں برسوں پہلے ان سے

تھوڑی دیر کے لیے لکھنؤ میں علیم کے گھر پر ملا تھا۔ اس کے بعد ان سے ملنے کا اشتیاق رہا، لیکن کبھی موقع نہ ملا۔ تاہم مجنوں کے مضامین اور دوسری نگارشات کے ذریعہ اور پھر کئی مشترک دوستوں (فراق، علیم،) کے وسیلے سے میں ان سے کافی واقف تھا۔ وہ ہماری زبان کے صاحبِ طرز ادیبوں، نکتہ رس اور فہیم نقادوں اور علم دوست شخصیتوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک سے اس کے آغاز سے ان کا الحاق میرے نزدیک کافی اہم بات تھی۔ مجنوں اپنی گوشہ نشینی کے لیے مشہور تھے، ان کے والد گورکھپور کے مسلمانوں کے بڑے گرم جوش لیڈر تھے اور صوبۂ متحدہ کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر تھے، جہاں پر وہ اپنی گرم کلامی کے لیے مشہور تھے۔ اس کے برخلاف مجنوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ذاتی نام ونمود، جلسوں یا کانفرنسوں میں شرکت یا تقریر کرنے یا سیاست میں براہ راست حصہ لینے سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ گو ان کی ہمدردیاں قوم پرست اور اشتراکی سیاست کے ساتھ ہیں۔ ان کا کام بس گورکھپور کے کالج میں انگریزی پڑھانا، مطالعہ اور کبھی کبھی لکھنا تھا۔ وہ ہماری ادبی کانفرنسوں میں بھی کبھی شرکت نہیں کرتے تھے۔ غالباً اس کا ایک سبب ان کی صحت کی خرابی بھی تھی۔ جب ایسے شخص کی جانب سے ہمارے پاس یہ اطلاع آئی کہ وہ گورکھپور میں ادبی کانفرنس منعقد کرنے میں منہمک ہیں تو ہمیں تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی۔ اس سلسلے میں بمبئی سے سردار جعفری، مجنوں کے ساتھ خط وکتابت کررہے تھے۔ ہم نے طے بھی کیا کہ بمبئی سے سردار جعفری گورکھپور جائیں۔ لیکن آخر وقت پر کسی سبب سے وہ نہیں جا سکے اور ان کی جگہ مجھے گورکھپور جانا پڑا۔ بمبئی سے میرے علاوہ اور کوئی نہ جا سکا۔ خود یو۔ پی میں بہت سے ترقی پسند موجود تھے جو ہماری تحریک کی گورکھپور کی کانفرنس میں نمائندگی کر سکتے تھے۔

گورکھپور کی کانفرنس میں نثر نگار ادبا کم تھے اور باہر سے آئے ہوئے اور مقامی شعرا بہت بڑی تعداد میں تھے۔ چنانچہ جہاں تک نثر کے حصے کا تعلق تھا، کانفرنس کا یہ پہلو بہت کمزور رہا۔ میں بھی عدیم الفرصتی کے سبب سے کانفرنس میں پڑھنے کے لیے کوئی ادبی مقالہ نہ لکھ سکا تھا اور سارے وقت یہ سوچتا رہا کہ محض ایک دو تقریر کرنے کے لیے بمبئی سے چل کر اتنی دور آنا کہاں تک درست ہے؟ مجھے تو خیر بہت سے ادیبوں، شاعروں اور دوستوں سے ملنے کا موقع ملے گا اور اپنے وطن کی سرسبز زمین کی سوندھی خوشبو دار اور میٹھی زبان کی چاشنی سے جان کو تازہ کروں گا۔ لیکن وہ

لوگ جنھوں نے مجھے آنے جانے کا کرایہ دے کر بلایا ہے اور جن کی محبت بھری مہمانداری ہر لمحے اور ہر طرف سے مجھے گھیرے میں لیے ہوئے ہے، محض میرے زبانی جمع خرچ پر اکتفا کرنے پر مجبور ہوں گے۔ بہر حال اگر وہ مجھ سے مایوس بھی ہوئے تو ان اچھے میزبانوں کی طرح، جو خود بھوکے رہ کر بھی بہت زیادہ کھانا کھا جانے والے مہمان کی ہوس پوری کرتے ہیں اور اپنی پیشانی پر ذرا بھی بل نہیں پڑنے دیتے، میرے گورکھپور کے میزبانوں نے اپنی بےاطمینانی کو مجھ پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔

مجنوں نے مجھے بتایا کہ انھوں نے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے پروفیسر رشید احمد صدیقی اور اقبال احمد سہیل صاحب کو خاص طور پر مدعو کیا ہے۔ اس زمانہ میں یو۔ پی میں ترقی پسند تحریک کے خلاف ایک نئی لہر اُٹھی تھی۔ لکھنؤ میں ایک کتاب ''مداوا'' کے نام سے شائع ہوئی تھی جس میں بڑے غیر سنجیدہ اور سوقیانہ انداز میں ترقی پسند ادب پر حملے کیے گئے تھے۔ احتشام حسین اور دوسرے ترقی پسندوں نے ''مداوا'' میں کیے گئے اعتراضات کے جوابات شائع کیے۔ ہمیں اس سلسلے میں سب سے زیادہ افسوس اور تعجب اس بات پر ہوا تھا کہ رشید احمد صدیقی صاحب کا بھی ایک مضمون ''مداوا'' میں شائع ہوا تھا۔ ترقی پسند ادیب ان سے اچھی طرح واقف تھے اور وہ ان سے۔ علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تمام نوجوان ترقی پسند شاعر اور ادیب رشید صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے۔ رشید احمد صدیقی صاحب نے کبھی ترقی پسند تحریک کی مخالفت نہیں کی تھی۔ یوں انھوں نے غالباً کبھی اس تحریک کی فکری بنیادوں کو اچھی طرح سمجھنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کے مزاج کی بےساختہ مزاحیت اور قدامت پسندی انھیں ایک دلچسپ معلم اور مزاح نگار بنائے تو بنائے، ادب کی کسی بھی صنف کا سنجیدہ اور پرمغز نقاد نہیں بننے دیتی۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کی بنا پر رشید صاحب ترقی پسند تحریک سے یکایک برافروختہ ہو گئے۔ انھوں نے اس کے خلاف جو مضمون لکھا وہ ''مداوا'' میں شائع ہوا۔ اس کو پڑھنے سے یہ افسوسناک انکشاف ہوتا تھا کہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے شعبۂ اُردو کا صدر اُردو زبان کی اس اہم تحریک اور اس کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب سے کماحقہ، واقف تک نہیں ہے، اور اس کے ذہن میں تعصب اور بداندیشی نے تاریکی کے کثیف جالے بُن دیے ہیں۔ پھر بھی رشید احمد صاحب کی شرافت طبع، ادب نوازی،

مذاق سلیم سے ہمیں اس کی توقع تھی کہ اگر اختلاف فیہ مسائل پر ان سے گفتگو کی جائے تو معاملات بڑی حد تک سلجھائے جاسکتے ہیں۔ مجنوں نے اسی خیال سے انھیں گورکھپور کانفرنس میں بلایا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ تشریف نہ لاسکے۔

اقبال سہیل صاحب اعظم گڑھ کے اچھے غزل گوشاعروں میں سے ہیں۔ رشید صاحب کی طرح وہ بھی بلادِ شرقیہ کی ان ہستیوں میں سے ہیں، جن کے مزاج اور جن کی ادبیت کا خمیر علی گڑھ یونیورسٹی اور مولانا شبلی کے مکتب خیال سے مل کر بنا ہے۔ مولانا شبلی کے جانشین، علامہ سید سلیمان ندوی اور ندوۃ المصنّفین، اعظم گڑھ کے بعض دوسرے اراکین (مثلاً مولانا عبدالسلام ندوی،) جن کو ادبی ذوق تھا، ترقی پسند ادب کی تحریک کی جانب سے ہمیشہ مشفقانہ اور دوستانہ رویہ رکھتے تھے۔ انھوں نے بعض امور پر تحریک کے ساتھ اپنے اختلافات کا اظہار کیا اور اس پر نکتہ چینی بھی کی۔ لیکن اس میں ہمیشہ سنجیدگی کا پہلو رہتا تھا۔ اگر ہم کبھی ان اعتراضات سے متفق نہیں بھی ہوئے تھے تو اس پر ہمیشہ غور کرتے تھے، اور اگر انھیں صحیح سمجھتے تھے تو اپنی اصلاح کی کوشش...... بہرصورت ان بزرگوں اور عالموں کی نگارشات کو پڑھنے، ان سے گفتگو کرنے اور ملنے سے ہمارے قلیل مبلغ علم میں اضافہ ہوتا تھا اور اپنی تہذیبی اور اخلاقی روایات کے بہت سارے پہلوؤں پر روشنی پڑتی تھی، جن سے ہم اکثر افسوسناک حد تک بے بہرہ تھے۔ لیکن جن سے واقفیت ترقی پسند ادبی تحریک کے نامیاتی ارتقا کے لیے ضروری تھا۔

ان حضرات کے گورکھپور نہ پہنچنے کے سبب سے کانفرنس کا وہ جو مقصد تھا کہ مختلف ادبی خیالات رکھنے والوں کے مابین، دوبدو اور ادبی فضا میں گفتگو اور بحث کر کے کم از کم غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا جائے، اس کی تکمیل نہیں ہوسکی۔ پھر بھی یہاں یو۔ پی کے مشرقی اضلاع سے، خاص طور پر اعظم گڑھ، جونپور، گونڈہ وغیرہ سے کافی لوگ آئے تھے۔ ترقی پسندوں میں وہاں پر مجنوں کے علاوہ فراق، جاں نثار اختر، اور وامق موجود تھے۔ جگر صاحب تو گورکھپور کی ادبی زندگی کے روح رواں ہیں۔ یوں تو میں نے کوئی ایسا مشاعرہ نہیں دیکھا جس میں لوگ ان کے والہ وشیدا نہ ہوں۔ لیکن گورکھپور میں ان کی ہردلعزیزی کے ساتھ قرابت و یگانت کی فضا بھی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ گونڈہ میں سکونت پذیر ہونے کے سبب سے جگر صاحب گورکھپور کے بھی اتنے ہی سمجھے

جاتے تھے جتنا کہ گونڈہ کے۔ گورکھپور کے ادب نوازوں کے یہاں مہینوں ان کا قیام رہتا تھا اور وہاں ان کی ادبی محفلوں کے چراغ فروزاں تھے۔ گونڈے کے ایک اور شاعر ذوقی صاحب سے یہاں میں پہلی بار ملا اور ان کے کلام سے محظوظ ہوا۔

اپنی طالب علمی کے زمانے میں جگر صاحب کو میں کئی بار مشاعروں میں سن چکا تھا اور دُور سے ان کی زیارت بھی کی تھی۔ گورکھپور میں پہلی بار ان سے ملنے کا موقع ملا۔ ہمارے غزل گو شاعروں میں برسوں سے وہ سب سے زیادہ مقبول اور محبوب تھے۔ ان کا کلام خواص سے زیادہ عوام کے لیے غیر معمولی کشش رکھتا تھا۔ حیات و منفوع اور پیچیدہ مسائل پر فکر و نظر کی گہرائی ان کے ہاں نہ تھی۔ لیکن عشق و محبت کے خواب کی وادی میں بیٹھ کر انھوں نے ایسے رسیلے گیت گائے تھے، جنھیں ہر شخص گنگنانا چاہتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ لوگ ان سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور جس بڑے مشاعرے میں جگر نہ پڑھیں، اسے لوگ ادھورا سمجھتے ہیں اور ان کی تسکین نہیں ہوتی۔ ایسی ہر دلعزیزی کسی انسان کے لیے بھی قابل فخر ہے۔ جب میں جگر صاحب سے ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ ان کی شخصیت کی سادگی اور خلوص، اور ان کا انکسار اور حلم بھی یقیناً ان کی شاعری کی عظیم مقبولیت کے اسباب میں سے ہے۔ وہ لوگوں سے ملتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اس کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دے رہے ہیں کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے۔ بلکہ اس کے دل کو ٹٹول رہے ہیں، اور دیکھ رہے ہیں کہ یہ انسان بھی ہے یا نہیں ہے۔ ان کے انسانیت کے معیار سے اختلاف کر سکتے ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ جگر صاحب چونکہ بہت زیادہ نیک اور سیدھے سادے انسان ہیں، اس لیے انھیں اس سلسلے میں کبھی کبھی دھوکا بھی ہوتا ہے اور مایوسیاں بھی۔ لیکن اس کی وجہ سے ان کی اپنی انسانیت اور دردمندی میں فرق نہیں آتا، بلکہ وہ زیرلب اپنی ہی محرومی کا رنج کر کے چپ ہو جاتے ہیں۔

لاکھ آفتاب پاس سے ہوکر گزر گئے
بیٹھے ہم انتظارِ سحر دیکھتے رہے

گورکھپور کے اس ادبی اجتماع میں مجھے یہ بات نمایاں معلوم ہوئی کہ یہاں ترقی پسندی یا غیر ترقی پسندی کے مباحث اور جھگڑے بالکل ہی موجود نہ تھے۔ ہزار دو ہزار انسان، جن میں سخن

شناس بھی رہے ہوں گے اور وہ بھی جن کی شعر فہمی کی سطح سادہ ہوگی، اس بات سے ہی خوش بلکہ شکر گزار معلوم ہوتے تھے کہ اتنے بہت سے مشہور اور اچھے شاعر دُور دُور سے آ کر اپنا کلام انھیں سنا رہے ہیں۔ ایک مضافاتی شہر کی نسبتاً بے کیف اور پرسکون زندگی میں یہ چہل پہل، یہ رونق، شعر کا ترنم اور نغمگی، اور حسن و محبت سے سرشار مرقعوں کی رنگینیاں، ایک نورانی آبشار کی طرح ان کے دل و جان کو تازہ اور مسرور کر دیتی ہوں گی۔

ہمارے بعض نقادوں نے غالباً خود اپنی ذہنی برتری اور افضلیت کا اظہار کرنے کے لیے یہ رویہ اختیار کر لیا ہے کہ شعر کی کنہ اور ماہیت، اس کی فکری اور نظریاتی بلندی اور فنی حسن کا پتہ چلانے کی اشک آور کاوش اور جدوجہد کے بعد ہزاروں شعروں، بیسیوں اصناف سخن اور بیشتر شاعروں کو اپنے اعلیٰ معیار سے گرا ہوا قرار دے کر ان سب کو مسترد کر دیتے ہیں اور وہ اپنی ہی بنائی ہوئی بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز معیاری چوٹیوں کی نوک پر خود کو تراز و کر کے ادبی دنیا کی پست مخلوق کا حقارت کے ساتھ نظارہ کرتے ہیں اور پھر ان کی طرف سے نظریں موڑ کر حسرت کے ساتھ آسمانوں پر چمکتے ہوئے دور ستاروں کے نظارے میں محو ہو جاتے ہیں، فن کے یہ جوہری دائمی تنویر اور ابدی حیات کے اتنے گرویدہ ہیں کہ ان کے نزدیک حسن کی دیوی کے سر کا تاج محض کوہ نور سے، اس کے گلے کا ہار دُرِّ شاہوار اور اس کا کنگن لعل بدخشاں سے ہی بن سکتا ہے۔ محبت کی چھوٹی راتوں کو اپنی مختصر زندگی کی قربانی دے کر مہکا دینے والے موتیے اور چمیلی کے اجلے اور سبک گجرے انھیں حقیر اور بے مایہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ صبح ہوتے ہوتے ان کا رنگ روپ لُٹ چکتا ہے، رات کی رانی تاریکی سے بوجھل فضاؤں میں اپنے پھولوں کی خوشبو گھول کر چاروں طرف عطر بکھیر دیتی ہے۔ لیکن وہ جن کے مشام بلوریں شیشوں میں بند روحِ گلاب کے متلاشی ہوتے ہیں اور اسی کو اصلی خوشبو سمجھتے ہیں، اپنے حواس کے دریچے بند کر لیتے ہیں اور اس دورئ گریزاں نزہت کے شبینہ طلسم سے اپنے کو متاثر نہیں ہونے دیتے۔

یقینی یہ لازمی ہے کہ فن و ادب کے بلند ترین معیار قائم کیے جائیں اور ان اصولوں کو بدلتی ہوئی زندگی اور ادبی اور فنی تخلیقات کی روشنی میں مسلسل پرکھا جائے اور سائنسی اور علمی بنایا جائے۔ ان نقادوں کی کوششیں، جو ایسا کرتے ہیں، لائق تحسین ہیں۔ لیکن ایسا کرتے وقت ہمیں بعض

باتوں کی طرف دھیان رکھنا ضروری ہے۔

ایک تو یہ کہ زندگی متنوع اور رنگا رنگ ہے، اور فنون لطیفہ کی ہر صنعت، چونکہ زندگی کی ہی کسی نہ کسی طرح سے عکاسی کرتی ہے اور اسی سے اخذ کی جاتی ہے، اس لیے اس کے بھی مختلف پہلو اور مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ معاشرت اور اس کے مختلف طبقے اور گروہ جو معاشرت کے اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں، اپنے ارتقا کے دوران میں ماحول، زمانے اور معاشرتی تعلقات سے متاثر ہو کر فنون لطیفہ کی مختلف اصناف کو جنم دیتے ہیں۔ مثلاً شاعری میں گیت، رمزیہ، بیانیہ، غنائیہ شاعری وغیرہ۔ ہیئت اور ماہیت دونوں میں تبدیلی اور ارتقا ہوتا ہے۔ بعض اصناف سخن ختم ہو جاتی ہیں۔ بعض میں تبدیلی آتی ہے، نئی صنفیں، نئے طرز اور طور وجود میں آتے ہیں جو مختلف ادوار کی ذہنی اور روحانی کیفیتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ جب ہم مختلف اصناف کو جانچیں اور پرکھیں تو ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ایک صنف کا دوسری صنف سے فرق بھی دیکھیں۔ مثلاً ہمیں اس کا تو اختیار ہے کہ ہم جب دو پھولوں کا مقابلہ کریں تو گلاب کو چنبیلی پر مجموعی حیثیت سے ترجیح دیں، لیکن اگر ہم فطرت کے ان دو بہشتی تحفوں کی علاحدہ اور منفرد خوبیوں کو بھی نہیں سمجھتے، تو پھر ہماری تنقید یک طرفہ اور نامکمل اور اس لیے گمراہ کن ہوگی۔ شعر و ادب زندگی کے ہر پہلو کی ہزاروں نئے اور دلفریب انداز میں تنقید اور تصویر کشی کرتے ہیں، انھیں نمایاں کرتے ہیں اور بے شمار طریقوں سے ہمارے دل و دماغ کو متاثر اور محظوظ کرتے ہیں۔ ایک وقت اور ایک موقع پر زندگی کا ایک خاص پہلو زیادہ لائق توجہ ہوسکتا ہے...... دوسرے وقت اور دوسرے موقع پر دوسرا پہلو۔ اس کے زیادہ اہم اور کم اہم پہلو بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم سادہ عوامی گیتوں کو بھی اہمیت دیتے ہیں، اور غالب کی فکری شاعری کو بھی، میر کی پر درد عاشقانہ غزلوں کو بھی اور اپنے جدید ترقی پسند شاعروں کی پر جوش انقلابی اور سیاسی نظموں کو بھی۔ ہم ان مختلف اصناف میں بھی کھوٹے اور کھرے، سچے اور جھوٹے، مصنوعی، سطحی اور سوقیانہ اور پر خلوص، سنجیدہ اور پر وقار کی تفریق کرتے ہیں۔ لیکن ایک کو دوسرے کے ساتھ خلط ملط نہیں کرتے۔ ادب ایک بوستانِ نعیم ہے جس کی رونق رنگا رنگ پھولوں، لہراتی بیلوں، ہوا میں کھیلتے ہوئے فواروں، تلملاتی سیمیں لہروں، جھمکتے آبشاروں، پر اسرار کنجوں، کشادہ سبزہ زاروں اور گھنے تناور درختوں کی ہم آہنگی اور اجتماعیت سے پیدا ہوتی ہے۔ عظمت کا تاج تو ان

ادیبوں یا شاعروں کے سر پر ہی رکھا جاتا ہے جو اپنی تخلیق میں ساری روحِ عصر کو سمیٹ لیتے ہیں، جو زندگی کے چھوٹے اور بڑے مسائل، اس کی پستیوں، سطحوں اور بلندیوں اور پُر پیچ راہوں پر اس طرح نور افشانی کرتے ہیں کہ کشف و کرامت کے آسمانی دروازے ہمارے لیے کھل جاتے ہیں اور حق و صداقت کی دور افتادہ منزلیں، اہتزاز و انبساط کے کیف آور طوفان میں ہمارے قدموں سے لپٹی ہوئی معلوم ہونے لگتی ہے۔

لیکن کیا ہماری انسانیت اس کی متقاضی نہیں ہے کہ معمولی انسانوں کی سادہ اور معمولی آسودگیوں اور زندگی کی بیّن اور عام طور سے محسوس کی جانے والی شادکامیوں کی بھی حرمت کریں؟ وہ نغمہ جو تھوڑی دیر کے لیے دلوں کو گرما کر فضا کی خلاؤں میں ہمیشہ کے لیے کھو جاتا ہے، ہماری زندگی کے ایک وقفہ کو سرور سے پُر کرتا ہے، اس کی بھی قیمت ہے۔ بالآخر ایسے ہی گریزاں لمحوں اور وقفوں کے انبار کو ہم اپنی زندگی کا سب سے بیش بہا خزانہ سمجھتے ہیں۔ اچھی آسودہ اور خوشی کی زندگی بسر کرنا ساری نوعِ انسانی کا مدعا ہے۔ اس لیے ہر مرتبہ جب کوئی دوسروں کو آزار پہنچائے بغیر، کیف و مسرت کے ذخیرے سے اپنا حصہ لے لیتا ہے وہ اس انسانی مقصد کو اس حد تک پورا کرتا ہے۔ محبت سے سرشار ہستیاں جب جان سپاری کرتی ہیں یا محنت کرنے والے دست و بازو سے اسبابِ معیشت پیدا کرتے یا بناتے ہیں، اور اہلِ ہنر لفظ، رنگ، پتھر یا آواز اور اس کے تموج سے حسن کاری کرتے ہیں تو وہ گویا توشۂ حیات تیار کرتے ہیں۔ محبت، محنت اور ہنر کا سرمایہ جو زندگی کی اساس بھی ہے اور اس کا زیور بھی، کتنی طرح کی چیزوں اور عوامل سے مل کر بنتا ہے۔ چشمِ محبوب کی ایک جنبشِ اقرار، اور شہیدانِ وطن کے خون کے وہ قطرے جن میں قوم کی آبرو جھلکتی ہے، ایک خوشۂ گندم، اور جوہری قوت کو تسخیر کرنے والا جدید ترین نازک اور پیچیدہ آلہ، برسات کی مدھ بھری راتوں میں گایا جانے والا بِرہ کا ایک گیت، اور سخن کی تمام لطافتوں، معنویت اور تاثیر سے بھری ہوئی ایک عظیم نظم...... ان سب کی قدر و قیمت ہے۔ ان میں سے انھیں نظر انداز کرنا جن کی تخلیق بظاہر اور نسبتاً سہل یا خفیف معلوم ہوتی ہے، زندگی کی قدروں کے ذخیرے کو گھٹانے کے مترادف ہوگا، کیوں کہ آخر انھیں کے وسیلے سے زیادہ تر انسانوں کو بہت سی چھوٹی چھوٹی خوشیاں میسر ہوتی ہیں...... اور انھیں معصوم آسودگیوں اور مسرتوں کے مجموعے کو بیشتر انسان اپنی زندگی کا سب سے

پُر لطف اور خاطر خواہ زمانہ تصور کرتے ہیں۔

اس زمانے میں رفتہ رفتہ صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ اُردو کی تقریباً جتنی بھی اہم ادبی کانفرنسیں ہوتی تھیں، ان میں ترقی پسند مصنّفین کافی نمایاں حصہ لیتے تھے۔ ہماری پالیسی بھی یہ تھی کہ ہم اپنی سرگرمیوں کو محض انجمن کے جلسوں یا اس کی طرف سے ہی منعقد ہونے والے اجتماع یا مشاعروں تک محدود نہیں کرتے تھے۔ ترقی پسند ادبی تحریک ملک کی وسیع تر تہذیبی سرگرمیوں کا ایک حصہ تھی۔ اس کے ساتھ منسلک رہنا، اور تمام ان ثقافتی کاموں میں حصہ لینا جن سے کسی بھی طرح سے علم وادب کی ترقی اور فلاح ہوتی ہو، ہمارا فرض ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں ہمارے راستہ میں کبھی کبھی غیر متوقع دشواریاں پیش آتی تھیں۔ اُردو ہندی کا جھگڑا دن بہ دن بڑھ رہا تھا۔ اُردو اور ہندی، دونوں زبانوں کے ترقی پسندوں کو ایک طرف اپنی زبان کے مخالف فرقہ پرستوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دوسری طرف خود ان کی زبان کے طرفداروں اور حمایتیوں میں ایک گروہ ایسا تھا جس کا نقطہ نظر محض اپنی زبان کی حفاظت اور ترقی ہی نہیں، بلکہ دوسری زبان پر چوٹ لگانا، اس کی تحقیر کرنا، یہاں تک کہ اس کے وجود سے انکار کر کے اسے فنا کر دینے کی کوشش کرنا تھا۔ اُردو اور ہندی زبانیں ہندو مسلم فرقہ پرستی کے مہلک اور تہذیب کش تنازعہ کی آماجگاہ بن گئی تھیں جس کی وجہ سے بہت سے سنجیدہ اور سمجھدار لوگوں کے لیے بھی اس مسئلے پر اپنے دماغی توازن کو برقرار رکھنا کافی مشکل ہوگیا تھا۔ چنانچہ بعض ایسے بھی لوگ تھے جو اپنی زبان کی حد تک تو ترقی پسند بنتے تھے، لیکن جب دوسری زبان اور اس کی تعلیم اور ادب کو فروغ دینے کا سوال آتا تھا تو وہ بدترین قسم کی تنگ نظری کا اظہار کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سوالات محض ادبی یا تہذیبی نہ تھے، ان کا تعلق سیاسی مسائل، یعنی ہماری آزادی اور اس آزادی کی نوعیت سے تھا۔

مغلوں کے زمانے میں فارسی (راجہ ٹوڈرمل نے اکبر کے زمانے میں فارسی کو مغل دفاتر اور کچہریوں کی زبان بنایا تھا) اور انگریزوں کے عہد میں انگریزی زبان سرکاری زبان تھی۔ ہمارے ملک کی مختلف قومی زبانوں کو سرکاری حیثیت کبھی حاصل نہ تھی۔ اب راشٹر بھاشا کے نام پر قومی وحدت کے لیے ہندی کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ قوم پرستوں کے ایک گروہ اور مہا سبھائی فرقہ پرستوں کی طرف سے ہو رہا تھا۔ اُردو کے طرفدار کہتے تھے کہ اُردو کو قومی زبان ہونا چاہیے،

ہندی کو نہیں۔ گاندھی جی اور ان کے ہم خیال اُردو اور ہندی کے میل سے ہندستانی کو راشٹر بھاشا بنانا چاہتے تھے، جو کہ اُردو یا ہندی دونوں رسم خط میں لکھی جاسکتی تھی۔

یہ تو ہوا سارے ملک کی سرکاری زبان کا مسئلہ۔ اب رہ گیا وہ علاقہ جسے ہم ہندستانی بولنے والا علاقہ کہہ سکتے ہیں۔ جو انبالہ سے لے کر بنگال کی سرحد تک اور ناگپور سے لے کر نیپال کی سرحد تک پھیلا ہوا ہے اور جس کی آبادی تقریباً دس کروڑ ہے، جہاں کی بول چال میں اُردو ہندی کا فرق نہیں ہے۔ البتہ اس علاقے میں دو زبانیں لکھی اور پڑھی جاتی ہیں...... وہ اُردو اور ہندی ہیں۔ یہ ایک غیر معمولی صورت حال تھی جس کے اسباب تاریخی تھے۔ تقریباً آٹھ سو سال سے اُردو اور ہندی زبانوں کی دو دھارائیں اس علاقہ میں بہہ رہی تھیں۔ حالانکہ ان دونوں زبانوں کی بنیاد ایک تھی، اور ان کی نحوی ساخت تقریباً یکساں تھی۔ الفاظ کا ذخیرہ بھی ان میں کافی حد تک مشترک تھا۔ لیکن ان کے رسم خط اور الفاظ، طرز اور ان کی روایتوں میں فرق بھی تھا۔ انگریزی عہد میں انگریزی حکمرانوں نے اس فرق کو اور زیادہ بڑھانے کی کوشش کی اور فرقہ پرست عناصر نے اس کام میں ان کی مدد کی۔ دونوں زبانوں میں فطری طور پر اور ہندستانی بولنے والے علاقے میں قومی یکجہتی کے عوامی جمہوری اور غیر فرقہ پرست رجحان اس سامراجی اور سامنتی رجحان کے خلاف دونوں زبانوں کو قریب لانے کی کوشش کرتے تھے۔ اُردو اور ہندی کے بہت سے ادیب اور شاعر ایسے بھی تھے جو ایسی زبان لکھتے تھے جس کو اُردو بھی کہا جاسکتا تھا اور ہندی بھی۔

اس علاقے میں بھی قومی اتحاد کے نام پر ہندی کے طرف داروں کا ایک گروہ ایسا تھا جو اُردو کو غیر ملکی زبان قرار دے کر اسے ختم کر دینے کے حق میں تھا۔ دوسری طرف اُردو کے طرفداروں میں بعض ایسے لوگ تھے جو ہندی زبان کو سرے سے ہندو فرقہ پرستی کا مظہر سمجھتے تھے، اس سے نفرت کرتے تھے، اسے مصنوعی زبان کہتے تھے، اور اگر چہ ایک بڑی اکثریت کی زبان ہونے کی حیثیت سے وہ اسے مٹانے کی بات تو نہیں کر سکتے تھے، لیکن ان کے رویہ سے معلوم ہوتا تھا کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ ایسا ہی کرتے۔

ان مسائل پر ترقی پسند ادیبوں کا عام طور سے یہ رویہ تھا کہ جہاں تک قومی بین صوبائی زبان کا سوال تھا، وہ کہتے تھے کہ کسی بھی ایک زبان کو سارے ملک پر زبردستی اور قانون کے ذریعہ

مسلط نہیں کرنا چاہیے۔ ہندی اور اُردو ایسی زبانیں تھیں جنھیں بین صوبائی حیثیت حاصل تھی۔ انھیں یقینی ہر صوبے میں پھیلانا چاہیے۔ جس کا جی چاہے اُردو سیکھے اور جس کا جی چاہے ہندی۔ جن علاقوں کی زبانیں اُردو یا ہندی نہیں ہیں، وہاں کی علاقائی زبانیں ان صوبوں یا ریاستوں کی قومی زبان ہونی چاہیے۔

صوبے کا سرکاری کام اور تعلیم انھیں علاقائی زبانوں میں ہونا چاہیے۔ ہندی اور اُردو وہاں بھی پڑھائی جائیں۔ لیکن جبریہ طور پر نہیں۔ اتحاد بالجبر کے ہم قائل نہیں تھے۔ اس لیے کہ یہ طریقہ اتحاد کا نہیں بلکہ بین قومی جھگڑے اور فساد برپا کرنے کا ہے۔ کسی غیر زبان کو ایک قوم پر مسلط کرنا غیر جمہوری فعل ہے اور قومی خود اختیاری کے حق کے منافی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس طرح سے اُردو اور ہندی صحیح طریقے سے سارے ملک میں پھیلائی جاسکتی ہے اور علاقائی زبانوں کو بھی پھولنے پھلنے کا موقع مل سکتا ہے۔

اب رہ گیا ہندستانی بولنے والے علاقے کا سوال۔ ہم کہتے تھے کہ اس علاقے میں اُردو اور ہندی کو سرکاری طور سے مساوی حقوق حاصل ہوں۔ سرکاری دفاتر اور کچہریوں میں دونوں کا استعمال جائز ہو۔ نیز اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں دونوں زبانیں ضرورت کے مطابق ذریعۂ تعلیم ہوں تاکہ آسانی کے ساتھ اُردو اور ہندی کے طلبا اپنی پسند کی زبان میں تعلیم حاصل کرسکیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم کہتے تھے کہ حکومت اس کی پیہم کوشش کرے کہ یہ دونوں زبانیں زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ وہ ایک علاقے کی زبانیں ہیں۔ یہ فطری امر ہے کہ ان میں یکجہتی پیدا ہو۔ لیکن اس سلسلے میں ہم کسی قسم کا جبر یا مصنوعی اور بے ہنگم یکسانیت کے قائل نہ تھے، اور سمجھتے تھے کہ ابھی کافی عرصے تک اُردو اور ہندی کے طرز اور رسم خط میں اختلاف رہے گا۔ اختلاف کے معنی جھگڑے کے نہیں ہیں۔ اس کے معنی باہمی منافرت کے بھی نہیں ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ آزادی، جمہوریت کے قیام کے لیے مشترکہ عوامی جدوجہد اور عوام کی فتح کے بعد جمہوریت، تہذیب، اور تمدن کی تعمیر کی متحدہ سعی و کاوش عوام کے مختلف گروہوں کو قریب لائے گی۔ ان میں ہم آہنگی، تعاون اور دوستی کا جذبہ پیدا کرے گی۔ اس میل کو بڑھانے کی کوشش کرنا ترقی پسندوں کا فرض تھا۔ اس ہم آہنگی کا ایک لازمی جزو ہر گروہ اور فرقہ کے علاحدہ تہذیب و تمدن اور

عقائد کے احترام کی بنیاد پر ایک مضبوط اتحاد قائم کرنا تھا۔ ہمارا یہ مشترک تمدن اور زندگی کو بنانے اور سنوارنے کی مشترک کوشش آگے چل کر اُردو اور ہندی کے ایک ہو جانے کے امکانات پیدا کرے (۱)۔

یہاں پر ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ اس پیچیدہ اور الجھے ہوئے مسئلے کے چند بنیادی نکات بیان کیے تھے۔ ان کی وضاحت اور اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کے لیے ایک دفتر لکھا جا سکتا ہے جس کا یہ موقع نہیں ہے۔ ترقی پسند مصنّفین کی انجمن نے جماعتی حیثیت سے اس سوال پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ ہم میں آپس میں بھی قومی زبان اور اُردو ہندی کے سوال پر اختلافات تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس زمانے میں جب کہ انگریزی سارے ملک کی سرکاری زبان تھی اور ہمارے سامنے خاص سوال آزادی کا تھا، ہم اس بات پر زیادہ زور دیتے تھے کہ تمام ادیب اور شاعر جو کوئی بھی زبان جانتے ہوں، اس میں ترقی پسند ادب کی تخلیق کریں۔ اپنے ملک کی ہر زبان میں ادب کے قافیہ کا بدلنا ہمارا مقصد تھا، اور ہم اس بات پر خوش تھے کہ ہماری جماعت ہی ملک کی وہ واحد جماعت تھی، جہاں پر اُردو اور ہندی کے ادیب ایک ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ ہم کوشش کرتے تھے کہ اُردو کے ادیب ہندی سیکھیں اور اس کے ادب سے واقفیت حاصل کریں، اور ہندی والے جن میں ویسے بھی ان اُردو والوں کے مقابلے میں جو ہندی جانتے تھے، اُردو جاننے والے زیادہ تھے، اُردو پڑھیں اور اس کے ادب سے دلچسپی لیں۔ اس سے دونوں کا فائدہ ہوگا۔

تاہم مسائل پر اختلاف ہونے کی وجہ سے ہماری دشواریاں بڑھتی تھیں۔ ہندی کے ترقی پسند ادیبوں میں بعض لوگ اُردو کے متعلق تقریباً وہی رائے رکھتے تھے جو تنگ نظر قوم پرستوں یا فرقہ پرستوں کی تھی۔ مثلاً مہا پنڈت راہل سانسکر تیائین...... وہ ہندی کو راشٹر بھاشا یا سرکاری زبان اور ہندستانی علاقوں میں واحد ذریعۂ تعلیم بنانے کے قائل تھے۔ اگست 1947 کے بعد الہ آباد میں ہندی کے ترقی پسند ادیبوں کی ایک کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی۔ بمبئی سے سردار جعفری، اور میں بھی اس میں شریک ہوئے۔ میری اس کانفرنس میں دوہری حیثیت تھی۔ ایک تو انجمن کے سکریٹری

---

(۱)۔ یہ صورتِ حال اس وقت تھی جب ہندستان کی تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں ہندی کو بین صوبائی حیثیت دینا ممکن نہیں رہا۔

کی، دوسرے اُردو کے ترقی پسندوں کی طرف سے رفیقانہ مندوب کی (جس حیثیت سے جعفری بھی اس میں شرکت کے لیے آئے تھے)۔فراق الہ آباد میں ہی تھے۔وہ بھی ہمارے ساتھ اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کا افتتاح پنڈت امرناتھ جھا (وائس چانسلر، الہ آباد یونیورسٹی) نے کیا۔اس کی صدارتی مجلس میں راہل سانسکر تیائین اور آنند کوشلیائن بھی تھے۔

راہل سانسکر تیائین اور آنند کوشلیائن دونوں نے ہندو مذہب ترک کرکے بودھ مت اختیار کیا تھا۔ وہ سنسکرت اور پالی کے عالم تھے۔ ہندی ادب میں بھی ان کا اونچا مقام ہے۔ افسانے، ناول، تاریخ اور ہماری پرانی تہذیب پر انھوں نے قابل قدر کام کیا ہے۔راہل اشترا کی خیالات کو بھی اپناتے تھے اور بہار کی کسان تحریک میں انھوں نے عملی حصہ لیا تھا۔ترقی پسند مصنّفین کی تحریک سے ان کا ربط 1937 یا 1938 سے شروع ہوا تھا۔آنند کوشلیائن ان کے خاص چیلے تھے۔

ہندی کے ترقی پسند مصنّفین کی اس کانفرنس میں دو رجحانات صاف طور پر ہمیں نظر آئے۔ایک تو ہندی نوازی کے ساتھ اُردو دشمنی کا تھا، اور دوسرا وہ جو ہمارا اور ہندی کے اور بہت سے نوجوان ترقی پسند مصنّفین کا تھا۔یعنی ہندی کو سرکاری اداروں میں جگہ ملے، وہ ذریعۂ تعلیم بنائی جائے، اور اس کی بھرپور ترقی ہو۔لیکن اُردو کو دبا کر اور اُردو کی جگہ پر نہیں، اُردو کو بھی سرکاری زبان مانا جائے۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ ان کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہو، اس کا بھی انتظام کیا جائے۔ مرکزی حکومت کے اداروں میں اور بین صوبائی حیثیت سے کسی بھی ایک زبان کو جبریہ اور قانون کے ذریعے نافذ نہ کیا جائے۔ ہندی اور اُردو چونکہ بین صوبائی حیثیت اختیار کر چکی تھی، اس لیے ان دونوں کو اس حیثیت سے ترقی دی جائے یا ساتھ ساتھ ہندی اور اُردو کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش جاری رہے۔ دونوں رسم خط اس وقت تک برتے جائیں جب تک کہ باہمی رضامندی سے ایک رسم خط قبول نہ کر لیا جائے۔کانفرنس میں بہت سے ایسے ہندی کے ادیب بھی مدعو تھے، جو ترقی پسند تحریک سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ہمیں اس کی توقع تھی کہ راہل جی اپنے خطبہ صدارت میں اور بعد میں، جب اُردو ہندی کا مسئلہ پیش ہو تو اول الذکر رجحان کی سختی سے مخالفت کریں گے۔لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ہندی کو سرکاری طور سے سارے ملک اور ہندستانی

بولنے والے صوبوں کی واحد راشٹر بھاشا بنانے کا رزولیوشن آنند کوشلیائن نے پیش کیا۔ ڈاکٹر رام بلاس شرما، پرکاش چندر گپت، امرت رائے، سردار جعفری، فراق اور میں اور دوسرے کئی مندوبین اس رائے کے تھے کہ اس مسئلہ پر اس کانفرنس کو قطعی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ بہتر صورت یہ ہوگی کہ ہندی اور اُردو اور ملک کی دوسری بڑی زبانوں کے ترقی پسند مصنّفین آپس میں مل کر اور انجمن میں عام اور کھلی بحث کے بعد اس مسئلہ پر اپنی پالیسی کا اظہار کریں۔ آنند کوشلیائن اس ترمیم پر بہت ناراض ہوئے۔ راہل جی نے بھی خاموشی اختیار کی۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہماری تجویز کو ناپسند کرتے ہیں۔ لیکن تنظیم کے ڈسپلین کے خیال سے چپ ہیں۔ آخر میں کانفرنس میں ویسی ہی تجویز منظور ہوئی جیسا کہ رام بلاس شرما اور ہم چاہتے تھے۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ جلسے کے کافی بڑے حصے کو اس سے اطمینان نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ جب خود راہل جی، جو اس زمانے میں ہندی کے ترقی پسند ادیبوں کے سردار سمجھے جاتے تھے، ہندی کے ادیبوں میں جو اُردو کے خلاف فضا پھیلی ہوئی تھی، اسے کم کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے، تو اس قسم کی سمیّت کا پھیلا رہنا لازمی تھا۔ الہ آباد ہندی ساہتیہ سمیلن اور مہا سبھائی عناصر کا بھی مرکز تھا۔ بابو پُرشوتم داس ٹنڈن کے خیالات کے وہاں پر بہت سے ہندی ادیب تھے۔

کانفرنس کی فضا کو دیکھ کر سردار جعفری اور میں نے طے کیا کہ اُردو ہندی کے مسئلہ پر ہم تقریر نہ کریں۔ ہندی ادیبوں کے مجمع میں ہماری نظر میں بہتر یہ تھا کہ خود ہندی کے ترقی پسند ادیب اپنی جماعت میں تنگ نظر اُردو دشمنی کی مخالفت کریں۔ چنانچہ ہم نے اُردو کے ترقی پسندوں کی طرف سے ہندی کے ادیبوں کو رفیقانہ تہنیت پیش کی اور ترقی پسندی کے عام مسائل پر تقریریں کیں۔ لیکن فراق اس رائے کے نہ تھے۔ وہ مصر تھے کہ انھیں اُردو ہندی کے نزاع پر تقریر کرنے کا موقع دیا جائے۔ مجھے چونکہ اس کا علم تھا کہ ہندی والوں میں فراق کے خلاف خاص طور پر غصہ ہے، اس لیے میں نے ان کو یہی رائے دی کہ وہ اس مسئلہ پر نہ ہی تقریر کریں تو بہتر ہوگا۔ فراق نے ہندی کے بعض بڑے بڑے جدید شاعروں پر بڑی سخت نکتہ چینی کی تھی اور انھوں نے ہندی میں ایک سلسلہ مضامین ان کے خلاف لکھا تھا۔ اس کی وجہ سے کافی ہنگامہ برپا ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا کہیں لوگ فراق کو ہندی کا ہی مخالف سمجھ کر جھگڑا نہ شروع کر دیں۔ حالانکہ ظاہر ہے یہ درست

نہیں ہے، اور معاملہ سلجھنے کے بجائے الجھ جائے۔ فراق غالباً میرے دل کی بات تاڑ گئے اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ بھئی میں صرف پانچ منٹ کے لیے تقریر کرنا چاہتا ہوں۔ تم اسے سنو گے تو تم کو خوشی ہوگی۔ کسی طرح سے مجھے اس کی اجازت دلوادو، ان کے اس اصرار پر میں نے راہل جی سے چپکے سے کہا...... ''فراق صاحب بھی بولنا چاہتے ہیں۔ انھیں تھوڑا سا وقت دیجئے۔'' راہل جی اس وقت صدارت کر رہے تھے۔ وہ میری درخواست کو ٹال نہ سکے اور فراق صاحب کو تقریر کا موقع مل گیا۔

یوں تو میں نے بہت سے موقعوں پر فراق کو ادبی موضوعات پر تقریر کرتے سنا ہے اور ان کی تقریر ہمیشہ دلچسپ اور پُر مغز ہوتی ہے۔ لیکن اس دن تو انھوں نے کمال ہی کر دیا۔ نہایت آہستگی، نرمی، اور سنجیدگی سے انھوں نے چند منٹوں میں اُردو کے متعلق چند ایسی باتیں کہیں، جن سے ثابت ہوتا تھا کہ اُردو دراصل اسی ملک کی ایک زبان ہے۔ اس کی اور ہندی کی بنیاد ایک ہے۔ دونوں زبانوں میں میل ہونا فطری امر ہے اور ان کی باہمی مغائرت غیر فطری اور رجعت پسندانہ۔ ترقی پسند ادیبوں کو یہ مغائرت دور کرنا چاہیے۔ اس سے دونوں کو فائدہ ہوگا۔ باتیں کچھ اس قسم کی تھیں، لیکن فراق نے واقعات، اعداد و شمار کا حوالہ دے کر اور اتنے مدلل، معقول اور پرلطف طریقے سے ایسے بیان کیا کہ سارے مجمع میں اس کا اچھا اثر ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر اُردو اور ہندی کے ترقی پسند ادیب اپنے اپنے عوام میں اس طرح معاملہ کو پیش کریں تو رفتہ رفتہ ہم رجعت پرست عناصر کو پسپا ہونے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ ایسی بات جو جمہوری اصولوں پر مبنی ہو اور جس میں سب کی بھلائی ہو، بالآخر عام طور سے ضرور قبول کی جائے گی۔

اُردو اور ہندی کی بنیادی قربت کا اندازہ، اور اس بات کا تجربہ کہ ہندی داں عوام کو اُردو سے مغائرت نہیں ہے (بشرطیکہ انھیں غلط بیانیاں کر کے بھڑکایا نہ جائے)، ہمیں کانفرنس کے کوی سمیلن میں ہوا۔ کوی سمیلن الہ آباد کے سنگیت ودیالیہ کے ہال میں ہوا، جس میں آٹھ نو سو کا مجمع تھا۔ ہندی کے بڑے اور نامور کوی سمترا نند پنت، نرالا، نریندر شرما، سمن وغیرہ وہاں پر موجود تھے۔ انھوں نے اپنی اپنی کویتائیں سنائیں، جن میں سے بعض مقبول ہوئیں اور بعض کو لوگوں نے خاموشی سے اور اکتاہٹ کے اظہار کے ساتھ سنا۔ ہر مشاعرے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے

ہندی کے ترقی پسند رفیقوں نے اصرار کیا کہ سردار جعفری بھی اپنا کلام سنائیں۔ سردار جعفری نے اس زمانے میں اپنی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' نئی نئی کہی تھی۔ انھوں نے تحت اللفظ میں اس کے چند حصے سنائے۔ حاضرین نے نہ صرف اسے دلچسپی سے سنا، بلکہ ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس نظم سے متاثر بھی ہو رہے ہیں۔ ہر چند منٹ کے بعد کسی زوردار بند یا خوبصورت مصرعے کے خاتمے پر زوردار تالیاں بجتیں۔ اس وقت بالکل یہ نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ یہ مجمع اُردو دانوں کا نہیں، ہندی دانوں کا ہے۔ اُردو مشاعروں میں شاید اس سے کسی قدر ہی زیادہ شعر فہمی کا اظہار ہوتا ہوگا۔ جب جعفری ختم کر کے بیٹھے تو جتنی تحسین و آفریں انھیں نصیب ہوئی، کسی دوسرے ہندی کوی کو اس سمیلن میں اتنی نہیں ہوئی۔ کانفرنس میں ہندی اور اُردو کے مسئلہ پر بحث کے دوران میں بعض اشخاص کی تنگ نظری کے مظاہرے سے ہم کو کسی قدر دکھ ہوا تھا۔ ہندی کے کوی سمیلن میں اُردو کے ایک نوجوان شاعر کے اس اعزاز اور عام مقبولیت سے وہ دور ہو گیا اور ہمیں اس بات کا اور بھی زیادہ یقین ہو گیا کہ مستقبل ماضی پرست اور تفرقہ پرداز رجعتوں کے ہاتھ نہیں۔ ہماری قومی زندگی کا ارتقا متقاضی ہے کہ ثقافت اور تہذیب کے مختلف اور رنگا رنگ مظاہرے میں باہمی رفاقت، یکجہتی اور اتحاد ہو۔ زندگی کے اس دھارے کو تعصب اور جہالت کے کچّے بندھ باندھ کر کب تک روکا جا سکے گا۔

البتہ جمہوری تعمیر کے ان کشادہ اور شاداب مرغزاروں تک پہنچنے کے لیے، جہاں انسانی تہذیب کے ہر پہلو اور اس کی مختلف اقسام کو پوری آزادی کے ساتھ اور کھلی فضاؤں میں نمو اور ترقی کا موقع ملے گا۔ ابھی ہمیں رنج و محن کی کافی دشوار گزار اور جاں سوز اندھیری اور پُر پیچ وادیوں سے گزرنا ہوگا۔ ترقی کے میدان میں آگے بڑھنے والوں کو قدم قدم پر اس کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ کانفرنس جاری ہی تھی کہ مشرقی اور مغربی پنجاب ہولناک فرقہ وارانہ خونریزی کی آگ سے جل رہے تھے۔ دہلی اور صوبہ متحدہ کے بعض اور شہروں میں قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ الہ آباد میں بھی اکا دکا قتل کی وارادات ہو گئیں۔ ایک دن کانفرنس کے دوران میں شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ ڈیلی گیٹوں کو رات کے نو بجے اپنی قیام گاہوں پر جانے کے لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے یہاں سے پاس حاصل کیے گئے۔ فراق، سردار، اور میں ایک ساتھ کانفرنس سے جب گھر جانے

کے لیے نکلے تو شہر کی سڑکیں، جن پر اس وقت سب سے زیادہ گہما گہمی رہتی ہے، بالکل سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ جعفری فراق کے مہمان تھے اور انھیں کوئی تین میل کے فاصلے پر جانا تھا، اور میں جہاں مقیم تھا، وہ جگہ کوئی ڈیڑھ میل دور تھی۔ ہم مجبوراً پیدل چل پڑے۔ اس وقت ہم تینوں میں سے فراق ہی تھے جو اپنے لباس کے لحاظ سے مسلمان لگ رہے تھے۔ اس لیے کہ وہ شیروانی اور چوڑی دار پائجامہ اور کشتی نما ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ جعفری سوٹ پہنے ہوئے اور ننگے سر تھے۔ میں کھدر کا کرتہ پائجامہ اور صدری پہنے ہوئے تھا۔ ہم تینوں نہتّے تھے۔ سوائے اس کے کہ فراق کے ہاتھ میں ایک نازک سی چھڑی تھی۔

کانفرنس الہ آباد کے پرانے شہر کے بیچ ہوتی تھی اور ہمیں آدھے شہر سے گزر کر سول لائن اور یونیورسٹی کی جانب جانا تھا۔ ہم تینوں تھکے ہوئے تھے، جس کا غالباً نفسیاتی سبب یہ تھا کہ بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ قتل و غارت گری کی خبروں سے ہمارے دل بوجھل تھے۔ جب بھی اس قسم کے سانحے ہوتے تھے، ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ یہ رجعت پرستی کا جارحانہ حملہ ہے اور جمہوریت اور ترقی پسندی کی پسپائی۔ گو ہم میں سے اکثر کی ساری زندگیاں اس قسم کی رجعتی طاقتوں کے خلاف جدوجہد میں ہی بسر ہوتی تھیں۔ لیکن فرقہ وارانہ فساد اس کی سب سے گھناؤنی شکل تھی، اور اس کا ہر خون آشام مظاہرہ ہمارے لیے ایک تکلیف دہ اور روح فرسا تجربہ تھا۔ جب ہم الہ آباد کی سنسان سڑکوں کے چند تاریک گوشوں سے گزرے، دو مسلمان اور ایک ہندو ترقی پسند، تو میں اپنے دل میں سوچنے لگا کہ اگر اس وقت کسی دھرم آتما کو جوش آیا تو وہ فراق کے لباس سے انھیں مسلمان سمجھ کر ان پر حملہ کرے گا، اور اگر کسی مجاہدِ اسلام کی رگِ حمیّت پھڑکی تو وہ میرے کھدر کے کرتے اور پائجامے کو کانگریسی ہندو کی وردی سمجھ کر پہلے مجھ پر ہی اپنی توجہ مبذول کرے گا۔ انگریزی کپڑوں کی وجہ سے جعفری ہم سے نسبتاً زیادہ محفوظ تھے۔ فرقہ واری فتنے کی بنیاد گو کہ چالاک سامراجیوں، قدیم جاگیری نظام اور بڑے گھاگ سرمایہ داروں کے گٹھ جوڑ پر ہے۔ لیکن اس کے مظاہرے کس قدر احمقانہ ہوتے ہیں، اگر وہ اتنے مہلک اور زہریلے نہ ہوتے تو کتنے مضحکہ خیز ہوتے۔

ترقی پسند مصنّفین بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ فرقہ وارانہ جنون کے اس دور میں جماعتی اور انفرادی طور پر وہ ترقی پسندی کے راستے پر نہ صرف ثابت قدم رہے بلکہ اپنی طاقت اور مقدور کے

مطابق انھوں نے رجعتیوں کے اس حملہ کا جواب بھی دیا۔ بمبئی میں جب قتل وخون کی وارداتوں، دہشت انگیزی اور کرفیو کے نفاذ کے سبب سے ہمارے لیے گھروں سے نکلنا تک مشکل ہو گیا تھا، ہم نے انجمن کے خاص جلسے کیے، جن میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر ادیب کو اس موقع پر فرقہ واریت کے خلاف لکھنا چاہیے۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھ کر ان بستیوں میں کھیلے جائیں جہاں اس کا انتظام ہو سکے۔ چنانچہ عصمت چغتائی نے ''دھانی بانکپن'' لکھا اور اشک نے بھی ایک ڈرامہ لکھا۔ بمبئی میں پیپلز تھیئٹر نے اشک کا ڈرامہ اسٹیج بھی کیا۔ کرشن چندر نے اپنے چند بہترین افسانے لکھے۔ احمد ندیم قاسمی نے بھی 1947 کے فسادات اور اس کے بعد مہاجرین کی جو درگت ان کے نئے وطن میں بنی، اس موضوع پر متعدد افسانے لکھے۔ عصمت چغتائی، بیدی، احمد عباس، فکر تونسوی، رضیہ سجاد ظہیر، اور دوسرے لوگوں نے بھی افسانے لکھے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ ندیم، سردار جعفری، فیض، ساحر، فکر تونسوی، اور دوسرے ترقی پسند شاعروں نے نظمیں لکھیں۔ حیات اللہ انصاری، بعض نظریاتی اختلافات کے سبب سے ترقی پسندوں کی انجمن سے کٹ گئے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ ترقی پسند تھے۔ انھوں نے بھی اپنے نقطہ نظر سے اس موضوع پر اچھے افسانے لکھے۔ ممتاز حسین، احتشام حسین اور دوسرے مضمون نگاروں نے فرقہ واریت اور کلچر کے موضوع پر مضامین لکھے۔

ملک کی تقسیم کے ساتھ ساتھ لاکھوں انسانوں کی ایک مملکت سے دوسری میں ہجرت بڑے پیمانے پر قتل وتباہ کاری، لوٹ مار، اخلاقی قدروں کا زوال، عورتوں کے ساتھ بہیمانہ بدسلوکی اور ان کا اغوا وغیرہ...... یہ ایسے ہولناک اور دل دہلا دینے والے سانحے تھے جنھوں نے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے ذہن پر بہت گہرا اثر چھوڑا۔ ان حالات میں دو مملکتوں کے قیام سے انگریزی حکومت کی جگہ کانگریس کی ہندستان میں اور مسلم لیگ کی پاکستان میں حکومتیں بن جانے سے ہماری سیاسی اور معاشرتی زندگی میں بھی گہری تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ شاید ہی کوئی مصنف ایسا رہا ہو جس نے ان نئے حالات کے کسی نہ کسی پہلو پر خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ لیکن اگر اس قسم کے تمام ادب پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہند اور پاکستان، دونوں میں ہی ترقی پسند مصنّفین کی ہی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جو تعصب کی بو، سمیت سے فی الجملہ

پاک ہیں، جن میں انسانیت کا درد ہے اور جن میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ نئے حالات کی اس طرح تصویر پیش کی جائے جس سے ہمارے سماج کے رِستے ہوئے ناسوروں پر انگلی رکھی جا سکے، اور انسان کے بہترین جذبات، شعور، اور قوت عمل کو بیدار کر کے اسے ان سماجی حالات کو بدلنے کے لیے آمادہ کیا جا سکے جو اس کے لیے اتنی بڑی تباہی اور مصیبت کا باعث بنے۔

حالانکہ سنجیدہ اور سمجھدار لوگوں نے ترقی پسند ادیبوں کی ان کوششوں کو پسند کیا اور ان کی نگارشوں کو اچھی نظر سے دیکھا (1)۔ تاہم بعض ایسے صاحبان بھی تھے جنھوں نے ایسے جانگداز موقع پر بھی ترقی پسند ادیبوں پر حملہ کرنا ضروری تصور کیا۔ ان صاحبوں کے اعتراضات تین قسم کے تھے۔ اول تو ان کا کہنا تھا کہ ترقی پسند ادیب فرقہ وارانہ خانہ جنگی کے متعلق جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ ادب نہیں، پروپیگنڈہ ہے۔ دوسری بات انھوں نے یہ کہی کہ ترقی پسند ادیب خود فرقہ پرستی کا شکار ہیں۔ مثلاً کرشن چندر کے افسانوں کے متعلق یہ کہا گیا کہ ان میں ہندوؤں کے ساتھ جانبداری برتی گئی ہے۔ خواجہ احمد عباس کے ایک افسانہ کے بارے میں کہا گیا کہ اس میں سکّھوں پر حملہ ہے۔ یہ افسانہ ضبط کر لیا گیا، اور آخر میں ترقی پسند مصنّفین پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ اس مملکت کے

---

(1)۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب صدر، شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ وہ ہمارے سخت ترین معترضین میں رہ چکے ہیں۔ لیکن کل ہند بہار اُردو کانفرنس، منعقدہ پٹنہ، مئی 1951 کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے فرمایا...... ''بذاتِ خود میرا خیال ہے کہ ترقی پسندوں کا مقصد کچھ بھی رہا ہو۔ گزشتہ پندرہ سولہ سال میں اُردو میں موضوع اور اسالیب کے اعتبار سے جتنے نئے، کامیاب اور مفید تجربے ہوئے اتنے اُردو کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئے، اور باوجود اس کے کہ ترقی پسند مصنّفین میرے کچھ ایسے عاشق زار بھی نہیں، میں اس کا قائل ہوں کہ انھوں نے اُردو کی بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ البتہ یہ بات نہ پہلے کبھی کہنے سے باز رہا، نہ اب رہ سکتا ہوں کہ ترقی پسند مصنّفین کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب تک انسانیت کے بہترین مقاصد انسانیت ہی کے بہترین طور طریقوں سے پورے نہ کیے جائیں، نہ اعلیٰ انسان وجود میں آئے گا، نہ اعلیٰ ادب۔ تقسیم ملک کے بعد جو قیامت مچی، اس کو فرو کرنے اور رجعت پسند طاقتوں سے ٹکر لینے میں ترقی پسند مصنّفین کا قلمی جہاد نہ صرف اُردو ادب میں بلکہ اس دیش کی تاریخ میں شکر گزاری کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ اس قلمی جہاد میں بعض ایسی تصانیف وجود میں آئیں، جن کا اُردو ادب میں کلاسیکی درجہ ہے۔''

(ماخوذ از ماہ نامہ نظام، کانپور۔ جولائی 1953)

''وفادار'' نہیں، جہاں کے وہ تھے۔

جہاں تک پہلے الزام کا تعلق ہے اس میں اس حد تک سچائی تھی کہ ترقی پسند ایک خاص انسانی اور جمہوری مقصد کے تحت ایسی باتوں کے متعلق لکھ رہے تھے جن سے ہماری معاشرت کی ساری عمارت متزلزل ہوگئی تھی۔ اگر ہمارے گھر میں یا ہمسائے میں آگ لگ جائے اور اسے بجھانے کے لیے زور زور سے آواز دے کر لوگوں کو جمع کیا جائے اور آتش زدگی کے خطرے سے انھیں آگاہ کیا جائے، تو اس فعل کو پروپیگنڈہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔ ترقی پسند مصنّفین نے ایسا پروپیگنڈہ کرنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ بلکہ ان کا طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ وہ عوام کو آنے والے خطروں سے آگاہ کرتے ہیں، جب ان پر ناگہانی مصیبتیں آتی ہیں تو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ان میں حوصلہ اور جوش اور اعتماد پیدا کرتے ہیں۔ جنگ و امن، قحط، فرقہ وارانہ خانہ جنگی تو خیر بڑے مسائل ہیں، ترقی پسند ادیب، مزدوروں کی ایک ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لیے، چند کسانوں کی ان کی زمین سے بے دخلی کو روکنے کے لیے، طلبا کی فیسوں کو کم کرنے کے لیے یا الیکشن میں ترقی پسند جمہوری امیدوار کو کامیاب کرنے کے لیے بھی اپنے قلم کو جنبش میں لا سکتے ہیں اور لاتے ہیں۔ مظلوم انسان کی بھلائی کے لیے ناچیز مساعی سے بھی وہ شرمندہ نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ یہی کام جو ''چھوٹے'' معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں بڑے مقاصد کی تکمیل کا راستہ دکھاتے ہیں۔ خود غرضی اور خود پرستی کے خول میں اپنے کو بند کر لینا، اپنی قوم کے کثیر عوام کی طرف سے منہ موڑ لینا، جن کی محبت سے زندگی ثمر بار ہے، استحصال کرنے والی قوتوں اور ظالموں کی خدمت گاری کرنا اور ان کی صفائی میں طرح طرح کی فلسفیانہ، جمالیاتی اور الوہی دلیلیں پیش کرنا اگر ''ادب عالیہ'' بغیر ان خصائل اور حرکات کے پیدا نہیں ہوسکتا تو ترقی پسندوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ وہ نہیں بلکہ دوسرے اس کے خالق ہوں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس دارو گیر کے زمانے میں بھی فرقہ وارانہ فسادات اور ان کے آثار کے موضوع پر جو ادبی تخلیق ہوئی، اس میں سے بہترین ترقی پسند مصنّفین کی ہی نگارش ہے اور اگر پائندگی حاصل ہے تو ان ہی کی نظموں اور ان ہی کے لکھے ہوئے افسانوں اور مضامین کو۔

فیض کی نظم جو اس مصرعہ سے شروع ہوتی ہے......

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

......کبھی بھلائی جا سکتی ہے؟ اس میں جذبات کی شدت کے ساتھ جن حقائق کی حسین و نازک مصوری کی گئی ہے وہ 14 اگست 1947 کے بعد سے شروع ہونے والے پورے دور کی ماہیت کا فنکارانہ تعین کرتے ہیں اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے ان کی صداقت اور زیادہ واضح ہوتی جاتی ہے۔

اور شمالی ہندستان خاص طور پر مشرقی اور مغربی پنجاب میں فرقہ وارانہ تباہ کاریاں اور اس سے پیدا ہونے والی معاشرتی ابتلا کی ہولناک کیفیت کو انسانیت کے گہرے درد اور دل کو پگھلا دینے والی بے رحم صداقت کے ساتھ ندیم نے اپنی نظم ''آزادی کے بعد'' میں جاودانی بخشی ہے......

روٹیاں بوٹیوں سے تلتی ہیں، عصمتوں کی سجی دکانوں پر
پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے خون کا ذائقہ زبانوں پر
آدمیت پلٹ کے تکتی ہے، اپنے بچپن کے رہگزاروں کو
جیسے معزول شہر یار گنے، اپنی عظمت کی یادگاروں کو

......اور اس نظم کے آخری دو بند جن میں خاک و خون میں غلطاں ہونے کے باوجود نئی زندگی کی فتح پر شاعر کے یقین کا ایسے سنہرے نعروں کے ذریعہ اظہار کیا گیا ہے، جن کی بازگشت روح کی گہرائیوں کو تابندہ کرتی ہے......

ایک آفاق گیر سناٹا، زندگی! زندگی پُکارتا ہے
سٹپٹاتا ہے اپنے ہونٹوں سے، خون کی پپڑیاں اُتارتا ہے
زندگی کو سنبھالنے کی مہم، کب مقدر کے انتظار میں ہے
یہ زمیں، یہ خلا کی رقاصہ، آدم نو کے انتظار میں ہے

ترقی پسندوں پر فرقہ واریت کا الزام بھی نیا نہ تھا۔ دونوں طرف سے فرقہ وار ہمیشہ سے ان پر یہ الزام دھرتے تھے۔ جس زمانہ میں فرقہ واریت جنون کی حد تک پہنچ جائے اور معمولی

انسانی اقدار بھی فراموش کر دی جائیں، ظاہر ہے کہ ایسے میں تمام وہ لوگ جو انسانیت، تہذیب، اور حب وطن کے نام پر امن و آشتی کی کوشش کریں گے، ضرور معتوب کیے جائیں گے۔ تاہم ہمیں اس بات کا یقین تھا کہ اپنی قوم کی شریف ترین روایات کو اظہار کرنے کی ہم کوشش کر رہے تھے، نہ کہ وہ لوگ جو اپنی جانب کی زیادتی اور بہمیت پر پردہ ڈال کر دوسرے فرقے کو شیطانی رنگ میں پیش کرتے تھے، اور اس طرح سارے ملک کی فضا کو زہریلی بنا کر رجعتی اور حیات کش طاقتوں کو مضبوطی پہنچاتے تھے۔ رہ گیا وفاداری کا سوال، اس الزام کا جواب دینے کی ہم کو چنداں ضرورت نہ تھی۔ اہل اقتدار، ان کے ملازموں اور ان کی خوشامد کرنے والوں کی طرف سے ہم پر یہ الزام مضحکہ خیز تھا۔ اس لیے کہ ان میں سے اکثر نے اپنے وطن اور قوم سے وفاداری کا اظہار تک 14 اگست 1947 سے ہی شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے ان کی وفاداری اور چاہتیں اغیار کے ساتھ تھیں! تاریخ کا پہیہ گھومتا رہے گا اور آخر وہ دن آئے گا جب دربار وطن میں ان کی اور ہماری، دونوں کی وفاداریاں پرکھی جائیں گی اور اس وقت سب اپنی جزا اور سزا کو پہنچیں گے اور وہی فیصلہ سچا اور قطعی ہوگا۔

OOO

تلخیص

پچھلے صفحوں میں 1936 سے 1947 کے وسط تک ترقی پسند ادبی تحریک کی ایک تاثراتی اور چلتی پھرتی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گو راقم الحروف اپریل 1948 تک انجمن کا جنرل سکریٹری رہا، لیکن ملک کی تقسیم اور بھارت اور پاکستان کے آزاد مملکتوں کی حیثیت سے قیام کے بعد دراصل اس تحریک کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ 1948 میں پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنّفین علاحدہ قائم ہوئی۔ کل ہند انجمن کے جنرل سکریٹری کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد چند در چند مجبوریوں اور قباحتوں کے سبب سے میرے لیے اس تحریک میں عملی حصہ لینا ناممکن ہو گیا۔ اس لیے اس نئے دور کے حالات کی کماحقہ، نقاشی کا میں اہل نہیں ہوں۔ انجمن کے دوسرے اراکین اس کام کو مجھ سے بہتر کر سکتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ اسے انجام دیں گے۔

بھارت اور پاکستان، دونوں میں 1947 کے بعد ترقی پسند مصنّفین کی تنظیم کو نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن جدید اُردو ادب کے ارتقا پر نگاہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ ترقی پسند ادب کی تحریک آج پہلے سے بھی زیادہ وسیع پیمانے پر پھیل گئی ہے اور بہت سے نئے لکھنے والے اس سے متاثر ہیں۔

قومی تہذیب و تمدن کو اس کی بہترین صورت میں برقرار رکھنے اور اسے عروج و ترقی کی نئی

درخشاں منزلوں کی طرف بڑھانے کی کاوش اور جدوجہد میں رجعتی طاقتیں رُکاوٹ تو ڈال سکتی ہیں، اندرونی آویزش یا کم نظری سے پیدا ہونے والی خامیاں ترقی کی رفتار کو دھیمی کر سکتی ہیں، لیکن ایسی تحریک جسے اس آگ سے حرارت ملتی ہے، جو جمہورت کے سینے میں دہک رہی ہے، نہ دبائی نہ ختم کی جاسکتی ہے، اس کا مستقبل اس کے ماضی اور حال سے زیادہ روشن ہوگا۔

کلیدِ گنج سعادت قبول اہلِ دل است   مبادکس کہ دریں نکتہ شک و ریب کُند

ـــ حافظؔ

ـــ سجّاد ظهير

سنٹرل جیل، مچھ، بلوچستان

17 جنوری 1954

اشاریہ

(INDEX)

شعرا، مصنّفین، ناقدین، فنکار اور سیاسی شخصیات

آڈن	23
(مولانا) ابوالکلام آزاد	39, 53, 275
ابراہیم جلیس	218, 272, 305, 311
اُپیندرناتھ اشک	198, 218, 234, 235, 236, 271, 354
احتشام حسین	9, 73, 160, 216, 219, 284, 313, 314, 315, 317, 321, 340, 355
احمد علی	11, 63, 73, 87, 95, 99, 122, 174, 175, 176, 177, 178, 186, 187, 188, 194, 197, 216
احمد علی خاں	9
احمد ندیم قاسمی	35, 198, 218, 252, 282, 283, 295, 355, 358
احمد شاہ بخاری (پطرس)	234, 236
اختر الایمان	247,270

اختر انصاری	219, 284
اختر حسین رائے پوری	129, 130, 132, 133, 216, 285
اختر شیرانی	19, 31, 32
ادیب مالیگانوی	324, 325
ارسطو	111, 276
اروبندو گھوش	39
اسرار الحق مجاز	129, 160, 185, 186, 187, 189, 203, 204, 206, 207, 208, 213, 214, 216, 217, 234, 235, 236, 252, 255, 257, 261, 271, 279, 295, 325, 330, 332, 333
اسٹالن	286
اسٹیفن اسپنڈر	23
(ڈاکٹر) اشرف علی	130
(ڈاکٹر) اعجاز حسین	9, 73, 99, 160
افلاطون	111, 276
(میاں) افتخار الدین	17, 21, 24, 26, 27, 28, 29, 33, 74, 91, 137
اقبال احمد سہیل	340, 341
اقبال سنگھ	18
اکبر الہ آبادی	39, 293
آل احمد سرور	73
(مولانا) الطاف حسین حالی	19, 38, 138, 226, 243, 258, 293, 338
اُماشنکر جوشی	168
امرت رائے	160, 350
(پنڈت) امرناتھ جھا	10, 66, 98, 99, 349
امتیاز علی تاج	301
انّا بھاؤ ساٹھے	254, 266

اندولال یاجنک	91, 168, 171
انور	271
آصف جاہ عثمان علی خاں	145
آنندکوشلیائن	349, 350
(پنڈت) آنند نرائن ملاّ	71, 152, 160
انیل ڈی سلوا	244
اودے شنکر	248
ایس۔اے ڈانگے	256, 257
اوم پرکاش سہگل	150
(مسز) اینی بیسنٹ	71
بابا پیارے لعل بیدی	17
بابو پرُشوتم داس ٹنڈن	351
باکولیش	244
بال گنگادھر تلک	39
بائرن شیلے	164
بہال سنگھ	194
بدھ دیو بوس	183
(چودھری) برکت علی	198, 201
برناڈ شا	6
حکیم برج لال	194
(پنڈت) برج نرائن چکبست	71
(میاں) بشیر احمد	28, 29, 30, 33, 34, 198
بشمبر ناتھ پانڈے	151, 160
بشوا ناتھ داس	155, 156
بھگت سنگھ	19, 195
بلراج ساہنی	186, 266, 268

بلونت گارگی 303
(پنڈت) بنارسی داس چترویدی 76
بنائے رائے 266, 268
بھوگی لعل گاندھی 167, 244, 332
پرکاش چندر گپت 350
پرماتما چودھری 182
پرمود سین گپتا 3
پرویز شاہدی 218, 306
(منشی) پریم چند 11, 12, 13, 14, 15, 34, 37, 65, 66, 74, 75, 76, 77, 78, 80, 81, 83, 84, 86, 94, 95, 106, 155, 166, 117, 118, 119, 120, 121, 123, 126, 159, 160, 176, 219, 253, 269, 295
پرتھوی راج 248
پریم دھون 266, 267
(پنڈت) بال کرشن شرما 76
(ڈاکٹر) تارا چند 10, 11, 313, 314, 321
تاراشنکر بنرجی 183, 184
تاراشنکر سین گپتا 189
تبسم 332, 333
ترپتی مشرا 266, 268
تلسی داس 114, 226
تلوک چند محروم 306
تمنّائی 216, 285
ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ 23, 180, 183
ٹوجو 288
ٹیکارام سخن 136

جاں نثار اختر 129, 208, 271, 341
(ڈاکٹر) جان گل کرائسٹ 145
جدن بائی 331
(مرزا) جعفر علی خاں اثر 219, 220, 221, 222
جگر مراد آبادی 210, 220, 222, 248, 264, 269, 272, 280, 327, 328, 341, 342
جمال الدین افغانی 38, 54
جواہر لعل نہرو 59, 64, 66, 67, 125, 126, 152, 155, 159, 207
جوش ملیح آبادی 11, 13, 14, 15, 34, 106, 115, 117, 129, 152, 160, 210, 214, 215, 217, 248, 250, 251, 255, 256, 257, 258, 261, 269, 270, 274, 275, 276, 279, 280, 283, 295, 298, 321, 327, 328, 311, 332, 333, 335
جے پرکاش نارائن 74, 91, 122, 150
جے۔این۔سین گپتا 182
(بابو) جیبنیدر کمار 75, 76, 94, 150
(ڈاکٹر) جیوتی گھوش 3
چراغ حسن حسرت 19, 33, 136
چنڈی داس 183
چودھری محمد حسین 139
چودھری نذیر 198, 201
حافظ 295, 296
حامد علی خاں 198
(مولانا) حسرت موہانی 78, 79, 80, 86, 89, 90, 91, 95, 106, 269, 313, 314,318, 319, 320, 337
(ڈاکٹر سید) حسین ظہیر 70
(مولانا) حفظ الرحمٰن 297

(پروفیسر)حلیم 130
حفیظ جالندھری 236, 237, 328
حمیداختر 270, 271, 272, 273, 274, 281, 291, 308, 332, 334
حمید بٹ 268
حیات اللہ انصاری 130, 159, 160, 204, 206, 207, 216, 217, 355
(حکیم مرزا) حیدر بیگ 329, 331
خدیجہ مستور 271
خواجہ احمد عباس 130, 243, 244, 250, 257, 260, 261, 266, 267. 268, 272, 282, 329, 355, 356
خواجہ محمد صادق 22
خواجہ محمد شفیع 293, 294, 297
دامن 302
دمینتی 186, 266
دیانرائن نگم 11, 14, 15
دیوندرستیارتھی 292
ڈبلیو۔زیڈ۔احمد 248
ڈیوڈ گیٹ 173
ڈی۔پی مکھرجی 176, 177
(ڈاکٹر)ذاکرحسین 66, 67, 327
رابندرناتھ ٹیگور 72, 85, 87, 152, 153, 154, 155, 156, 158, 159, 171, 181, 183, 184, 186, 218
راجندرسنگھ بیدی 35, 198, 216, 219, 355
راجہ صاحب محمودآباد 331
راجیشر بلی 10
رالف فاکس 18, 173

رام بلاس شرما	299, 350, 351
رام کرشن بینی پوری	151
(پنڈت) رام نریش ترپاٹھی	143, 149, 150
راہل سانکرتائن	256, 349, 350, 351
رتن ناتھ سرشار	38
رجنی پامدت	197
(پروفیسر) رشید احمد صدیقی	33, 34, 220, 222, 340, 341, 356
(ڈاکٹر) رشید جہاں	3, 11, 13, 16, 20, 21, 22, 23, 24, 25, 26, 27, 29, 31, 33, 35, 69, 72, 73, 74, 75, 76, 86, 94, 95, 234, 291
رضا انصاری	207, 217, 218, 234, 257
(سر) رضا علی	293, 296
رضی عظیم آبادی	208
رضیہ سجاد ظہیر	186, 187, 274, 275, 286, 291, 355
رفعت سروش	271, 330
رفیع احمد قدوائی	207
رمیش چندر سنہا	150, 244
رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری	9, 11, 12, 63, 73, 86, 87, 88, 99, 117, 160, 210, 214, 215, 216, 295, 313, 321, 338, 341, 349, 350, 351, 352, 353, 354
رگھوپتی چوپڑہ	136
رگھوونش کمار کپور	136
(مولانا) روم	226
ریم بو	183
ساحر لدھیانوی	35, 218, 270, 272, 273, 283, 315, 321, 325, 327, 328, 330, 332, 335, 355
ساغر نظامی	85, 86, 87, 95, 248, 250, 251, 255, 257, 261, 270, 325, 326, 330

سبط حسن	116, 129, 130, 186, 187, 204, 207, 208, 209, 210, 213, 214, 216, 217, 218, 219, 234, 249, 250, 257, 269, 272, 286, 314, 319
سبھاش چندر بوس	125, 152, 155
سبھدرا کماری چوہان	76, 248
ستین مجمدار	256
سجاد ظہیر	3, 12, 102, 121, 123, 188, 216, 260, 291, 235, 360,
سُچپائیاں	256
سدھیندر ناتھ دت	176, 177, 182, 183, 187, 190
سرتیج بہادر سپرو	142, 143
سرسید احمد خاں	38, 39, 52, 54, 88, 144
سری نواس لاہوتی	311
سروجنی نائڈو	47, 91, 106, 172, 313
سریندر بالوپوری	160
سعادت حسن منٹو	140, 216, 234, 236, 271, 295, 317, 331, 114, 226, 295
سعدی	114, 226, 295
(قاضی) سعید احمد	293, 294, 295, 297
سلامت اللہ	286
سلیمان اریب	218, 311
(مولانا سید) سلیمان ندوی	341
سُمن	352
سمترا انندن پنت	76, 106, 152, 219, 352
سنت سنگھ	136
سوپن رستھ	244
سودا	93, 239, 295

سومندرراناتھ ٹیگور	171
(پنڈت) سندرلال	152
(بابو) سنپورن آنند	122
سواتکی شرما	195, 197
سوریالسٹون	187
سومناتھ چٹ	18
سہراب مودی	248
سہیل عظیم آبادی	285
ستارامایہ	152
سیماب اکبرآبادی	298
شاہداحمد	129, 131, 132
شاہدصدیقی	218, 311
شاہدلطیف	160, 271
(مولانا) شبلی نعمانی	39, 53, 144, 341
شرف اطہرعلی	130
شیخ صادق حسن	21
شرت چندچٹر جی	184
شری پدڈانگے	256, 257
شری پت رائے	219
شریمتی اومانہرو	141
شریمتی لیلاوتی	7
(مولوی) شریعت اللہ	50
شمشیرسنگھ نرولا	133, 292
شمیم کرہانی	208
شلر	163
شنبھومترا	266, 268

شہاب ملیح آبادی 130

شولوخوف 285

شیام کماری نہرو 141, 142

شیفتہ 209

شیلا بھاٹیہ 266, 267

شیودان سنگھ چوہان 9, 63, 133, 150, 219, 234, 292

شیورانی 118, 119

صاحب سنگھ مہرا 266

(مولانا) صلاح الدین 198, 237

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم 31, 32, 33, 35, 299

صوفیہ وادیا 121

ڈاکٹر ضیاء الدین 130

طفیل احمد خاں 292

ظ۔انصاری 271, 276, 279, 280

ظفر علی خاں 19, 39, 53

ظہیر کاشمیری 35, 136, 218, 253, 305, 306

(ڈاکٹر سید) عابد حسین 34, 106, 129, 145

عادل رشید 272

عالم خوند میری 311

عبادت بریلوی 218

عبداللہ ملک 218, 250, 252, 292, 299

(مولانا) عبدالباری 204, 205

(مولوی) عبدالحق 11, 13, 34, 37, 106, 115, 121, 123, 129, 143, 144, 145, 146, 147, 148, 149, 209, 210, 248, 269

(سر) عبدالرشید 28, 29

(مولانا) عبدالرزاق ملیح آبادی 184

(ڈاکٹر)عبدالستار صدیقی 13

عبدالسلام خورشید 303

(مولانا)عبدالسلام ندوی 11, 341

(ڈاکٹر)عبدالعلیم 73, 77, 78, 85, 92, 94, 95, 99, 160, 171, 174, 175, 176, 178, 179, 186, 187, 188, 195, 207, 214, 216, 234, 23, 240, 257, 260, 286, 317, 318, 319, 321, 338

(قاضی)عبدالغفار 16, 34, 106, 115, 129, 252, 269, 298, 313, 319, 321,

(شیخ)عبدالقادر 19

(مولانا)عبدالماجد دریا آبادی 9

عبدالمجید سالک 19, 33, 106, 145, 237

عبدالمجید بھٹی 300

عشرت حسین 39

(پروفیسر)عزیز احمد 284, 311

عصمت چغتائی 27, 28, 29, 216, 271, 282, 354, 355

علی اشرف 160, 286

علی اطہر 130

علی جواد زیدی 208, 216

علی برادران 57, 71

علی سردار جعفری 130, 160, 185, 186, 187, 189, 202, 203, 204, 207, 208, 213, 214, 216, 217, 218, 234, 243, 244, 249, 250, 251, 255, 257, 261, 264, 267, 268, 270, 279, 280, 2, 295, 314, 315, 324, 327, 328, 330, 332, 334, 335, 339, 349, 350, 351, 352, 353, 354, 355

غالب 34, 92, 113, 138, 217, 269, 272, 344

غلام رسول مہر 19

فارغ بخاری 307

فخر ماتری 336

فرانکو 172, 173

فرائڈ 72

فردوسی 226

فکر تونسوی 35, 304, 305, 355

فورسٹر 248

فیروز دین منصور 33, 136

فلابیر 183

فیض احمد فیض 21, 22, 23, 24, 25, 26, 31. 32, 33, 35, 86, 94, 99, 133, 135, 136, 160, 171, 186, 198, 201, 216, 218, 219, 252, 262, 263, 264, 292, 293, 294, 295, 355, 357

قاضی محمد احمد 133, 292, 293

قدوس صہبائی 270, 281

قیوم نظر 237

کاڈویل 173

کارن فورڈ 18, 173

کالی داس 285

کاکا صنوبر حسین 307

کاکا کالیلکر 152, 161

کانتی چرن سون رکھشا 133

کرتار سنگھ دگل 301

کرشنا راؤ 267

کرشن چندر	35, 136, 186, 198, 201, 202, 216, 218, 219, 234, 235, 236, 237, 240, 252, 257, 270, 272, 274, 279, 280, 282, 295, 313, 315, 316, 324, 329, 330, 332, 333, 334, 335, 354, 356
کرم سنگھ مان	17
کلیم اللہ	286, 311
کملا دیوی چٹوپادھیائے	74, 91
کنہیا لعل منشی	7, 8, 65, 66, 67, 167
کیفی اعظمی	218, 255, 261, 262, 271, 272, 279, 283, 324, 325, 327, 328, 330, 332, 335, 336
گوتم بدھ	226
گوئٹے	163
لوہسون	284
لطیف احمد	298, 299
لینن	286
مارکس	72, 104, 286
ماماوریرکر	244
مانک بنرجی	183, 184, 189
ماہر القادری	327, 328, 329, 331, 332
مجروح سلطانپوری	255, 261, 272, 280, 281, 328, 330, 333, 335
مجنوں گورکھپوری	210, 214, 216, 284, 298, 238, 339, 340, 341
محسن عبداللہ	130
(پروفیسر) محبّ الحسن	136
(ڈاکٹر) محمد اشرف	3, 16, 133, 136, 137, 139, 140, 144
(ڈاکٹر) محمد اقبال	18, 53, 54, 72, 87, 94, 137, 138, 139, 140, 226, 293, 315, 327, 334, 335
محمد حسین آزاد	19, 338

(ڈاکٹر) محمد دین تاثیر 3, 18, 133, 135, 136, 137, 138, 139, 198. 292
(مولانا) محمد علی جوہر 71
محمد علی جناح 142, 319
محمد مہدی 271
(چودھری) محمد حسین 139
(چودھری) محمد علی ردولوی 72, 77, 80
(ڈاکٹر) محمود الظفر 3, 19, 20, 21, 22, 23, 24, 25, 27, 28, 29, 31,
33, 69, 70, 73, 74, 76, 87, 92, 94, 102
محمود شیرانی 19
محمود علی قصوری 17
(ڈاکٹر) محی الدین 11
مخدوم محی الدین 129, 208, 216, 252, 255, 257, 262, 263,
264, 267, 271, 283, 308, 310, 311, 313, 324
مخمور جالندھری 286, 294, 295, 305
مخمور اکبر آبادی 298
مدھوسودن 271
مسعود اختر جمال 208, 210, 216
مسولینی 172, 173, 288
سید مطلبی فرید آبادی 191, 193, 194, 195, 216, 283, 286
معین احسن جذبی 129, 204, 271, 283, 295
مقیم الدین فاروقی 292
(ڈاکٹر) ملک راج آنند 3, 18, 172, 173, 174, 175, 176, 177, 178,
179, 186, 188, 271, 286, 303
ممتاز حسین 218, 271, 285, 291, 321, 332, 334, 336, 355
ممتاز شاہنواز 28, 29
ممتاز مفتی 271

(پروفیسر) موہن سنگھ 301

مہاتما گاندھی 57, 65, 104, 116, 121, 126, 142, 161, 167, 204, 346

مہندرناتھ اشک 35, 247, 270, 272

میرتقی میر 93, 95, 344

میراجی 237, 247, 271, 294, 295, 331

میرانیس 138, 226

میرزاادیب 35

میکسم گورکی 144, 216, 269, 285, 286

(بابو)میتھلی شرن گپت 38, 76, 152

نرالا 352

نرگس 331

(آچاریہ)نریندردیو 74, 106, 143, 149, 151, 207

نریندرشرما 9, 144, 150, 352

(مولوی)نذیراحمد 38, 53, 144

نشاط مالیگانوی 324, 325

نظرحیدرآبادی 311

ن۔م۔راشد 234, 294, 295

نیتشے 72

نیازحیدر 271, 311, 330, 332, 335

(مولانا)نیازفتح پوری 85, 86, 87

واتسائن 236, 238

وارث شاہ 226, 301

وارث علوی 333

وامق جونپوری 218, 264, 267, 341

ورلیس 183

ورڈز ورتھ	164
وحید بنارسی	332
ولاٹھول	253
(پنڈت) وشنو شرما	114
وشوامتر عادل	271
وقار انبالوی	208
وقار عظیم	9, 160
وکٹر ہیوگو	163
ولی دکنی	335
وی۔ پی مکھرجی	248
ہاجرہ بیگم	76
ہاجرہ مسرور	271
ہٹلر	172, 173, 211, 288
ہریش چندر بھارتیندو	38
ہنس راج رہبر	35, 218, 303, 304
ہتھی سنگھ	3, 5, 6
ہیرالال گودی والا	167, 332
ہیرن مکھرجی	3, 16, 99, 102, 182, 184, 188
ہیولاک	72
(ڈاکٹر) یوسف حسین خاں	3, 16
یوسف مہر علی	91
یوسف ظفر	300

تنظیمیں، تحریکات اور قومی ادارے

احرار جماعت 19

اسٹوڈنٹ فیڈریشن 59, 218

اسلام 47, 52, 54. 55, 104

آکسفورڈ مجلس 153

آل انڈیا کانگریس کمیٹی 152, 171

انجمن ترقی اردو 16, 38, 116, 129, 130, 144, 145, 146, 147, 209, 210, 269, 285

انجمن ترقی پسند مصنفین 103, 126, 127, 128, 160, 171, 180, 188, 233, 244, 252, 256, 306

انجمن حمایت الاسلام 38

بھارتیہ ساہتیہ پریشد 65,116, 167

پنجاب ترقی پسند مصنفین 135

پنجاب کسان کمیٹی 134

ترقی پسند تحریک، ادب، ادیب 34, 35, 36, 60, 62, 64, 65, 74, 80, 84, 85, 88, 96, 97, 98, 101, 102, 103, 104, 106, 114, 115, 120, 127, 131, 134, 137, 138, 139, 140, 141, 142, 145, 151, 161, 163, 166, 168, 171, 172, 181, 183, 184, 186, 187, 196, 198, 201, 204, 206, 207, 208, 213, 215, 216, 217, 218, 219, 220, 222, 233, 236, 243, 247, 251, 252, 253, 254, 256, 257, 264, 270, 276, 277, 280, 281, 282, 283, 284, 285, 291, 292, 294, 295, 299, 302, 304, 305, 306, 307, 308, 309, 310, 311, 314, 317, 318, 319, 320, 321, 322, 323, 324, 325, 326, 327,

328, 329, 331, 332, 339, 340, 341, 347, 349, 351, 352, 355, 356, 357, 360

ترقی پسند مصنفین 1, 2, 3, 7, 9, 10, 18, 22, 23, 28, 33, 36, 62, 69, 70, 77, 83, 89, 92, 93, 94, 98, 103, 105, 122, 125, 129, 131, 135, 142, 145, 149, 150, 151, 154, 155, 158, 159, 161, 165, 167, 171, 172, 174, 176, 181, 182, 190, 191, 196, 197, 198, 199, 201, 213, 215, 220, 222, 228, 233, 234, 235, 236, 237, 238, 239, 240, 258, 259, 264, 266, 267, 269, 274, 275, 281, 285, 286, 287, 290, 291, 292, 293, 298, 304, 311, 312, 319, 321, 332, 333, 345, 349, 350, 354, 355, 356, 357, 360

تحریک سول نافرمانی 141

جامعہ ملیہ اسلامیہ 78, 129, 132, 133, 149, 194, 196

خلافت تحریک 36, 54, 57, 71, 204, 241

سوشلزم، سوشلسٹ 6, 129, 144, 159, 229, 230

علی گڑھ تحریک، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی 3, 38, 77, 78, 130, 133, 143, 144, 202, 340, 341, 356

غدر پارٹی 19

فرائضی تحریک 50

کاشی ودیا پیٹھ 149

کانگریس 59, 64, 67, 74, 91, 125, 126, 128, 141, 151, 152, 155, 171, 207, 230, 241, 250, 251, 319, 332, 333, 355

کانگریس سوشلسٹ پارٹی 59, 125, 128, 149, 151, 245

کانگریس کمیٹی، صوبہ متحدہ 152, 171, 207, 308, 339, 352

کسان کانفرنس، امرتسر 135

کسان سبھا 125, 126, 128, 134, 135, 151

کل ہند ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس 77

کمیونزم، کمیونسٹ، کمیونسٹ پارٹی 6, 59, 98, 102, 103, 105, 125, 128, 142, 150, 181, 184, 230, 238, 243, 245, 250, 270, 319, 334, 335

مارکسی سوشلزم 181

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس 38

مسلم لیگ 31, 54, 139, 205, 206, 241, 316, 319, 320, 328, 329, 333, 334, 336, 355

نوجوان بھارت سبھا 59

ناگری پرچارنی سبھا 38

تحریک نان کوآپریشن 57, 71

ہندی پرچار سبھا 65, 66

ہندی ساہتیہ سمیلن 61, 65, 66, 116, 351

ہندستانی اکیڈمی 10, 11

رسالے، اخبارات اور تخلیقات

ادبی دنیا (لاہور) 198, 219

ادب لطیف (لاہور) 144, 198, 201, 213, 218, 219, 304

انگارے 9

اسٹیٹس مین (انگریزی) 97, 98, 102, 115, 185, 219, 238

آہنگ 204, 216

برہان 293

بمبئی کرانیکل (انگریزی) 243

پرچم (لکھنؤ)	209
پرتیچے (بنگال)	167, 182, 253
پنچ تنتر	113
پیام، روزنامہ	16, 129
تہذیب الاخلاق	38
جنتا	151
زمانہ (کانپور)	11, 15, 117
زمیندار (لاہور)	19, 54
ساقی	129
سویرا	144
شاہجہاں	129, 132
شمیم (پٹنہ)	213
قومی جنگ	250
کامریڈ	54
کلیم	117, 129, 160, 214
کویتا کومودی	149
گیتانجلی	152
لندن کی ایک رات	216
مخزن	19
معارف	293
منزل (لکھنؤ)	216, 218
نظام ہفتہ وار	270, 281, 308
نقوش	144
نگار	85

نیا ادب (لکھنؤ) 66, 120, 158, 159, 213, 214, 215, 216, 217, 218, 219, 221, 249, 250, 270, 271, 274, 283, 284, 285, 320, 330, 332

نیا زمانہ 270, 324, 332

نیوانڈین لٹریچر (انگریزی) 188

ہمایوں (لاہور) 30, 198

ہندوستان (لکھنؤ) 159, 160, 207, 208, 209

ہنس 116, 121, 123, 142, 219

مقامات، صوبہ جات اور ممالک

اجمیر 187

احمد آباد 58, 64, 176, 308, 312, 322, 332, 333, 335, 336

اڑیسہ 155, 156, 185

آکسفورڈ 3, 4, 19, 29, 152, 153

آگرہ 129, 253, 298, 299

الہ آباد 9, 16, 19, 29, 62, 63, 64, 69, 70, 73, 92, 99, 117, 122, 123, 128, 141, 143, 150, 151, 160, 161, 169, 174, 175, 188, 204, 253, 269, 322, 324, 349, 351, 352, 354

امرتسر 3, 11, 16, 19, 20, 21, 69, 129, 134, 135, 137, 175, 201, 237, 302, 305

آندھرا پردیش 185, 253, 254, 265, 266, 267

بمبئی 3, 4, 5, 6, 16, 34, 57, 58, 64, 67, 168, 175, 213, 217, 241, 243, 244, 245, 247, 248, 249, 250, 252, 254, 255, 256, 257, 260, 261, 264, 265, 267, 268, 269, 270, 271, 272, 273, 275, 281, 283, 286, 291, 299, 311, 312, 315, 320, 321, 32, 324, 325, 326, 327, 328, 329, 330, 332, 335, 339, 349, 354

بنارس 65, 117, 118, 119, 121, 122, 123, 128, 149, 160, 253, 269, 325

بنگال 16, 34, 39, 48, 50, 55, 57, 64, 73, 78, 87, 99, 122, 147, 155, 159, 167, 168, 171, 176, 180, 181, 182, 183, 184, 188, 189, 250, 253, 256, 259, 264, 265, 246

بہار 50, 78, 130, 150, 160, 185, 308, 350

بیجواڑہ 168, 322

پاکستان 1, 144, 145, 147, 239, 305, 355, 360

پانی پت 243

پٹنہ 119, 122, 128, 213, 216, 269, 285, 356

پونا 122, 168, 255, 257, 275, 283, 321

پیرس 16

پنجاب 16, 17, 18, 23, 26, 73, 78, 134, 135, 136, 137, 140, 144, 160, 168, 186, 191, 201, 216, 221, 252, 265, 266, 270, 299, 300, 301, 302, 303, 305, 307, 308, 315, 324, 332, 357

جلیاں والا باغ (امرتسر) 19, 57, 135, 136, 137, 302

جون پور 264, 341

حیدرآباد(دکن)	3, 11, 15, 16, 65, 66, 129, 146, 186, 190, 198, 208, 213, 252, 257, 271, 272, 284, 308, 309, 310, 311, 313, 315, 317, 319, 321, 322
دہلی	32, 75, 129, 130, 133, 134, 143, 144, 149, 150, 160, 171, 191, 194, 203, 213, 217, 234, 235, 236 237, 238, 239, 253, 269, 291, 292, 293, 294, 295, 297, 298, 307, 308, 312, 322, 353
رامپور	19, 22
راولپنڈی	305, 306
سلہٹ(آسام)	167, 181, 185
سوویت روس	6, 102, 117, 136, 181, 184, 229, 238, 254, 286, 288, 324
عظیم آباد(پٹنہ)	285, 322
علی گڑھ	3, 13, 27, 129, 133, 134, 143, 160, 203, 204, 206, 340
فریدآباد	191, 194
کراچی	144, 145
کلکتہ	3, 16, 58, 97, 146, 152, 154, 156, 167, 175, 180, 181, 184, 186, 186, 187, 188, 213, 235, 241, 256, 260, 269, 308, 322
کیمبرج	18, 183
گوہاٹی	167

لاہور	17, 21,23, 24, 26, 28, 29, 31, 33, 35, 64, 65, 66, 121, 129, 135, 137, 144, 175, 186, 198, 201, 213, 237, 250, 273, 283, 285, 286, 291, 292, 293, 299, 300, 301, 302, 303, 304, 305, 312, 322, 324
لندن،انگلستان، برطانیہ	3, 4, 9, 17, 18, 19, 23, 25, 29, 33, 39, 44, 92, 97, 102, 103, 130, 137, 164, 172, 173, 178, 179, 182, 231
لکھنؤ	9, 10, 20, 29, 32, 64, 69, 70,71,72, 73, 74, 78, 80, 85, 86, 91, 116, 120, 121,122, 123, 126, 128, 130, 141, 152, 159, 160, 174, 175, 180, 182, 186, 189, 190, 198, 201, 202, 203, 204, 207, 208, 209, 210, 214, 215, 217, 219, 230, 236, 237, 249, 260, 271, 291, 292, 293, 298, 309, 312, 322, 324, 331, 338, 340
مالابار	57, 168, 265
میرٹھ	85
میسور	168
ناگپور	121, 123, 167, 168, 246
ہندستان	1, 3, 6, 10, 19, 43, 46, 48, 54, 59, 62, 78, 88, 92, 96, 102, 143, 145, 149, 159, 172, 174, 197, 241, 242, 252, 269, 282, 288, 309, 312, 348, 355, 357, 360
ہری پورہ (بمبئی)	171, 172
یورپ	6, 25, 153, 162, 172, 175, 179

○○○

سر سید وزیر حسن (والد سجاد ظہیر)

سکینہ الفاطمہ، لیڈی وزیر حسن (والدہ سجّاد ظہیر)

سجاد ظہیر، آکسفورڈ (1927)

سجاد ظہیر (1971)

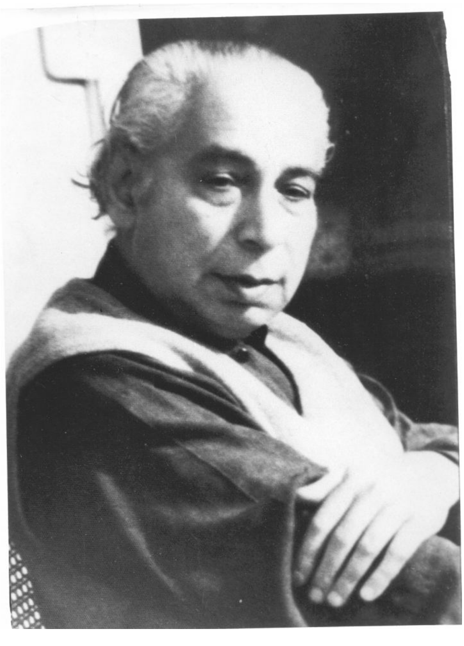

رضیہ سجاد ظہیر، نادرہ، نور، نجمہ اور نسیم عید کے موقع پر

ہری ونش رائے بچن اور دیگر احباب کے سامنے تقریر کرتے ہوئے سجاد ظہیر

سجاد ظہیر، رضیہ، نجمہ اور نسیم بمبئی میں (1946)

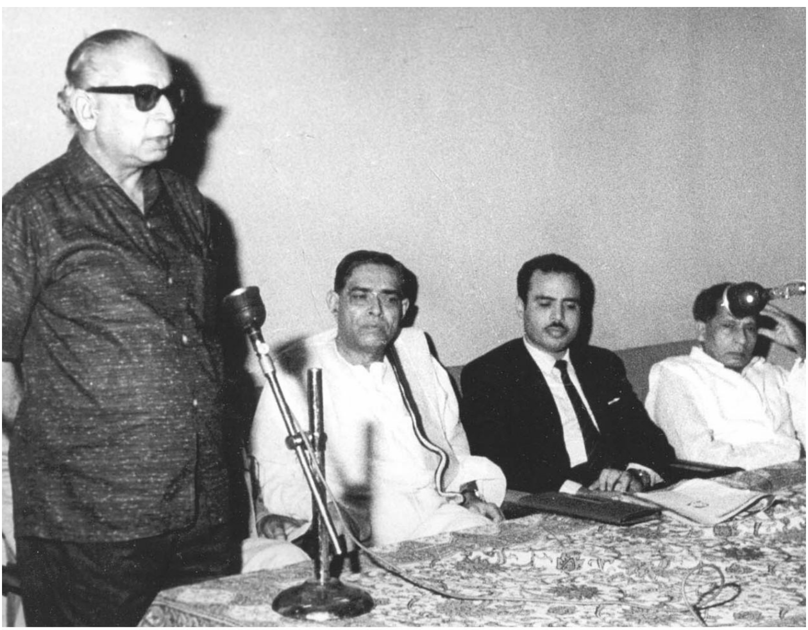

وزیراعظم جواہر لعل نہرو کے ساتھ سجاد ظہیر اور نسیم

علی باقر، نجمہ باقر اور سجاد ظہیر لندن میں (1968)

مخدوم محی الدین کے ساتھ سجاد ظہیر

غلام ربانی تاباں اور راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ سجاد ظہیر

ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے سجاد ظہیر

صدرِ جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین اور سجاد ظہیر

جاں نثار اختر اور ساحر لدھیانوی سے محوِ گفتگو سجاد ظہیر

سجاد ظہیر، آئی کے گجرال، جاں نثار اختر اور قمر رئیس

کرشن چندر، مخدوم محی الدین، فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی کے ساتھ سجاد ظہیر

پی۔ڈبلیو۔اے کی کل ہند کانفرنس میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کی تقریر سنتے ہوئے سجاد ظہیر (بمبئی)

ہری ونش رائے بچن، انور عظیم اور ایک روسی خاتون کے ساتھ محو گفتگو سجاد ظہیر

رضیہ سجاد ظہیر، سردار جعفری، سکندر علی وجد، سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین، رئیس مرزا، زبیر رضوی اور حسن نعیم

فیض احمد فیضؔ اور ایلیس فیض کے ساتھ ماسکو میں سجاد ظہیر

ایک روسی مصنف کے ساتھ علی سردار جعفری اور سجاد ظہیر محو گفتگو

سجاد ظہیر، ساحرؔ لدھیانوی اور دوسرے دوستوں کے ساتھ

رضیہ سجاد ظہیر، بچی نادرہ اور سجاد ظہیر

علی باقر اور سجاد ظہیر لندن میں

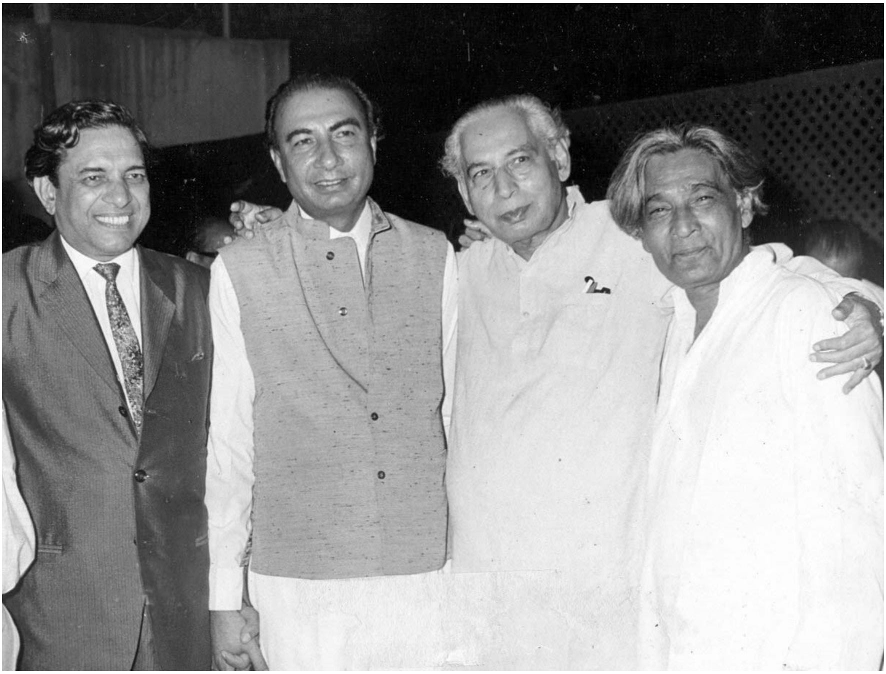

سجاد ظہیر کے ساتھ ساحرؔ لدھیانوی، جاں نثار اخترؔ اور مہندر کپور

پاکستان کے ایک مشاعرے میں سجاد ظہیر کی آخری شرکت

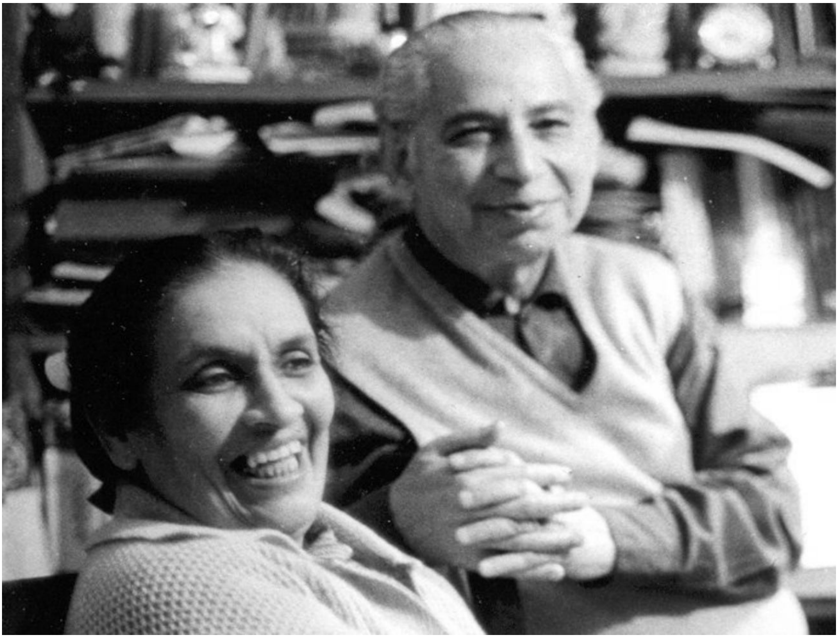

سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد ظہیر

ساٹھویں سالگرہ پر سجاد ظہیر اپنی اہلیہ کے ساتھ

سجاد ظہیر انتقال سے چار دن قبل فیض احمد فیضؔ کے ساتھ روس میں (1973)